# تاریخ ادب اُردو

(1838 تا 1857)

(جلد چہاردہم)

محمد انصار اللہ

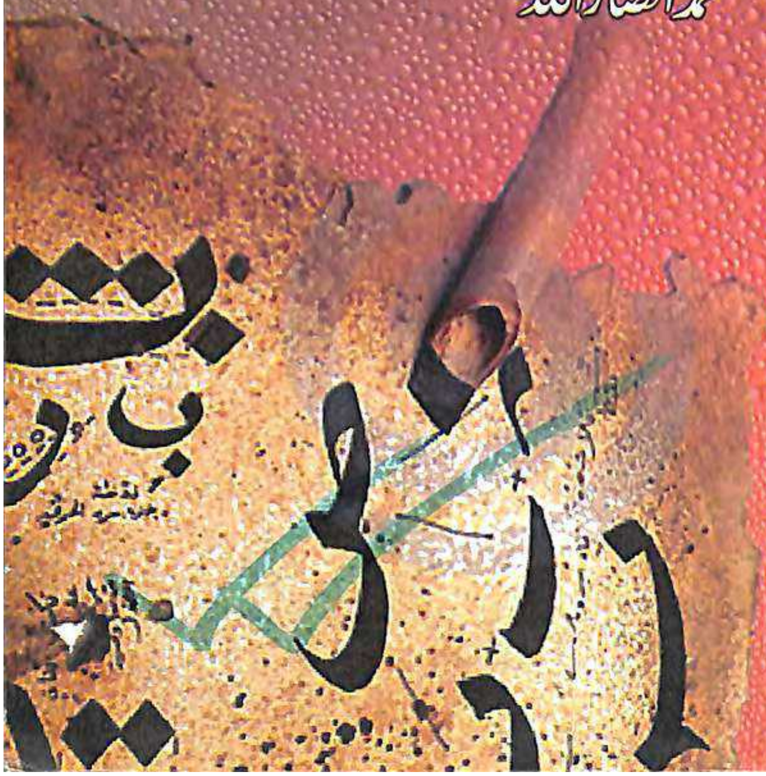

# تاریخ ادب اردو

## جلد سیزدہم

## (1838 تا 1857)

محمد انصار اللہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2015
تعداد : 550
قیمت : -/259 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1862

**Tareekh-e-Adab-e-Urdu Vol.13**

**By: Mohammad Ansarullah**

ISBN :978-93-5160-094-7

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

# پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہردلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائرکٹر

# فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| | مقدمہ | | vii |
| -1 | روہیل کھنڈ | | 1 |
| | i | رام پور | 15 |
| | ii | بریلی | 25 |
| | iii | بدایوں | 29 |
| | iv | مرادآباد | 35 |
| | v | شاہجہاں پور | 39 |
| | vi | حواشی | 144 |
| -2 | ضلع فرخ آباد | | 153 |
| | i | چھبرامئو | 163 |
| | ii | فتح گڑھ | 165 |
| | iii | فرخ آباد | 167 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| | iv | قائم گنج | 173 |
| | v | شمس آباد | 175 |
| | vi | حواشی | 203 |
| -3 | کانپور | | 207 |
| | i | حواشی | 390 |
| -4 | الہ آباد | | 399 |
| | i | حواشی | 418 |
| -5 | لکھنؤ | | 421 |
| | i | حواشی | 484 |
| | ماخذ | | 595 |

# مقدمہ

مرزا ابوظفر بہادر شاہ ثانی بادشاہ دہلی بحد امکان اپنے اسلاف کی روایتوں کو نباہتے اور ان کی روش پر چلتے رہے تھے۔ بہ ایں ہمہ وہ انگریزوں کے ہتھکنڈوں اور ان کی چال بازیوں سے خود کو پوری طرح مامون و محفوظ نہیں رکھ سکے۔ مرزا ابوظفر کی بادشاہت کے ابتدائی زمانے میں سیاسی نقطۂ نظر سے ایک نہایت اہم واقعہ یہ بھی رونما ہوا تھا کہ روہیل کھنڈ کا علاقہ چھوٹی چھوٹی کئی ریاستوں میں منقسم ہو گیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ روہیلوں کی طاقت تقریباً ختم ہو گئی اور اس اطراف ہو گئی اور اس اطراف میں سرکار کمپنی بہادر کی گرفت خوب مضبوط ہو گئی۔

شہر کلکتہ کمپنی بہادر کا دارالامارات اور عملاً ایک ہندوستان کا پایۂ تخت مقرر ہوا۔ کیفیت یہ ہوئی کہ عوام ہی نہیں، خواص میں نواب رامپور کو بھی اپنے اہم مسائل کے حل کے لیے کلکتہ کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک انگریزوں کے بسائے ہوئے بڑے چھوٹے شہر اور قصبے کئی وجود میں آ گئے تھے۔ خود ضلع فرخ آباد انگریزی افواج کا ایک اہم کیمپ بن گیا تھا۔ چھوٹے قصبوں میں ایک کا ذکر میر علی اوسط رشک نے اس طرح کیا ہے ؎

معاذ اللہ یہ ترسا ہیں طے الارض کے حاکم    کہ منڈیاؤں جاتے ہیں تو لندن دیکھ لیتے ہیں

کانپور انگریزی افواج کا بڑا کیمپ بنا اور وہ "ملک نصارا" کر کے مشہور ہوا۔ اس ملک میں

انگریزی مصنوعات اور اداروں کے علاوہ کئی ایسی چیزیں تھیں جن سے دلی اور لکھنؤ والے بالکل نا آشنا تھے مثلاً بجلی، واٹر ورکس، اگن بوٹ اور بجرے وغیرہ۔ اسی سلسلے میں ان اضلاع انگریزی کے اردو شاعروں اور ان کی اردو نظم ونثر وغیرہ کی بعض اصناف کا مذکورہ بھی مناسب ہے۔

اہل فرنگ کے حوصلے بلند تھے چنانچہ ان کی ضرورتیں بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ اب ان کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اہل ہند کی معاشرت، بول چال اور ان کے طرز فکر و بیان سے متعلق اچھی واقفیت حاصل کرلیں۔ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے علاوہ دلی کالج اور بمبئی، دکن اور مدراس وغیرہ کے اسکولوں اور کالجوں میں یہ کام پوری خوش اسلوبی اور خلوص کے ساتھ کیا گیا۔ اردو قواعد اور لغت کی کتابیں مرتب کی گئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں علم عروض سے بھی دلچسپی لی گئی اور اس علم سے متعلق رسالے نثر ہی میں نہیں نظم میں بھی لکھے گئے۔ عالمگیر اورنگ زیب کے زمانے میں اردو تحریر کے مسائل کی طرف توجہ کی جانے لگی تھی۔ پھر اکبر شاہ اور بہادر شاہ کے وقت میں اردو تحریر کے ساتھ ساتھ دیوناگری خط کے معاملات کا بھی دلی، لکھنؤ، بمبئی، کرناٹک اور مدراس وغیرہ میں ذکر کیا جانے لگا تھا۔ طالب علموں کو اردو اور انگریزی وغیرہ زبانیں سکھانے کے لیے بھی گجرات اور دوسرے علاقوں میں بعض رسالے تالیف کیے گئے تھے۔

اکبر شاہ اور بہادر شاہ کے عہد کے دانشوروں کو غیر ممالک کے بسنے والوں کے حالات اور معاملات سے بھی بخوبی دلچسپی رہی ہے۔ بنگال ہی نہیں، گجرات وغیرہ کے علاقوں میں بھی سمندر کے راستوں سے مختلف اقوام کی آمد و رفت کے سلسلے جاری تھے۔ اس زمانے کی داستانوں میں روم، مصر، شام اور فرنگ وغیرہ کے بعض دیدہ اور شنیدہ احوال اور واقعات قلمبند کیے گئے ہیں۔ اس قسم کی تحریریوں کا فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ اس زمانے کے جدید ترین علوم سے بھی زبان اردو کا دامن بھرنے لگا۔ شدہ شدہ مختلف زبانوں کی تحریروں کو اردو میں منتقل کرنے کا بھی رواج ہو گیا۔

اردو نثر کے سرمایہ میں سفرناموں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ عام طور سے یوسف خاں کمبل پوش کے سفرنامہ ''عجائبات فرنگ'' کو اردو کا پہلا سفرنامہ خیال کیا گیا ہے لیکن اب یہ بات سامنے آئی ہے کہ ارکاٹ کے علاقے میں اس سے پہلے بھی ایک منظوم سفرنامہ لکھا گیا تھا۔

---

ے اس سلسلے میں راقم کے رسالہ ''اردو کے حروف تہجی'' کا مطالعہ بھی افادیت سے خالی نہیں ہے۔

بہادر شاہ ثانی کے زمانے میں ملک میں چھاپے خانوں کا بھی رواج عام ہو گیا تھا اور نتیجہ کے طور پر تقریر و تحریر کے نئے نئے اطوار اور انداز سامنے آنے لگے تھے۔ ملک کے گوشے گوشے سے اخبار اور رسالے جاری ہو گئے تھے۔ کبت، پہیلی اور بارہ ماسے، دوہرے اور سورٹھے۔ نظم جدید اور مضمون نگاری وغیرہ کے علاوہ تصانیف کی منزل سے گزر کر تالیف اور ترجے وغیرہ کے کام سے بھی دلچسپی لی جانے لگی، اس طرح زبان و بیان اور علم و دانش کے بھی اطراف ملک میں لائق توجہ مراکز وجود میں آنے لگے تھے۔ ان میں سے جلد دوازدہم میں درج ذیل کا ذکر کیا جا چکا ہے:

دہلی، میرٹھ اور مضافات ( بلند شہر، خورجہ، سہارنپور، بجنور)۔ پنجاب، ہریانہ، بلوچستان، راجستھان (اجمیر، الور، بھرت پور، ٹونک، جے پور) آگرہ، علی گڑھ، فیض آباد، جونپور، غازی پور اور بنارس

اور اب اس جلد سیزدہم میں جن مراکز کی کارکردگی کا احوال قلمبند کیا جا رہا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

روہیل کھنڈ (رامپور، بریلی، بدایوں، مرادآباد، شاہجہان پور) فرخ آباد، کانپور، الہ آباد، لکھنؤ

یہ تمام مراکز عملاً انگریزی عمل داری میں تھے۔ لکھنؤ میں اگرچہ بادشاہت تھی لیکن وہ بھی انگریزوں کی سرپرستی میں تھی۔

آئندہ جلد نمبر چہاردہم میں اندرونِ ملک کے مراکز کے علاوہ بیرونِ ملک کے بھی صرف بعض مراکز کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے نام اس طرح ہیں:

خطۂ بہار (عظیم آباد، پٹنہ)، بنگال اور مضافات (کلکتہ، مرشد آباد، ڈھاکہ، سلہٹ)، اڑیسہ، گجرات (احمد آباد، بڑودہ، بھڑوچ، پٹن، سورت، کھمبایت)، صوبہ متوسط و برار (ایلچ پور، جلگاؤں، ملکاپور) بمبئی، ناگپور و کامٹی، دکن (حیدرآباد، ویلور، کرنول، قمرنگر) بیگن پلی، کرناٹک، مدراس بشمول ضمیمہ:

نیپال، برما، جزائر انڈمان، پنانگ (ملایا)، مکہ معظمہ

اس تفصیل سے اردو زبان و ادب کی خوبیوں اور وسعتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ زمانی اور مکانی تقسیم کے ساتھ زبان و ادب اردو کی تاریخ قلمبند کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ اس میں طرح طرح کی کوتاہیاں اور فروگذاشتیں ہوئی ہوں گی۔ ارباب علم و بصیرت سے گزارش ہے کہ وہ ازراہ

علم نوازی ان کو نظر انداز کریں اور صحیح صورت حال کی طرف ہماری رہنمائی فرمائیں۔ شکریہ۔

محمد انصار اللہ
4/1172 سر سید نگر، علی گڑھ (یو پی)

# 1- روہیل کھنڈ

i راممپور
ii بریلی
iii بدایوں
iv مرادآباد
v شاہجہان پور
vi حواشی

| | | | |
|---|---|---|---|
| | | روہیل کھنڈ - ماحول | 9 |
| | | الف - غزل | 15 |
| | | رامپور | 15 |
| -1 | ناظم- | نواب یوسف علی خاں | 15 |
| -2 | الم- | سعیداللہ خاں | 18 |
| -3 | نحیف- | محمد مہدی علی خاں | 18 |
| -4 | نظام- | سید نظام شاہ | 18 |
| -5 | اصغر- | محمد اصغر علی خاں | 19 |
| -6 | بیتاب- | نواب عباس علی خاں | 20 |
| -7 | تسکین- | میر حسین | 21 |
| -8 | بیمار- | شیخ علی بخش | 22 |
| -9 | حسین- | غلام حسین خاں | 23 |
| -10 | گرم- | مظفر خاں | 24 |
| | | بریلی | 25 |
| -1 | راسخ- | نواب ظفریاب خاں | 26 |
| -2 | جوش- | نواب احمد حسن خاں | 27 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| -3 | مصروف- | مصروف خاں بہادر | 28 |
| | | بدایوں | 29 |
| -1 | حشر- | رسول بخش | 29 |
| -2 | رسوا- | مولوی فیض احمد | 30 |
| -3 | شرر- | علی بخش | 30 |
| -4 | مذاق- | محمد دلدار علی | 31 |
| -5 | مست- | فضل رسول | 33 |
| -6 | طالب- | طالب علی خاں | 33 |
| -7 | کامل- | شیخ جمال الدین | 34 |
| | | مرادآباد | 35 |
| -1 | تنہا- | نواب محمد شبیر علی خاں | 35 |
| -2 | عاجز- | شبیر علی خاں | 36 |
| -3 | علی- | رفیع علی خاں | 36 |
| -4 | ذکی- | شیخ مہدی علی | 36 |
| -5 | ہادی- | منشی امام الدین | 37 |
| | | شاہجہان پور | 39 |
| -1 | احمد- | مولوی احمد خاں | 39 |
| -2 | حسین- | نواب غلام حسین خاں | 40 |
| -3 | سکندر- | سکندر خاں | 41 |
| -4 | فخر- | محمد فخر الدین | 41 |
| | | ب - نعت | 43 |
| -1 | حیات- | محمد حیات خاں | 44 |
| -2 | شہیدی- | کرامت علی خاں | 45 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 3- | عباس- | سید عباس علی | 47 |
| 4- | عباس- | مرزا عباس بیگ | 47 |
| 5- | کافی- | محمد کفایت علی | 48 |
| 6- | لطف- | لطف علی خاں | 49 |
| 7- | مذاق- | محمد دلدار علی | 51 |
| | | ج - مثنوی | 53 |
| | | عشقیہ مثنویاں | 55 |
| 1- | احمد- | سید یمین الدین احمد | 55 |
| 2- | انور- | امام الدین خاں | 56 |
| 3- | بیتاب- | عباس علی خاں | 57 |
| | | مذہبی مثنویاں | 59 |
| 1- | بندہ- | حفظ اللہ | 59 |
| 2- | حیات- | محمد حیات | 60 |
| 3- | حیدری- | شیخ حیدری | 61 |
| 4- | کافی- | محمد کفایت علی | 61 |
| | | متفرق مثنویاں | 63 |
| 1- | جمال- | محمد جمال خاں | 63 |
| 2- | جوہر- | حکیم ہادی حسین خاں | 63 |
| 3- | قادری- | سید غلام جیلانی | 64 |
| | | د - نوحہ وسلام | 65 |
| 1- | ناظم- | نواب یوسف علی خاں | 66 |
| 2- | قربان علی- | میر قربان علی | 68 |
| 3- | رضا- | میر رضا علی | 69 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| -4 | شاد- | میاں فضل علی قوال | 69 |
| | | ہ - قصیدہ | 71 |
| -1 | ناظم- | نواب یوسف علی خاں | 71 |
| -2 | بحر- | شیخ امداد علی | 73 |
| | | و - واسوخت | 75 |
| -1 | ناظم- | نواب یوسف علی خاں | 75 |
| -2 | بیتاب- | محمد عباس علی خاں | 87 |
| | | ز - مخمس | 89 |
| -1 | ناظم- | نواب یوسف علی خاں | 89 |
| -2 | داغ- | نواب مرزا خاں | 90 |
| -3 | مذاق- | مولوی دلدار علی | 92 |
| -4 | رسا- | انبا پرشاد | 92 |
| | | ح - تاریخ گوئی | 95 |
| -1 | ناظم- | نواب یوسف علی خاں | 95 |
| -2 | حسین- | میر حسین علی | 96 |
| -3 | سَروَری- | نواب محمد کاظم علی خاں | 97 |
| -4 | ذکی- | شیخ مہدی علی | 98 |
| -5 | عجمی- | ہیرالال | 98 |
| -6 | عدیل- | میر عوض علی | 99 |
| -7 | فاخر- | حکیم احمد خاں | 99 |
| -8 | انوار و تسلیم- | منشی انوار حسین | 101 |
| | | ط - کبت وغیرہ | 103 |
| -1 | تاب- | امداد اللہ خاں | 106 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 2- | حسین- | سید حسین شاہ | 109 |
| 3- | گوال- | گوال رائے | 109 |
| | | ی - داستانیں | 113 |
| 1- | کلب علی خاں- | نواب کلب علی خاں | 114 |
| 2- | رسا- | میر احمد علی | 114 |
| 3- | رسا- | انبا پرشاد (عبدالرحمٰن) | 115 |
| 4- | ذکی- | مہدی علی خاں | 119 |
| 5- | صارم- | سید احمد حسین | 120 |
| 6- | گرم- | محمد مظفر خاں | 120 |
| | | ک - تذکرے | 121 |
| 1- | سحر- | احمد حسین | 122 |
| 2- | نفیس- | محمد اشرف علی | 126 |
| 3- | انوار- | انوار حسین | 128 |
| | | ل - مذہبی نثر | 129 |
| | | ترجمے | 129 |
| 1- | غلام عباس | | 129 |
| 2- | حیدر علی شاہ | | 130 |
| 3- | مفتی محمد سعد اللہ | | 130 |
| 4- | ملا محمد نظام الدین | | 132 |
| | | تالیفات | 135 |
| 5- | قاری فخر اللہ | | 135 |
| 6- | قاضی عبدالسلام | | 136 |

| | | |
|---|---|---|
| 7- | وزیر علی | 136 |
| 8- | مفتی محمد سعد اللہ | 137 |
| | | 139 |
| 1- | مدن پال | 139 |
| 2- | آئینِ سپاہ | 140 |
| 3- | لب لباب ہزل | 141 |
| | ن - مطبعے | 143 |
| | حواشی | 144 |

# روہیل کھنڈ - ماحول

روہیل کھنڈ کا خطہ نواب محمد عبداللہ خان بہادر عاصی تخلص کے بے دخل کیے جانے کے بعد پانچ چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہوگیا تھا۔ اس تقسیم کے نقصانات کو صرف ایک یعنی رامپور کی ریاست جھیل سکی۔

مرزا ابوظفر بہادر شاہ ثانی کے ابتدائی زمانے میں رامپور میں نواب احمد علی خان بہادر رند تخلص حکمراں تھے۔ 25 جمادی الاول 1256ھ (26 جولائی 1840) کو انھوں نے وفات پائی تو نواب محمد سعید خان بہادر مسند نشین ہوئے۔ ان کے بارے میں امیر مینائی نے لکھا ہے :

> "نواب محمد سعید خاں صاحب بہادر خلف الصدق نواب غلام محمد خان صاحب بہادر..... جس دن سے آپ کے پدر بزرگوار حرمین شریفین کی طرف نہضت فرما ہوئے، آپ چندے بنارس میں اور چندے شہر لکھنو میں جلوہ فرما رہے اپنے مقدمے میں پیروی کے واسطے دارالامارت کلکتہ کے سفر کا بھی اتفاق ہوا۔ جب نواب احمد علی خان بہادر نے وفات پائی، آپ بدایوں میں تشریف رکھتے تھے۔ حسب منظوری سرکارِ انگلشیہ اس دارالریاست میں تشریف لائے اور جمادی الآخر کی اکیسویں تاریخ بارہ سو چھپن ہجری، اگست کی بیسویں، اٹھارہ سو چالیس عیسوی میں

پنجشنبہ کو مسند آرا ہوئے۔ اس زمانے میں اصول اس ریاست کے بالکل برباد اور لوگ نہایت سرہنگ و سرکش، سراپا شرارت و فساد تھے۔ آپ نے اپنی رائے حکیمانہ سے ایسے ضوابط اور قواعد ایجاد فرمائے کہ روز بہ روز خرابیاں گھٹنے لگیں۔ رعایا آباد، خلق خدا شاد، فوج آراستہ، سپاہ پیراستہ ہوگئی...... طب میں حکیم مرزا احمد علی صاحب لکھنوی سے تلمذ تھا۔ نثر عاری خوب لکھتے تھے۔ مرزا قتیل صاحب سے اس فن میں مشورہ تھا۔ بارہ سو ہجری میں رجب کی بیسویں تاریخ کہ مئی کی انیسویں سترہ سو چھیاسی عیسوی سے مطابق تھی جمعہ کو پہر دن چڑھے آپ کی ولادت ہے۔ پندرہ برس اکیس دن آپ مسند آرا رہے۔ پھر مسلول ہو کر دوشنبہ کو چار گھڑی دن چڑھے رجب کی تیرھویں تاریخ بارہ سو اکہتر ہجری میں کہ یکم اپریل اٹھارہ سو چھپن عیسوی سے مطابق تھی اکہتر برس کی عمر پاکر دار نعیم کی طرف نہضت فرمائی۔"[1]

آنولہ اور بدایوں کے علاقے میں فتح خاں خانساماں حاکم تھا۔ نواب محمد سعید خاں کے اس خاندان سے اچھے روابط تھے اسی لیے یہ بدایوں میں مقیم رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ روہیل کھنڈ کے پورے خطے میں انگریزوں کی بالادستی مسلم ہو چکی تھی چنانچہ ان کی منظوری کے بعد ہی محمد سعید خاں کو رامپور کی مسند حاصل ہو سکی تھی۔

نواب محمد سعید خاں شاعر نہیں تھے لیکن علوم و فنون سے ان کی دلچسپی غیر معمولی تھی۔ امتیاز علی خاں عرشی نے لکھا ہے :

"کتاب خانۂ رامپور مدرسۂ عالیہ کی طرح نواب سید فیض اللہ خان بہادر کا قائم کیا ہوا ادارہ ہے لیکن اس کی باقاعدہ ترقی کا دور نواب سید محمد سعید خان بہادر کی مسند نشینی سے شروع ہوا۔ انھوں (جنت آرامگاہ) نے ریاست کے دوسرے محکموں کی اصلاح کے ساتھ کتاب خانے کو بھی توجہ کا شرف بخشا۔ توشہ خانے میں کتابوں کے لیے جداگانہ کمرہ معین ہوا۔ لکڑی کی الماریوں میں کتابیں قرینے سے رکھی گئیں۔ ایک مُہر بنوائی گئی جس میں سنہ 1268ھ کے ساتھ یہ شعر کندہ ہے ؎

ہست ایں مُہر بر کتب خانہ والیِ رامپور فرزانہ

"......کشمیر سے میرزا غلام رسول اور میرزا محمد حسن دو بھائی طلب کیے گئے۔ یہ دونوں خطِ نسخ کے ماہر تھے۔ خطِ نستعلیق کے لیے میر عوض علی بلیخ آبادی لکھنو سے بلائے گئے........"2

میر عوض علی شاعر بھی تھے۔ عدیل تخلص کرتے تھے۔ امیر مینائی نے ان کے بارے میں جو لکھا ہے، مختصراً یہ ہے :

"عدیل میر عوض علی صاحب خوشنویس سیدِ حُسینی خلف میر چاند علی صاحب، حافظ ابراہیم صاحب ابن حافظ نور اللہ صاحب کے شاگرد نامور ہیں بلکہ بعض باتوں میں استاد سے بہتر ہیں۔ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ خطِ نستعلیق کو انھوں نے کیسی رونق دی ہے........ برکت کا یہ حال کہ جس نے چندے تلمذ اختیار کیا محروم نہ رہا۔ بہت شاگرد خوشنویس کامل ہو گئے.....بعض رسائل جو ان کی تالیف ہیں نام اُن کے لکھے جاتے ہیں۔

رسالہ سہل ممتنع املا کے بیان میں، صحت الملوک طب میں، دستور العمل تدبیر معاش ساکین میں، طریق تقسیم ساکین، رسالہ اصولِ نستعلیق، ناتمام مثنوی نان نعمت۔

اصل وطن ان کا بلیخ آباد ہے۔ جب نواب محمد سعید خاں صاحب لکھنو میں تشریف رکھتے تھے نواب محمد یوسف علی خان بہادر کی تعلیم کے واسطے میر صاحب کو مقرر فرمایا تھا......

80 برس کی عمر ہے۔ سالہائے دراز سے یہیں رہتے ہیں۔ بطور تفنن کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں ؎

اب تو بار نفس نہیں اٹھتا　　　آہ کس درجہ ناتواں ہیں ہم
آپ میں ہیں، نہ آپ سے باہر　　　کچھ نہیں جانتے کہاں ہیں ہم" 3

رامپور میں میر عوض علی اور میرزا غلام رسول کے واسطے سے خوش نویسی کا شوق تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔ یہاں ان کے صرف ایک شاگرد کا احوال نقل کیا جاتا ہے :

"غریب، الٰہی بخش نام ولد شیخ منیر الدین صدیقی۔ چونتیس برس کی عمر ہے سرکار دولت مدار میں ملازم، جوہر قابل ہیں۔ نسخ و نستعلیق دونوں میں خوشنویسِ کامل ہیں۔

خطِ نستعلیق میر عوض علی عدیل سے حاصل کیا اور خطِ نسخ آغا غلام رسول کشمیری سے مشق کر کے کامل کیا۔ کلام اس ہیچمدان کو دکھاتے ہیں ۔

عرش تک کب مرا گذر نہ ہوا نہ ہوا اس کے دل میں گھر نہ ہوا '' 4

امیر مینائی نے نواب احمد علی خاں رند کے زمانے کے کتاب خانے کے ایک ملازم کا احوال اس طرح قلمبند کیا ہے :

'' محوی آغا یوسف علی خاں ابن فیض اللہ خاں بحرینی۔ ان کے جدِّ امجد یوسف خاں بحرینی نادر شاہ کی طرف سے کابل میں قلعہ بالا حصار کے حاکم تھے۔ بعد ان کے ان کے باپ بھی اسی منصب پر رہے۔ یہ بزرگ کابل میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی..... اب مدّت سے ہندوستان میں ہیں اور اس سرکار میں نواب احمد علی خان بہادر کے عہد سے عہدۂ کتاب خانے پر ملازم ہوئے۔ آج تک بدستور وظیفہ خوار ہیں۔ اب 67 برس کی عمر ہے ۔

تو نہ دیدی ز حیا سوے مَن دِمَن ہمہ شب ہمچو آئینہ بہ رخسار تو حیراں بودم '' 5

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتب خانہ کی طرف سے بے توجہی نواب احمد علی خاں کے زمانے میں بھی نہیں رہی ہے البتہ بعد کے زمانے میں معاملات بہتر ہوتے چلے گئے اور کتب خانہ بتدریج ترقی کرتا چلا گیا۔

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ نواب محمد سعید خان بہادر کی سرپرستی میں خوشنویسی کے فن کو ترقی ہو رہی تھی، اسی سلسلے میں اہلِ ذوق نے تصویر کشی کے فن سے بھی دلچسپی لینی شروع کر دی اور یہ فن بھی بتدریج لیکن خاصی تیزی سے مقبول ہونے لگا تھا۔ یہاں مثال کے طور پر صرف ایک شخص کا حال نقل کیا جاتا ہے :

'' مختار، میر مظہر الدین محمد خلف میر عوض علی عدیل....... خوش نویسی اور شاعری دونوں میں اپنے والد ماجد کے شاگرد...... فنِ تصویر کشی سے بھی طبیعت کو مناسبت تھی۔ تصویر خوب کھینچتے تھے۔ عہد ولی عہدی میں ملازم و مصاحب سرکار فیض آثار تھے افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی۔ چالیس برس کا سن تھا کہ محرم کی 26 ویں تاریخ 1282ھ

(1865) میں اس دارِ فانی سے رحلت کی۔ یہ ان کا کلام ہے ؎

آ کے قاتل نے قبر پر یہ کہا آج وعدہ وفا کیا ہم نے "6

اس زمانے میں نواب مذکور کی سرپرستی میں فارسی اور اردو کی نظم و نثر کی طرف بھی توجہ زیادہ ہوئی۔ امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں اس عہد کے کئی درجن شاعروں کا تعارف کرایا ہے۔ ان میں سے بعض نے اردو نثر میں بھی کچھ کچھ کارنامے انجام دیے تھے۔

نواب محمد سعید خان بہادر کے بعد ان کے صاحبزادے نواب محمد یوسف علی خان بہادر ناظم تخلص مسند آرائے ریاست ہوئے۔ اس کے کوئی دو ہی برس کے بعد مُلک میں وہ انقلاب عظیم رونما ہوا جس کے نتیجے میں لکھنو اور پھر دہلی کی بھی بادشاہت ختم ہوئی اور سرکار انگلشیہ کو مُلک پر تسلّط حاصل ہو گیا۔ نواب یوسف علی خان نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنی ریاست کو اس آشوب سے نہ صرف مامون و محفوظ رکھا بلکہ انگریزی حکومت سے روابط کو بہتری کی صورت بھی عطا کی۔

نواب یوسف علی خان خود بھی شاعر تھے۔ شروع زمانے میں انھوں نے دیارِ مشرق میں قیام کیا تھا اور وہاں کے استادوں سے کسب فیض کیا تھا۔ پھر وہ خود اور رشتے کے ان کے کئی بھائی دہلی میں حکیم محمد مومن خاں مومن کے شاگرد ہوئے۔ ان سب کے زیر اثر رامپور میں شعر و سخن کا خوب رواج ہوا اور یہاں کے شعری ماحول پر لکھنؤ کے ساتھ ساتھ حکیم مومن کے طرز کی چھاپ بھی نمایاں رہی۔

نواب یوسف علی خان کے زمانے میں کتب خانے میں جس تحریری سرمایے کا اضافہ ہوا، بطور مجموعی اس کا معاملہ بھی یہی تھا۔ ان کے دور میں رامپور میں اس کتب خانے کے فیض سے خطاطی اور مصوّری وغیرہ کے فنون میں بھی گویا جان پڑ گئی تھی۔

# الف - غزل

## رامپور

### 1- ناظم- نواب یوسف علی خاں

نواب یوسف علی خاں بہادر شاعر بھی تھے اور شاعر نواز بھی۔ ناظم تخلص کرتے تھے اور اردو شاعری کی سبھی معروف اصناف میں کم وبیش طبع آزمائی کرتے تھے۔ مختلف علوم وفنون میں دخل رکھتے تھے۔ جب مسند نشین ہوے تو اپنے زمانے کے صاحبانِ علم ودانش کی بخوبی پذیرائی بلکہ سرپرستی کرتے رہے۔اس سلسلے میں اُن کا یہ مقطع ضرب المثل کی حد تک مشہور ہے ؎

ناظم منیر آے یہاں، ہم ہیں قدرداں — شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

نواب ناظم نے اپنے والد کے علاوہ نواب احمد علی خاں رند کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔ ایک قطعہ میں انھوں نے اپنی ریاست کے تین سابق حکمرانوں کا احوال اس طرح نظم کیا ہے :

"قطعۂ تاریخ ہا"

وہ مہر مرتبہ نواب ذی حشم جن کا — خطاب خان بہادر ہے، نام فیض اللہ

گئے ارم کو تو تاریخِ سال سے سب کو — کیا سروش نے لفظِ غروب سے آگاہ

1208

ہوے وہ خان بہادر رئیس بعد اُن کے    کہ جن کا نام تھا احمد علی عالی جاہ
غروبِ کوکب اگر ان کا سالِ رحلت ہے    تو راست ہے کہ وہ تھے آسمانِ حسن کے ماہ
1256
پھر ان کے بعد ہوے رامپور کے حاکم    سپہر رتبہ، معلیٰ خطاب، عدل پناہ
ہے اسم پاک محمد سعید خاں نواب    بہادر ایسے کہ عالی بہادری پہ گواہ
جو وہ جناب ہوے زیب بخشِ باغِ جناں    تمام خلق کو آیا نظر زمانہ سیاہ
سروشِ غیب یہ بولا غروب کوکب ہے    شمار سال اسی میں ہے کیجیے جو نگاہ
1271

عجب طرح کے یہ تینوں رئیس تھے ناظم    رہیں ریاضِ جناں میں بہ زیرِ ظلِ اللہ

اس میں خوبی یہ ہے کہ لفظ ''غروب'' کے اشتراک سے تین شخصوں کی تاریخِ وفات کہی ہے۔ قابلِ توجہ ایک نکتہ یہ ہے کہ نواب ناظم کے دادا نواب غلام محمد خان بہادر بھی مسند نشین ریاست ہوے تھے اور ان کی تاریخ بھی اسی طور پر کہی جاسکتی تھی لیکن ان کی مسند نشینی کو نواب آصف الدولہ نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہوئی تھی کہ ناظم نے بھی ان کے ذکر کو غیر ضروری کہہ کر نظر انداز کردیا۔

یوسف علی خاں ناظم نے بنارس اور لکھنو میں بچپن گذارا تھا۔ ان شہروں کی یادیں حافظے میں رہ گئی تھیں اور اپنے کلام میں انھوں نے ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کے ایک واسوخت کا بند یہ ہے ؎

رات دن مستِ مئے عیش تھے اے رشکِ قمر    رنج کہتے ہیں کسے، تھی نہ زمانے کو خبر
شام ہر روز اودھ کی تھی، بنارس کی سحر    کام تھا گانے بجانے سے تمھیں آٹھ پہر
منہ سے جس وقت کوئی تان نکل جاتی تھی
سن کے زہرہ کی دہیں جان نکل جاتی تھی

سنِ تمیز کو پہنچنے کے بعد نواب ناظم کا قیام بدایوں اور دہلی وغیرہ علمی مراکز پر رہا تھا۔ دہلی میں ان کے درود وغیرہ کی تاریخیں حکیم محمد مومن خاں مومن نے بھی کہی تھیں۔ قرائن اس حق میں ہیں کہ ناظم نے ان سے کسبِ فیض کیا تھا۔

اردو کے قدیم شاعروں میں نواب یوسف علی خاں ناظم کو سب سے زیادہ عقیدت محمد تقی میر سے تھی۔ اپنے ایک مقطع میں اُنھوں نے اس کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

نسبت اور اہلِ سخن سے مجھے کیا ہے ناظم ہم زباں حق نے بنایا ہے مجھے میر کے ساتھ

اس سے ناظم کے طرزِ فکر و بیان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"ناظم تخلص نواب یوسف علی خان بہادر والی رامپور بریلی..... علم عربی و فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ شعر صاف عاشقانہ خوب کہتے ہیں۔" 1

اپنی مسند نشینی کے وقت ناظم ایک مشّاق اور قابلِ ذکر شاعر کی حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ غزل کے علاوہ مختلف مروّجہ اصناف میں بھی وہ طبع آزمائی کرتے تھے۔ مندرجہ بالا قطعہ سے ظاہر ہے کہ وہ تاریخیں بھی خوب کہتے تھے۔ مزاج میں جدّت پسندی بہت تھی۔ نمونہ کے طور پر یہاں ان کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں ؎

ہم نے سو سو طرح بنائی بات سامنے اُس کے بَن نہ آئی بات

قہر کرتی ہے پلک ہاتھوں کی تیرے، رقص میں بجلیاں بَن کر چمک جاتی ہیں جانی چوڑیاں

کہتے ہو جائینگے، پھر کیوں نہیں جاتے، جاؤ میرے جینے کی مجھے راہ بتاتے جاؤ

اُس بُت کا کوچہ مسجدِ جامع نہیں ہے شیخ اُٹھیے اور اپنا یاں سے مصلا اٹھایئے

جو زرد زرد پھول تھے سب سُرخ ہو گئے آئے جو تم، بدل گئی صورت بسنت کی

پردے میں کر رہے ہو یہ کیا لَن ترانیاں بیٹھو تو آکے دیکھنے والوں کے سامنے

ہمارے زمانے کے بعض کج فہم اردو کی عشقیہ شاعری پر غیر فطری ہونے کا الزام رکھتے ہیں۔ جن صاحبانِ نظر نے نواب ناظم اور ان کے ہم زبانوں کے کلام کو پڑھا اور سُنا ہے وہ اس قسم کے بدخیالوں کے ہرگز مؤید نہیں ہو سکتے۔

کاروبارِ ریاست میں گھرے رہنے کے باوجود نواب یوسف علی خاں ناظم بعض نومشقوں کے کلام کو بھی اصلاح سے نوازتے رہتے تھے۔ امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں ان کے چند شاگردوں کا احوال قلمبند کیا ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں :

2- الم- محمد سعید اللہ خاں

"صاحبزادہ محمد سعید اللہ خاں ولد صاحبزادہ محمد امداد اللہ خاں تاب، جناب نواب محمد یوسف علی خاں صاحب بہادر ناظم تخلص اور صاحبزادہ محمد عباس علی خاں بیتاب کی شاگردی سے اس فن میں مشتہر ہوئے۔ خود بھی خوش فکر ہیں مگر اساتذہ کی خوش مذاقی سے اور بھی نامور ہوئے ۔

عشق بازی کے لیے چاہیے پتھر کا جگر ہم نے اس کام کو سب کاموں سے مشکل پایا" [2]

3- نحیف- محمد مہدی علی خاں

"صاحبزادہ محمد مہدی علی خاں بہادر ولد صاحبزادہ حفیظ اللہ خاں بہادر ولد نواب غلام محمد خاں صاحب بہادر۔ ابتدا میں ان کو حضرت فردوس مکان نواب محمد یوسف علی خاں صاحب بہادر ناظم سے تلمذ تھا، آخر میں میر احمد علی رسا کے شاگرد ہوئے۔ چھتالیس برس کی عمر پائی ۔

ہم کو فنا کے بعد ملی منزل بقا جب بے وطن ہوئے تو میسر وطن ہوا" [3]

4- نظام- سید نظام شاہ

"نظام تخلص سید نظام شاہ ابن سید احمد شاہ، بڑے خوش فکر و خوش مذاق، شعر عاشقانہ کہنے میں طاق۔ نواب محمد یوسف علی خان صاحب بہادر ناظم کے شاگرد رشید ہیں۔ شیخ علی بخش بیمار اور اپنے پیر و مرشد میاں احمد علی مرحوم احمد تخلص سے بھی مستفید ہیں۔ پچاس برس کی عمر ہوئی ۔

عادت ہی تکلف سے ہوئی شرم و حیا کی سوتے میں بھی منہ پر سے دوپٹا نہیں اٹھتا" [4]

نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے حالات میں مذکور ہے کہ دہلی میں قیام کے زمانے میں نواب ناظم نے ان کی والدہ اور خالہ کی سرپرستی کی تھی۔ داغ جب اس لائق ہوئے تو انھوں نے ان کو سکندر نامہ کی تعلیم بھی دی تھی۔ اس قسم کے واقعات سے یہ حقیقت بخوبی ظاہر ہے کہ رامپور کے علمی اور ادبی ماحول کی تشکیل میں نواب ناظم کی شعوری کوششوں اور کاوشوں کو بھی بہت دخل رہا ہے۔

## 5- اصغر-        محمد اصغر علی خاں

نواب غلام محمد خان بہادر کے نواب ناظم پوتے تھے۔ اور وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ میرٹھ میں رہے تھے۔ ان کے حالات میں امیر مینائی نے تحریر کیا ہے :

"صاحبزادہ محمد اصغر علی خاں ابن صاحبزادہ محمد عبداللہ خان ظریف، شاعر خوش مذاق ہیں۔ آفرینش مضامینِ عاشقانہ میں طاق ہیں۔ مومن خاں صاحب مرحوم دہلوی کے شاگرد رشید، کلام ان کا لائق دید و قابلِ شنید۔ اٹھیں برس کی عمر پائی۔ بارھویں رجب کو 1273ھ (1857) تھے کہ عارضۂ خناق میں مبتلا ہوکر میرٹھ میں رحلت فرمائی۔ وہاں سے جنازہ دہلی کو گیا اور درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوا۔" 5

کم عمری کے باوجود ان کا شمار دہلی کے سخن شناسوں میں ہوتا تھا۔ ان کے دولت کدے پر مشاعرہ بھی ہوتا تھا۔ محمد حسین آزاد نے ایک مشاعرے کا حال اس طرح قلمبند کیا ہے :

"1845 (1261ھ) میں نواب اصغر علی خاں کے ہاں رامپور کے بعض خوانین آئے۔ نواب موصوف نواب عبداللہ خاں صدر الصدور میرٹھ کے بیٹے تھے۔ اصغر علی خاں مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ انھیں ساتھ لیکر استاد ذوق مرحوم کے پاس آئے اور بڑے اصراروں سے مشاعرے میں آنے کا اقرار لیا۔ اللہ اکبر۔ یاد ایام : استاد میرے والد کے بغیر مشاعرے میں نہ جاتے تھے۔ ان کے پاس آئے......... میں نے بھی والد مرحوم سے کہا۔ غرض کہ مشاعرہ میں گئے...... مومن خاں نے کہا کچھ ان دنوں کا کہا ہوا سنایئے...... دو شعر سنا دیے کہ انھیں دلوں میں ہوئے تھے ؎

خط بڑھا، کاکل بڑھی، زلفیں بڑھیں، گیسو بڑھے        حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے
بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے دل        اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے" 6

اصغر علی خاں کے والد نواب عبداللہ خاں بھی بقولِ آزاد شعر و سخن کے شیدا تھے اور خود بھی اچھا کہتے تھے 7...... استاد (ذوق) کی ان سے شناسائی تھی مگر وہ انھیں استاد مانتے تھے۔" آزاد نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبداللہ خاں ذوق کو ناسخ اور حفیظ کے مقابلے میں بلند مرتبہ خیال کرتے تھے۔

اصغر صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کا قلمی دیوان جو باسٹھ اوراق پر محیط ہے رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

اس ناز کی پر اس سے تو ہرگز نہ ٹوٹتا　　اصغر وفا کا عہد ہی ناپائدار تھا
دردوغم کے سوا بھی اے اصغر　　کیا کہوں میرے دل میں کیا کیا ہے

اصغر علی خاں کے صاحبزادے محمد رضا علی خاں بھی شاعر تھے اور رضا تخلص کرتے تھے لیکن ان کا کلام ہمیں نہیں مل سکا۔

## 6- بیتاب- نواب عباس علی خاں

یہ بھی نواب یوسف علی خاں ناظم کے بھائیوں میں سے تھے۔ مدت تک دہلی اور لکھنو میں رہے تھے۔ مرزا قادر بخش صابر نے ان کے بارے میں جو لکھا ہے، مختصراً اس طرح ہے :

"بیتاب تخلص، سروِ حدیقۂ دولت و اقبال نواب عباس علی خاں خلف نواب عبدالعلی خاں کہین برادر نواب محمد سعید خان بہادر رئیس رامپور، قلم حیران ہے کہ کس کس خوبی کا بیان کرے۔ حُسنِ خلق کو لکھے یا جمال صورت کا ذکر کرے۔ شاہجہاں آباد میں مومن خاں مرحوم مومن تخلص سے مشورے کا اتفاق ہوتا تھا۔" 8

امیر مینائی نے ان کے کوائف میں بعض مفید اطلاعات قلمبند کی ہیں۔ ان میں ہے :

"صاحبزادہ محمد عباس علی خان بہادر ابنِ صاحبزادہ محمد عبدالعلی خان بہادر ابن نواب غلام محمد خان صاحب..... یہ مومن خاں صاحب دہلوی کے شاگردوں میں بہت ممتاز، ہم چشموں میں خوش فکری کی بدولت سرفراز ہیں۔ چھیاسٹھ برس کی عمر ہے۔ یہ ان کے دیوان کا انتخاب ہے۔ ہر شعر لا جواب ہے ؎

ضد تو دیکھو کہ نہ کی غیر کی جانبداری　　بولنا یوں بھی انھیں ہم سے گوارانہ ہوا
خیر ہے بیتاب، بتخانہ کہاں اور تم کہاں　　ہم گئے تھے کعبے میں تم کو مسلماں چھوڑ کر
کون کہتا ہے کہ رسوا ہوئے ہم عالم میں　　اُس کی محفل میں تو اپنا کہیں مذکور نہیں
وہ نزاکت سے اور ضعف سے ہم　　ہاتھ سے تھام کر کمر بیٹھے" 9

بیتاب کے دیوان کے چند قلمی نسخے رضا لائبریری میں محفوظ ہیں۔ اس دیوان میں غزل کے

علاوہ قصیدہ وغیرہ مختلف اصناف میں بھی ان کی طبع آزمائی کے نمونے موجود ہیں۔

بیتاب بھی اپنے زمانے کے معتبر استادوں میں سے تھے چنانچہ ان کے کئی شاگردوں کا ذکر امیر مینائی نے بھی کیا ہے۔

یہاں تک ''طبقۂ والیانِ ملک'' میں سے مومن کے چند شاگردوں کا ذکر کیا گیا۔ اب مومن کے بعض اور رامپوری تلامذہ کا احوال نقل کیا جاتا ہے۔

7- تسکین- میر حسین

حکیم مومن کے ممتاز اور نام برآوردہ شاگردوں میں تھے۔ ان کے بارے میں صابر نے لکھا ہے :

''تسکین زبدۂ خاندانِ سیادت، میر حسین، نسب میر حیدر قاتل وزیر فرخ سیر تک پہنچتا ہے۔ کتب فارسی کو استاذی مولوی امام بخش صہبائی سے پڑھا ہے۔ کلام کو شاہ نصیر کی نظر اصلاح میں گزرانا۔ پھر مومن خاں سے اصلاح لینی شروع کی۔ تلاشِ معاش کے ذریعے سے سفر رامپور کا اتفاق ہوا۔ 1268 ھ (1852) میں روضۂ خلد کی طرف راہی ہوا۔''10

امیر مینائی کے تذکرے سے ان کے بارے میں کچھ اور معلومات حاصل ہوتی ہیں، اس طرح:

'' تسکین میر حسین ابن میر حسن عرف میرن صاحب، سلسلہ ان کے نسب کا میر حیدر قاتل وزیر فرخ سیر تک پہنچتا ہے۔ فارسی مولوی صہبائی سے پڑھی۔ شعر گوئی کا شوق ہوا۔ ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لی، انتہا میں مومن خاں صاحب مرحوم کے فیض سے مشقِ سخن آفرینی کمال کو پہنچی۔ وطن ان کا دہلی ہے مگر اس دارالریاست میں سالہائے دراز تک نوکر رہے۔ قدر افزائی رئیس قدردان سے نامور رہے۔ پچاس برس کی عمر ہوئی۔ شوال کی سترھویں تاریخ بارہ سو اڑسٹھ ہجری میں قضا کی اور نواب احمد علی خان بہادر کے مقبرے کے قریب مدفون ہوئے۔''11

ان کے دیوان کا ایک مختصر سا قلمی نسخہ رامپور میں محفوظ ہے۔ تسکین نے بھی غزل کے علاوہ بعض اور اصناف میں طبع آزمائی کی تھی چنانچہ دو شعروں پر مشتمل ان کا ایک ہجویہ قطعہ بھی امیر مینائی

نے نقل کیا ہے۔ غزل کے ان کے چند شعر یہ ہیں ؎

یہ تو سچ ہے کہ جو تم چاہو گے کر گزرو گے　　پر یہ ممکن نہیں، ہم پر کبھی بیداد نہ ہو
وحشت اب لاش کو لے بھاگے گی　　تنگی گور سے گھر یاد آیا
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے　　کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی
آئی جو ماہتاب میں رونق　　بام سے وہ اُتر گئے شاید

تسکین بھی اپنے زمانے کے مسلم الثبوت استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں محمد نور خاں افغاں، میر عبداللہ غمگین وغیرہ معروف ہوئے۔

حکیم مومن خاں کے رامپوری شاگردوں میں ذیل کے نام بھی قابلِ توجہ ہیں :

صاحبزادہ محمد عنایت علی خان بہادر عنایت　　　ہدایت علی خاں غربت

وغیرہ۔ علم و شعر کے اس مرکز کے ماحول کو بنانے میں یہ سب بہت موثر تھے۔

مومن کے علاوہ مصحفی اور آتش کے علاوہ شیخ ذوق کے بھی بعض شاگرد رامپور میں سکونت پذیر تھے چنانچہ کچھ کا ذکر مختصراً کیا جاتا ہے۔

8- بیمار- شیخ علی بخش

پرانے شاعر تھے۔ مرزا قادر بخش صابر نے ان کے بارے میں مختصراً لکھا ہے :

"بیمار تخلص شیخ علی بخش ساکن سنبھل کا، فارسی میں استعداد کامل ہے اور ریختہ گوئی میں مہارتِ تام۔ الفاظ کی شستگی اور زبان کی پاکی احاطۂ بیان سے خارج ہے۔ سرکار محمد سعید خاں والی رامپور میں فی الجملہ ناخن بندی وسیلہ تحصیل معاش ہے اور رئیس مذکور کی فرمائش سے کوئی جلد بوستانِ خیال کی کہ افسانہ ہے عجیب اور داستان ہے غریب، اردو میں نظم کرتا تھا۔ معلوم نہیں اختتام کو پہنچایا نہیں"12۔

امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں ان سے متعلق بھی کئی مفید اضافے کیے ہیں، اس طرح:

"بیمار شیخ علی بخش ابن شیخ غلام علی، متوطن شہر بانس بریلی، شاگرد میاں مصحفی، مرد خوش فکر و خوش مذاق، حسن کلام سے مشہورِ آفاق تھے۔ جب اس دارالریاست میں آ کر سرکار کے ملازموں میں داخل ہوئے، یہاں احمد خاں غفلت کا دور دورہ تھا، مصلحتاً ان

کے شاگردوں میں شامل ہوے۔ سڑسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ چوبیسویں ربیع الاول کو 1271ھ (1854) میں رحلت کی۔ کلام بہت تھا مگر تلف ہوگیا۔"13

دیوانِ بیمار کا ایک قلمی نسخہ بخطِ مصنف جو اُنتالیس ورق پر محیط ہے رامپور کی رضا لائبریری میں موجود ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

لبِ جو کون سیر کو آیا | موج منہ چومتی ہے ساحل کا
سانس آہستہ لیجیو بیمار | ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

نہ رہنے دے گی وحشت بت کدے میں | اُٹھو بیمار جو مرضی خدا کی
او بدگماں کہاں میں، کہاں محفلِ نشاط | بزمِ عزا میں بھی نہیں ملتی ہے جا مجھے

بیمار کے شاگرد بہت تھے۔ ان میں سے بعض جو رامپور میں سکونت پذیر تھے، یہ ہیں :

مبارک شاہ خاں خانزادہ — احمد علی رسا

محمد مجتبیٰ خاں محو — صاحبزادہ مہدی علی خاں مہدی

### 9- حسین۔ غلام حسین خاں

اپنے وقت کے معروف استادوں میں سے تھے۔ ان کا احوال امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں اس طرح تحریر کیا ہے :

"حسین تخلص، صاحبزادہ غلام حسین خاں ابن صاحبزادہ احمد یار خاں افسر کہ حال اُن کا مع سلسلۂ نسب حرف الف میں لکھا گیا۔ خوش فکر ہونا کلام سے پیدا ہے۔ رسائی ذہن اشعار سے ہویدا ہے۔ اساتذۂ لکھنؤ سے مستفید ہیں۔ خواجہ حیدر علی آتش مرحوم لکھنوی کے شاگردِ رشید ہیں۔ 76 برس کی عمر ہے.......... "14

لالا سری رام نے ان کی عمر کے بارے میں لکھا ہے:

"کئی برس ہوے اُسّی سال کی عمر پاکر انتقال کیا۔"15

ان کی غزل کے چند شعر نمونہ کے طور پر یہاں نقل کیے جاتے ہیں ؎

یہی تقدیر میں یارب لکھا ہو | کہ سراپا ہو، اس کا نقشِ پا ہو
جھڑکنے پر تو ہوں اس کا ثنا خواں | خدا جانے تسلی دے تو کیا ہو

پھری تقدیر تو بھی یہ نہ دیکھا　　کہ قاصد کوئے جاناں سے پھرا ہو
کیا کوئی زلف ہوگئی برہم　　دل کو اب تک تو پیچ وتاب نہ تھا

## 10- گرم- مظفر خاں

خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کے گرم جوش تلامذہ میں سے تھے۔ مرزا قادر بخش صابر نے ان کے تعارف میں لکھا ہے :

"گرم تخلص مظفر خاں، جوانِ خوش طبع، ظریف مزاج، متوطن رامپور، مدت مدید سے نواب عبداللہ خاں برادر حقیقی محمد سعید خاں والی رامپور کی رفاقت میں خاک پاک شاہجہاں آباد کو رشکِ ارم کیا اور اب اُسی نواب کے ہمرکاب شہر میرٹھ میں مقیم ہے۔ مشق سخن شیخ ابراہیم ذوق مرحوم سے بہم پہنچائی۔"16

نواب عبداللہ کا ذکر ضمناً کیا جاچکا ہے۔ وہ سخن گو ہی نہیں، سخن فہم اور سخن شناس بھی مشہور تھے۔ شیخ ذوق کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتے تھے۔ مظفر خاں گرم بھی خوش فکر شاعر تھے۔ امیر مینائی نے ان کے حالات میں بعض اضافے کیے ہیں۔ لکھا ہے :

"گرم محمد مظفر خاں ولد محمد خاں، ساٹھ برس کی عمر ہوئی۔ جمادی الآخرہ کی دسویں تاریخ 1285ھ (1868) میں قضا کی۔ جے پور میں تھے۔ وہیں دفن ہوئے۔ فتح یاب خاں اخگر ان کے فرزند ہیں۔"17

غزل کے علاوہ مثنوی اور قصیدے کے لیے بھی گرم نے نام پایا تھا۔ ان کا کلیات (غیر مطبوعہ) دو حصوں میں ساڑھے نو سو سے زائد اوراق پر مشتمل رامپور کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ان کے بیٹے اخگر کے کلام کی بھی ایک مختصر سی قلمی بیاض وہاں موجود ہے۔ گرم کی غزلوں کے چند شعر نمونہ کے طور پر یہاں درج کیے جاتے ہیں ؎

بسکہ لختِ جگر ودل سے ہوئی مملو چشم　　نہ رہی ہائے تصور کو ترے جا خالی
ایک دم نچلے نہیں رہتے ہمارے ہاتھ پاؤں　　جوشِ وحشت میں ہمارے ہیں تمھارے ہاتھ پاؤں
ایڑیاں رگڑیں، کف افسوس بھی ملتے رہے　　ہے جو آئی اک بلا، دکھتے ہیں سارے ہاتھ پاؤں
چاہ میں اک بتِ ہرجائی کی　　در بدر ناصیہ فرسائی کی

# بریلی

نواب علی محمد خان بہادر کے بعد ان کے بیٹوں میں ناچاقی ہوگئی اور بالآخر اُن کا ملک پانچ حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ بریلی اور پیلی بھیت وغیرہ کا علاقہ حافظ رحمت خاں کے حصے میں آیا۔ کچھ عرصہ میں بخشی سردار خاں، دوندے خاں اور فتح خاں خانساماں کا انتقال ہوگیا تو بادشاہ دہلی نے حافظ رحمت خاں کو خطاب ''حافظ الملک'' سے سرفراز کیا۔

ادھر بکسر کی لڑائی میں شکست کھانے کے بعد شجاع الدولہ بھی کسی سہارے کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ احمد خاں بنگش کے مشورے سے وہ نواب گورنر بہادر کی خدمت میں پہنچے اور ان سے معاہدہ کرنے کے بعد حافظ رحمت خاں سے جنگ پر آمادہ ہوئے۔ اس موقع پر نواب رامپور نے بھی شجاع الدولہ کا ساتھ دیا۔ امیر مینائی نے لکھا ہے :

> ''شجاع الدولہ بہادر نے معرکہ آرائی پر کمر باندھی...... ابتدا ہی سے غلبہ حریف کی صورت نظر آنے لگی۔ دو چار ہی فیر ہونے کے بعد لشکر انگریزی سے ایک توپ کا گولا حافظ الملک کے سینے پر پڑا لشکر نواب شجاع الدولہ میں فتح کا نقارہ بجا......'' 1

مرزا محمد رفیع سودا نے اس موقع پر جو قصیدہ پیش کیا تھا اس کے آخری دو شعر یہ ہیں ؎

حافظ نے سر دیا، نہ دیا زر، ہوئی ہے یہ
989 - 8 + 207 =1188

تاریخ اس کے فوت کی کر لے عدد شمار

تاریخِ فتح عرض کی سودا نے یوں کہ ہو
11 +

یہ فتح نو مبارک نواب نامدار
1177 =1188

بریلی، پیلی بھیت وغیرہ کا علاقہ اودھ میں شامل کرلیا گیا۔ پھر نواب سعادت علی خاں نے اپنی مسند نشینی کے صلے میں جو حصہ انگریزوں کے حوالے کیا تھا اس میں باندہ، فرخ آباد وغیرہ کے علاوہ چکلہ بریلی بھی شامل تھا۔ اس طرح حافظ الملک کی ریاست کوئی پچیس برس کے اندر ہی بن کر بگڑ بھی گئی۔

انتظامی ضرورتوں سے انگریزوں نے مہدی علی خاں کو بریلی کا صوبے دار مقرر کردیا تھا۔ وہ خود اور ان کے بیٹے اور اعزا اپنی اپنی بساط کے مطابق علم و شعر کی سرپرستی کرتے رہتے تھے لیکن اُن مخصوص سیاسی حالات میں اس علاقے میں شعر و فن کے پروان چڑھنے کے مواقع کم سے کم تھے۔ گنتی کے شاعر تھے اور ان میں بھی بیشتر کے کلام کا معیار کچھ بلند نہیں تھا۔ اس علاقے کے شعرا عموماً غزلیں کہتے رہے۔ بعض نے نعت گوئی اختیار کی۔ قصیدہ، مثنوی وغیرہ معروف شعری اصناف سے دلچسپی کمتر رہی۔

## 1- راسخ- نواب ظفریاب خاں

بریلی کے نام بر آوردہ شاعروں میں بیشتر حافظ رحمت خاں کے اخلاف تھے چنانچہ راسخ بھی انھیں میں سے تھے۔ محسن کے تذکرے میں ان کا مذکور اس طرح آیا ہے :

> ''نواب ظفریاب خاں راسخ خلف ملامیاں، اولاد میں حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں مغفور کی، صوبہ دار کٹھیر، باشندہ ضلع بریلی، مقیم لکھنؤ، صاحب دیوان، شاگرد رشید نواب منصور علی خاں مہر''[2]

لالا سری رام نے ان کے ذکر میں ضروری اضافے کیے ہیں، لکھا ہے :

''نواب ظفر یاب خاں راسخ مقیم لکھنو....... 1857 میں انتقال کیا۔ فن شعر سے عشق تھا۔ شبانہ روز یہی مشغلہ رہتا تھا۔ طرز سخن میں ناسخ کے مقلد معلوم ہوتے ہیں۔ بڑی تلاش سے کچھ کلام ہاتھ آیا۔ ''3

مولانا امداد صابری کا کہنا ہے کہ انگریزوں نے ان کو بھی پھانسی دے دی تھی۔ 4ان کے بعض شعر ضرب المثل کے طور پر زبانوں پر جاری ہیں مثلاً :

اس آب حیات سے جدا ہوں　　مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہوں

دریائے حُسن اور بھی دو ہاتھ بڑھ گیا　　انگڑائی اس نے نشہ میں لی جو اٹھا کے ہاتھ

بے دیدۂ گریاں ہو کہاں دل کی صفائی　　روشن نفساں رہتے ہیں ہر وقت وضو سے

دلِ بے آرزو کون ومکاں کا ہے تماشائی　　رکھا خالی ازل سے ہم نے آغوشِ تمنا کو

راسخ کے استاد منصور علی خاں مہر بھی حافظ رحمت خاں کے پوتے تھے۔ اگرچہ مہر اور راسخ لکھنؤ میں رہتے تھے، بریلی سے انھوں نے اپنا تعلق قائم رکھا تھا چنانچہ اپنے آخر زمانے میں راسخ اسی شہر میں تھے۔

## 2- جوش- نواب احمد حسن خاں

یہ بھی اسی خاندان کے فرد تھے۔ محسن نے ان کا احوال اس طرح لکھا ہے :

''نواب احمد حسن خان بہادر عرف اچھے صاحب بہادر جوش خلف اکبر نواب مقیم خان بہادر مقیم بن نواب محبت خان بہادر شہباز جنگ محبت تخلص بن نواب حافظ الملک، فارسی گو صوبہ دار کٹھیر کے، باشندۂ بریلی، مقیم لکھنؤ، صاحب دیوان، شاگرد نواب ظفر یاب خاں راسخ ''5

لالا سری رام نے ان کے حالات کسی قدر تفصیل سے قلمبند کیے ہیں :

''نواب احمد حسن خاں جوش.....نواب ظفر یاب خاں راسخ مرحوم اور نواب عاشور علی خاں سے اصلاح لی تھی۔ ان کے دو دیوان مسمّٰی بہ گلدستۂ سخن معروف بہ بہارستان جوش اور چمنستانِ جوش اور ایک قصہ افسانۂ جوش نامی شائع ہو چکے ہیں..... عاشقانہ

مضامین خوب باندھتے تھے۔ گاہ گاہ فارسی میں بھی غزل کہتے تھے۔ اخیر عمر میں حضرت
اسیر کے تلامذہ میں داخل ہوئے۔ 1243ھ (28-1827) میں پیدا ہوئے۔
60 برس دنیا کی ہوا کھا کر لکھنؤ میں انتقال کیا۔'' 6

ان کا ایک دیوان ''نگارستان جوش''، مطبع علی بخش خاں لکھنؤ میں 1269ھ (=1853)
میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

کیوں نہ یکتا اسے کہیے جس نے　　اپنا ثانی کوئی پیدا نہ کیا
بیٹھنا تم نہ میری تربت پر　　فاتحہ کو تو ہاتھ اٹھا دینا
ابر میں چاند گر نہ دیکھا ہو　　رُخ پہ زلفوں کو ڈال کر دیکھو
ان آنکھوں کی بدولت دل پہ آفت آ ہی جاتی ہے　　نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آ ہی جاتی ہے

3- مصروف- مصروف خان بہادر

مولانا امداد صابری نے ان کے حالات بہت تفصیل سے قلمبند کیے ہیں۔ ان کا خلاصہ
اس طرح ہے:

''مصروف خان بہادر خاں، حافظ الملک کے پوتے اور نواب ذوالفقار خاں کے
صاحبزادے تھے......علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ فارسی عربی اور اردو کے ماہر تھے۔ ان
کے بھائی نواب احمد یار خاں راغب ریاست فرخ آباد میں نواب تجمل حسین خاں کے
زمانے میں نیابت کے عہدے پر مقرر ہوئے تھے۔......جنرل بخت خاں نے نواب
خان بہادر کو بریلی بلکہ کل روہیلکھنڈ کا نواب منتخب کیا.........1859 میں زیر دامن
کوہ نیپال ایک لڑائی میں گرفتار ہوئے......پھانسی دی گئی۔'' 7

ان کی ایک غزل کے دو شعر یہ ہیں ؎

تا حشر اب خیال نہ میرا کرے گا دل　　تو اس کو مل گیا تو مجھے کیا کرے گا دل
جان وجگر تو نام کو باقی نہیں رہے　　کیونکر اب اس کی زلف سے سودا کرے گا دل

بریلی میں حافظ رحمت خاں کے اخلاف کے علاوہ بھی بعض لوگ شعر کہتے تھے لیکن شاعر کی
حیثیت سے انھوں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا اس لیے ان کا ذکر غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

# بدایوں

تقسیم کے نتیجہ میں آنولہ، بدایوں وغیرہ کی کارفرمائی فتح خاں خانساماں کے حصے میں آئی تھی۔ اُس زمانے میں روہیل کھنڈ کا سب سے اہم مقام آنولہ تھا۔ اس جگہ ایک زبردست قلعہ بھی تھا جو "بن گڑھ" کہلاتا تھا۔ امیر مینائی نے آنولے کے بارے میں لکھا ہے :

"آنولہ کہ اس زمانے میں شہر عظیم الشان تھا، قوم قوم کے محلے جدا جدا تھے اور 1700 مسجدیں جمعہ و جماعت سے آباد تھیں۔"

فتح خاں خانساماں نے کچھ ہی مدت میں انتقال کیا۔ ان کے بیٹوں نے اپنی ریاست کو سنبھالا لیکن آصف الدولہ اور انگریزوں کے مشترکہ لشکروں نے روہیلوں کو بہت تباہ کیا اور عملاً رامپور تک کا علاقہ آصف الدولہ کے تحت آ گیا تھا۔ پھر بڑی ہوشیاری سے اس پر انگریزوں نے تسلط حاصل کرلیا۔ اس علاقے کی علمی اور تہذیبی روایتیں بھی رفتہ رفتہ ماند پڑتی گئیں۔ شعروسخن کے بھی وہ چرچے باقی نہیں رہ گئے۔ صرف چند کم معروف شاعروں کا ذکر معاصر تذکروں میں ملتا ہے۔

## 1- حشر- رسول بخش

شاہی کے زمانے میں بدایوں میں یہ شاعروں کی نئی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ جوانی

کے جوش میں ان کی شاعری عجیب ہنگامہ خیز تھی چنانچہ احمد حسین سحر نے بھی ان کے بارے میں لکھا ہے :

''حشر تخلص رسول بخش نام، باشندہ خاص بدایوں ست۔ در بدایوں از ہنگامۂ شاعری خود قیامت بپا کردہ، تلاشِ مضمون شاں نسبتِ بندشِ شعر خوش است ؎

زخمی ہوا ہوں ابروِ پُر خم کو دیکھ کر          رکھنا ہمارے زخم پہ مرہم کو دیکھ کر
یاد آگیا وہ کان کا موتی کسی کا حشر          برگِ سمن پہ قطرۂ شبنم کو دیکھ کر''2

2- رسوا- مولوی فیض احمد

مولانا امداد صابری نے ان کے حالات تفصیل سے قلمبند کیے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے :

''مولوی فیض احمد بدایونی کا سلسلۂ نسب حضرت عثمانؓ بن عفان تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد حافظ غلام احمد نواب مرشد آباد کے طبیب تھے۔ وہ ان کو تین برس کا چھوڑ کر رحلت کر گئے تھے۔ مولانا فضل رسول نے جو فیض احمد کے ماموں تھے ان کو تعلیم دی۔ جنگِ آزادی میں جنرل بخت خاں وغیرہ کے ساتھ بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا اور 1274ھ (1857) میں فرنگیوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔''3

مولوی فیض محمد رسوا تخلص کرتے تھے۔ صاحب دیوان اور صاحب تصنیف تھے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

تم جسے چاہو چڑھا لو سر پر          ورنہ یوں دوش یہ کاکُل ٹھہرے
ہم جو چپ ہوں تو بزرگی کہلائیں          شیخ چپ ہوں تو توکل ٹھہرے

قطعہ

بت خانوں میں دے مکّرر اذانیں          ناقوس بھی کعبے میں بجایا
لیکن نہ کسی نے یوں بھی پوچھا          بے وقت یہ راگ کس نے گایا

3- شرر- علی بخش

یہ بھی اُس زمانے کے نوخیز شاعروں میں تھے۔ چنانچہ احمد حسین سحر نے مختصراً ان کے بارے میں لکھا ہے :

''شرر تخلص، علی بخش نام، از رئیسانِ قصبہ بدایوں است۔ بسیار خوش فکر و عالی طبع است''4

البتہ لالا سری رام نے ان کے حالات کسی قدر تفصیل سے تحریر کیے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے ۔

''شرر، سخن سنج صاحب ہنر مولوی علی بخش خاں شرر ولد سلطان بخش......کچھ دنوں علم جفر، رمل، نجوم وغیرہ سے بھی شوق رہا۔ سرسید احمد خاں کے عقائد کے رد میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ایک عاشقانہ دیوان مطبع اسعد الاخبار آگرہ میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد مشقیہ شعر گوئی سے متنفر ہو گئے... 1881 (1298ھ) کے قریب انتقال ہوا۔''5

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ۔

ضعف سے پاؤں پہ سر آیا ہے آہ　　ہو گئے نالوں سے ہم اپنے تباہ
میکدے کو جو کوئی جائے شرر　　شیخ سے مستی میں وہ پوچھے ہے راہ
غم کھانے سے دل سیر ہمارا نہیں ہوتا　　تھوڑی سی غذا پر تو گزارا نہیں ہوتا
ہے فکر کہ پھر مشقِ جفا کس پہ کریں گے　　مرنا بھی برا اُن کو گوارا نہیں ہوتا

ان کا ایک قلمی دیوان علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں بھی محفوظ ہے۔

## 4- مذاق- محمد دلدار علی

شیخ محمد ابراہیم ذوق کے آخر زمانے کے شاگردوں میں سے تھے۔ احمد حسین سحر نے ان کے ابتدائی زمانے کے حالات اس طرح لکھے ہیں :

''مذاق تخلص، محمد دلدار علی نام، از قاضی زادہ ہاے بدایوں وعزیزانِ ظہور اللہ خاں نواست.... بافقیر سررشتۂ اتحادش مستحکم است.......پیشتر عیار تخلص می کرد واکثر افکار وغزلیات او کہ شہرتے پیدا کردند ہمیں تخلص است۔ عرصۂ چند سال است کہ عیار را بدل کردہ، بہ ایں تخلص بامذاق مشہور است ودر اصنافِ سخن دستگاہ لایق دارد۔ دیوانش بہ ترتیب رسیدہ وشاگرد رشید محمد ابراہیم ذوق دہلوی است۔''6

مولوی محمد مظفر حسین صبا نے بعد کے زمانے میں ان کے تعارف میں تحریر کیا ہے :

7 ''مذاق مولانا دلدار علی شاہ ابن حافظ محمد نثار علی، اتصالِ نسب آبائی او بہ محمد بن ابی بکر

صدیق ؓ ونسب امہاتی وے بہ حضرت علی مرتضی است۔ ظہورش از عالم بطون در سنہ
خمس وثلثین والف واقع شدہ، معرفت کردگار مادہ تاریخ میلاد اوست۔

1235

تحصیل علوم عقلیہ بخدمت مولوی فضل حق خیرآبادی نمود وعلوم نقلیہ را بہ اکتساب از
علمائے دیگر براں اقران دوفن سخنوری از خواجہ محمد ابراہیم ذوق آموخت وسرمایہ علم باطن
بہ طریقہ برہمہ سلاسل طریقت از سید شاہ فضل غوث بریلوی اویسی اندوخت۔ اکثر
اشعار اردو وکمتر اشعار فارسی موزوں می نماید وجادۂ دری چنیں می پیماید "6

اپنے تخلص کے بارے میں مولوی ولدار علی نے دو شعروں کا یہ قطعہ کہا ہے ؎

کیا کروں عرض اشتیاق اپنا شعر کہنا غرض تھا شاق اپنا
ذوق تھا یہ ترے تلمذ کا کہ تخلص کیا مذاق اپنا

اسی سلسلے میں یہ مقطع بھی توجہ طلب ہے ؎

سب توجہ سے ذوق کی ہے مذاق یہ مزا جو ترے سخن میں ہے

تحصیلِ علم کے سلسلے میں یہ رامپور بھی گئے تھے۔ وہاں ملا محمد غفران سے علوم عربیہ کا درس لیا تھا۔ 10/ربیع الثانی 1312ھ (11/اکتوبر 1894) کو فالج کے نتیجہ میں وفات پائی تھی۔ ان کے مزار کے دروازہ پر لکھا ہے : "روضہ منورہ"

1312

مذاق کا دیوان" کلام ولدار علی مذاق" کے نام سے 1281ھ (1864) میں چھپ کر مشتہر ہو چکا تھا۔ رامپور کی رضا لائبریری میں ایک قلمی نسخہ "مخمساتِ مذاق" کے نام سے بھی محفوظ ہے جس کا سال کتابت 1265ھ (=1849) ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

نیک وبد سارے جہاں کے خوب ہیں اپنی نظروں میں سبھی محبوب ہیں
شعلہ رویوں کو یاد کرکے مذاق ہم نے انگاروں پر گذاری رات
کوسو، کاٹو، ہنسو، بکو، بولو جنبشِ لب سے کام ہے صاحب
سر رکھوں پاؤں میں، آنکھوں کو ملوں تلووں سے دیکھ پاؤں جو کہیں یار کو آتے جاتے

## 5- مست- فضل رسول

یہ بدایوں کے اُس زمانے کے معزز اور موقر شاعروں میں سے تھے۔احمد حسین سحر نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے :

''مست تخلص، مولوی فضل رسول صاحب خلف مولوی عبدالمجید صاحب، متوطن قصبہ بدایوں۔ خطہ بہ ایں نسبت کہ مولدش واقع شدہ برخودی بالد ومنبع ہزار خیر و برکات است۔ عالم تبحر و طبیب حاذق و شاعر بے بدل است۔ بیشتر روزگار پیشہ بود........ سالہاست کہ بہ تعلقات دنیوی پشت بازدہ، مردانہ بہ فقر و غنا پرداختہ...... بہ کعبۃ اللہ و مدینہ منورہ از چشم و سر رفت۔ اکنوں بہ مراتب اولیائے کامل در بدایوں رسیدہ سرگرم استفاضہ است۔ ''8

ان کے چند شعر یہ ہیں ۔

حسن الفاظ ہے کس حور لقا کا صدقہ ہے یہ انداز سخن کس کی ادا کا صدقہ
آ وجانی: حسرتیں تو لیں دلوں کی سب نکال جو کہ ہونی تھیں، وہ سب کچھ ہو چکیں رسوائیاں
یوں بہانے بھی نہ آنے کے بنا سکتے ہو پر جو آنے ہی پہ آجاؤ تو آ سکتے ہو
زندگانی سے، ترے ہجر میں بیزار ہیں ہم موت کو عمر ابد سمجھیں، وہ بیمار ہیں ہم

ان چند کے علاوہ بدایوں میں اور بھی شاعر تھے۔اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے مقامی طور پر شعر وسخن کی رونقوں کو برقرار رکھا تھا لیکن اس شہر کو معروف علمی مرکز کا درجہ حاصل نہیں رہ گیا تھا۔ بطور مجموعی شاعری کا معیار بھی بہت بلند نہیں تھا۔

## 6- طالب- طالب علی خاں

آنولہ کی رونقیں سب ختم ہو چکی تھیں، پھر بھی بعض لوگ محض اپنے شوق سے شعر کہہ لیتے تھے اور ماضی کی یادوں کو زندہ کیے ہوئے تھے۔طالب باصلاحیت شخص تھے۔ان کے کلام کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی چنانچہ محسن نے بھی اپنے تذکرے میں ان کا ذکر کیا ہے، اس طرح :

''نقشہ نویس عدالت فرخ آباد، طالب علی خاں طالب، ولد دلاور علی خاں باشندۂ قصبہ آنولہ ضلع بانس بریلی، صاحب دیوان، شاگرد سید اسماعیل حسین منیر''

معلوم ہوتا ہے کہ اپنی مصلحتوں سے انگریزوں نے علاقائی روابط کو بھی بدل دیا تھا چنانچہ آنولہ کو بدایوں سے الگ کر کے بریلی سے متعلق کر دیا تھا۔ آنولے میں روزگار کے مواقع بھی کم رہ گئے اس لیے وہاں کے لوگوں کو تلاشِ معاش میں دوسرے مقاموں کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ طالب کے دو شعر یہ ہیں ۔

ہے مناسب زرِ خورشید کا طرّا سر پر      سادی پگڑی نہ رکھا اے آئینہ سیما سر پر
وصل کی رات سمٹ کر ہوئی جوڑا سر پر      مل گئی میری شبِ عیش ترے بالوں میں

## 7- کامل- شیخ جمال الدین

پرانے شاعروں میں سے تھے۔ سعادت خاں ناصر نے ان کے بارے میں بس اتنا لکھا ہے کہ :

''مردِ خردمند، شخصِ عاقل، شیخ جمال الدین کامل تخلص، شاگرد میاں مصحفی'' 10۔

محسن نے ان کی سکونت وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے، اس طرح :

''شیخ جمال الدین کامل، باشندۂ آنولہ لکھنؤ میں واسطے تحصیلِ علم کے وسائل بھی نہیں رہ گئے۔ کامل کے دو شعر یہ ہیں ۔

کب ہوئی پھر ہوس دانۂ خالِ کا کل      طائرِ دل کو جو رہتا ہے خیالِ کاکل
دو چار دن ہے زندگی مستعار دل'' 11۔      آغاز میں عیاں ہے یہ انجامِ کارِ دل

آنولہ کے خوش فکروں میں کچھ اور شاعر بھی تھے۔ لیکن وہ قابلِ ذکر و توجہ حیثیت حاصل نہیں کر سکے تھے۔

# مرادآباد

روہیل کھنڈ کے خطے کی تقسیم کے نتیجے میں ''مرادآباد مع متعلقات'' دوندے خاں کے قبضے میں آ گیا تھا لیکن دوندے خاں کی وفات کے بعد ہی اس نومولود ریاست کا وجود متزلزل ہو گیا تھا اور کچھ ہی مدّت کے بعد اپنے سیاسی داؤں پیچ سے انگریزوں نے اس کو بھی اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔ سیاسی عدم استحکام نے اس علاقے میں مشرق کی تہذیبی اور علمی روایتوں کو پنپنے نہیں دیا اور یہاں کے شعرا اور علما کو ملک کے اطراف و جوانب میں منتشر ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جو لوگ گھر چھوڑ کر باہر نکلنے پر خود کو آمادہ نہ کر سکے، ان کی صلاحیتیں اور لیاقتیں سب گھٹ کر رہ گئیں۔

1- تنہا- نواب محمد شبیر علی خاں

بیشتر تذکرے ان کے نام اور کلام سے خالی ہیں۔ لالا سری رام نے البتہ ان کے بارے میں اتنا لکھا ہے:

> '' تنہا، نواب محمد شبیر علی خان بہادر، رئیس مرادآباد۔ مہدی علی خاں ذکی مرحوم مرادآبادی کے شاگرد تھے۔ معمر و سن رسیدہ بزرگ تھے۔ 70 سال سے زیادہ عمر پا کر حال ہی میں (1911 سے پیشتر) انتقال کیا۔ زبان و بیان، بندش الفاظ، فصاحت، روزمرہ، غرض ہر طرح ان کا کلام اچھا ہے۔ پرانے مشاق تھے۔ اکثر نعتیہ غزلیں کہا

کرتے تھے۔ دیوان بھی مرتب ہوگیا ہے۔" 1

شبیر علی تنہا کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

نالہ نغمہ ہے اس کی محفل کا	رقص ہے بیقراری دل کا
کھینچ گیا یار تنک نگاہ کے ساتھ	ناتوانی ترا گلہ نہ رہا
بہت پاؤں پھیلائے اے اشک تو نے	مگر ہاتھ آیا نہ دامن کسی کا
رہے چھیڑ اس مژہ کی نیشتر سے	لہو بہتا رہے زخمِ جگر سے

کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو مضامینِ تازہ کی تلاش کا بہت شوق تھا۔

## 2- عاجز- شبیر علی خاں

مولانا امداد صابری نے ان کے بڑے بھائی نواب شبر علی خاں عاجز مرادآبادی کا حال بہت تفصیل سے قلمبند کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

"عاجز قادر الکلام شاعر تھے۔ اردو میں نہیں کہتے تھے۔ فارسی میں حمدیہ اور نعتیہ غزلیں کہا کرتے تھے......... 25/اپریل 1858 کو انگریزوں نے مرادآباد پر مکمل قبضہ کرلیا تو نواب شبر علی خاں بھی گرفتار ہو کر فرنگی کی گولی کا نشانہ بنے۔" 2

## 3- علی- رفیع علی خاں

مولانا امداد صابری نے ان کے رشتہ کے ایک بھائی نواب رفیع علی خاں مرادآبادی علی تخلص کا بھی احوال مفصل تحریر کیا ہے لیکن ان کی اردو شاعری کا کوئی نمونہ پیش نہیں کیا ہے۔ مولانا کے بیان کے مطابق یہ سب عظمت اللہ خاں ناظم کشمیر کی اولاد میں تھے اور اس اعتبار سے مرادآباد کے امرا میں سے تھے۔

## 4- ذکی- شیخ مہدی علی

یہ نواب شبیر علی خان تنہا کے استاد اور مرادآباد کے شاید سب سے زیادہ باکمال شاعر تھے۔

سعادت خاں ناصر نے ان کے بارے میں یہ کلمات تحریر کیے ہیں :

"صاحب ارشاد، علم معما اور تاریخ میں استاد، شیخ مہدی علی ذکی ساکن مرادآباد" 3

لیکن محسن نے ان سے متعلق اچھی معلومات قلمبند کردی ہیں، اس طرح :

''ذکی شیخ مہدی ولد شیخ کرامت علی، بزرگ ان کے شیخ زادے لکھنو کے، مولد و مسکن ان کا مراد آباد۔ یہ عہد حضرت سلطان عالم میں بواسطہ قطب الدولہ مخاطب بہ ملک الشعرا ہوئے۔ صاحب دیوان فارسی و ہندی۔ تاریخ گوئی میں دستگاہ خوب رکھتے ہیں۔''4

ذکی رامپور میں بھی رہے تھے۔ اس کا ذکر امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں کیا ہے :

''ذکی شیخ مہدی علی ابن شیخ کرامت علی مراد آبادی۔ جنت آرامگاہ (= محمد سعید خاں) کے عہد میں برسوں اس سرکار کے نمک خوار رہے۔ چندے لکھنؤ چلے گئے۔ پھر فردوس مکاں (= یوسف علی خاں ناظم) کے عہد میں نوکر ہو کر مور د افتخار رہے۔ شیخ امام بخش ناسخ کے شاگردوں میں نامور تھے۔ 72 برس کی عمر پا کر 1281ھ (1864-65) میں انبالے گئے۔ ذی قعدہ کے مہینے میں قضا کی۔ وہیں دفن ہوئے۔''5

ذکی پہلی مرتبہ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں آئے تھے۔ جب دوسری مرتبہ آئے تو 1265ھ (=1849) میں ملک الشعرائی کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ ان کا کلیات مطبع نولکشور میں چھپ چکا ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

رات کاٹی تارے گن گن کر کبھی آیا جو یاد　　اس کی چوٹی میں الجھنا موتیوں کے ہار کا
منت مرے جل بجھنے کی پوری ہوئی لیکن　　تم شمع چڑھانے کو بھی مدفن پہ نہ آئے
جوہر تو مجھ میں تھے ملکوتی خصال کے　　انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی
نہ ہوئی لطف تصور میں یہاں تاب سخن　　ورنہ شکوے تو بہت اے غم تنہائی تھے

## 5- ہادی- منشی امام الدین

مراد آباد کے علاقے میں بعض گمنام اور کم معروف شاعر اور بھی تھے۔ مولانا امداد صابری نے بعض کا ذکر کیا ہے۔ انھیں میں ایک منشی امام الدین سنبھلی بھی ہیں جن کو گرفتار کر کے 1858 میں بغاوت کے جرم میں پھانسی دے دی گئی تھی۔ مولانا کا کہنا ہے کہ امام الدین سنبھلی ''فن شعر میں کمال رکھتے تھے اور ہادی تخلص کرتے تھے۔'' ان کے پوتے کا کہنا ہے کہ یہ مقطع ان کا ہے ؎

جو رحمت کی ہے آدم پر تو ہادی کو بھی بخشے گا
وہ تیری شانِ غفاری جو پہلے تھی سواب بھی ہے

ہادی کے پوتے کو باوجود یہ کہ وہ پرانے کانگریسی تھے 1948 میں گڑھ مکتیشور کے ہندو مسلم فسادات میں پورے خاندان کے ساتھ شہید کر دیا گیا تھا۔ فاعتبر وا.........

# شاہجہان پور

شاہجہان پور کے علاقے کا بھی وہی حال رہاتھا جو روہیلوں کی دوسری بستیوں کا ہوا تھا۔ اودھ کے تیسرے بادشاہ محمد علی شاہ کے وقت سے 1857 تک اس علاقے میں بھی علم وشعر کی ترویج واشاعت سے متعلق کوئی قابلِ ذکر کام سامنے نہیں آیا۔شاعروں کی تعداد بھی برائے نام تھی اوران کی شاعری کا معیار بھی کچھ بلند نہیں تھا۔

1- احمد- مولوی احمد خاں

یہ شاہجہان پور کے کوئی غیر معروف شاعر تھے۔ان کے حالات بالکل معلوم نہیں۔محسن نے صرف اتنا لکھا ہے:

''احمد، صاحب دوزبان مولوی احمد خاں احمد شاہجہاں پوری۔'' 1

اس سے بس اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ یہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔کلام کا انداز یہ ہے ؎

کیا پریشانی میں ڈالا دل کو آج   میں نہ جانوں کس نے کی تقریرِ زلف
دشت مجنوں کا مجھے احمد ہے شوق   دل پہ میرے ہے مگر تاثیرِ زلف

2- حُسین- نواب غلام حسین خاں

شاعر کی حیثیت سے اپنے وقت میں خاصے معروف تھے۔ احمد حسین سحر نے اپنے تذکرے میں ان کی خوبیوں کا بیان اس طرح کیا ہے :

''حسین تخلص، نواب غلام حسین خاں، در شاہجہانپور از رؤسائے عظام است قطع نظر از گدازیٔ طبع مزاجِ عاشقانہ دارد۔ در نظم اشعار فارسی و ہندی دستگاہ کامل دارد ونہایت خوش فکر وخوش مذاق است۔ ہنگامِ تحریر ایں اوراق چند شعرِ ایشاں بہ یادِ فقیر بودند''

محسن نے ان کے بارے میں بعض مفید اطلاعات قلمبند کی ہیں :

'' نواب غلام حسین خاں حسین خلفِ نواب شیر داد خاں رئیس شاہجہانپور، وار دِ لکھنو۔ فارسی اکثر اور ریختہ کمتر فرماتے ہیں''3

لالا سری رام نے ان پر ضروری اضافے کیے ہیں اور لکھا ہے :

''شاعر فصیح البیان نواب غلام حسین خاں حسین مرحوم۔ ان کے والد نواب شیر داد خاں رئیس شاہجہانپور، نواب دلیر خاں منصب دار دربار شاہجہانی وبانی قصبہ شاہجہانپور کی اولاد میں تھے۔ تمام عمر بڑی عزت وتوقیر سے بسر اوقات کرتے رہے۔ زیادہ تر توجہ فارسی نظم کی طرف تھی۔ اردو بہت کم کہتے تھے۔

1296 (1879) تک حیات تھے۔''4

ان کے چند شعر یہ ہیں ؎

خط نہ سمجھو کہ یہ اُٹھا ہے غبارِ عارض لیلیٔ چشم ہوئی ناقہ سوارِ عارض
بتوں نے مومنوں کے دل میں جا کی خدا کے عرش پر نوبت بجا کی
سناؤں گا دلِ نالاں کو روکر کہانی آہِ حاجت نارواکی
خوش آہنگانِ فارس جانتے ہیں نوا سنجی حسین بے نوا کی

ان کے دیوان کا قلمی نسخہ جو کوئی سوا سو اوراق پر محیط ہے رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ ان کا صحیح سالِ وفات 1281ھ (65-1864) معلوم ہوتا ہے۔

### 3- سکندر- سکندر خاں

کوئی برخود غلط نومشق شاعر تھا۔ مرزا قادر بخش صابر نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

> ''سکندر تخلص، سکندر خاں، ساکن شاہجہانپور۔ طالب علمی کی تقریب سے چند سال شاہجہاں آباد میں قیام کیا۔ اب چند مدت سے لکھنؤ میں تحصیل علوم میں ساعی ہے۔ جب یہاں تھا گاہ گاہ شعر ریختہ بھی کہتا تھا اور مومن خاں سے اصلاح لیتا تھا۔ ایک روز ایک شعر میں استاد سے مباحثہ کیا اور ترکِ مشورہ کیا۔''5

اس کے دو شعر یہاں لکھے جاتے ہیں ؎

ہوش کھوئے ترے نظارے نے ایسے کہ سحر آئینہ اپنی بھی حیرانی پہ حیراں نہ ہوا
ہے وہ کیا قتل سکندر کہ خجل ہو اس سے جب کہ خوں ریزی اعدا سے پشیماں نہ ہوا

### 4- فخر- محمد فخر الدین

ان کا تعارف صابر نے اس طرح قلمبند کیا ہے:

> '' فخر تخلص، محمد فخر الدین خاں متوطن شاہجہانپور۔ ارباب اعتبار اور صاحبان اقتدار میں محسوب اور حسنِ اخلاق اور عمومِ وفاق سے طبائع احباب میں مرغوب ہے۔ موزونی کلام طبعی اور ذوقِ سخن جبلی ہے۔ یہ دو شعر اس کے ہیں ؎

ہم سے کچھ اور ہی ہے دل میں کدورت تجھ کو یوں تو کہنے کو تو اے شوخ کسی کا نہ ہوا
بیخودی سے ہے غرض، کون ہے مے کا طالب چشمِ ساقی تو ہے گو ساغرِ صہبا نہ ہوا''6

کچھ شک نہیں کہ شاہجہانپور میں اور بھی کئی شاعر تھے لیکن ان کے کلام کا معیار ایسا نہیں کہ اس کا یہاں ذکر ضروری معلوم ہو۔

# ب - نعت

اردو شاعری کی بنیاد خالقِ کائنات کے ساتھ، اور پھر نتیجہ کے طور پر اس کی تمام مخلوقات اور ان کے معاملات کے ساتھ عشق پر ہے۔ اردو غزل میں اُس ذاتِ مطلق کی تعریف، توصیف اور اس کے ساتھ اپنے دلی جذبات کے اظہار اور ہر نوع کے معاملات و مسائل کا بیان کیا جاتا ہے۔ گوشت پوست کی ان آنکھوں سے اُس ذاتِ مطلق کا مشاہدہ ممکن نہیں ہے اس لیے اہلِ دہلی نے اکثر اپنی بات کہنے کے لیے محبوبانِ مجازی کا سہارا لیا ہے۔

لکھنؤ میں ائمۂ معصومین کی شخصیتوں کو عقیدت کے محور کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں وہاں کی شاعری کا انداز اور مزاج مختلف ہو گیا تھا۔

روہیل کھنڈ پٹھانوں کی بستی تھی جن کی مذہب پرستی زندگی کے تمام معاملات میں جاری وساری تھی۔ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی مشہور و معروف جرأت و جانبازی کی بنیاد بھی ان کے عقیدے ہی پر مبنی تھی۔ مذہب اور بزرگانِ مذہب کے ساتھ غیر معمولی لگاؤ اور تعلقِ خاطر نے طبیعتوں کو حمد، نعت، منقبت اور سلام وغیرہ مختلف شعری اصناف کی طرف مائل کر دیا تھا۔ بلاشبہ ہیئت اور بیان کا انداز وہی غزل کا تھا لیکن موضوع کی مناسبت سے چونکہ مطلوب تعریف، توصیف اور تحسین ہوتی تھی۔ ان اصناف پر قصیدے کا پرتو بہت نمایاں رہا ہے۔

یہ تو نہیں ہے کہ دہلی، لکھنو اور حیدر آباد وغیرہ مراکز پر نعتیں نہیں لکھی گئی تھیں لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اس قبیل کی مختلف اصناف کو روہیل کھنڈ کے خطے میں بطورِ خاص فروغ حاصل ہوا تھا۔ کیفیت یہ تھی کہ یہاں ایسے شاعر بھی موجود تھے جنھوں نے نعت گوئی کے لیے اپنی صلاحیتوں کو وقف کر دیا تھا اور اسی اعتبار سے ان کو شہرت بھی حاصل ہوئی تھی۔ ان کے بعض نعتیہ اشعار ضرب المثل کا درجہ بھی حاصل کر چکے ہیں۔

## 1- حیات- محمد حیات خاں

شیخ محمد ابراہیم ذوق مذہب پسند شخص تھے۔ ان کا یہ مطلع مدتوں زبانوں پر جاری رہا ہے۔

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے　　کم نہیں منہ میں زباں ہرگز تری، مسواک سے

اُن کے حالات اور کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے شاگردوں کو بھی وہ ایسے مطالب کے نظم کرنے کی تلقین کرتے تھے چنانچہ ان کے تلامذہ میں سے بعض نعت اور منقبت وغیرہ شعری اصناف سے خصوصیت کے ساتھ دلچسپی لیتے رہے تھے۔ نواب محمد سعید خان بہادر کے عہد میں اس معاملے میں نام پیدا کرنے والوں میں ایک شاعر حیات تخلص کرتے تھے۔ امیر مینائی نے ان کے بارے میں لکھا ہے :

> "حیات تخلص، مولوی محمد حیات خاں ولد سید احمد خاں، علم صرف ونحو مولوی عبدالرحمن پنجابی سے پڑھا۔ علم حدیث وتفسیر مفتی محمد شرف الدین مغفور سے حاصل کیا۔ مرد خوش اوقات۔ آخر شب التزام تلاوت قرآن شریف ودلایل الخیرات، مجالس میلاد شریف میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے۔ شعر کا بھی کچھ کچھ ذوق تھا۔ نعت شریف کہنے کا شوق تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق کی شاگردی کا اقرار کرتے تھے۔ ساٹھ برس کی عمر ہوئی۔ رمضان کی 20 دیں تاریخ 1287ھ (1870) میں رحلت کی۔" 1

مرزا قادر بخش صابر نے ان کے حالات میں کئی مفید اطلاعات کا اضافہ کیا ہے۔ ان کی عبارت اس طرح ہے :

> "حیات تخلص محمد حیات خاں ولد احمد یار خاں، قوم افغان متوطن قدیم رامپور، ساکن حال میرٹھ۔ مردِ کریم الاخلاق عمیم الاشفاق ہے۔ اگرچہ بیشتر استفادہ روشن شاہ روشن

تخلص سے کیا تھا نواب مرحوم الٰہی بخش خاں معروف سے بعد شرف بیعت کے گاہ گاہ
فنِ سخن میں بھی مستفید ہوا۔ تیس برس کے عرصے سے پرمٹ کے سر رشتے میں
گرد آوری کے عہدہ سے ممتاز ہے۔"[2]

حیات کے والد کا نام وہی صحیح ہے جو صابر نے لکھا ہے یعنی احمد یار خاں۔ شروع میں انھوں نے روشن شاہ سے کسبِ فیض کیا تھا جو بریلی کے رہنے والے تھے۔[3] پھر میرٹھ میں سکونت اختیار کر کے ترکِ علائق کر چکے تھے۔ شاید نعت گوئی کی طرف مائل ہوئے ہوں۔ حافظ احمد علی خاں شوق نے حیات کے بارے میں یہ معلومات بھی قلمبند کی ہیں :

"حیات......قوم افغان، قدر زئی حسب، سید نسب، ماں کمال زئی اور نانی سیدانی
تھیں۔ کوکبِ رخشاں (1199) تاریخ ولادت ہے۔ ابتدا میں گویا تخلص تھا۔ کلام
عشقیہ جمع نہیں کیا۔ کلام نعتیہ اردو و فارسی دو جلدوں میں مدوّن تھا۔ ایک مثنوی اردو
نعت میں مسمّٰی بہ گلشنِ نور بھی لکھی تھی۔"[4]

ان کی نعت کا ایک شعر یہ ہے ؎

دیا ہے خلعتِ نور اُس کو حق نے نہ چھوڑا جس نے دامانِ محمدؐ

## 2- شہیدی- کرامت علی خاں

کرامت علی خاں نام تھا، عبدالرسول خاں کے بیٹے، ضلع اناؤ کے رہنے والے، آخر میں بریلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ بہ لباسِ فقیری شہر شہر گھومتے رہتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ان کا ایک واقعہ اس طرح نقل کیا ہے :

"شہیدی مرحوم بہ لباس فقیری دلّی میں آئے۔ مناسبتِ طبع نے نواب (عبداللہ خاں)
سے بھی ملایا.....اثنائے گفتگو میں کہا کہ معصران سخن کے نزدیک آج فنِ شعر میں تین
شخص ہیں۔ شیخ ناسخ لکھنؤ میں، شیخ حفیظ دکن میں، شیخ ابراہیم ذوق دہلی میں۔ نواب
صاحب نے کہا کہ شیخ ابراہیم ذوق کو تیسرا درجہ دینے کا کیا باعث؟ شہیدی نے شیخ ناسخ
کی بہت تعریف کی اور شاخ کی غزل سنا کر کہا کہ اس غزل پر آج کون قلم اٹھا سکتا ہے؟

نواب نے استاد کو بلایا، حال بیان کیا اور غزل کی فرمائش کی.......استاد نے یہ غزل کہہ کر مع قصیدہ جلسۂ خاص میں سنائی....... یہ سن کر شہیدی مرحوم دہلی سے روانہ ہو گئے۔''5

ان کی وفات کا حال مرزا قادر بخش صابر نے اس طور پر قلمبند کیا ہے :

''شہیدی...... مدت تک پنجاب اور گجرات میں رہا.......آخر مکہ معظمہ کو جا کر حج بیت اللہ کو ادا کیا پھر روضۂ منورہ کی طرف روانہ ہوا۔ اتفاقاً تپ محرقہ لاحق ہوئی۔ مجیب الدعوات سے چاہا کہ زیارت روضۂ اطہر سے پہلے جانِ ناتواں تن سے مفارقت نہ کرے...ناگاہ رفیق راہ نے گنبد مقدس کا پیش نگہ ہونا بیان کیا۔ اس مخلص بے ریا نے کمال شوق سے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور جان سوختۂ عشق کو نثار کیا۔''6

لالا سری رام نے شہیدی کے بارے میں لکھا ہے کہ :

'' وہ ہندوستان کے پہلے نعت گو شاعر ہیں جن کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ کلام میں سوز و گداز اور بلا کا اثر ہے۔ ان کے کامل شاعر ہونے میں کلام نہیں۔ کہیں کہیں پرانے الفاظ نظر آتے ہیں۔''7

شہیدی نے 4/صفر 1256ھ (1840) کو وفات پائی۔ ان کا دیوان 212 صفحوں پر 1850 میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ ان کی ایک نعت یہ ہے

ہے سورۂ والشمس اگر روئے محمدؐ ۔۔۔ واللیل کی تفسیر ہوئے موئے محمدؐ
جب روئے محمدؐ کی نظر آئی تجلی ۔۔۔ سمجھا میں شب قدر ہے گیسوئے محمدؐ
کس وضع اٹھائے ہوئے ہیں بارِ دو عالم ۔۔۔ ظاہر میں تو نازک سے ہیں بازوئے محمدؐ
تھا بیش بہا حُسن کے بازار میں یوسف ۔۔۔ پر ہو نہ سکا سنگِ ترازوئے محمدؐ
گلگشت گلستاں میں پڑھو صلِ علیٰ تم ۔۔۔ ہر پھول کی بو میں ہے رچی بوئے محمدؐ
کعبہ کی طرف منہ ہو نمازوں میں ہمارا ۔۔۔ کعبہ کا شب و روز ہے منہ سوئے محمدؐ
ہر نخلِ بیابانِ عرب مجھ کو ہے طوبیٰ ۔۔۔ ہوں شیفتۂ قامتِ دلجوئے محمد

رضواں کے لیے لے چلوں سوغات شہیدی
گر ہاتھ لگے خار و خسِ کوئے محمدؐ

### 3- عباس- سید عباس علی

یہ مولوی کفایت علی کافی کے شاگردوں میں نامور تھے۔ امیر مینائی نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

"عباس، سید عباس علی خلف سید نادر علی مراد آبادی، پہلے عدالتِ منصفی مراد آباد میں وکیل تھے، پھر اس دارالریاست میں محکمۂ رجسٹری کے محرر اول ہوئے۔ مولد شریف پڑھنے کے مشتاق، ایسی محافل متبرکہ کے بہت مشتاق۔ اسی ذوق میں کبھی کبھی نعتیہ شعر کہتے تھے۔ مولوی امین الدین امین اور مولوی کفایت علی کافی مرحوم سے تلمذ تھا۔ پچپن برس کی عمر تھی کہ ہیضہ کر کے اُنیسویں جمادی الاولیٰ کو 1284ھ (1867) میں راہی ملکِ بقا ہوئے۔ یہ ان کا کلام ہے۔

درنعت

اے خالقِ ارض وسما، دیدار احمدؐ کا دکھا ہر دم یہ تجھ سے ہے دعا، دیدار احمد کا دکھا
درگاہ میں تیری یہی ہے التجا عباس کی دن رات، ہر صبح وشام، دیدار احمد کا دکھا" 8

### 4- عباس- مرزا عباس بیگ

اپنے تذکرے میں امیر مینائی نے ان کا احوال اس طرح قلمبند کیا ہے:

"عباس تخلص مرزا عباس بیگ نام، اصل وطن بانس بریلی ہے۔ مرزا ذکی متخلص بہ ندیم کی اولاد میں تھے۔ علم انگریزی سے آگاہ، انشا نویسی میں مشہور رہے۔ ایک مدت تک وابستۂ دامنِ دولت ریاست رامپور رہے۔ پھر لکھنؤ گئے۔ خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوئے۔ انھوں نے تخلص بدل دیا۔ بجائے عباس نادر تجویز کیا۔ وہاں سے باندے گئے۔ نواب کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ چالیس برس کی عمر تھی کہ غدر ہوا اور وہیں پھانسی پائی۔ من جملہ تصنیفات ایک مثنوی ان کی ہے کہ فسانۂ عجائب کو مثنوی لیلیٰ ومجنوں کی بحر میں موزوں کیا ہے اور سنا گیا کہ دیوان بھی ترتیب دیا ہے مگر نہ دیوان کا پتہ لگا نہ مثنوی کا نشان ملا۔" 9

سید لطیف حسین ادیب نے ان کی ایک نعت نقل کی ہے، وہی یہاں لکھی جاتی ہے ۔

خدا ہے تیرا ثنا خوان یارسول اللہؐ 10 بڑی ہے سب سے تیری شان یارسول اللہؐ
یہ نام وہ ہے کہ جس کی ثنا نہیں ممکن کہ آپ کہتا ہے سبحان یارسول اللہؐ
دل اس کا نورِ حقیقت سے کیوں نہ ہو روشن زباں پہ جس کی ہو ہر آن یا رسول اللہؐ
خدا نے اپنی عنایت سے ہے کیا نازل تمھارے واسطے قرآن یارسول اللہؐ
بہ وقتِ گرمی خورشید حشر ہو کافی تمھارا سایۂ داماں یا رسول اللہؐ
لکھا ہے لوحِ مقدّس پہ خود تمھارا نام تمھارے نام کے قربان یا رسول اللہؐ

یہ عرض آپ کی خدمت میں رکھتا ہے عباس
دمِ اخیر ہو آسان یا رسول اللہؐ

## 5- کافی- محمد کفایت علی

یہ مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی کے شاگرد اور اپنے وقت کے استادوں میں تھے۔ چنانچہ ان کے ایک شاگرد کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے ان کے تعارف میں اتنا لکھا ہے:

"کافی تخلص، مولوی محمد کفایت علی مرادآبادی۔ صاحب علم وفضل وزہد وورع ہیں۔ بیشتر اشعار ان کے حمد ونعت میں ہوتے ہیں۔" 11

اہل تذکرہ کا اس باب میں اتفاق معلوم ہوتا ہے کہ کافی مداحِ جناب رسالت مآب صلعم میں اپنے اوقات عزیز کو صَرف کرتے تھے۔ 1857 میں بغاوت کے جُرم میں گرفتار کر کے ان کو مرادآباد جیل کے پاس مجمع عام کے سامنے پھانسی دیدی تھی۔ یہ وہیں پر دفن بھی کیے گئے تھے۔

مولانا کافی کی تصانیف متعدد تھیں چنانچہ ان کے موقع پر ان کا ذکر کیا جائے گا۔ ان کی نعتوں کا نمونہ یہ ہے ۔

بہارِ خلد ہے روئے محمدؐ شمیم جاں فزا ہے بوئے محمدؐ
دلِ وحشی ہے زنجیریں تڑاتا بہ شوقِ یادِ گیسوئے محمدؐ
گر جنوں بھی ہو تو عشقِ احمدی کا ہو جنوں ہو اگر سودا تو سودائے جنابِ مصطفیؐ
بس آرزو یہی دلِ حسرت زدہ کی ہے سنتا رہے شمایلِ احوالِ مصطفیؐ

عرشِ بریں ایوان محمد صلی اللہ علیہ وسلم     خلد سرا بُستانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
آپ کفیلِ کارِ اُمت، آپ شفیع روزِ قیامت     ہیں بیحد احسانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
مظہرِ رحمت، مصدرِ رافت، مخزنِ شفقت، معینِ عنایت     ذاتِ محمد، جانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
رحمت عالم اس کا لقب ہے، خلقتِ عالم کا وہ سبب ہے     ہے کیا عالی شان محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بہرِ شفائے دردو مصیبت اور برائے رنج وفلاکت
کافی ہے درمانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

### 6- لطف- لطف علی خاں

لطف علی خاں نام، حسن علی خاں کے بیٹے، بریلی کے رہنے والے باعمل اور صوفی مَنِش شخص تھے سید لطیف حسین ادیب کا کہنا ہے کہ :

''تمام عمر صرف نعت لکھی۔ نعتیہ شاعری دو دواوین پر مشتمل تھی۔ ایک دیوان ضائع ہو گیا دوسرا مطبع آئینۂ سکندر میں پہلی بار 1270ھ (1853) میں چھپا تھا۔ اس کے کم سے کم تین ایڈیشن نکلے۔ اس میں نعتیہ غزلیں، ایک مخمس، ایک مسدس اور ایک تضمین ہے۔''12

لطف کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں ہے۔ اس کی کیفیت اس طرح ہے :

''دیوانِ لطف     صفحے۔44 سطر۔25
مصنف۔ لطف علی خاں لطف     تاریخ تصنیف۔     بعد 1250ھ
آغاز۔

ازل میں جوش پر آیا جو دریا حق کی رحمت کا     سرِ احمد پہ رکھا تاج عالم کی شفاعت کا

اس میں نعتیہ غزلیں ردیف وار ہیں۔
اختتام۔

مجھے امید قوی ہے، یقین واثق ہے     عجب نہیں اگر اے لطف بخش دے غفار

ترقیمہ۔ ہزار شکر جناب کبریا کہ دیوانِ لطف تصنیف مولوی لطف علی خاں ساکن بریلی کہ مشتمل بر نعتِ جناب رسول مقبول صلعم۔ شانزدہ ماہ ربیع الثانی 1281ھ

(1864-65) میں تحریر ہوا.....

ے عشق محبوب سے مجھے سرشار کر

وَنُصلّی علیٰ محمد وّ اٰلہ وّ اصحابہ و اھلِ بیتہ اَجمعین" 13؎

اسی کا ایک نسخہ آزاد لائبریری علی گڑھ میں بھی ہے۔ اس کے بارے میں لکھا ہے :

" مجموعہ نعت        لطف        اوراق سولہ        سطر۔ 17

ابتدا۔

ازل میں جوش پر آیا جو دریا حق کی رحمت کا        سر احمد پہ رکھا تاج عالم کی شفاعت کا

خاتمہ۔

بیعت کا کرے حضرتِ موسیٰ سے اشارہ        دیکھے یدِ بیضا جو کفِ پائے محمدؐ

کیفیت۔ کاتب نے نامکمل نقل کیا ہے۔ پہلے صفحے پر کسی کی یہ تحریر ہے:

اس کا کاتب محسن گورکھپوری ہے۔ تقریباً یہ مخطوطہ 1897 کے لگ بھگ لکھا گیا ہے۔" 14؎

نمونہ کے طور پر لطف کی ایک نعت یہاں لکھی جاتی ہے ؎

کوئی نہیں تمھارا ہمسر مرے پیمبرؐ        لاریب تم ہو سب سے برتر مرے پیمبرؐ

ہوں برق سے فزوں تر بمضطر مرے پیمبرؐ        شعلے بھڑک رہے ہیں دل پر مرے پیمبرؐ

اب تو بلالو اپنے در پر مرے پیمبرؐ        کب تک پھرا کروں میں دردر مرے پیمبرؐ

وردِ زباں یہی ہے اکثر مرے پیمبرؐ        قرباں ہوں جان و دل سے تم پر مرے پیمبرؐ

مُلکِ عرب میں حضرت، ہندوستاں میں بندہ        چین آئے میرے دل کو کیونکر مرے پیمبرؐ

ابرِ کرم کو اپنے فرمایئے اشارہ        دھو ڈالو سب گنہ کے دفتر مرے پیمبرؐ

آواز کو بہ کو ہے رہبر کی جستجو ہے        لو اب بُلالو اپنے در پر مرے پیمبرؐ

ہردم یہ آرزو ہے ہر دم یہ التجا ہے        بھولوں نہ یاد تیری دم بھر مرے پیمبرؐ

دشوار تھا پہنچنا جنت میں تھا نہ آساں
اے لطف گر نہ ہوتے رہبر مرے پیمبرؐ

## 7- مذاق- محمد دلدار علی

غزل گو کی حیثیت سے مولوی محمد دلدار علی مذاق بدایونی کا حال لکھا جا چکا ہے۔ عمر کے ساتھ مزاج میں پختگی آئی تو طبیعت روحانیت کی طرف مائل ہوئی اور غزلیہ شاعری کو چھوڑ کر حمد، نعت اور منقبت وغیرہ اصناف شعری سے دلچسپی لینے لگے۔ کہتے ہیں کہ آخر زمانے میں نعت وغیرہ کے سوا کچھ بھی لکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی ایک نعتیہ غزل کے کچھ شعر درج کیے جاتے ہیں ۔

علیم تو ہے، کلیم تو ہے، سمیع تو ہے، بصیر تو ہے　　مراد کون ومکان تو ہے، مراد خلق وتقدیر تو ہے

تو ہی ۔ اول، تو ہی ہے آخر، تو ہی ہے باطن، تو ہی ہے ظاہر　　تو ہی ہے مظہر، تو ہی مظاہر، ظہور تو ہے، ظہیر تو ہے

تو ہی مکیں ہے، تو ہی مکاں ہے، تو آپ سیار لامکاں ہے　　تو ہی ہے جاں اور تو ہی جہاں ہے، جہان وجاں کا مشیر تو ہے

تو ہی وجود وعدم ہے جانی، تجھی سے ہے سب کی زندگانی
تو ہی ہے اک جان دوجہانی بہ ہر صغیر و کبیر تو ہے

# ج - مثنوی

ضیاء الدین عبرت اور غلام علی عشرت نے ملک محمد جائسی کی شاہکار ''پدماوت'' کے قصے کو اپنے زمانے کی مروجہ اردو زبان میں نظم کا جامہ پہنا کر روہیل کھنڈ کے علاقے میں مثنوی کی صنف کو عملاً توجہ طلب بنا دیا تھا چنانچہ نواب احمد علی خان بہادر رند تخلص کے عہد میں مختلف موضوعات سے متعلق چھوٹی بڑی مثنویاں نہ صرف تصنیف اور تالیف کی گئیں بلکہ فارسی کی کچھ اور معروف اور مقبول مثنویوں کے اردو میں ترجمے بھی کیے گئے۔ ان میں غلام احمد نکہت کی مثنوی ''نل ودمن'' اور غلام حسین بخشی کی مثنوی ''معدنِ یاقوت'' نے اپنے وقت میں قابلِ ذکر حیثیت حاصل کر لی تھی۔

نواب محمد سعید خان بہادر کے زمانے میں جب حکیم محمد مومن خاں مومن دہلوی کی شاعری کے اس علاقے میں اثرات زیادہ ہوئے تو دوسری شعری اصناف کے ساتھ ساتھ مثنوی کی صنف بھی مقبول و مروّج ہوئی اور اکثر شاعروں نے اپنی صلاحیت، حوصلہ، مزاج اور ہمت کے مطابق اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ امیر مینائی کے تذکرے میں اس زمانے کی کئی مثنویوں کا مجملاً ہی سہی لیکن ذکر مل جاتا ہے۔ ان کے عنوانوں پر ہی خیال کریں تو اندازہ ہوگا کہ اُس وقت تک موضوع کے اعتبار سے اُس جوار میں صنف مثنوی میں خاصا تنوع آچکا تھا لیکن بطور مجموعی معیار کچھ زیادہ بلند نہیں ہو سکا تھا۔

# عشقیہ مثنویاں

1- احمد-           سید یمین الدین احمد

یہ ایک باذوق لیکن کم معروف شاعر تھے۔ انھوں نے سکندر نامہ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا اور اسی ترجمے کی وجہ سے ان کے نام کو حیاتِ جاوید مل گئی۔ امیر مینائی نے ان کا احوال اس طرح قلمبند کیا ہے:

> ''احمد تخلص، سید یمین الدین احمد ولد سید معین الدین احمد، سلسلہ ان کے نسب کا حضرت امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز تک پہنچتا ہے۔ 1245ھ (30-1829) ان کا سال ولادت ہے۔ ماہ ربیع الاول کی 12ویں تاریخ 1282ھ (1865) زمانۂ رحلت ہے۔ اس حساب سے 37 برس کی عمر ہوئی۔ میاں احمد حسین راحت سے تلمذ تھا۔ سکندر نامہ زبان اردو میں ان کا موزوں کیا ہوا ملا۔ اس سے یہ کلام منتخب ہو کے لکھا گیا۔'' [1]

شروع زمانے میں میاں احمد حسین راحت غلام علی عشرت سے کسبِ فیض کرتے تھے۔ اس تعلق سے احمد کا سکندر نامے کو اردو میں ترجمہ کرنا مناسب ہی تھا۔ امیر مینائی کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد نے پورے سکندر نامے کا ترجمہ کر لیا تھا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں ؎

ہوا جب کہ تابندہ بہر منیر — صف آرا ہوا شاہِ گردوں سریر
جواں وہ جو تھے شیر صحرائے جنگ — چلے دشمنوں کی طرف بے درنگ
ملے دونوں لشکر بہم اس طرح — کہ ساون سے بھادوں ملے جس طرح
کسی سمت تھے گرز آتش فشاں — کہیں پارسینوں کے نوکِ سناں
کوئی نیم جاں تھا، کوئی خستہ تن — میسّر کسی کو نہ آیا کفن
پڑی لاش پر لاش تھی اس قدر
کہ کشتوں کے پشتے ہوئے سربسر

زبان کی شستگی اور بیان کی پختگی ان شعروں سے ظاہر ہے۔ کچھ شبہ نہیں کہ ان میں سے بعض شعروں میں ضرب المثل بن جانے کی لیاقت بھی موجود ہے۔

## 2- انور- امام الدین خاں

یہ مولوی غلام جیلانی خاں کے پوتے تھے۔ فارسی میں اپنے نام کی مناسبت سے امام اور اردو میں انور تخلص کرتے تھے۔ اپنی کتاب مجمع الکرامات میں انھوں نے تفصیل سے اپنے حالات قلمبند کیے ہیں۔ وہیں سے تذکرہ کاملانِ رامپور میں نقل ہوئے ہیں۔ امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں ان کے بارے میں لکھا ہے :

> ''انور، امام الدین خاں خلف غلام حسین خاں، کسی کے شاگرد نہ تھے۔ پینسٹھ برس کی عمر میں ربیع الآخر کی 12 ویں تاریخ 1259ھ (1843) میں قضا کی۔ ان کے بھتیجے عبدالقادر خاں سے معلوم ہوا کہ فارسی میں ان کا تخلص امام ہے۔ تالیف ان کی بہت تھیں مگر وقتِ تالیفِ تذکرہ ایک دیوان ناتمام اور ایک مثنوی مختصر ملی۔''[2]

ان کی ایک مثنوی ''فراق نامہ'' کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے جس کی ضخامت صرف گیارہ ورق کی ہے۔ اس کے چند شعر نمونہ کے طور پر یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

عشق سے ہے زلف کا مصرع دراز — عشق روئے حُسن کا آئینہ ساز
عشق ہے قفلِ دلِ تنگ چمن — عشق ہے بوئے گل و رنگِ چمن

عشق بازی کا سُنا چاہے جو حال　　پوچھ انور سے کہ ہے اس کو کمال
دل کی سوزش سے وہی آگاہ ہے　　اس کو اس آتشکدے میں راہ ہے
لالہ ساں رکھتا نہیں عشرت کا جام　　خونِ دل پیتا ہے جوں غنچہ مدام
کون اس کا ہم نشیں غمخوار ہے
ایک پہلو میں خیالِ یار ہے

ان میں سے تیسرے شعر میں شاعر کا دعویٰ یہ ہے کہ اس مثنوی کی تصنیف کے وقت وہ عشق بازی کے فن میں کمال کے درجے کو پہنچ چکا تھا۔ ان شعروں سے ان کی خوبیِ فکر و بیان کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہر شعر سلاست اور فصاحت کا نمونہ ہے اور اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ شاعر کو مثنوی کے لکھنے میں ملکہ حاصل تھا۔

3- بیتاب- عباس علی خاں

رامپور کے حکمراں خاندان کے فرد تھے۔ محسن نے ان کے تعارف میں لکھا ہے :

'' عباس علی خاں بیتاب ولد نواب عبدالعلی خاں بن غلام محمد خاں بن نواب فیض اللہ خاں رامپوری'' غزل گو کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے 1301ھ (1884) میں وفات پائی تھی۔ زبانِ اردو میں چند مثنویاں لکھ کر خوش فکری کی داد دی تھی۔ ان کی دو مثنویوں کے قلمی نسخے رامپور کی رضا لائبریری میں محفوظ ہیں :''3

الف۔ بہارِ عشق۔ اس مثنوی کی کتابت محمد حبیب الرحمٰن نے کی تھی۔ کُل دو سو پانچ اوراق ہیں۔

ب۔ گلزارِ عشق۔ اس کے کاتب کا نام رتن سنگھ کانستھ، ماتھر ہے۔
سالِ کتابت 1268ھ (1852) ہے۔ ایک سو پندرہ اوراق پر محیط ہے۔

امیر مینائی نے بیتاب کی ایک مثنوی کے یہ چند شعر اپنے تذکرے میں نقل کیے ہیں ؎

سینے سے جدا کروں میں جی کو　　چھاتی سے لگائے تو کسی کو
ہو لب پہ یہاں تو آہِ پُرسوز　　مِسّی کی دھڑی جمائے تو روز

یہاں غم سے ہو دل جگر مرا خون　　مہندی سے وہاں ہوں ہاتھ گلگوں
جل جائے یہاں مرا کلیجا　　وہاں آپ کا دل ہو سن کے ٹھنڈا
ہو تم کو خوشی، میں غم سے مانوس　　تم عطر ملو، میں دستِ افسوس

یہ طور نئے ہوئے ہیں ایجاد
تم بھولتے جاؤ، ہم کریں یاد

ان شعروں سے مثنوی کی صنف میں شاعر کی کامیاب طبع آزمائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

# مذہبی مثنویاں

## 1- بندہ- حفظ اللہ

انھوں نے اردو میں کئی مذہبی مثنویاں لکھی تھیں۔ان کے حالات امیر مینائی کے تذکرے میں اس طرح آئے ہیں :

> ''بندہ، مولوی حفظ اللہ ولد مولوی شیخ کرامت اللہ مرحوم، بدایوں ان کا وطن آبائی تھا۔ قصبہ بلاسپور مسکن ذاتی تھا۔صاحب ارشاد تھے۔مولوی غلام جیلانی رفعت اور مولوی محمد سلیم اللہ دونوں ان کے استاد تھے۔حافظ خیر محمد ان کے مرید سے معلوم ہوا کہ رسالہ بیت المعرفت اور شرح ظہوری اور آداب الصبیان اور انشائے فیض رساں ان کی تالیفات سے ہیں۔ پچاس برس کی عمر میں جمادی الآخرہ کی ستائیسویں تاریخ جمعے کے دن 1277ھ (61-1860) میں رحلت کی۔ایک مثنوی جس میں میلاد شریف حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات موزوں کیے ہیں اور ایک مجموعہ جس میں اردو فارسی دونوں زبانوں کی غزلیں تھیں ملا اور معلوم ہوا کہ فارسی میں حفظ تخلص ہے۔لہٰذا فارسی کلام حاے حطی میں آئے گا۔اردو شعر اس جگہ لکھے گئے۔''4

حافظ احمد علی خاں شوق نے بندہ کے والد کے نام کے ساتھ ''عباسی'' تحریر کیا ہے اور بتایا ہے کہ:

''کتاب بیت المعرفت میں مولف نے اپنا نام حفظ اللہ عباسی الہاشمی القادری لکھا ہے۔''5

ساتھ ہی یہ ذکر بھی کیا ہے کہ ان کی ایک ''مثنوی در بیان معراج ہے۔'' اس مثنوی کے کچھ شعر یہ ہیں ؎

حمدِ خدا خامے کی معراج ہے — نامِ خدا نامے کا سرتاج ہے
بسملۂ مصحفِ حُسنِ رقم — شاہدِ مضموں کی ہے ابرو کا خم
خامہ ہے لکھنے کے سبب شاخِ طور — نور سے ہر صفحہ ہے رخسارِ حور

مولوی حفظ اللہ بندہ کی دو اور اردو مثنویوں کے قلمی نسخے رضا لائبریری رامپور میں موجود ہیں۔ ان کی کیفیت اس طرح ہے :

الف۔ راہِ نجات (منظوم) ۔ یہ مثنوی صرف چار ورقوں پر محیط ہے۔

ب۔ مولود خیر الوریٰ۔ اس کا قلمی نسخہ اکسٹھ ورق کا ہے۔

ایک اور قلمی نسخے میں جس کی کتابت محمد فیاض نامی کسی شخص نے 1299ھ (1882) میں کی تھی اور جو 277 ورق پر محیط ہے، یہ مثنوی شامل تھی۔

مولوی حفیظ اللہ بندہ نے غزلیں بھی کہی تھیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کو صنف مثنوی سے زیادہ دلچسپی تھی اور اسی کے لیے انھیں شہرت بھی ملی تھی۔

## 2- حیات- محمد حیات

ان کے حالات میں حافظ احمد علی خاں شوق نے تحریر کیا ہے :

''مولوی محمد حیات تخلص حیات ........ کلام نعتیہ (ان کا) لوگوں کی زبانوں پر موجود ہے۔ محلہ نالہ پار کی مسجد میں تنہا شب و روز رہتے تھے۔ قرآن شریف اور درود شریف کا ورد تھا۔ ہر مہینے میں خواب میں زیارت آنحضرت صلعم سے مشرف ہوتے تھے۔''6

انھوں نے ایک نعتیہ مثنوی بھی لکھی تھی جس کا عنوان مطالب کی مناسبت سے ''گلشنِ نور'' مقرر کیا تھا۔ اس کے بارے میں حافظ احمد علی شوق نے، افسوس ہے کہ ضروری معلومات بھی قلمبند نہیں کی ہیں۔

### 3- حیدری- شیخ حیدری

شیخ حیدری نام، شیخ قادر بخش کے بیٹے، امروہہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی ''ولایت نامہ'' کے نام سے لکھی تھی۔ ذخیرۂ شیرانی میں اس کا جو قلمی نسخہ ہے اس کی کتابت 1259ھ (1843) میں ہوئی تھی اور وہ صرف بیالیس اوراق پر محیط ہے۔7

### 4- کافی- محمد کفایت علی

مولوی محمد کفایت علی مرادآبادی کافی تخلص اپنے وقت کے ممتاز نعت گو تھے۔ انھوں نے نعتیہ قصیدے اور کئی مذہبی مثنویاں لکھی تھیں۔ مولوی امداد صابری نے ان کے احوال میں لکھا ہے :

''مولانا کافی کی زیادہ تر تالیف وتصانیف نظم میں ہیں اور ان میں بھی احادیث کے تراجم یا ان کی شرح ہوتی ہیں۔ چہل احادیث کا ترجمہ نسیم جنت، شمائل ترمذی کا ترجمہ بہار خلد، اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے رسالہ ترغیب اہل سعادت کا ترجمہ خیابان فردوس ہے۔ دیوان کافی کے علاوہ داستان صادق، جذبۂ عشق، مثنوی تجمل دربار نبی کریمؐ، حلیہ شریف، مولود بہاریہ، اور اوقات نحو وصرف، بھی مولانا کافی کی تصانیف ہیں۔''8

ان کی ''حمد بہاریہ'' اس طرح ہے ؎

حمد لائق داورِ اکبر کو ہے  خالقِ اشیاے بحر و بر کو ہے
ہے یہ ادنیٰ وصف اُس خلاّق کا  باغباں ہے گلشنِ آفاق کا
ہے عجب وہ صانعِ رنگیں نگار  جس نے پیدا کیں بہاریں بیشمار
یہ نگارستان عالم کا چمن  ہے نسیم لطفِ حق سے خندہ زن
اُس نے دکھلائیں بہاریں بے شمار  گُل کھلائے سینکڑوں، لاکھوں، ہزار9

مولانا کافی کی ''مولد شریف'' 1271ھ (1853) میں چھپ کر شائع ہوگئی تھی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رامپور کی رضا لائبریری میں موجود ہے۔ عباداللہ بیگ دہلوی نامی کاتب نے اس کو 28 ورقوں پر 1289ھ (1872) میں لکھا تھا۔

نسیم جنت میں جس کا اوپر ذکر آیا قصیدۂ نعتیہ، خیابانِ فردوس اور فضائل درود بھی شامل ہیں۔ یہ مجموعہ انصاری پریس دہلی میں 1300ھ (1883) میں چھپا تھا۔ 10 مثنوی خیابانِ فردوس جو رسالہ ترغیب اہل سعادت کا ترجمہ ہے الگ سے بھی کتابی صورت میں غالبًا 1883 میں چھپ گئی تھی۔ ''مثنوی داستانِ صادقاں'' 1271ھ (1853) میں مطبعِ مصطفائی محمد حسین خاں دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اس کی کتابت محمد بشارت علی نے کی تھی۔ مثنوی بہارِ خلد جس کا ذکر اوپر آیا ہے، مطبع محمدی لکھنؤ میں 1261ھ (1845) میں 164 صفحوں پر چھپی تھی۔ ''قصہ شیخ صنعاں عرف داستانِ عبرت افزا'' 1285ھ (1868) میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تھا۔ اس قصے کے بارے میں شیخ ابراہیم ذوق کا یہ شعر بہت خوب ہے ؎

عشق ہے اے ذوق وہ کافر کہ جس کے ہاتھ سے ۔۔۔ شیخ صنعاں سا مسلماں رندِ بد مشرب بنے

مولوی کفایت علی کافی کی اردو نثر و نظم میں بعض تالیف اور بھی تھیں چنانچہ ایک جگہ ضمناً مثنوی شہادت نامہ کا ذکر بھی دیکھنے میں آیا ہے۔

# متفرق مثنویاں

## 1- جمال-   محمد جمال خاں

لکھنؤ میں مرزا محمد رفیع سودا اور پھر محمد تقی میر نے منظوم شکارنامے لکھے تھے۔ روہیل کھنڈ کے علاقے پر شجاع الدولہ اور پھر آصف الدولہ کو بالادستی حاصل ہونے کے نتیجہ میں وہاں کی اکثر روایتوں نے یہاں رواج حاصل کر لیا تھا۔

محمد جمال خاں نامی کوئی شاعر رامپور میں "نالہ پار" میں رہتا تھا۔ اس شخص نے نواب محمد سعید خان بہادر کا زمانہ پایا تھا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص نواب کے متوسلوں میں شامل تھا۔ اس نے ایک مثنوی "در حالات سیر و شکار" لکھی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ رامپور کے حلقوں میں یہ مثنوی مقبول ہوئی چنانچہ رضا لائبریری میں اس کے ایک سے زیادہ قلمی نسخے موجود ہیں۔ مثنوی بہت طویل نہیں ہے۔ ایک نسخہ کل 16 اوراق پر محیط ہے۔

جمال کے حالات اور اس کی شاعری وغیرہ کی کیفیت افسوس ہے کہ فی الوقت معلوم نہ ہو سکی۔

## 2- جوہر-   حکیم ہادی حسین خاں

حکیم ہادی حسین خاں نام، جوہر تخلص، مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے مثنوی

''طبِ منظوم''، لکھی تھی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رامپور کے کتب خانے میں موجود ہے جس کی ضخامت صرف سولہ ورق ہے۔ اس کے سوا جوہر کی کسی تالیف کا پتہ نہیں چل سکا۔

3- قادری- سید غلام جیلانی

امیر مینائی کے تذکرے میں اس شاعر کا احوال اس طور پر درج ہے:

'' قادری سید غلام جیلانی خلف سید شاہ حقیقت اللہ عرف بھورے میاں قدس سرہما، قصبہ بلاسپور (تحصیل ریاست رامپور) کے متوطن، بڑے مرد مرتاض، انتہا کے صاف باطن، مدت تک ٹونک میں رونق افروز رہے۔ نواب وزیرالدولہ والی ٹونک اور بہت سے وہاں کے لوگ حضرت کے فیض سے بہرہ اندوز رہے۔ گاہ گاہ بطور خود شعر بھی موزوں فرماتے تھے۔ ابتدا میں معلم تخلص تھا۔ 67( کذا) برس کی عمر پائی۔ محرم کی اٹھارھویں تاریخ، 1273ھ (1856) میں وفات پائی''11۔

حافظ احمد علی خاں شوق نے ان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اُن میں یہ مذکور بھی ہے کہ:

'' آپ کی تصانیف میں بہ زبانِ اردو تین قلمی کتابیں ہیں۔12۔

ایک فقر میں۔ نظم ہدایت، دوسری جنگ نامہ حضرت امامین علیہ السلام، تیسری میلاد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی'' ان میں سے جنگ نامہ کا صرف ایک شعر امیر مینائی نے نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے ۔

نور چشم وقرۃ العینِ محمدؐ مصطفیٰؐ راکبِ دوشِ پیمبرؐ، سبطِ خیرالمرسلینؐ

رامپور اور اس کے مضافات میں اور بھی مختلف شاعروں نے مثنویاں لکھی تھیں مثلاً :

حافظ شاہ غلام علی شاہجہانپوری نے '' مولدِ نبی'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی جس کا 1258ھ (1842) کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ جو 26 اوراق پر محیط ہے رامپور کے کتب خانے میں موجود ہے، اور مظفر خاں گرم نے کئی مثنویاں لکھی تھیں جن کے مخطوطے رضا لائبریری میں محفوظ ہیں۔

ان سے اہلِ رامپور کی صنف مثنوی سے خاصی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس خطے میں مثنوی کا معیار زیادہ بلند نہیں ہوسکا۔

# د - نوحہ وسلام

نواب آصف الدولہ کے زمانے میں ہی روہیل کھنڈ کا خطہ عملاً ان کے ممالکِ محروسہ میں شامل ہو گیا تھا اور بقول امیر مینائی :

> ''عہد نامۂ جدید مشتمل بر شرایط حسنہ تحریر کر دیا اور نواب احمد علی خان بہادر کو کہ ۲ سالہ تھے مسند ریاست پر بٹھایا۔'' 1

ان کے بعد نواب محمد سعید خان بہادر مسند نشین ہوئے جو بنارس اور لکھنؤ میں مقیم رہے تھے۔ ان کے زمانے میں ''احکام وغیرہ میں قواعدِ شرعیہ عدل و داد کی رونق بڑھانے لگے۔''2 کا پنی پسند کی نام بر آوردہ شخصیتوں کو انھوں نے رامپور میں مدعو کیا اور مذہبی عالموں کی بطورِ خاص سرپرستی کی۔ امیر مینائی نے حُسین تخلص کے ایک فارسی گو شاعر کے ذکر میں ریاست کے اس ماحول کی نشاندہی کی ہے جو نواب کی سرپرستی میں تیزی سے تشکیل پا رہا تھا۔ لکھا ہے:

> ''حُسین، آغا محمد حسین خلف آغا محمد علی ولد حاجی محمد بیگ ابنِ آغا علی نقی، قوم تُرک بقبیلہ افشار، متوطن ارومیہ من مضافاتِ آذربائیجان..... حیدرآباد اور مچھلی بندر ہوتے ہوئے کلکتے آئے۔ وہاں سے لکھنؤ آ کر ملازمتِ شاہی سے اعزاز پائے۔ اکثر شغلِ روضہ خوانی رہا، یہاں تک کہ بہ حکم قدر شناسی حضرت نواب محمد سعید خاں صاحب

بہادر پچیسویں ذی الحجہ کو 1262ھ (1846) میں وارد دارالرّیاست رامپور ہو کر اس سرکار ذی اقتدار کے نمک خوار ہوئے۔ آج تک بدستور قدر شناسی سرکار سے سرمایہ اندوز سعادت وافتخار ہیں۔ نہایت مردمتین، مہذب، باوضع، سلیقہ شعار ہیں۔ ایک کتاب مسمّیٰ بہ مجالس الاخبار فضائل ومصائب جناب سید الشہدا وائمہ ہدا میں تصنیف کی ہے۔ اس میں کچھ اشعار فارسی پیش خوانیوں سے انتخاب کر کے زیب تذکرہ کیے۔"3

### 1- ناظم- نواب یوسف علی خاں

نواب کی ایما بلکہ سرپرستی میں روضہ خوانی اور اس قبیل کی مجلسیں آراستہ کی جانے لگیں اور بہ تدریج نوحہ، سلام اور مرثیہ وغیرہ کا چلن رامپور ہی میں نہیں، اس کے آس پاس کی بستیوں میں بھی زیادہ ہونے لگا۔

نواب یوسف علی خاں ناظم بھی اپنے پدر والا قدر کی طرح مذہب پسند شخص تھے۔ انھوں نے مذکورہ مجلسوں کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ عملاً ان میں شرکت بھی کی۔ ان کے دیوان میں کئی سلام موجود ہیں۔ اگرچہ ان سلاموں کے زمانے کا تعین نہیں کیا گیا ہے، ان کی موجودگی اس صنف کے ساتھ نواب ناظم کی دلچسپی کی مظہر ہے۔

اپنی ہیئت کے اعتبار سے نواب ناظم کے سبھی سلام غزل کے طور پر ہیں۔ ان میں معمولاً مطلع اور مقطع کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ سلام کے شعر عموماً معنی کے لحاظ سے مکمل ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی قطعہ بند اشعار بھی کہہ لیے جاتے ہیں، مثال کے طور پر یہ اشعار ہیں ؎

ہو کر شہیدِ تیغِ ستم ، جب عطا ہوا کوثر کا جام، سرورِ عالی مقام کو
پاسِ ادب سے لے تو لیا، پر نہ پی سکے اوندھا دیا کنارۂ کوثر پہ جام کو

بیسویں صدی کے نصف اول تک بھی "سلام" کے محل پر وبندگی، تسلیم اور مجرا وغیرہ الفاظ بولے جاتے رہے ہیں۔ اکثر مذہبی اصطلاحوں میں لفظ "درود" کو بھی سلام کے مرادف کی حیثیت سے لاتے ہیں۔ نواب یوسف علی خاں ناظم نے اپنے سلاموں میں ان سبھی کلمات کا استعمال کیا ہے چنانچہ ذیل کے شعروں میں دیکھا جا سکتا ہے ؎

اے منبعِ ائمہؑ اظہار بندگی نفسِ رسولؐ حیدر کرارؓ بندگی
تسلیم ہے حُسین علیہ السلام کو اِقلیم دیں کے شاہِ سپہر احتشام کو
درود اُس شاہِ عالی آستاں پر کہ جس کا آستاں ہے آسماں پر
مجرا ہے اُسے جس کے ثناخواں ہیں ہزاروں ہر بزم میں اس کے لیے گریاں ہیں ہزاروں

لفظ مُجرا کی مناسبت سے سلاموں میں حسب موقع اکثر کلمہ "مُجرئی" بھی لایا جاتا ہے۔ نواب ناظم نے بھی ایک مطلع میں کہا ہے ؎

مجرئی سنتے ہیں کل صبح وہ ساماں ہوگا کہ سوا نیزے پہ خورشیدِ درخشاں ہوگا

نواب ناظم کے مطبوعہ دیوان میں ایک سلام ایسا بھی ہے جس کے مطلع میں درود، سلام کی قسم کا کوئی لفظ بھی نہیں آیا ہے۔ اس کے مقطع میں البتہ شاعر نے لفظ "سلام" نظم کیا ہے۔ یہاں مطلع اور مقطع کے ساتھ اس کا ایک بیت بھی نقل کیا جاتا ہے ؎

کل روپ اور دیکھیے گا کائنات کا روزِ شمار دن ہے شہادت کی رات کا
لکھتا ہوں جب سے شاہ کے اخلاق کی صفت آہو کا نافہ نام ہے میری دوات کا
ناظم کی داد دو کہ جوابِ سلام میں امیدوار ہے رقمِ التفات کا

اس دیوان میں ایک اور نظم بھی کم وبیش اسی نوعیت کی ہے۔ اس کے بھی کچھ شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

کسی نے سجدے سے پوچھا تھا امتحاں کے لیے کہ بعد کعبے کے سمجھیں تجھے کہاں کے لیے
متاعِ گریہ کی محشر میں ہے خریداری نویدِ نفع ہے چشمِ گہر فشاں کے لیے
یہ کجروی، یہ ستمگری، یہ بے ادبی علی الخصوص پیمبرؐ کے خانداں کے لیے
دُھنے گی اس کو قضا روئی کی طرح ناظم دن انتقام کا آتا ہے آسماں کے لیے

ان میں سے کسی شعر میں بھی لفظ سلام نہیں آیا ہے۔ مطالب پر غور کریں تو ان میں بھی سلام کی مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔ بے شک بعض مضامین میں مرثیہ کی کیفیت ضرور موجود ہے۔ ان دونوں منظومات کو سلام قرار دینے میں تامل ہوتا ہے۔

نواب یوسف علی خاں ناظم کی طبیعت کے میلان اور ان کی سرپرستیوں کے فیض سے رامپور

کو تیزی سے نوحوں، سلاموں اور مرثیوں وغیرہ کے بھی ایک قابلِ توجہ مرکز کی حیثیت حاصل ہونے لگی تھی۔ یہاں بعض گھرانوں نے بھی اس باب میں خصوصیت حاصل کرلی تھی۔ نواحی بستیوں میں البتہ ان اصناف کا چلن زیادہ نہیں ہو سکا تھا۔

2- قربان علی- میر قربان علی

یہ میر محبّ علی مفلس کے بیٹے تھے جن کے بارے میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے لکھا تھا :

"میر محبّ علی مفلس تخلص، شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق، ساکن رامپور، عمر پنجاہ سالہ داشت۔ چہار سال می شوند کہ ازیں جہاں درگذشت۔ در مقطع ہر غزل مضمون افلاس برائے رعایتِ تخلص خود می بست۔ ہمہ سوداتش بربادرفتہ۔"[4]

مفلس نے نواب احمد علی خاں رند کے زمانے میں وفات پائی تھی۔ وہ "مضمون افلاس" ضرور نظم کرتے تھے لیکن کسی تذکرہ نویس نے ان کو "مرثیہ گو" نہیں کہا ہے۔

میر محبّ علی مفلس کے بیٹے میر قربان علی باقاعدہ شاعر نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے لیے کوئی تخلص بھی مقرر نہیں کیا تھا اور معاصر تذکرہ نویسوں نے شاعر کی حیثیت سے ان کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمانے کی ہوا کو دیکھ کر نواب محمد سعید خان بہادر کے عہد میں وہ سلام اور مرثیے کہنے لگے تھے۔ اَمیر مینائی نے کہ جو خاص اس دارالریاست کے متوطن اور متوسل مشاعروں کا تذکرہ لکھ رہے تھے، ان کا احوال بھی لکھ دیا ہے:

"قربان علی سید رضوی خلف سید محبّ علی مفلس تخلص کی جگہ پورا نام بھی موزوں کرتے تھے، تریسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ ربیع الآخر کی نویں تاریخ بارہ سو سترہ میں قضا کی۔ کسی سے تلمذ نہ تھا۔ بطور خود سلام اور مرثیہ کہتے تھے"[5]

قربان علی کے سلاموں کے یہ دو شعر امیر مینائی نے درج کیے ہیں ؎

جہازِ اہلِ پیغمبر جو ڈوبا عین خشکی میں تلاطم میں ہے غم سے آج تک پانی سمندر کا

اور ؎

جو اُچھلا مثلِ فوارہ لہو اکبر کے سینے سے اُبل کر آ گیا خوفِ دلِ شبیر آنکھوں میں

### 3- رضا-      میر رضا علی

یہ میر قربان علی کے بیٹے اور میر محب علی مفلس کے پوتے تھے۔ شاعری حیثیت سے یہ تیسری پشت تھی۔ امیر مینائی کے تذکرے میں ان کا حال اس طرح لکھا ہے :

''رضا تخلص، میر رضا علی ابن میر قربان علی مرحوم۔ پچاس برس کی عمر ہے۔ کبھی کبھی سلام کہتے ہیں۔ میرزا قاسم علی بیگ متخلص بہ ذوق شاگرد میاں دلگیر سے تلمذ ہے۔''[7]

باپ کی طرح اس بیٹے کو بھی شہرت نہیں ملی۔ امیر مینائی ہی کے تذکرے میں ان کے ایک سلام کے دو شعر ملے ہیں ؎

طوق بھی ڈال دو گردن میں، یہ کہتے تھے عدو      بیڑیاں جس گھڑی عابد کو پنھانے آئے
ناریوں نے نہ کیا نور خدا کا کچھ پاس      خیمۂ سبط پیمبرؐ کو جلانے آئے

صنائع لفظی و معنوی کی طرف ان کی طبیعت زیادہ مائل رہی ہے۔ شاید یہ اثر میاں دلگیر کے سلسلے سے وابستگی کا رہا ہو۔

### 4- شاد-      میاں فضل علی قوال

یہ بڑے باکمال مغنّیوں کے اخلاف میں تھے اور خود بھی کہن سال اور باکمال قوال تھے۔ امیر مینائی نے کسی قدر تفصیل سے ان کا احوال لکھا ہے :

''شاد تخلص، میاں فضل علی قوال ولد غلام مصطفیٰ عرف میاں ٹینٹو، مرد ظریف الطبع، خلیق، نیک خو، خیال گانے میں بے بدل، خوش آوازی میں ضرب المثل، 18 زبانوں کا گانا گاتے تھے، اناڑی کھلاڑی سب کو رجھاتے تھے۔ اجداد ان کے حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کے سکھیا کار تھے۔ شیخ شیر محمد اور ان کا بیٹا کبیر اور معین الدین جو حضرت محمد شاہ انار اللہ برہانہ میں فن موسیقی میں کامل تھے، جن کا حال تاریخ مراۃ آفتاب نما میں مندرج ہے، وہ انھیں کی شاگردی سے مشتہائے روزگار تھے۔ میاں غلام مصطفیٰ کے والد راجے خاں بعد خرابی دہلی عہد نواب شجاع الدولہ میں وارد لکھنؤ ہوئے۔ بعد ایک زمانے کے والا جناب نواب محمد سعید خان بہادر نے میاں فضل علی کو لکھنؤ سے طلب فرمایا۔ مدت مدید تک یہیں رہے۔ 84 برس کا سن ہوا۔ شوال کی اُنیسویں کو

1272ھ (1856) میں مسلول ہو کر رحلت کی۔ میاں دلگیر سے تلمذ تھا۔ انگریزی، فارسی ناگری، میں بھی مداخلت تھی۔ اب کس وکوان کے سب ملازم سرکار ہیں۔" 8

عنایت خاں راسخ نے شیخ معین الدین کے بارے میں لکھا ہے :

"شیخ معین الدین ولد شیخ جوہر ابن شیخ شیر محمد دریں وقت باوصف ضعف پیری یگانہ زمانہ است و بے ہمتا در خواندن اقسامِ خیال وقول وترانہ 9

اور شیر محمد کے ذکر میں یہ تحریر کیا ہے :

"شیخ شیر محمد و شیخ کبیر شاگرد او درقوالی بے نظیر وقت بودہ اند وطرز علاحدہ وضع نمودہ، درسرکار شاہ بلند اقبال محمد داراشکوہ از اقران وامثال امتیاز تمام داشتند۔ بردو اکبرآبادی مولد بودند۔" 10

شروع میں قوالی کے لیے یہ کچھ کچھ کہہ لیتے ہوں گے۔ جب رامپور پہنچے، یہاں کے حالات کے مطابق مرثیہ اور سلام وغیرہ کہنے لگے۔ شاد کے علاوہ رضا بھی میاں دلگیر کے سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ خیال ہوتا ہے کہ رامپور کے ماحول میں میاں دلگیر اور ان کے شاگرد زیادہ مقبول تھے۔

امیر مینائی کے تذکرے میں میاں فضل علی شاد کے سلام کا یہ ایک شعر ملا ہے ؎

جب قتل رن میں قاسم خورشید رو ہوا
سہرے کے تار منہ پہ پڑے تھے کرن کی طرح

نواب محمد سعید خاں اور نواب یوسف علی خاں کے زمانے میں رامپور میں مرثیے اور سلام لکھے جانے لگے تھے۔ نئی نسل نے بھی ان اصنافِ شعری سے دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ بعد کے زمانے میں ان کا معیار بھی کسی قدر بہتر ہوا اور تعداد بھی مرثیہ گویوں کی زیادہ ہوگئی۔

## ۵ - قصیدہ

1 - ناظم - نواب یوسف علی خاں

نواب یوسف علی خاں ناظم نے قصیدے کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ چنانچہ ان کے مطبوعہ دیوان میں دو قصیدے بھی شامل ہیں۔ پہلے کا عنوان اس طرح قائم کیا گیا ہے :

"قصیدہ در مدحِ امیر المومنین حضرت علیؑ "

یہ قصیدہ کُل پندرہ شعروں پر مشتمل ہے اور یہ سب شعر غزل کے طور پر کہے گئے ہیں۔ قصیدے کے معروف اجزائے ترکیبی کے مطابق ان کو مرتب نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا درج ذیل مطلع سے آغاز ہوتا ہے ؎

سمجھے ہوئے ہیں ہم کہ نہیں ہے جُدا علیؑ  نامِ خدا ، سمّی خدا ہے خدا علیؑ

اس قصیدے کے ہر شعر میں اپنے مخصوص عقیدے کے مطابق شاعر نے حضرت علی کی خوبیوں اور نیکیوں کا بیان کیا ہے اور غزل کے شعروں کی طرح التزام کیا ہے کہ معنی کے لحاظ سے ہر شعر اپنی جگہ پر مکمل ہو، مثلاً ؎

دانا دبیرِ دفترِ اسرارِ کاف ونون  عادل وزیرِ داورِ روزِ جزا علیؑ

مقطع بھی اسی طور پر کہا ہے ؎

ناظم نبیؐ کے بعد امامت کے واسطے  شایاں نہیں ہے کوئی بجز مرتضیٰ علیؑ

اس کو قصیدے کے مقابلے میں مدحیہ غزل خیال کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے قصیدے کا بھی یہی موضوع ہے اور اس کا عنوان یہ ہے:

''قصیدہ در منقبت''

پہلے سے یہ اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں مطالب کی تقسیم روایتی انداز پر کی گئی ہے اس میں شعروں کی تعداد 61 ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

اعجاز نما کون ہے مجھ سا دمِ تقریر　　ہو کاشفِ اسرارِ نہاں خانۂ تقدیر

مطلع کا مضمون اس امر پر صاف دلالت کر رہا ہے کہ تشبیب کے مطالب خودستائی پر مبنی ہیں، مثال کے طور پر دو شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں ؎

کھولیں گے زباں خاک سخنداں مرے آگے　　ہے بلبلِ شیراز یہاں بلبلِ تصویر

خاموش ہے خجلت سے فلاطوں مرے آگے　　سحباں کو کہاں تاب کہ کھولے لبِ تقریر

گریز اگرچہ طویل ہے لیکن بہت خوب ہے۔ اس جزو کے مضامین تشبیب کے مطالب سے پوری طرح ہم آہنگ اور مربوط ہیں، اس طرح ؎

حاصل ہے اُسی سے مجھے شاگردیٔ عرفاں　　جبرئیل کا استاد جو ہے صاحبِ توقیر

ہمنامِ خدا، شوہرِ خاتونِ قیامت　　احمدؐ کا برادر، پدرِ شبر و شبیر

قصیدے کے جزوِ اصلی یعنی مدح کا آغاز اس طور پر ہوتا ہے ؎

لازم ہے لکھوں مدح میں وہ مطلعِ روشن　　ہو جس سے عیاں مطلعِ خورشید کی تنویر

مطلع

تقدیر کا لکھا ہے جو وہ کرتے ہیں تحریر　　ہر سطر ہے سطرِ قلمِ کاتبِ تقدیر

اس میں شبہ نہیں کہ شاعر نے اس جزو کی تکمیل میں محنت کی ہے اور اپنے شعروں کو طرح طرح کی تلمیحوں اور صنعتوں سے مزین کیا ہے۔ اپنے قصیدے کی خوبیوں کی شاعر نے اس کے خاتمے میں خود نشاندہی کی ہے۔ کہتا ہے ؎

ناظم نہیں حدِ بشری مدحتِ مولا　　شمہ نہ لکھا جائے جو دفتر بھی ہو تحریر

ہر چند بہت خوب کیا نظم قصیدہ　　وا اہلِ سخن کے ہیں ثنا میں لبِ تقریر

یہ قصیدہ جیسا کہ عنوان سے بھی ظاہر ہے حضرت علیؑ کی منقبت میں ہے۔اس کا اختتام دعا پر ہونا چاہیے تھا اور شاعر نے ایسا ہی کیا ہے ؎

یارب رہیں جب تک مہ وخورشید درخشاں        یارب رہے جب تک کہ یہ دورِ فلک پیر
پیش آئے جو مشکل مجھے آسان وہ ہو جائے        تدبیر سے ہر وقت موافق رہے تقدیر

حضرت علیؓ کا لقب مشکل کشا بھی ہے۔اسی کی مناسبت سے نواب ناظم نے یہ دعا کی ہے۔ کچھ شک نہیں کہ دعا کا انداز بہت خوب ہے۔

اس قصیدے میں نواب یوسف علی خاں ناظم نے شاعری کی اس معروف صنف کی روایتوں کو بطور مجموعی سلیقے سے نباہا ہے اور یہ صورتِ حال اس باب میں ان کی عمدہ صلاحیتوں کی مظہر ہے۔

نواب یوسف علی خاں ناظم نے جیسا کہ مذکور ہوا مختلف مرکزوں سے نام برآوردہ شاعروں کو طلب کر کے رامپور میں جمع کیا تھا۔ اکثر مقامی شاعروں نے بھی حالات کو دیکھ کر حوصلہ کیا اور اس طرح یہاں قصیدہ گوئی کا سلسلہ جاری ہوا۔ مظفر خاں گرم اور عباس علی خاں بیتاب وغیرہ مقامی شاعروں نے بعد کے زمانے میں اس کے لیے نام پیدا کیا۔ رضا لائبریری رامپور میں ان کے قصیدوں کے قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ بعض یہ ہیں :

| | | |
|---|---|---|
| قصیدۂ بیتاب | صاحبزادہ محمد عباس علی خاں رامپوری | بہ عہد نواب کلب علی خاں بہادر |
| | کُل چھ ورق | |
| قصیدۂ گرم | محمد مظفر خاں رامپوری گرم تخلص | سالِ تصنیف 1281ھ (1864-65) |
| | کُل دو ورق | |
| مجموعہ قصائد گرم | محمد مظفر خاں گرم رامپوری | کتابت 1952، بہ قلم تراب علی خاں |

بیتاب اور گرم دونوں کے حالات اپنے اپنے موقع پر تحریر کیے جا چکے ہیں۔

### 2- بحر- شیخ امداد علی

یہ لکھنؤ کے باکمالوں میں سے تھے۔ اپنے تذکرے میں امیر مینائی نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''بحر شیخ امداد علی خلف شیخ امام بخش، پینسٹھ برس کی عمر، لکھنؤ وطن ہے۔ اب اس سرکار کے

وظیفہ خوار ہیں، اس سبب سے یہ دارالریاست ان کا مسکن ہے۔ شیخ امام بخش ناسخ مغفور کے شاگردوں میں نامور ہیں۔ کلیات ان کا چھپ گیا ہے۔ دور دور تک مشتہر ہے۔'' 1

ان کے قیام رامپور سے متعلق مولانا محمد مبین کیفی چریا کوٹی نے لکھا ہے :

'' کچھ دنوں کے لیے رامپور میں بھی قیام کیا۔ کلب علی خان نے تنخواہ مقرر کردی تھی لیکن وطن کی کشش کھینچ لائی۔'' 2

رامپور میں قیام کے زمانے میں انھوں نے چند قصیدے بھی لکھے تھے۔ یہاں ان کے کچھ کچھ شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

''تہنیتِ شادیِ صاحبزادہ محمد ذوالفقار علی خاں مرحوم''

وہ زمانہ ہے کہ آئے جو عروسانہ بہار    آشیانوں میں عنادل کے بندھے بندھن وار
آب جو صورتِ مشاطہ ہے آئینہ بہ کف    کیا عروسانِ چمن کرتے ہیں بن بن کے سنگھار
ڈال کر اپنے محافے پہ گلابی پوشش    آئی ہے بوئے گل باغ جناں ہو کے سوار

یہ تشبیب کے شعر ہیں، بہار یہ مضامین نظم کیے ہیں۔ ہر شعر شاعر کی خوش فکری اور جدتِ خیال کا مظہر ہے۔

سیاں بحر کے ایک اور قصیدے کا عنوان اس طرح ہے :

'' درمدحِ جناب مستطاب نواب محمد یوسف علی خاں صاحب بہادر فردوس مکاں اَنار اللہ برہانہٗ '' اس کی تشبیب بھی بہاریہ ہے لیکن مطالب کا انداز مختلف ہے۔ چند شعر یہ ہیں۔

اشرفی کی ہے وہ رنگت اگر اس کی پتی    چھوڑ ے تانبے پہ مِس تو بنالے کندن
نونہالانِ چمن کا جو یہ عالم دیکھے    کھول کر آنکھ نہ دیکھے کبھی دولھا کو دولھن
شاخِ شمشیر میں مانندِ سپر پھول لگیں    جو ے گلشن میں جو حداد بجھالے آہن
کھیت تلوار کے پانی سے ہوے ہیں سیراب    خاک میں پھولوں کی چادر ہیں شہیدوں کے کفن
دیکھے کیفیت گلشن تو پڑھے شیخ درود    پاے انگور کے دانے تو بنالے سمرن

اس قسم کے استادانہ قصائد نے نومشقوں کو نہ صرف حوصلہ دیا بلکہ انھیں راہ بھی دکھائی چنانچہ ان کے بعد رامپور میں اکثر شاعروں نے قصیدے لکھے تھے۔

# و - واسوخت

## 1- ناظم- نواب یوسف علی خاں

19 ویں صدی عیسوی کے ربعِ ثانی (13 ویں صدی ہجری کے ربعِ ثالث) میں واسوخت کا چلن اس حد تک ہو گیا تھا کہ اسے اس زمانے کی متداول شعری اصناف میں شمار کیا جانے لگا تھا۔ واسوخت معمولاً مسدس کی صورت میں لکھے جاتے تھے۔ رامپور کے نواب یوسف علی خاں ناظم نے بھی اپنے سبھی واسوخت اسی صورت میں تصنیف کیے تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ اس صنف سے ان کی دلچسپی حکیم محمد مومن خاں مومن کے فیوض میں سے ہوگا۔

نواب ناظم کے دیوان میں پانچ واسوخت ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں الگ الگ واقعہ بیان کیا گیا ہے اس طرح مطالب کے اعتبار سے انھوں نے اس صنف شاعری میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے ایک واسوخت کے آخر میں انھوں نے کہا ہے ؎

واہ واسوخت نیا تم نے سُنایا ناظم　　خوب ہی زور طبیعت کا دکھایا ناظم
کوچۂ نظم میں کیا باغ کِھلایا ناظم　　سب کے واسوختوں کا رنگ مٹایا ناظم
زمزمے بزم میں اربابِ سخن بھول گئے
چہچہے باغ میں مرغانِ چمن بھول گئے

اس سے شاعر کی نگاہ میں اس صنف کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس واسوخت میں کل چالیس بند ہیں اور اس میں محبوب سے براہِ راست خطاب کیا گیا ہے۔ پہلا شعر اس کا یہ ہے ؎

کل کی ہے بات کہ تم میں نہ یہ زیبائی تھی   نہ یہ شوخی، نہ یہ خوبی، نہ یہ رعنائی تھی

عاشق کا دعویٰ یہ ہے کہ ؎

ظلم سہہ کر ستم ایجاد بنایا تم کو   ہو کے دیوانہ، پری زاد بنایا تم کو

نتیجہ اس صورتِ حال کا یہ ہوا کہ محبوب ''شہرہ آفاق'' ہو گیا اور پھر اس کی عاشق سے نگاہ پھر گئی اور اب وہ ''جھوٹوں بھی'' اس کا حال نہیں پوچھتا ہے۔ محبوب کے احوال کو دیکھ کر عاشق اس کو متنبہ کرتا ہے کہ ع

ٹھوکریں کھاؤ گے، کہتے ہیں یہ اچھی نہیں چال

اور خود اپنے بارے میں اس کا کہنا یہ ہے کہ ع

عاشقانہ جو طبیعت ہے تو معشوق ہزار

چنانچہ کچھ مدت کے بعد وہ محبوب کو خبردار کرتا ہے کہ ؎

ان دنوں زینتِ آغوش ہے وہ غیرتِ حور   جس کے رخسار سے ہے نورِ تجلی کا وفور

اس کے بعد اس ''غیرتِ حور'' کے سراپا اور معاملوں کا بیان کیا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ؎

سُن کے ان باتوں کو محجوب ہوا دل میں وہ ماہ   سر جھکایا یہ خجالت سے کہ اٹھی نہ نگاہ

محبوب نے شرمندہ ہو کر کہا کہ بدگمان ہو کر اسے مفت میں بدنام کرنا مناسب نہیں ہے۔ پھر اس کے رخساروں پر اشک بہنے لگے جس سے عاشق کا دل پسیج گیا۔ محبوب پر پیار آ گیا اور پھر اس نے کہا کہ ؎

جل کے باتیں تمھیں یہ ساری سناتے ہیں ہم   تم نے چھیڑا جو ہمیں تم کو ستاتے ہیں ہم
ورنہ کب اور سے دل اپنا لگاتے ہیں ہم   آؤ مل جاؤ، نہ روٹھو کہ مناتے ہیں ہم
ہے یہی فکر کہ راضی کسی اسلوب ہو تم
ہم وہی عاشقِ شیدا، وہی محبوب ہو تم

دوسرے واسوخت میں شاعر نے محبوب سے معاملات کو درست کرنے کے لیے ایک دلچسپ تدبیر کی۔ اس واسوخت میں 59 بند ہیں۔ اس کی تمہید میں جو خاصی طویل ہے "بہار چمن عشق" کی کیفیت بیان کی ہے۔ چمنِ عشق کی آفت خیزیوں کے بیان کے بعد شاعر نے اعتراف کیا ہے کہ بالآخر وہ بھی ان میں مبتلا ہو گیا اور ع

بندۂ عشق ہوئے ایک گل اندام کے ہم

اس وقت اس گل اندام کا احوال یہ تھا کہ ع وضع سادہ کہ نہ کھائی تھی زمانے کی ہوا

عاشق اپنے اس محبوب پر قربان ہونے لگا۔ اس کی رہائش کے لیے ایک بنگلہ بنوایا اور پھر عیش سے بسر ہونے لگی لیکن یہ صورت "فلک تفرقہ باز" کو نہ بھائی۔ محبوب کے سر میں نخوت کی ہوا بھر گئی اور وہ سرکشی پر آمادہ ہوا۔ عاشق نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور کہا ؎

دل میں سوچو تو کہ کیسے ہیں ہمارے احساں بات کرنی تمھیں آتی تھی نہ اے غنچہ دہاں
اب وہ طرار ہوئے چلتی ہے قینچی سی زباں ناز و انداز میں تم طاق ہوئے سروِ رواں
طرزِ دلداری و آئینِ ادب بھول گئے
آ گئے ایسے ہوا میں کہ وہ سب بھول گئے

اس قسم کی گفتگو سننے کے بعد محبوب نے بھی زبان کھولی اور کہا کہ آپ ہم پر بھی رنگ جمانے لگے۔ جاننا چاہیے کہ میرا جیسا گل اندام زمانے میں کوئی نہیں ہے۔ اس پر عاشق نے جواب دیا کہ

ع تم سے بہتر نہیں، تم سا تو دکھا سکتے ہیں

اور ؎

نرم باتیں جو سنیں اُس سے ہوا دل یہ نہال کھِل گیا گل کی طرح، دور ہوا خارِ ملال
جا کے اک کمرے کی اس گلِ رعنا سے یہ چال نصب آئینہ کیا جس میں ہو پیدا تمثال
بادِ نخوت کا مزا تا اسے حاصل ہو جائے
بوستاں اور گلستاں کے مقابل ہو جائے

پھر اُس کمرے میں اُس محبوب کو بلایا۔ اپنے عکس کو دیکھ کر اس نے کہا ؎

خیر معلوم ہوا عاشقِ یک رنگ ہو تم

اور پھر اس نے صلح کی درخواست کی۔ کچھ ردّ وقدح کے بعد کیفیت یہ ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں ساون کی جھڑی لگ گئی۔ عاشق کو بھی رحم آ گیا اور ؎

الغرض صلح ہوئی، دور ہوا خارِ ملال　　پچھلی باتیں جو تھیں ناظم وہ ہوئیں خواب وخیال
مجھ کو پایا جو فرح ناک ہوئے وہ بھی نہال　　ساغرِ دل سے عشرت نے کیے مالا مال
وہ ہوئے شاد، طبیعت مری مسرور ہوئی
پھر گلستاں میں بہار آئی، خزاں دور ہوئی

نواب یوسف علی خاں ناظم نے جو سب سے طویل واسوخت تصنیف کیا ہے اس میں کُل ایک سو تیئیس بند ہیں۔ اس کی تمہید میں جو عشق کی کارفرمائیوں کے بیان پر مشتمل ہے، طرح طرح کے قابلِ توجہ اور دلچسپ مضامین نظم کیے ہیں چنانچہ ایک بند میں کہتے ہیں ؎

گرچہ توضیحِ اشارات وشفا مشکل ہے　　ناز کا شرح وبیاں اس سے سوا مشکل ہے
سہل ہے فہمِ کتب، فہمِ ادا مشکل ہے　　کیا معمائے دہن نامِ خدا مشکل ہے
کیسا مصرع قدِ موزوں ہے کوئی کیا جانے
بیت ابرو کا جو مضموں ہے کوئی کیا جانے

اسی سلسلے میں یہ بھی کہا ہے کہ ؎　　ہم سے پوچھو کہ ہیں ہم میکشِ میخانۂ عشق

اس قسم کی طویل تمہید کے بعد اپنے ایک واقعہ کا بیان اس طرح کیا ہے ؎

لو سنو کرتے ہیں اک سانحۂ تازہ بیاں　　جس کی رنگینیِ مضموں سے ہے گلبرگ زباں
ایک معشوق ملا حشر خرام، آفتِ جاں　　جس کے جلوے کے ہیں مشتاق تمام اہلِ جہاں
زلف کھولی جو نظر وہ مہِ کامل آیا
کچھ نہ سوجھا ہمیں، آندھی کی طرح دل آیا

پھر اس کے ساتھ عیش سے بسر ہونے لگی لیکن

ع　چرخِ ظالم کو شبِ عیش نہ آئی یہ پسند

اور کسی نے اس سے یہ بات لگادی کہ تم جسے اپنا عاشق زار سمجھتے ہو وہ کسی اور پر عاشق ہے اور

ع　تم سے ہر روز یہ چھپ چھپ کے کہیں جاتے ہیں

یہ سن کر وہ آگ بگولہ ہو گیا اور اس کے دل سے الفت مٹ گئی۔ ہاتھ جوڑے، پاؤں پڑے لیکن بات نہ بن سکی۔

پھر ؎

ناگہاں دل نے یہ تدبیر نئی بتلائی ہم نے اک چین سے تصویرِ حسیں منگوائی
ہمہ تن خوب، سراپا میں عجب زیبائی طرفہ رعنا کہ فدا اس پہ ہو خود رعنائی
کون سی شان تھی جو اس سے نمودار نہ تھی
بے زبانی سے مگر طاقتِ گفتار نہ تھی

ایک مکان آراستہ کر کے در پر دربان وغیرہ کو تعینات کیا اور اس میں وہ تصویر لگوادی۔ پھر اس معشوق کو مطلع کیا کہ ہمیں تم سے بھی بہتر ایک صنم مل گیا ہے۔ تمھیں اگر یقین نہ ہو تو خود آ کر دیکھ لو۔ اس خط کو پڑھ کر وہ بہت لال پیلا ہوا اور زیورات سے آراستہ ہو کر نکلا۔ عاشق نے یہ خبر سنی تو اس نے کہا کہ اچھا ہے۔ وہ آئے گا تو دربان روکیں گے اور یہی تذلیل اس کی سزا ہے۔ آخر یہی ہوا۔ وہ بے طلب آیا۔ کرسیِ زر پر ایک شاہدِ رعنا کو بیٹھا دیکھا۔ چاہا کہ اسے ہٹا دے لیکن خواصوں نے اسے قریب آنے نہ دیا۔ ذلتِ فاش اٹھا کر وہ ایک گوشہ میں چلا گیا۔ عاشق تک خبر پہنچی کہ

؎ مُنہ پہ پلّہ لیے افسوس میں ہیں، روتے ہیں

پھر ؎

سُن کے یہ بات مجھے ضبط کا یارا نہ رہا دل جو بیتاب ہوا اشک بہے، دوڑ پڑا
جا کے گوشے میں گلے اس کو لگا کر یہ کہا میرے پاس آئے تھے، جانا تمھیں اس گھر میں نہ تھا
تھا وہی پاس، مرے پاس جو آئے ہوتے
طعنہ زن کس لیے پھر اپنے پرائے ہوتے

اس کے بعد دونوں کے مابین کچھ گفت وشنید ہوئی۔ آخر محبوب یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ ؎

زیست منظور نہیں، زہر ہی کھاتے ہیں ہم

دونوں نے قسمیں کھائیں۔ پھر عاشق کی اجازت پا کر وہ اس تصویر کے پاس پہنچا اور اس سے دریافت حال کیا لیکن اس کے لب نہ ہلے۔ وہاں جو لوگ موجود تھے ان سے پوچھا تو

انھوں نے کہا کہ یہ آپ کے رعب کی وجہ سے قالب بے جان ہو گیا ہے۔ پھر جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو محض تصویر ہے۔ اس کے بعد وہ عاشق کے پاس پہنچا اور کہا ؎

چل گیا خوبیِ تقدیر سے فقرا تیرا

یہ واسوخت اس بند پر ختم ہوتا ہے ؎

خوش ہوا اس کی اطاعت سے ہمارا دلِ زار　　اس کے خواہانِ رضا ہم بھی ہوئے لیل و نہار
ناظم اب طولِ سخن کا نہیں موقع زنہار　　یار سے صلح ہوئی، آئی گلستاں میں بہار

تیزیِ ذہنِ رسا خوب دکھائی تو نے
بات بگڑی ہوئی دَم بھر میں بنائی تو نے

ناظم کے ان واسوختوں میں جن تفصیلات کا بیان ہوا ہے وہ صاف طور پر والیانِ ملک میں سے کسی شخص سے متعلق ہیں۔ ان سے شاعر کے معتقدات، اس کے اطوار اور معاملات کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اس اعتبار سے یہ واسوخت فکر اور بیان میں صداقت کے قابلِ توجہ نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس مقام پر یہ نکتہ بھی توجہ طلب ہے کہ ناظم کے سبھی واسوختوں میں محبوب کو دوبارہ صحیح راستے پر لے آنے کی کوشش کی گئی ہے اور تعلقات کو منقطع کرنے کے بجائے مصالحت کی طرح طرح سے تدبیریں کی گئی ہیں۔ بے راہروی کا ارتکاب محبوب کی طرف سے ہوتا ہے لیکن عاشق کے فکر و عمل میں کوئی لغزش نہیں ہوتی ہے چنانچہ وہ بوقتِ مصالحت محبوب سے بے تامل یہ کہہ سکتا ہے کہ ؎　　تمھیں منصف ہو، بگاڑا ہوا گھر کس کا ہے

نواب یوسف علی خاں ناظم کے دیوان میں ایک واسوخت ایسا بھی ہے جس میں اُنھوں نے داستان گویوں کے انداز سے پوری سرگذشت سنائی ہے۔ اس میں کل 77 بند ہیں۔ پہلا بند یہ ہے ؎

اے ندیمانِ خرد پیشہ نیا حال سنو　　نہ سنا ہو جو کبھی تم نے، وہ احوال سنو
سرگذشتِ ستمِ چرخِ کہن سال سنو　　کس طرح کشتِ توقع ہوئی پامال سنو

تھا وفا کا جو گماں یار سے باطل نکلا
جس کو سمجھے تھے مسیحا وہی قاتل نکلا

پھر اُن ندیمانِ خرد پیشہ سے کہا گیا ہے کہ تم جانتے ہو کہ میری بزمِ عشرت آٹھوں پہر آراستہ رہتی ہے لیکن ایک ''بُتِ خودسر'' کے خیال نے دل کو مضطر بنادیا ہے اور

ع روز روشن ہے شب تار مری آنکھوں میں

غیرت کا تقاضا ہے کہ اس ''آزردگی غیر سبب'' کو ترک کردو لیکن دل کا قول برعکس ہے چنانچہ ؎

ان ہی جھگڑوں میں مری جان پڑی رہتی ہے سامنے یار کی تصویر کھڑی رہتی ہے

ان معاملات کے ذکر میں شاعر نے پرواز دربیان صَرف کیا ہے چنانچہ ضمناً کوئی مصرع بلکہ پورا شعر بھی فارسی میں موزوں ہوگیا ہے۔ محبوب کے معاملات کے سلسلے میں کہا ہے ؎

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اس دلربا دلدار کے کان میں شیطان نے کچھ ایسا پھونک دیا کہ وہ میرے گھر سے اس طرح چلا گیا کہ پھر ادھر لوٹ کر نہ آیا۔ اس ذکر کے بعد پھر ندیمانِ خرد پیشہ سے خطاب کیا ہے کہ ؎

تم ہوا خواہ ہو میرے، مرادم بھرتے ہو کود پڑنے سے کنویں میں بھی نہیں ڈرتے ہو
دعوئے فہم ہے، دانائیوں پہ مرتے ہو کیوں پھر اتنا سا مرا کام نہیں کرتے ہو
اس کو سمجھاؤ کہ باتوں میں لگاکر لاؤ
جس طرح ہو مرے روٹھے کو منا کر لاؤ

کہنا اس سے یہ ہے کہ دن میں نہ سہی، رات ہی میں چھپ کر دو گھڑی کے لیے وہ یہاں آجائے۔ اس سلسلے میں اسے یہ یاد دلانا چاہیے کہ یہ کل کی بات ہے کہ اس میں خودنمائی نہیں تھی۔ ہم نے اسے ''معشوق'' بنایا۔ پھر وہ عیادت کا بہانہ کرکے دودن کے واسطے اپنے گھر گیا اور پھر نہ خود آیا نہ کوئی خبر بھیجی۔ حالات بتاتے ہیں کہ اسے بازار میں پھرنے کا شوق ہوگیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ افلاس نے اسے گھیر لیا۔ اس کی صورت بگڑگئی اور حالت یہ ہوگئی کہ

ع سر پہ چھپکا ہے، نہ کانوں میں ہیں بالی پتے

ایسے میں وہ خیال کرے کہ یہاں اس کے کیسے کیسے عیش تھے ؎

جب تلک تم تھے یہاں، عیش کیا کرتے تھے قصرِ عالی میں بسر صبح ومسا کرتے تھے

اس سے یہ بھی کہا جائے کہ ؎

ہم کو دیکھو کہ وہی آج بھی الفت کا ہے حال　　بیوفائی کا تمھاری نہ کیا ہم نے خیال

اب اسے خود سمجھنا چاہیے کہ وہ خود اپنے لیے کیا کر رہا ہے ؎

روٹھ جانے سے، نہ آنے سے کہو کیا حاصل

اس طرح سمجھانے سے اگر وہ انصاف پر آ جائے تو بہتر ہے ورنہ خیال رہے کہ ؎

نہ منے گا اگر اب، پھر نہ مناؤں گا تجھے

تم کو اگر اپنے حُسن پر غرور ہے تو سمجھ لو کہ ؎

زعم باطل ہے سزاوار نہیں ہے یہ غرور　　تم سے ہیں کتنے حَسیں رونقِ ایوانِ حضور

خاص معشوقہ جو ہے رشک پری غیرتِ حور　　تم سے بہتر ہے کہیں، تم ہو اگر نار، وہ نور

غیرتِ بدر جبیں، ماہ کا پارا چہرہ

اس کے تلوے کو بھی پہنچے نہ تمھارا چہرہ

اس کے بعد اُس ''بتِ خودسر'' اور اس ''خاص معشوقہ'' کا موازنہ کیا ہے، اور پھر یہ بیان کرتے ہیں کہ ؎

یوں سنا ہے کہ جب اُس بت نے سنی یہ گفتار　　کھپ گیا دل میں مگر رشک سے جل کر ناچار

یوں کہا، خیر مبارک ہو انھیں وہ دلدار　　ہم سے بے فائدہ جھگڑا ہے، عبث ہے تکرار

جان پر کھیلے ہیں، ڈرتے نہیں اب موت سے ہم

سمجھ لیتے ہیں خدا چاہے تو اُس سوت سے ہم

اس کے بعد اس کی بیقراری اور پریشانی کا بیان کیا ہے۔

''پیغام رساں'' نے واپس آ کر بہ مشکل ساری کیفیت بیان کی جسے سن کر

ع　کچھ تسلی ہوئی اور کچھ ہوئی وحشت مجھ کو

صبح ہوئی تو خواصوں نے گھبرا کر خبر دی کہ وہ ''بتِ خودسر'' آ گیا ہے۔ جب وہ آیا تو ؎

میں نے پوچھا کہو سودے کا ہے کیا جوش و خروش　　بولے کیا کہتے ہو سودائی ہو میری پاپوش

شکر کرنے، نہ شکایت کے لیے آئے ہیں　　کربلا جاتے ہیں، رخصت کے لیے آئے ہیں

پھر آپس میں گلے شکوے شروع ہوئے۔اسی سلسلے میں اس بُت نے کہا ؂

بھاڑ میں جائے یہ چاہت، اجی تو بہ صاحب　　میں نہیں چاہتی دولت، اجی تو بہ صاحب

مصرع ثانی سے یہ بات پوری قطعیت کے ساتھ ظاہر ہے کہ وہ ''بت خودسر'' نہ کوئی مرد تھا اور نہ امرد تھا۔ باوجودیکہ شروع سے اس کے لیے تذکیر کے صیغوں کا استعمال کیا گیا ہے اس کے جنس اناث سے متعلق ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔اس مقام پر یہ کہنا واجب ہے کہ اردو شاعری کو من حیث المجموع امرد پرستی کے لیے مطعون کرنے والے کم علمی اور کج فہمی کے ساتھ ساتھ اپنی طبیعت کی خرابی کا بھی اظہار کرتے رہتے ہیں۔

عاشق اور معشوق کے مابین کچھ دیر تک سوال و جواب اور ردّ وقدح کا سلسلہ جاری رہا۔آخر دونوں کے درمیان صلح صفائی ہوگئی اور ؂

شکر، صد شکر کہ اس قصے کا انجام ہوا　　دلِ الفت زدہ لذت چشِ آرام ہوا

اس وا سوخت کا آخری بند یہ ہے ؂

ناظم اب صحبتِ جام دے دینا ہے مجھے　　وصلتِ غیرتِ بلقیس مہیا ہے مجھے
غمِ امروز ، نہ اندیشۂ فردا ہے مجھے　　نہ جفائے فلکِ سفلہ کا کھٹکا ہے مجھے
واعظ آگے مرے کچھ بات بنائے کیا دخل
محتسب گھر میں مرے بےخبر آئے کیا دخل

اس واسوخت میں بھی واقعات کی نوعیت اور ترتیب و تسلسل میں صداقت اور حقیقت کا عنصر نمایاں ہے۔

واسوخت جیسا کہ ظاہر ہے واردات عشقیہ پر مبنی اور مشتمل ہوتا ہے۔نواب ناظم نے اس صورت حال کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ان کے دیوان میں ایک اور واسوخت ہے جس کا ابتدائی بند یہ ہے ؂

عشق سا کوئی زمانے میں دل آزار نہیں　　یہ وہ ظالم ہے ترحم جسے زنہار نہیں
کس گلے پر یہ دَمِ خنجرِ خونخوار نہیں　　خونفشانی میں کہیں بند یہ تلوار نہیں
ڈھیر لاشوں کے لگائے سرِ میداں کیا کیا
بے گناہوں سے بھرے گنجِ شہیداں کیا کیا

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ واسوخت عشق کے ایک خاص پہلو یعنی دل آزاری کے واقعہ سے متعلق ہے۔ اس میں کل 71 بند ہیں۔ شروع کے کئی بند اس حقیقت کے اثبات میں ہیں کہ

ع عشق کیا شے ہے؟ فقط ذلت و رسوائی ہے

شاعر کا کہنا ہے کہ شروع زمانے میں جب کوچۂ عشق میں اس کا گذر نہیں ہوا تھا بڑے عیش سے بسر ہو رہی تھی، اور ؎

رات دن تذکرۂ شعر و سخن رہتا تھا　　صدفِ گوہر خوش آب دہن رہتا تھا
ہمزباں اپنا ہر اک کاملِ فن رہتا تھا　　جلسہ گلہائے مضامیں سے چمن رہتا تھا
طرح نو جب کوئی ایجاد کیا کرتے تھے
آنکھوں سے اہلِ نظر صاد کیا کرتے تھے

فلکِ شعبدہ پرداز کو یہ طور پسند نہ آسکا اس لیے اس نے حالات کو پلٹا دیا۔ صورت اس کی یہ ہوئی کہ

ع ایک محبوبِ قمر وش پہ دل آیا فی الفور

اسی دل کے آجانے کے سانحہ کی تفصیل اس واسوخت میں سنائی گئی ہے۔ ہوا یہ کہ ایک دن شاعر اپنے محل کے کسی کمرے میں تھا کہ ایک پردہ نشین خاتون نے حاضر ہو کر دولت و اقبال کی ترقی کے لیے دعا کے بعد عرض کیا کہ ایک حسین نے جس کا زمانے میں کہیں جواب نہیں ہے، آپ کے درد آمیز اشعار جب سے سُنے ہیں آپ کے عشق میں مبتلا ہے اور اب ؎

لائی ہوں خدمتِ عالی میں مَیں اس کا پیغام　　کہ بغیر آپ کے اک دم نہیں اُس کو آرام

اس نے یہ بیان کر کے رحم کی درخواست کی۔ نتیجہ کے طور پر

؎ بر سرِ رحم ہوئی خاطرِ فرخندہ صفات

اور حکم دیا کہ اُسے فوراً حاضر کیا جائے کیونکہ اپنے مشتاق کے ہم بھی مشتاق ہیں۔ محل میں اس کے استقبال کے لیے تیاریوں کا حکم دیا۔ غرض وہ ''نوگلِ خنداں'' ہمارے گھر میں آیا اور پھر

رونقِ بزم جو وہ آئینہ تمثال ہوا　　دلِ مشتاق کا حیرت سے عجب حال ہوا

چند روز میں ہمارا حال یہ ہوا کہ سارے زمانے کو بھول کر ہم اسی کے ہو رہے۔

شروع شروع میں تو اُس حور کی وضع سادہ سادہ تھی۔ پھر یہاں کے نئے زیوروں اور نئی پوشاکوں سے اس پر نیا جوبن آ گیا۔ پھر تو حال یہ ہوا کہ وہ ؎

گرمیاں سیکھ گیا، شوخ ہوا ناز آیا  ۔  نکلنے لگی ہر بات میں، انداز آیا

اس کی طبیعت کا رنگ بھی بدل گیا۔ عاشق نے کچھ مدت تک ضبط سے کام لیا، آخر مجبور ہو کر اس کے دل نے طے کیا کہ ؎  مُنہ کی کھائے وہ، دیا چاہیے جھٹکا کوئی

عاشق کے پاس مال و دولت اور منصب و جاگیر بھی کچھ تھا۔ اس کے لیے ہر قسم کی تدبیر ممکن تھی۔ بہت سوچ کر اس نے یہ کیا کہ ؎  ڈھونڈھ کر ایک نکالا صنم گرما گرم

اس نئے صنم کے ساتھ کچھ ہی مدت میں راہ و رسم زیادہ ہو گئی اور نوبت یہ ہوئی کہ ؎

چڑھ گیا اپنی نظر میں وہ قمر وَش ایسا  دل سے اُترے، نہ خیال اور حسینوں کا رہا

اس نہج پر شاعر نے اپنی طبیعت اور اُس کے عمل کا بیان ذیل کے بند میں بڑی خوبی سے کیا ہے ؎

اپنی خاطر کو ازل سے جو اطاعت ہے پسند  خود پسندی نہ ہو جس میں وہ طبیعت ہے پسند
ہو تصنع سے بَری جو، وہ محبت ہے پسند  خار جس میں نہ ہو، وہ گلشنِ صحبت ہے پسند
کی جگہ دل میں اطاعت سے وہ پیدا اُس نے
کر لیا اپنا ہمیں عاشق شیدا اُس نے

ایک روز اپنے پُرانے محبوب کا خیال آیا۔ اُس کو بُلانے کے لیے آدمی بھیج کر اُسے طلب کی۔ اس نے تعمیل کی۔ وہ آیا لیکن اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ آتے ہی اُس نے کئی طنز آمیز باتیں کہیں ؎

کہو کیوں یاد کیا، ہم سے ہے کیا آپ کو کام  جس سے مطلب نہیں، اُس کا کوئی لیتا نہیں نام

اُس بدخو کی طرف سے دل پہلے ہی پھیکا ہو رہا تھا۔ اب اس ترش روی نے اور بھی آزردہ کر دیا۔ ضبط سے کام لیا۔ پھر بھی اتنا کہا کہ جو شخص بے حیا ہو اس سے الفت کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ خیر ؎

رہو خاموش کہ اب بات کے قابل نہیں تم  وضعداروں سے ملاقات کے قابل نہیں تم

اس طور پر تنبیہ کے بعد یہ حقیقت بھی اُس پر ظاہر کردی کہ اب وہ دن گزر گئے اور اب تم سے مجھے کچھ کام نہیں ہے بلکہ ؎

اب تو وہ رشکِ قمر ہالۂ آغوش میں ہے    دھوم جس کی حسینانِ زری پوش میں ہے

پہلے تو اس کو اس بات کا یقین نہیں آیا لیکن جب میں نے بتایا کہ وہ پردہ نشیں، رشکِ قمر اسی جگہ موجود ہے اور ؎

سامنا جب کہ ہوا، دور ہوا دل شک سے    رہ گیا دیکھتے ہی ہو کے کلیجہ دھک سے

غصّے کے سارے انداز بھول گیا۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بڑے بول کا سر نیچا ہو گیا اور پھر اُس نے کہا ؎

اب ترحّم کی نظر کیجیے، تقصیر معاف    پاؤں پر رکھتے ہیں سر، کیجیے تقصیر معاف

اس نے ہر چند قسمیں کھائیں لیکن کوئی بات دل کو نہ لگی اور آخر اپنا سا منہ لے کر اُسے جانا پڑا۔ شاعر نے خوب کہا ہے کہ ؎

عمل انساں کا جو ہوتا ہے وہ پیش آتا ہے    جیسا کرتا ہے کوئی، ویسی سزا پاتا ہے

اُس کے چلے جانے کے بعد دوسرے فرمانبردار قمر وش محبوب کے ساتھ بخوبی بسر ہونے لگی۔ نواب ناظم کا بھی ایک واسوخت ہے جس میں انھوں نے ایک محبوب کو اس کی بدخوئی کی سزا کے طور پر دور کر دینے کا ذکر کیا ہے۔ اس واسوخت کا آخری بند یہ ہے ؎

طولِ واسوخت ہوا، ختم سخن کر ناظم    ناظم اب کوئی نہیں تیری برابر ناظم
بندشیں خوب، ہر اک بند ہے بہتر ناظم    ہے یقیں، دادِ سخن دیں گے سخنور ناظم
واقفِ لطفِ سخن کیا کوئی ناداں ہوگا
صاحبِ فہم جو ہوگا، وہ ثنا خواں ہوگا

اس بند سے ظاہر ہے کہ اس شہر رامپور میں واسوخت لکھنے والے اور لوگ بھی تھے لیکن نواب یوسف علی خاں ناظم ان میں سے کسی کو بھی اپنے برابر کا نہیں سمجھتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ نواب ناظم کی اتباع میں رامپور میں بعض شاعروں نے واسوخت لکھے تھے لیکن روہیل کھنڈ کے خطے میں دوسرے مراکز پر اس صنفِ شاعری کی طرف بہ گمانِ غالب توجہ نہیں کی گئی تھی۔

## 2- بیتاب- محمد عباس علی خاں

رامپور کے مقامی شاعروں میں صاحبزادہ محمد عباس علی خاں بیتاب کا تذکور گذشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے واسوخت بھی لکھے تھے اور ان کے واسوخت قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں واسوخت کے کچھ بند نمونے کے طور پر نقل کیے ہیں۔ ایک بند یہ ہے ؂

تھا یہی عہد کہ اب دل نہ لگائیں گے کبھی     خانۂ یار ہو جنت، تو نہ جائیں گے کبھی
گر پری در پہ کھڑی ہو، نہ بلائیں گے کبھی     حور آئے تو نہ پہلو میں بٹھائیں گے کبھی
کوئے دلدار ہو گلشن تو نہ پھیرا کیجے
درِ جاناں ہو جو کعبہ تو نہ سجدا کیجے

بیتاب کے ایک دوسرے واسوخت کا ایک بند یہ ہے ؂

اے فلک اب عیش و عشرت کے وہ ساماں کیا ہوئے     دلبری وشوخی و اندازِ خوباں کیا ہوئے
ہیں کہاں وہ لعلِ لب، وہ روئے خنداں کیا ہوئے     کیا ہوئے وہ ناز، وہ اندازِ جاناں کیا ہوئے
شادمانی کی ہے جا، ماتمِ دلِ ناشاد کا
قہقہوں کے بدلے غُل ہے نالہ وفریاد کا

واقعات ومعاملات کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں کو محسوس کرکے ان کو موثر انداز سے نظم کر دینے کی لیاقتوں کے ساتھ ساتھ زبان کی سلاست اور روانی اور بندشِ الفاظ کی خوبیوں کا ان دونوں بندوں سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

# ز ۔ مخمس

خمسہ کرنے کے لیے غزل کے ہر شعر پر تین تین مصرعے لگائے جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے اپنی یا کسی ایسے شاعر کی غزل کا انتخاب کیا جاتا ہے جس سے خمسہ کرنے والے کو عقیدت یا محبت ہوتی ہے۔ اس کے لیے مشاقی اور قدرتِ کلام کے ساتھ ساتھ فکر و خیال کی تیزی بھی ضروری ہے۔

1- ناظم- نواب یوسف علی خاں

نواب یوسف علی خاں ناظم کے مطبوعہ دیوان میں کُل 6 خمسے ہیں، ان میں سے ایک فارسی کی ایک غزل پر ہے۔ باقی پانچ خود ناظم کی اردو کی غزلوں پر ہیں۔ پہلے خمسہ کا پہلا اور آخری بند یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

اُف زباں پر، لب پہ ہر دم آہِ آتش بار ہے درد پنہاں کی علامت، زردیٔ رخسار ہے
صورتِ نرگس سراپا جسمِ نازک زار ہے رنگ فق، منہ خشک، گویا عشق کا آزار ہے
دوست میرا کیا نصیب دشمناں بیمار ہے

ہو جو خود رشکِ پری، ہو جائے وہ یوں مبتلا جس پہ ہو لاکھوں حسیں قرباں، وہ یوں ہو فدا
اک طلسمِ حیرت افزا ہے، کہوں کیا ماجرا حُسن و عشق اک جا ہوئے ہیں جمع، ناظم دیکھنا
شان ہے اللہ کی کیا نور ہے کیا نار ہے

ایک دوسرے خمسے کے بھی دو (یعنی پہلا اور آخری) بند درج ذیل ہیں ۔

بُرائی کوئی ہے تو آپ کو ہے بدی کسی کی نہ تو کیا کر
خلافِ تہذیب ہیں یہ باتیں، نہ پیٹھ پیچھے بُرا کہا کر
کسی کو اک دن ہے مُنہ دکھانا، نہ اس قدر ہجو بر ملا کر
سنبھال واعظ زبان اپنی خدا سے ڈر اک ذرا حیا کر
بتوں کی غیبت خدا کے گھر میں خدا خدا کر، خدا خدا کر

کہاں وہ انداز و نازِ جاناں، کہاں وہ چشم و نگاہِ دلبر
کہاں وہ اب عطر بیز چوٹی، کہاں وہ اب گیسوِ معنبر
خیالِ عیشِ وصال اُس کا، کمال رکھتا ہے دل کو مضطر
جو یاد آتا ہے مجھ کو ناظم، تو لوٹ جاتا ہے سانپ دل پر
بلائیں لینے کو منع کرنا، وہ اُن کا آنکھیں جھکا جھکا کر

شاعر نے مصرعے اس طرح لگائے ہیں کہ پہلے سے پانچویں تک مضمون مسلسل اور مربوط ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان لگائے ہوئے تینوں مصرعوں سے اصل شعر (یعنی بند کے چوتھے پانچویں مصرعے) کے مفہوم کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔

رامپور میں نواب یوسف علی خاں حکمراں ہی نہیں تھے، اس علاقے کے شاعروں کے لیے راہنما بھی تھے چنانچہ اس مرکز کے اکثر نوشتوں نے انھیں کے طرز پر خمسے کہے ہیں۔ اس مقام پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ روہیل کھنڈ کے خطے میں دوسرے مراکز کے شاعروں نے بھی ''خمسہ ہائے خوب'' کہے ہیں۔

## 2- داغ- نواب مرزا خاں

نواب مرزا خاں داغ دہلی کے رہنے والے تھے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم اپنے قیامِ دہلی کے زمانے میں ہی ان پر شفقت فرماتے تھے۔ پھر یہ دہلی سے رامپور آ کر نواب کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ امیر مینائی نے لکھا ہے:

''داغ نواب مرزا خاں خلف نواب شمس الدین خاں مغفور، چوالیس برس کی عمر،

صاحب دیوان شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی کے شاگردوں میں فرد کامل، خوش
مذاق ہونے میں یکتائی حاصل۔ سرکار فیض آثار کے ملازم ومعتمد خاص، اصطبل
وفراش خانے کی داروغگی سے اختصاص۔ وطن اصلی ان کا دہلی ہے مگر مدت سے
مع اہل وعیال یہیں ہیں۔ سرکار دولتمدار کے ہمرکاب زیارت حرمین شریفین
زادہما اللہ شرفا کو بھی گئے۔ اس شرف سے بھی بہ تصدق بندگانِ عالی مشرف
ہوئے۔'' 1

داغ کو نواب ناظم سے جو تعلقِ خاطر تھا اس کا اظہار اس طرح بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے نواب کی ایک سے زیادہ غزلوں کی تخمیس کی ہے۔ ایک مخمس کے دو بند یہ ہیں:

''مخمس برغزل حضرت فردوس مکاں نواب محمد یوسف علی خان صاحب بہادر طاب ثراہ''

کہتے تھے وہ بشر کو جو دل دے بشر غلط　　سودائی ہو کسی کا کوئی سربسر غلط
شامت جو آئی اُن کا بیاں جان کر غلط　　میں نے کہا کہ دعویٰ الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

جو عرض کی تھی داغ نے آخر وہی ہوا　　کوئی خفا ہو آپ کو ہے چھیڑ کا مزا
دیکھا نہ تم نے آج وہ بدخو برس پڑا　　یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کیا
کیوں یہ کہا کہ دعویِ الفت مگر غلط

ایک اور مخمس کا بند یہ ہے:

'' ایضاً مخمس برشعر حضرتِ ممدوح ''

جوششِ عشقِ نہانی ابھی دیکھی کیا ہے　　شدّتِ اشک فشانی ابھی دیکھی کیا ہے
ہے تمھیں سیر دکھانی، ابھی دیکھی کیا ہے　　میرے اشکوں کی روانی ابھی دیکھی کیا ہے
گفتگو نوح کے طوفاں میں ہے، دریا کیا ہے

اس مقام پہ یہ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنی غزل کے شعروں کے مطالب اور محرکات سے شاعر خود بخوبی واقف ہوتا ہے اس لیے اپنے شعروں پر خود مناسب اور مربوط مصرعے لگا لینا کسی قدر آسان ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے شخص کے شعروں کی تخمیس مشکل ہوتی ہے

کیونکہ اس کے لیے اصل شاعر کے خیالات اور اُس کی ذہنی کیفیات اور عوامل کا تصوّر باندھنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی اُس کی زبان کی خصوصیات اور بیان کے طرز ومزاج پر بھی حاوی ہونا ضروری ہوتا ہے کہ اس کے بغیر اصل مصرعوں اور ان پر لگائے جانے والے مصرعوں میں موافقت اور ہم آہنگی کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔ داغ کے مخمسوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے ایسی خوبی کے ساتھ مصرعے لگا دیے ہیں کہ یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ مصرعے دوسرے شاعر کے ہیں۔ بلاشبہ داغ بڑے قادرالکلام استاد تھے اور اپنی استادی کو انھوں نے خمسے کہہ کر بھی منوالیا تھا۔ داغ اور ان کے باکمال تلامذہ کا ایک معمول یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بڑے معرکے کے مشاعروں میں وہ غزل کے ساتھ خمسے بھی پڑھتے تھے۔

### 3- مذاق- مولوی دلدارعلی

مولوی دلدارعلی مذاق بدایونی شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد اور نواب مرزا خاں داغ کے استاد بھائی تھے۔ خمسے کہنے میں یہ بھی طاق تھے۔ رضا لائبریری رامپور میں ان کے مخمسوں کا بھی ایک مجموعہ محفوظ ہے جس کی کیفیت اس طرح ہے :

مخمسات مذاق — مولوی دلدارعلی بدایونی مذاق تخلص

سال کتابت — 1265ھ (=1849)

کل 6 ورق

ظاہر ہے کہ اس چھ ورقی قلمی نسخے کے علاوہ انھوں نے اور بھی خمسے وغیرہ کہے تھے۔

### 4- رسا- انبا پرشاد

اُنبا پرشاد رسا داستان گو کی حیثیت سے بہت معروف تھے لیکن وہ اپنے زمانے میں خمسے کہنے کے لیے بھی ممتاز تھے۔ وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ داستانوں میں ''غزلہائے خوب اور خمسہ ہائے مرغوب'' کو عملاً ایک لازمی جزو کی حیثیت حاصل تھی کہ ان کے بغیر داستان بے رنگ و بے کیف سمجھی جاتی تھی۔ امیر مینائی نے مختصراً ان کا ذکر اس طرح کیا ہے :

> ''رسا منشی انبا پرشاد ابن لالا چندی پرشاد، وطن ان کا لکھنو ہے مگر سالہائے دراز سے اسی دار الریاست میں رہتے ہیں۔ عہد جنت آرامگاہ طاب ثراہ

سے ملازم سرکار دولت مدار ہیں۔ داستان گوئی میں مشہور روزگار ہیں۔ پچاس
برس کی عمر ہے کبھی شعر کہنے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ میرزا محمد تقی خاں ہوس کو اپنا
استاد بتاتے ہیں۔"[2]

ان کے دو مخمسوں کے بند یہاں مثال کے طور پر درج کیے جاتے ہیں :

"مخمس بر شعر مرزا محمد تقی خاں ہوس"

نہیں ہوئے وہ کبھی کسی کے، وہ جانیں کیا رسم وراہِ الفت
نہ دلبری کی ہے بات اُن میں، نہ پاسِ یاری، نہ کچھ مروّت
چلن زمانے سے ہے نرالا، نئی طرح کی ہے اُن میں وحشت
مجھے جو راہی عدم کا پایا، چلے خفا ہو کے وقت رخصت
نہ مُڑ کے دیکھا، نہ بات پوچھی، نہ کی تسلّی قریب آ کر

"مخمس بر اشعار میر دوست علی خلیل"

نہ اُن سے نسبت ہے مہر کو کچھ، نہ اُن سے لگا ہے کچھ ثمر کو
شرابِ عشق و محبت ان کی، ہے زہر قاتل دل و جگر کو
جدھر یہ رہتے ہیں دشمنِ جاں، نہ جائے انساں کبھی اُدھر کو
بلا ہے سایہ بھی ان بتوں کا، خدا بچائے ہر اک بشر کو
پری کو دیوانہ چٹکیوں میں بناتے ہیں یہ اُڑا اُڑا کر

رسا کے کہنے کو مان غافل، طلسمِ فانی ہے نقشِ ہستی
جسے بلندی سمجھتے ہیں یہاں، جو غور کر تو ہے عین پستی
گئی جوانی، بڑھاپا آیا، نہیں ہے اب وقتِ جوشِ مستی
بُتانِ ہندوستاں میں تو نے، بہت سی کی سیر بُت پرستی
خلیل کعبے میں چل کے یہاں سے بس اب کوئی دن خدا خدا کر

ان مخمسوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں کسی داستان کا جزو بن جانے کی پوری لیاقت
موجود ہے۔

داغ اور رسا وغیرہ باہر سے آئے ہوئے باکمالوں نے اپنے اپنے انداز سے خمسے کہے تھے۔ مقامی شاعروں نے جن میں بہت سے نومشق بھی تھے، اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر ان کے طرز میں خمسے لکھے تھے۔ رفتہ رفتہ رامپور میں ہر قسم کے خمسوں کا چلن ہو گیا اور بعض اچھے خمسے بھی وجود میں آ گئے۔

# ح - تاریخ گوئی

1- ناظم- نواب یوسف علی خاں

مسند نشینی سے پہلے نواب محمد سعید خان بہادر بنارس، لکھنو اور بدایوں میں رہے تھے۔ وہ زمانہ تھا جب شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش اور ان کے تلامذہ کی سخن گوئی کی ہر طرف دھوم مچی ہوئی تھی۔ ناسخ اور ان کے بیشتر شاگرد مثلاً میر رشک، نواب مہر اور علی ضامن شوق وغیرہ بات بات پر تاریخ کہتے تھے۔ نواب محمد سعید خاں خود تو شاعر نہ تھے لیکن ان کے فرزند نواب یوسف علی خاں ناظم کے باصلاحیت اور قادر الکلام شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ شروع زمانے میں ہی انھوں نے تاریخ گوئی کی طرف توجہ کی تھی اور اچھی تاریخیں کہنے لگے تھے۔ ان کے مطبوعہ دیوان میں ایک قطعہ تاریخ یہ ہے

تاریخِ باغ

واہ کیا پُر فضا بنا یہ باغ　　باغِ رضواں ہے جس کے رشک سے داغ

غنچۂ فکر نے چٹک کے کہا　　نام تاریخی اس کا نادر باغ

1258ھ

مختصر، برمحل اور مکمل مادّہ تاریخ ہے اور باغ کے لیے بہت خوب نام بھی ہے۔ اس قطعہ میں

تیسرا مصرع بھی شاعر کی خوبیِ فکر کا عمدہ مظہر ہے۔

ناظم نے تعمیہ اور تخرجہ سے بھی بعض تاریخوں میں کام لیا ہے، مثال کے طور پر

'' قطعہ تاریخ یافتن ملکِ جدید ''

جب گورنمنٹ سے حاصل ہوا ملک مجھ کو بہ صیغۂ انعام

ناظم از روئے ہمّت عالی سالِ بخشش ہے بخشش حکام

1276=1271 + 5 ھ

نواب یوسف علی خاں ناظم نے دہلی میں قیام کے زمانے میں حکیم محمد مومن خاں مومن کی شاگردی کی تھی، جو بیساختہ تاریخیں کہنے کے لیے مشہور تھے۔ اُن کے فیض نے ناظم کی اس فن سے متعلق صلاحیتوں کو بخوبی جلا دی تھی اور نواب بھی بڑی خوبی سے ہر قسم کی تاریخیں کہہ لیتے تھے۔

2- حُسین- میر حسین علی

امیر مینائی کے تذکرے میں ان کا احوال اس طرح مندرج ہے :

''حُسین میر حسین علی ابن میر کرم علی وطن مرادآباد ہے۔ جناب نواب محمد سعید خاں صاحب کے عہد سے ملازمِ سرکارِ فیض آثار رہے۔ محکمۂ عالیۂ صدر میں نائب سررشتہ دار رہے۔ 70 برس کی عمر پائی۔ ربیع الاول کی چوتھی تاریخ 1289ھ (1872) میں رحلت کی۔ طبیعت موزوں تھی۔ تاریخ اکثر کہتے تھے۔ اپنے والد سے تلمذ تھا۔''1

ان کو بڑے موقع کے مادۂ تاریخ سوجھتے تھے اور اسے قدرت کا عطیہ سمجھنا چاہیے۔ نمونہ کے طور پر دو تاریخیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

'' قطعہ تاریخ درتقریب جشن حضرت فردوس مکاں''

چو نواب زماں جمشیدِ ثانی مرتب کرد جشنِ کامرانی

محباں از برائے سالِ تاریخ بدل گفتند جشنِ خسروانی

1280 ھ

''تاریخ درتقریب صحتِ بندگانِ حضور''

بہ طفیلِ رسولؐ ہر دوسرا    چوں شفاشد بحضرتِ والا
بہر تاریخ داعیِ دولت    گفت صحت عطا نمود خدا

1283ھ

دونوں مادّے نہایت برمحل ہیں۔ لطف یہ ہے کہ تعمیہ یا تخرجہ کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔

### 3- سَرْوَری- نواب محمد کاظم علی خاں

یہ تخلص ہے نواب یوسف علی خاں ناظم کے چھوٹے بھائی کا۔ بڑے بھائی کی صحبت اور سرپرستی میں رہ کر یہ بھی ہر قسم کی تاریخیں کہنے لگے تھے۔ امیر مینائی کے تذکرے میں ان کا مذکور اس طرح آیا ہے:

> ''سروری نواب محمد کاظم علی خاں صاحب بہادر خلفِ کوچک نواب محمد سعید خاں بہادر.....صفاتِ جلیلہ آپ کے ظاہر ہیں۔ نزدیک و دور سب با ہر ہیں...ساٹھ برس کی عمر شریف ہے۔ کبھی کبھی نظم کی طرف بھی توجہ فرماتے ہیں۔ دو مادۂ تاریخ اور ایک قطعہ فارسی نتیجۂ فکرِ عالی رونقِ تذکرہ کے واسطے لکھے جاتے ہیں۔''2

الف۔'' مادۂ تاریخ صحت جناب نواب محمد یوسف علی خاں صاحب بہادر فردوس مکاں طاب ثراہ از مرضِ سرطان ؎

بکن از ظہر جناب نواب    سرطاں دور وبیفزاے شفا

381    + 320 -    1220

حل اس تاریخ کا یہ ہے کہ اعدادِ حروف ''ظہر جناب نواب'' سے مجموع بارہ سوبیس ہوتے ہیں۔ اعداد لفظ ''سرطان'' کہ تین سو بیس ہیں ساقط کیے جائیں تو نو سو رہ جائیں گے۔ اس نو سو پر اعداد لفظ ''شفا'' کے کہ تین سو اکاسی ہیں بڑھائے جائیں تو پورے بارہ سو اکاسی ہجری ہوں گے''

ب ''مادۂ تاریخ تہنیت عید سعید بندگانِ حضورِ پُرنور دام ملکھم واقبالھم

ملفوظی و معنوی نوشتہ ام    ہشتاد و چہار و یکہزار و دو صد ''

1284ھ

ملفوظی اور معنوی تاریخوں کا اگرچہ لکھنؤ وغیرہ مراکز پر بہت چلن رہا ہے، کچھ شک نہیں کہ اس

کے لیے بڑی ذہانت اور مشاقی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ تاریخ گوئی میں جدتِ فکر، محنت اور دماغ سوزی نے اس کو فنِ معما کے قریب قریب تک پہنچا دیا ہے، اسی لیے بسا اوقات ان کے ''حل'' کو بھی قلمبند کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

اوپر جو تاریخیں نقل کی گئی ہیں، ان سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ سرؔوری نے تاریخ گوئی کے فن میں کمال حاصل کر لیا تھا۔

### 4- ذکی- شیخ مہدی علی

شیخ مہدی علی نام، شیخ کرامت علی کے بیٹے، مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ تاریخ گوئی کے لیے مشہور و ممتاز تھے۔ ان کے حالات لالا سری رام نے کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے:

> ''ان کے بزرگ شیخ زادگانِ لکھنؤ سے تھے مگر ان کا مولد و مسکن مراد آباد ہے۔ نواب محمد سعید خاں کے عہد میں برسوں وظیفہ خوار ریاست رہے۔ پھر غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد میں لکھنؤ چلے گئے تھوڑے دنوں کے لیے دہلی آئے۔ سہارنپور اور حیدر، باد دکن بھی گئے۔ پھر مراد آباد واپس آئے۔ دہلی سے لکھنؤ پہنچے اور 1265ھ (1849) میں واجد علی شاہ بادشاہ کی سرکار سے خطاب ''ملک الشعرا'' پایا۔ نواب یوسف علی خاں ناظم نے طلب کیا تو رامپور پہنچے۔ جب تک نواب زندہ رہے یہ وہیں مقیم رہے۔ ان کی وفات کے بعد انبالے گئے۔ وہاں دو برس رہ کر ماہ ذیقعدہ 1283ھ (1866) میں قضا کی۔ انتخابِ یادگار میں تاریخ وفات 1281ھ درج ہے مگر غلط ہے۔ مورخ بے بدل تھے۔ ایک رسالہ عروض و قوافی میں مسمیٰ بہ ''یادگیر'' 1265ھ میں مرتب کیا تھا۔ کلیاتِ ذکی منشی نولکشور نے اپنے مطبع سے شائع کیا تھا۔''3

سعادت خاں ناصر نے ان کو ''صاحبِ ارشاد، علمِ معما اور تاریخ میں استاد'' کہا ہے۔4 محسن نے لکھا ہے کہ ''تاریخ گوئی میں دستگاہ خوب رکھتے تھے''5 اور صابر کا کہنا ہے کہ ''مادۂ تاریخ بہم پہنچانے میں بے مثل و مانند تھے۔''6

### 5- عجمی- ہیرا لال

> ''عجمی ہیرا لال ولد لالہ چنی لال قوم کائستھ، مولانا محمد غیاث الدین صاحب عزت

مرحوم کے شاگرد، عربی اور فارسی، بھاکا اور سنسکرت سب زبانوں میں کامل تھے۔
حساب کے فن میں ید طولیٰ، تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ 65 برس کو پہنچ کر
1275ھ (59-1858) میں قضا کی۔"7

ان کا کہا ہوا ایک قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

آں کہ از جود و سخا مثلِ حباب　　کشتِ اُمید جہاں را داد آب
سالِ تاریخِ مکانش ہاتفے　　گفت دولت خانۂ عالی جناب

1263ھ

نہایت برمحل اور بہت خوب مادۂ تاریخ ہے۔ اس سے امیر مینائی کے مذکورہ بالا بیان کی بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے۔ شاعر نے اس مادۂ تاریخ کو سلیقے کے ساتھ نظم بھی کیا ہے۔

6- عدیل- میر عوض علی

اس جلد کے شروع میں میر عوض علی عدیل حسینی کا خوشنویس کی حیثیت سے ذکر کیا جا چکا ہے۔ لکھنؤ میں قیام کے زمانے میں نواب یوسف علی خان ناظم بہ عالم طفلی ان کے شاگرد رہ چکے تھے۔ عدیل اپنے زمانے کے کامیاب تاریخ گویوں میں سے تھے۔ نمونہ کے طور پر ایک قطعہ تاریخ درج کیا جاتا ہے۔

"قطعۂ تاریخ جشنِ کتخدائی بندگانِ حضور پُرنور دام مُلکھم وَ اقبالھم"

مبارک ہو کلبِ علی خان کا بیاہ　　جہاں جب تلک ہو یہ نوشاہ ہو
ہوئی ایسی تاریخ کی جستجو　　کہ مشہور ماہی سے تا ماہ ہو
عجب سالِ فرخ مِلا اے عدیل　　یہ نوشاہ یارب شہنشاہ ہو

1262

دعائیہ تاریخ ہے اور بہت برمحل ہے۔ اس میں تعمیہ تخرجہ کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔

7- فاخر- حکیم احمد خاں

خاندانی طبیب اور پُرانے شاعر تھے۔ ان کا احوال امیر مینائی کے تذکرے میں اس طور پر مندرج ہے :

"فاخر حکیم احمد خاں ولد حکیم محمد ناصر خاں، طبیب کامل تھے۔ نظم ونثر کی طرف مائل تھے۔ قدیم سے سرکار میں سرفراز رہے۔ فنِ طب میں دو کتابیں کہ ایک کا نام طب سعیدی اور دوسری کا نوطرز حکمت ہے، ان سے یادگار ہیں......... مولوی قدرت اللہ شوق کے شاگرد تھے۔ 90 برس کی عمر ہوئی۔ جمعے کے دن صفر کی 14 ویں تاریخ 1290ھ (1873) میں رحلت کی۔"8

حافظ احمد علی خاں شوق نے ان کے حالات میں خاصا اضافہ کیا ہے۔ صرف ضروری باتیں یہاں پر نقل کی جاتی ہیں :

"نواب سید احمد علی خان بہادر کے معالج تھے۔ تاریخ گوئی میں ملکہ تھا۔ جنگ وکشکول فارسی، 138 صفحہ کی قلمی کتاب کتب خانہ ریاست میں موجود ہے۔ بچوں کے لیے مختلف 'پند ونصائح' تواریخ وفات اور اردو فارسی کی ضرب المثلیں جمع کی ہیں۔ نواب محمد سعید خاں کے نام پر دیباچہ لکھا ہے........ "9

حکیم فاخر صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ، بخطِ مولف رامپور کے کتب خانے میں محفوظ ہے، جو دوسو چونتیس اوراق پر محیط ہے۔ آخر زمانے میں انھوں نے 1287ھ (1870) میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔ اس مثنوی کا بھی ایک قلمی نسخہ رامپور میں موجود ہے۔

حکیم احمد خاں فاخر کا وہ رسالہ جو "تواریخ وفات" پر مشتمل ہے قطعات تاریخ کے اوّلین مجموعوں میں شمار کیا جانا چاہیے اور اس اعتبار سے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ حکیم فاخر کی کہی ہوئی بعض تاریخیں نمونہ کے طور پر درج کی جاتی ہیں:

نواب محمد سعید خاں کے غسلِ صحت کی تاریخ — <u>نواب بہادر یافتہ صحت</u>

1265ھ

تاریخِ تیاری خاص بازار — <u>خاص بازار دلکشا آمد</u>

1257ھ

تاریخ تیاری عَلَم — <u>مظفر لوا</u>

1257ھ

| | |
|---|---|
| تاریخ پائیں باغ | <u>نور باغ</u> |
| | 1259ھ |
| تاریخ حوض | <u>فاغسلوا وجوھکم</u> |
| | 1258ھ |
| تاریخ خلعتِ ولی عہدی جناب نواب سید | <u>خلعت سلطانی</u> |
| یوسف علی خان صاحب بہادر | 1260ھ |

یہ سبھی تاریخیں نہایت برمحل، مناسب اور بے ساختہ ہیں۔ ان سے تاریخ گو کی مشاقی، تیزیِ طبع اور خوش فکری کا پتہ چلتا ہے۔

8- انوار و تسلیم- منشی انوار حسین

رامپور کے اُس مخصوص علمی اور ادبی ماحول میں بعض نومشق، نوجوان بھی فنِ تاریخ گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ ان میں منشی انوار حسین سہوانی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ شروع میں اپنے نام کی مناسبت سے انھوں نے اپنا تخلص انوار مقرر کیا تھا، پھر کچھ مدت کے بعد انھوں نے اپنے واسطے تخلص تسلیم پسند کیا اور اسی نئے تخلص سے انھوں نے شہرت پائی تھی۔

تسلیم نے بہت جلد تاریخیں کہنے کے لیے نام پیدا کر لیا تھا اور اکثر معاصرین کی خاطر سے وہ تاریخیں کہنے لگے تھے چنانچہ احمد حسین سحر کے تذکروں کی تسلیم کی کہی ہوئی بعض تاریخیں اپنے موقع پر درج کی جائیں گی۔ ایک مدت کے بعد فنِ تاریخ گوئی سے متعلق تسلیم نے چند کتابیں لکھ ڈالی تھیں جن کی اہمیت اور افادیت آج بھی مسلم ہے۔ انوار حسین تسلیم کی تاریخ گوئی کے بارے میں لالا سری رام نے لکھا ہے :

> ''تسلیم انوار حسین سہوانی خلف منشی احتشام الدین...... تاریخ گوئی میں ایسا ملکہ رکھتے تھے کہ ان کی مثال کم نظر آتی ہے چنانچہ انواع واقسام کے صنائع وبدائع سے آپ کی تاریخیں مملو ہوتی ہیں۔''13

# ط - کبت وغیرہ

اردو شاعری کے آغاز کا خیال کریں تو معلوم ہوگا کہ شروع شروع میں شعر گوئی کے لیے ہندوستان کی مختلف دراوڑ اور بعض آریائی زبانوں کی شاعری کے اصول وضوابط کے ساتھ ساتھ شعری ہیئتیں بھی برتی جارہی تھیں یعنی صوفیائے کرام اور بزرگانِ مذہب یہیں کے اوزان وبحور اور یہیں کی شعری اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہتے تھے۔ زبانِ ہندوی میں جو قدیم ترین کلام منظوم دستیاب ہو سکا ہے وہ حضرت فریدالدین گنج شکر سے منسوب ہے اور وہ یہ ہے ؎

راوَل دیوَل جِتے نہ چاہیے    پھاٹا پہنا، روکھا کھایئے
ہم دُرویشنہہ ای ہے ریت    پانی لوڑین اور میت

اور ؎

سائیں سیوَت گل گئے، ماس نہ رہیا دیہہ
تب لگ سائیں سیویاں، جب لگ ہوں سوں کیہہ

پہلے دو شعر ''چوپائی'' اور آخرالذکر ایک ''دوہا'' ہے۔ صوفیائے کرام کی شاعری کے لیے یہی دونوں یعنی چوپائی اور دوہے مقبول ترین سانچے قرار پائے چنانچہ فیروز تغلق کے عہد میں ملا داؤد نے اپنی ضخیم منظوم تصنیف ''چندائن'' انھیں اوزان وبحور میں مکمل کی تھی۔ شاعر ملا داؤد نے اس کے

سالِ تصنیف کا بیان اس طرح کیا ہے ؎

برس سات سَے ہوئے اٹھاسی   تبھیا یہ کہی سَرُ سے بھاسی

زبانِ ہندوی (=قدیم اردو) میں دستیاب یہی پہلی مکمل، مربوط اور باضابطہ کتاب ہے۔

ایک مدت کے بعد حضرت عبدالقدوس رودولوی (مدفن گنگوہ) نے ''ریختہ'' میں یہ ایک شعر کہا تھا ؎

صدق رہبر، صبر توشہ، دشت منزل، دل رفیق   سٹ نگری، دھرم راجا، جوگ مارگ رزملا

بہ گمانِ غالب یہی پہلا دستیاب شعر ہے جو فارسی کی کسی بحر میں موزوں کیا گیا ہے اور جس میں عربی اور فارسی کے لفظوں کا نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ صَرف کیا گیا ہے۔

کم وبیش اسی زمانے میں احمد نگر کے ایک شاعر اشرف بیابانی نے واقعاتِ کربلا سے متعلق ایک مثنوی ''نوسرہار'' کے نام سے لکھی جس کا سالِ تکمیل 909ھ (04-1503) ہے۔ بقولِ شاعر ؎

نوسو ہووے اگلے نو   یہ دُکھ لکھیا اشرف تو

اُس زمانے کی روایت کے مطابق یہ مثنوی بھی اصلاً ہندستانی اوزان میں مکمل کی گئی تھی لیکن درمیان میں 28 شعر فارسی کی بحرِ متقارب مثمن مقصور میں بھی موزوں ہو گئے ہیں۔ یہ حادثہ یا اتفاق اردو شاعری کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس مثنوی میں بعض مصرعے ہی نہیں ایک دو پورے پورے شعر بھی فارسی زبان میں موزوں ہو گئے ہیں۔ یہ صورتِ حال اردو زبان میں رونما ہونے والے ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ تھی یعنی اب یہ زبان ہر اعتبار سے فارسی کی ڈگر پر چلنے کے لیے آمادہ ہو رہی تھی چنانچہ کچھ ہی مدت کے بعد فخر دین نظامی بیدری نے اپنی طویل مثنوی ''کدم راوٗ پدم راوٗ'' فارسی کی مذکورہ بحر یعنی متقارب مثمن محذوف میں لکھی تھی۔ اس وقت سے اردو شاعری کی دو متوازی روشیں مقرر ہو گئیں اور کچھ مدت کے بعد انھیں کی مناسبت سے شعر گویوں کی بھی دو جماعتیں بن گئیں۔

اول وہ جو ہندستانی اوزان اور اصول کی پابندی کرتے تھے۔ ان کے کلام میں اسی سرزمین کی مقامی بولیوں کے اثرات غالب تھے۔ ان کے لیے لفظ ''کبت'' کی مناسبت سے کبتائی کی

اصطلاح وضع کی گئی اوران شاعروں کو ''کبیشر'' کہا جانے لگا۔

دوسری جماعت وہ ہوئی جو فارسی کی بحروں میں طبع آزمائی کرتی تھی۔ان کی زبان پر عربی اور فارسی کے اثرات چھائے ہوئے تھے چنانچہ ان کو شاعر اوران کی سخن گوئی کو شاعری کہا گیا۔

اس مقام پر یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ان جماعتوں کا تعلق عقیدے اور نسل سے مطلق نہیں تھا۔جیسا کہ سطور بالا سے بھی ظاہر ہے مسلمانوں میں بھی کبیشر ہوتے تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ 19 ویں صدی کے آغاز تک اکثریت انھیں کی تھی۔ انگریزوں کے تسلط کے ساتھ حالات نے پلٹا کھایا اور زمانے کی ستم ظریفی نے شعر کی مذکورہ صورتوں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ مختص کر دیا۔

شاہ عالم ثانی جو آفتاب تخلص کرتے تھے دونوں قسم کے شعر کہتے تھے چنانچہ ان کے کبت، دوہرے، ہوری وغیرہ کا مجموعہ '' نادراتِ شاہی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔عجائب القصص میں بھی انھوں نے ان اصناف کے نمونے شامل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ :

> ''اسی طرح کے اشعار اور خیال ودھرپت وپنے وگیت وکبت ودوہرے تہنیت میں گاتے اور رقص کرتے تھے۔'' 1

خواجہ میر درد اور مرزا محمد رفیع سودا نے بھی کبت اور دوہرے کہے تھے۔ یہاں نمونہ کے طور پر دونوں کا صرف ایک ایک دوہرا/کبت نقل کیا جاتا ہے۔

دوہرۂ درد (بحوالہ تذکرہ مسرت افزا)

کیسے توں کوں بھاوت ہے اور کیسے کے سُکھ پاوت ہے
یہ پھلواری درد ہمیں کچھ اور سمیں دکھلاوت ہے
کلیاں مَن میں سوچت ہیں جب پھول کوئی کھلاوت ہے
جادن واپُر بیت گیو سوداون موپر آوت ہے

اور، کبت سودا (بحوالہ معاصر پٹنہ نمبر 1 صفحہ 157)

ایکن کو کردینی صاحب تکت تاج کے ایکن کو ترنگ باج، ایکن کو بھکاری اناج کے
ایکن کو سوگ، ایکن کو جوگ، ایکن کو رس بھوگ، ایکن کو صاحب راج کے

ایکن کو بسن گڑھ کوٹ ایکن کو ناہیں تن کے اوٹ

فعل الحکیم لا ینحلوا عن الحکمة جانت ہیں اور ہم کیا جانیں کر تب مہاراج کے

بڑی بات یہ ہے کہ رامپور کے نواب محمد سعید خان بہادر کے عہد میں اس علمی مرکز کے بعض شاعروں نے جن میں خود نواب کے بعض اعزا بھی شامل تھے، اردو شاعری کی اس قدیمی روایت سے دلچسپی لی تھی اور امیر مینائی کا قابلِ تحسین ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس سلسلے کے شاعروں (کبیشروں) کا احوال قلمبند کرنے کے علاوہ کئی اچھے نمونوں کو بھی اپنے تذکرے میں جگہ دے کر گویا ان کو زندۂ جاوید بنادیا اور ایک بڑی غلط فہمی کی، جو خاص و عام میں عام ہونے لگی تھی، تردید کا عمدہ سامان کردیا۔ یہاں مختصراً دو ایک کا حال نقل کیا جاتا ہے۔

1- تاب- امداداللہ خاں

اپنے وقت کے باکمالوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کے تعارف میں امیر مینائی نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا اختصار درج ذیل ہے :

"تاب صاحبزادہ امداداللہ خاں ابن صاحبزادہ کفایت اللہ خاں کفایت تخلص، احمد خاں غفلت کے شاگرد رشید۔ یہ بزرگ جامع صفاتِ کمال اور جوانی میں بہت صاحب حُسن و جمال تھے۔ فنونِ متداولہ میں کمتر کوئی فن ایسا ہوگا جس میں دخل تام نہ تھا اور باایں ہمہ معلومات و دانست سوا تواضع اور انکساری کے اور کسی بات سے کام نہ تھا۔ عجب مردِ نیک نہاد تھے۔ زبان بھاکھا اور اردو دونوں میں استاد تھے۔ 61 برس کی عمر پائی۔ کلام اکثر تلف ہوگیا۔ ایک کبت جس زمانے میں یہ صاحبزادے لکھنؤ میں تھے، وہاں ملا میاں نے کہ حافظ رحمت خاں کی اولاد میں تھے اور اُن کو بھی اس فن میں بصیرت تھی، ان کو ایک چم چھپادی ع

سُرگ میں سسی کیدھوں، پتا لکھ سسی ہے

انھوں نے اسی صحبت میں یہ کبت موزوں کیا اور اس قدر جلد لکھ دیا کہ گویا پہلے سے یاد تھا۔"[2]

اس واقعے سے یہ حقیقت بخوبی ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے علمی اور شعری حلقوں میں غزل

وغیرہ کی طرح کبت وغیرہ بھی کہے اور سُنے جاتے تھے اور یہ بات رامپور تک محدود نہیں تھی بلکہ بریلی اور لکھنو کی صحبتوں میں بھی عام تھی۔ مذکورہ کبت اس طرح ہے ؎

رَس بن راگ ، جیسے پھول بن باگ ، جیسے تُری بن باگ ، جیسے روکھ بن ڈار ہے
راگ بے لذت ، باغ بغیر پھول کے ، بے لگام کا گھوڑا ، بغیر شاخ کا درخت
گج بن دَنت ، جیسے جوگ بن سَنت ، جیسے ناری بن کنت ، جیسے کنت بن نار ہے
بغیر دانت کا ہاتھی ، درویش بغیر ریاضت کے ، عورت بغیر شوہر کے ، مرد بغیر عورت کے
گوال بن کان ، جیسے مال بن دان ، جیسے دُھن بن بان ، جیسے ناد بن تار ہے
کنھیا کے بغیر گروہِ اطفال ، دولت بغیر صدقہ کے ، کمان بغیر تیر کے ، راگ بغیر ساز کے
بھَون بن بار ، جیسے کھڑگ بن دھار ، جیسے کچ بن نار ، جیسے بین بن سار ہے
گھر بغیر دروازہ کا ، تلوار بغیر باڑھ کے ، عورت بغیر پستان کے ، بین بغیر پردوں کی

یہ کبت زبان و بیان پر شاعر کی حاکمانہ قدرت کے ساتھ ساتھ خوبی بیان اور تیزی فکر کا بھی مظہر ہے امداد اللہ خاں تاب نے کبت کے علاوہ دوسری متداول اصناف میں بھی طبع آزمائی کی تھی چنانچہ ایک یہ ہے ؎

چھپّے درمنقبت

کپیو تلاتل اَتل بِتل، پاتال ہو ڈلیو ، کپیو سیس باراہ، مچھ کے تالی کھلیو
کچھ پیٹھ کٹ کھنڈ کھنڈ، ڈگپالن بھاگے ، اندر بجر لے بھجو گنڑن پنگت کے آگے
ہر ہر بدھ نرسنگھ بل، بسنت کربانی کہیو
کھمبر پر آیو علی ، سو پربت کھس کھس بھیو

شرح اس کی اس طور پر کی گئی ہے :

کپیو = کانپے، تلاتل اتل بتل = زمین کے تین طبقے، کل سات طبقے ہیں اور ان کے نام اس طرح ہیں: پہلا اتل کہ اس کو تل بھی کہتے ہیں، دوسرا بتل، تیسرا ستل، چوتھا تلاتل، پانچواں رساتل، چھٹا تہاتل، ساتواں پاتال۔ معنی اس جزو کے یہ ہوئے کہ تلاتل، اتل اور بتل جو طبقات زمین کے ہیں وہ ہیبت سے کانپ گئے۔

پاتال ہوڈلیو = پاتال بھی کہ ساتواں طبقہ ہے ہل گیا۔

سیس وہ سانپ کہ جس کے سر پر زمین قائم ہے

باراہ وہ اوتار کہ بہ شکلِ خوک ہے۔ یہ دونوں بھی خوف سے لرز گئے۔

مچھ دو ہیں۔ ایک تو مچھ اوتار اور ایک وہ مچھلی جو زیر زمین ہے اور اس کے سر پر زمین قائم ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ کمالِ ہیبت سے وہ مچھلی بھی چونک پڑی۔

کچھ = سنگ پشت جس کے سر پر زمین ہے۔ کھنڈ کھنڈ = ٹکڑے ٹکڑے

ڈگپال مذہب ہنود میں آٹھ ہاتھی ہیں کہ اطراف عالم میں محافظ دنیا کے ہیں، یہ سب بھی بھاگ گئے۔

بجر = اِندر کا ہتھیار جو الماس ہے بجو = بھاگ گیا

گنڑن = دیوتا، پنگت = گروہ

یعنی اندر بجر کو لیکر بھاگنے میں دیوتاوں کے گروہ سے آگے نکل گیا۔

ہَر بہ کسرِ ثانی = نام دشمن، اور ہَر بہ سکونِ را نام مہادیو

بُدھ = نام برھما، نَرسنگھ = ایک اوتار کامل کا، اِستُتِ = تعریف، توصیف، بانی = باتیں، کہیو = کہیں

مطلب یہ ہے کہ ان سب دیوتاوں نے متفق ہو کر آپ کی تعریف اور ثنا وصفت کی باتیں کہیں۔

کھیبر = خیبر، یعنی حضرت علیؓ نے خیبر پر حملہ کیا

پَربت = پہاڑ، کھس = گر پڑا کھس کھس کھیو = ریزہ ریزہ ہو گئے۔

فارسی اردو کے شاعر کے لیے اس قسم کے کلام کا تلفظ جس قدر مشکل ہے اس کے بیان کی احتیاج نہیں ہے۔ اس کے باوجود امداد اللہ خاں تاب وغیرہ کا کبت وغیرہ کہہ لینا نہایت قابلِ ستائش ہے۔ اس قسم کے کلام کی خصوصاً موجودہ حالات میں اہمیت اور افادیت بھی بہت زیادہ ہے۔

## 2- حسین- سید حسین شاہ

کبت وغیرہ کہنے کے لیے انھوں نے بھی اپنے زمانے میں بہت نام پایا تھا۔ ان کے تعارف میں امیر مینائی نے تحریر کیا ہے :

"افزوں، سید حسین شاہ ابن سید جلیل شاہ قدس سرھا، صورتاً نورِ مجسم، سیرتاً نفوسِ قدسیہ کا عالم، شب بیدار، تہجد گزار، باہمہ تقدس باتیں رنگین، طبیعت حسین، ہر طرح کی صحبت میں باغ و بہار، بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی میں یکتائے روزگار۔ اردو اور بھاکھا دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ ہر طرح کے رنگِ گویائی پر قادر تھے۔ اخوند زادے احمد خاں غفلت کو کلامِ اردو دکھایا، بھاکھا بطورِ خود فرمایا: چھپن برس کی عمر پائی۔ چوتھی شعبان کو 1269ھ (1863) میں رحلت فرمائی۔ بھاکھا میں حسین تخلص کرتے تھے۔"3

امداد اللہ خاں تاب کی طرح ان کے کبت بھی مفید اور دلچسپ ہوتے تھے۔ نمونہ یہ ہے۔

کبت در منقبت

کا او کو بھروسا ہے مُلک اور مار میں    کا او کو گمان ہے پھوج لاو لسکر پر
کو او گمرور ہے جو بَن دن چار میں    کا او کو گرور ہے اپنے بل، بھُجن پے
کو او پنڈتائی اور بید کے اُچار میں    کا او اِترات ہے جوگ اور برِوگ پر
مو کو اب تہاروہی سہارو سنسار میں    نہوری کرت حُسین بوطالب کے لال

حُسین کے کبتوں کی زبان پر برج بھاشا کا اثر نمایاں ہے اور اس اعتبار سے ان کا کلام صاحبزادہ امداد اللہ خاں تاب کے کلام سے الگ کیفیت دکھاتا ہے۔

## 3- گوال- گوال رائے

امداد اللہ خاں تاب کے سلسلے میں گوال رائے کی شاعرانہ شخصیت خصوصیت سے قابلِ ذکر رہی ہے۔ امیر مینائی نے ان کا احوال خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا اختصار اس طرح ہے :

"گوال رائے کبیشر ولد رائے سیوا رام، قدیم بندرابن کے رہنے والے تھے۔ بعد ازاں متھرا میں آکر اقامت اختیار کی۔ آغازِ سنِ شعور میں کسبِ علوم کے واسطے بنارس گئے۔ خوشحال رائے کبیشر ساکن بریلی سے کہ وہاں وارد تھے بعض کتابیں پڑھیں۔ پنجاب

جا کر مہاراجا رنجیت سنگھ کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ مہاراجا شیر سنگھ کے پاس رہے۔ جاگیر پائی۔ صاحبزادہ امداداللہ خاں تاب ان کے شاگرد تھے۔ ان کے خلف اکبر صاحبزادہ سعیداللہ خاں الم نے نواب فردوس مکاں کے حضور میں ان کا ذکر کیا۔ نواب نے موردِ عنایت فرمایا۔ نوکری انھوں نے منظور نہ کی۔ پینسٹھ برس کی عمر تھی کہ جمادی الاول کی نویں تاریخ 1284ھ (1867) میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ 14 پوتھیاں بڑی بڑی ان کی تالیف ہیں جن میں جملہ اقسام شعر مندرج ہیں۔ کہتے ہیں کہ بعد پیدا کرکے کہ گوالیار میں ایک بڑا کبیشر گذرا ہے گوال رائے کے سوا جامع کمالات ایسا دوسرا نہیں ہوا۔''4

صاحبزادہ امداداللہ خاں تاب کا گوال رائے جیسے باکمال کبیشر کے سلسلہ تلمذ سے وابستہ ہونا اہم بات تھی۔ تاب نے جیسا کہ مذکور ہوا اس فن میں خود بھی استادی کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔ امیر مینائی نے اپنے تذکرے میں ان کے بھی ایک شاگرد کا ذکر کیا ہے، اس طرح :

'' بدری چند خلف پنڈت اُتم چند، علم بیا کرن یعنی صرف ونحو اور جوتش یعنی نجوم اور کاب یعنی سنسکرت کی شاعری اور پنگل یعنی عروض پنڈت کرشنانند سے حاصل کیا اور نیائے یعنی علم منطق اور دھرم شاستر یعنی علم فقہ پنڈت ٹیکارام مرادآبادی سے پڑھا۔ بھاکھا زبان میں صاحبزادہ امداداللہ خاں تاب تخلص کے فیضِ صحبت سے دخل پیدا کیا۔ اکاون برس کی عمر ہے۔ سرکار دولتمدار میں ملازم ہیں۔''5

ممکن ہے کہ تاب کے اثر سے بعض اور شخصوں نے بھی اس فن یعنی کبتائی سے دلچسپی پیدا کی ہو۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ کبتائی اس بعد کے زمانے میں بھی ہندوؤں کی میراث نہیں بنی تھی۔ مسلمان اس فن میں برابر کا دخل رکھتے تھے اور ان میں بھی بعض لوگوں کو استادی کا درجہ حاصل تھا۔ اب یہاں دونوں کبیشروں کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

کبت در تعریف نَے      از گوال رائے

اور بکھ جیتی تیتی پرَ ان کی ہَریا ہوت بنسی کی کڑھی کی

کبھو جائی نہ لہر ہے

سُنتے ہی ایک سنگ رُوم رُوم رَچ جائی جوم جارڈ اری

پاری بیکلی گہر ہے

گوال کب لال تو سوں جور کر پوچھت ہوں، سانچ کہہ دیجو

جو پی مو پر مہر ہے

بانس میں کہ بیندھ میں، کہ ہونٹھ میں، کہ پھونک میں، کہ آنگری کی داب میں،

کہ ڈھن میں جھر ہے

شرح اس کی اس طرح ہے۔

بکھ = زہر ، جیتی = جتنی ہیں ، تیتی = اُتنی ، پران = جان

ہریا ہوت = لینے والی ہوتی ہیں ، بنسی = بانسری ،

کڑھی کی = نکلی ہوئی زہر کی

یعنی اور زہر جہان میں سب جان لینے والے ہیں کہ جس پر اُن کا اثر ہوا مار ڈالا مگر بانسری سے جو زہر نکلا ہے یعنی اس کی آواز ایسا زہر ہے کہ اس کی لہر یعنی کیفیت اور تاثیر دل سے کبھی نہیں جاتی۔

ایک سنگ = دفعتہً ، روم روم = رویں رویں میں ، رَچ جائی = پھیل جائے گی

جوم = زعم و پندار ، جارڈاری = جلا ڈالے گی، پاری = ڈال دی

بیکلی = بیقراری ، گہر ہے = سخت ہے

یعنی سننے کے ساتھ ہی رویں رویں میں اثر اس زہر کا پھیل جاتا ہے۔ پندار اور خودداری کو جلا ڈالتا ہے اور سخت بیقرار کر دیتا ہے۔

لال = اے معشوق ، توسوں = تجھ سے ، جور کر = ہاتھ جوڑ کر

یعنی اے معشوق میں ہاتھ جوڑ کر تجھ سے پوچھتا ہوں، سچ بتا دے اگر مجھ پر نگاہ لطف ہے۔

بانس میں = بانسری میں          بیندھ میں = سوراخ نے میں

یعنی بانسری میں، اس کے سوراخ، ہونٹ میں یا پھونک میں یا انگلی کے دباؤ میں یا راگ میں زہر ہے جس کا ایسا اثر ہے۔

از بدی چند          کبہ ، در تعریف حُسن معشوق

ایک سمیں دیکھ کے سُجان چتر ائن جو تیرو مکھ چند تولنی چند ہیرو ہے
ڈنڈی سسمار پلا دوودونو دُھرب کری تو لیو مکھ چند چندا دی گھنیرو ہے
آن آن تارے بدی چند چند نیرا کھے تو دھئیو ہلکو سو بھاری مکھ تیرو ہے
چھب کو لٹارو ہئ ہارو سو پد ھار وُمھ چین ہے نہ دیؤس رین
کری نت پھیرو ہے

مطلب اس کبت کا اس طور پر ہے۔
سمیں = سمے = وقت ، سجان چتر ائن جو = ہوشیار چتر ائن جو = برھمانے
تیرو مکھ چند = تیرے منہ کا چاند ، تولنے کو = تولنے کے لیے
ہیرو ہے = دیکھا ہے۔
یعنی ایک زمانے میں برہمانے تیرے منہ کے چاند کو اور اپنے چاند کو دیکھا تو چاہا کہ دونوں کو تولنا چاہیے۔
ڈنڈی سسمار = کہکشاں سے ترازو کی ڈنڈی بنائی
پلا دو دونو دھرب کری = دونوں قطبوں سے دو پلّے بنا لیے۔
یعنی چاند کو آبِ حیات دیکر تیرے منہ کے چاند کے ساتھ رکھا کہ پلڑا اُس کا بھاری ہو جائے۔
چند نیرا کھے = چاند کے پاس رکھے
یعنی آبِ حیات دینے اور لا لا کر سب تاروں کو اپنے چاند کے پاس رکھا پھر بھی وہ ہلکا ہی رہا اور تیرے منہ کا چاند بھاری رہا۔
چھب کو لٹارو = تیرے حُسن کا بھگایا ہوا ، ہئ ہارو = دل کا ہارا ہوا
سو پد ھار وُمھ = وہ آسمان کی طرف چلا گیا ، چین ہے نہ دیوس رین = نہ دن کو چین ہے نہ رات کو، کری نت پھیرو ہے = ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔
یعنی وہ آسمان کا چاند تیرے حُسن کا لتاڑا ہوا ہے اور دل کا ہارا ہوا ہے اس لیے وہ آسمان کی طرف چلا گیا۔ اسے دن رات میں کسی وقت قرار نہیں ہے اس لیے ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔

# ی - داستانیں

نثری داستانوں کے لکھے جانے کا سلسلہ رامپور کے علاقے میں نواب احمد علی خان بہادر کے زمانے میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ پھر نواب محمد سعید خاں بہادر کے عہد میں جب مختلف علوم و فنون کو فروغ حاصل ہوا، تو داستان نویسی کے ساتھ ساتھ داستان گوئی کے فن نے بھی ترقی کی۔ امیر مینائی نے مرزا خسو کے حالات میں تحریر کیا ہے :

> ''حسن مرزا کاظم حسین عرف مرزا خسو ولد مرزا عطا بیگ، وطن ان کا دہلی ہے مگر عہد نواب محمد سعید خاں صاحب سے ملازم ہو کر اسی دارالریاست میں رہے۔ یہیں انتقال کیا۔ 70 برس کی عمر پائی۔ 23 ویں جمادی الآخرہ کو 1282 ھ (1865) میں رحلت کی۔ عجب مرد رنگین طبیعت تھے......... داستان بھی خوب کہتے تھے۔ آخر عمر میں شعر گوئی کی طرف طبیعت آئی۔'' 1

یہ مذکور آ چکا ہے کہ نواب یوسف علی خاں ناظم نے جو واسوخت لکھے تھے۔ ان میں مختلف قسم کے عشقیہ واقعات کو تفصیل سے اور بڑی خوبی کے ساتھ نظم کیا تھا۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت قصہ گوئی کے لیے موزوں اور مناسب تھی۔ یہ صورتِ حال ان کے دور میں داستان نویسی کے فن کی ترقی کے لیے خاصی حوصلہ افزا ثابت ہوئی تھی۔

1- کلب علی خاں نواب کلب علی خاں

نواب ناظم کے ولی عہد نواب کلب علی خان نے داستان پسندی کے اس ماحول میں پرورش پائی تھی۔نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ انھوں نے خود بھی اردو نثر میں داستان لکھ ڈالی۔ان کا دور فن داستان نویسی کے لیے نہایت بارآور ثابت ہوا اوران کے وقت میں بڑی کثرت سے داستانیں لکھی گئی تھیں۔

نوابین رامپور کی یکے بعد دیگرے سرپرستی کا فائدہ یہ ہوا کہ روہیل کھنڈ کے خطے میں بڑی کثرت سے داستانیں لکھی گئی تھیں، یہاں ان میں سے صرف بعض کا حال مختصراً تحریر کیا جاتا ہے۔

2- رسا- میر احمد علی

یہ شاعر بھی تھے اور داستان نویس بھی۔اوائل عمری میں انھوں نے نواب محمد سعید خاں بہادر کا دور بھی دیکھا تھا۔امیر مینائی نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے :

'' رسا میر احمد علی ابن سید امام الدین، چھپن برس کی عمر ہے۔مزاج وارستہ،طبیعت رنگیں،سخن شناس،سخن آفریں،شیخ علی بخش بیمار کے شاگرد ہیں۔بہت کچھ کہا مگر آزاد طبعی سے دیوان مرتب نہیں کیا۔''3

لالا سری رام کا کہنا ہے کہ ان کے بزرگ ملتان سے آکر رامپور میں آباد ہوئے تھے۔4 لیاقت علمی ان کی بہت اچھی تھی۔ان کے شاگرد عبدالعلی فروغ مدراسی کے بقول انھوں نے 20شوال1292ھ(1875ء) میں لکھنؤ میں وفات پائی تھی۔

تاریخ اونوشت فروغ از سر الم <u>احمد علی چہ صاحب فضل وکمال بود</u>

1 + 1291=1292ھ

معلوم یہ ہوتا ہے کہ احمد علی رسا کو شروع سے قصے کہانیوں سے دلچسپی رہی ہے۔علی بخش بیمار سے تلمذ نے ان کے شوق کو مہمیز کیا چنانچہ اپنے استاد کی اردو داستان ''طلسم بیضا'' کی انھوں نے غالباً استاد کی خاطر سے کتابت بھی کی تھی۔

صاحبزادہ محمد امداداللہ خاں تاب نے کہ جن کا مذکور پہلے آچکا ہے ایک داستان کا پلاٹ تجویز کیا تھا جسے احمد علی رسا نے ''کہانی چہار شہزادہ'' کے عنوان سے لکھا تھا چنانچہ خود لکھتے ہیں کہ:

"کمترین (رسا) نے عرض کی کہ ہر چند کاتب عہدہ دار تالیف کا نہیں مگر امتثال امر لازم ہے، مضمون ارشاد ہو۔ چنانچہ بموجب فرمانے کے میں نے لکھا کہ بے اصلاح فرمائی کے پسند کیا۔"

وہ مضمون (= پلاٹ) اس طرح ہے کہ ایک بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کے چاروں بیٹے سلطنت کو وزیر کے حوالے کر کے خود دوسری ولایتوں میں چلے گئے اور وہاں کے بادشاہوں کے ملازم ہو گئے، شرط یہ تھی کہ جو کام کسی سے نہ ہو سکے گا۔ وہ ہم کریں گے۔ انھوں نے عجیب عجیب مہمات سر کیں۔ وہیں شادی کر لی۔ آخر وطن میں واپس آ کر ماں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور باپ کی مدد کہ سلطنت کا انتظام سنبھال لیا۔ نمونہ اس داستان کی عبارت کا یہ ہے :

"سب کہ آتو اور انّا نے دیکھا، صبح دولت دوشالے کا جھرمٹ مارے ایک کروٹ سے پڑی گہری سانسیں بھر رہی ہیں اور کسی وقت کان رکھ کر جو سنو تو کچھ رونے کی سی آواز بھی معلوم ہوتی ہے۔ پاس جا کر کان پر ہاتھ رکھا اور کہا :

'واری خیر تو ہے؟ تم کتنی دیر سے چپ چاپ سناٹے میں پڑی ہو۔ بتاؤ تو کس کے کارن؟'

اس نے ہرگز جواب نہ دیا۔ مثل مشہور ہے کہ کہنے سے ضد سوائی ہوتی ہے اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ ہر چند خوشامد کی۔ دونا اس سے پایا۔ آخر کو گھبرا گئیں۔ ایک نے دوسری سے کہا کہ :

"یہ کچھ نظر گذر ہے یا باد بتاس کا جھونکا ہے۔ خالی اسرار سے نہیں۔"

نثر اس داستان کی بامحاورہ بھی ہے اور اس زمانے کے روزمرّہ کے مطابق بھی۔ قافیہ اور سجع کا اس میں التزام نہیں کیا گیا ہے۔ داستان کا پلاٹ دلچسپ ہے اور اس میں عجائبات کی کثرت ہے۔

### 3- رسا- اَنباپرشاد

اسی زمانے میں رسا تخلص کے ایک باصلاحیت ہندو شاعر نے بھی لکھنؤ سے آ کر رامپور میں سکونت اختیار کی تھی۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ لالا سری رام دہلوی کے اتنے ضخیم تذکرے میں بھی ان کے نام اور کلام کو جگہ نہیں مل سکی البتہ امیر مینائی نے ان کے حالات اس طرح قلمبند کیے ہیں:

'' رسا منشی اَنبا پرشاد ابن لالا چندی پرشاد، وطن ان کا لکھنؤ ہے مگر سالہائے دراز سے
اسی دارالریاست میں رہتے ہیں۔ عہد جنت آرامگاہ (نواب محمد سعید خاں) سے
ملازم سرکار دولتمدار ہیں۔ داستان گوئی میں مشہور روزگار ہیں۔ پچاسی برس کی
عمر ہے۔ کبھی شعر کہنے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ میرزا محمد تقی خاں ہوس کو اپنا استاد
بتاتے ہیں۔'' 5

کہا گیا ہے کہ اَنبا پرشاد اپنے آبائی مذہب کو ترک کر کے مسلمان ہو گئے تھے۔ 6
ان کا اسلامی نام "عبدالرحمٰن" مقرر ہوا تھا۔ امیر مینائی نے ان کے بیٹے کا تعارف اس
طرح کرایا ہے :

'' رضا تخلص، غلام رضا ولد منشی اَنبا پرشاد رسا لکھنؤ ان کا وطن ہے مگر تیس برس سے یہی
دارالریاست مسکن ہے۔ ان کے باپ مدت سے اسی دولت کے نمک خوار ہیں۔
داستان گوئی میں ملازم سرکار ہیں۔ اب ان کی عمر 40 برس کی ہے۔ سلسلہ تلمذ کا۔
واسطہ اپنے باپ کے میرزا تقی ہوس مرحوم تک پہنچتا ہے۔'' 7

اَنبا پرشاد ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے زبان اردو میں سب سے زیادہ داستانیں لکھی تھیں۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے داستانی ادب کا انھوں نے بہت اچھا مطالعہ کیا تھا۔ رامپور پہنچنے سے پہلے ہی وہ داستان گو اور داستان نویس کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی سب سے قدیم تصنیف بہ ظاہر "حکایتِ سخن سنج" ہے۔ اس کے بارے میں لکھا ہے :

'' ترجمہ طوطی نامہ۔ حکایتِ سخن سنج از انبا پرشاد رسا داستان گو شاگرد میر احمد علی
داستان گو در 1262ھ (=1845) کارخودرا بہ اتمام رسانیدہ است۔'' 8

تکمیل کے فوراً بعد حکایت سخن سنج دہلی سے چھپ گئی تھی۔ اس کے شروع میں مترجم نے بیان کیا ہے:

'' حسب اتفاق مرشد زادۂ بلند اقبال......... بیدار بخت محمد مرزا بہادر نے...... کچھ ذکر
طوطی نامے کا کہ معروف بہ طوطا کہانی ہے، فرمایا اور کمال عنایت خدا سے میری طرف

متوجہ ہو کر ارشاد کیا کہ اگر تو اس طوطا کہانی کو زورِ طبیعت سے اپنے طور پر پردازی دلائے اور حاضر کرے تو سبب خوشنودی خاطر مابدولت کا ہے۔ لہٰذا میں نے طوطی زبان کو گویا کیا اور فرمان واجب الاذعان بجالایا...اور قطعہ تاریخ کا کہ متضمن اوپر نام اس کتاب کے ہے۔ بیچ خیالِ ناقص کے یوں گذرا

رباعی

جب ختم ہوئی رسا کہانی　　تاریخ کا اس کی مجھ کو تھا رنج
ناگاہ بولا یہ ہاتفِ غیب　　تاریخ حکایت سخن سنج"

1262ھ

اس ترجمے کا جو قلمی نسخہ رامپور کے کتب خانے میں ہے اُس کی کتابت عبدالرشید نامی کسی شخص نے چونسٹھ اوراق پر 1274ھ (1857) میں کی تھی۔ اس ترجمے کی عبارت کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے :

"جب کہ دوست دلخواہ صبح یعنی آفتاب ظلمت شام فراق کی دیکھ کر گوشۂ مغرب میں لاچار ہو کر بیٹھا اور معشوق شب یعنی ماہ خلوت خانہ مشرق سے نکلا، خجستہ پوشاک تبدیل کر کے ہائے وائے کرتی، ٹھنڈی سانسیں بھرتی، طوطے کے پاس گئی اور کہنے لگی کہ اے طوطے قصے کہانیاں تو روز سنتی ہوں لیکن میں یہ کہتی ہوں، وہ کون سی شب ہوگی جو میں اپنے دوست سے سینہ بہ سینہ، لب بہ لب ہو کر سوؤں اور دردِ دل اور سوزِ جاں کو کھوؤں۔"

زبان اس ترجمے کی فارسی آمیز اور طرزِ بیان اکثر مقاموں پر پُر تکلف بلکہ مصنوعی ہے۔ یہ شاید نو طرزِ مرصع وغیرہ کا اثر ہے۔

اوپر میر احمد علی داستان گو کا ذکر آیا ہے۔ یہ بہ گمانِ غالب احمد علی رسا سے مختلف شخص تھے اور اُنبا پرشاد رسا نے فنِ داستان گوئی میں ان سے کسب فیض کیا تھا۔ میر موصوف نے اپنے شاگرد اُنبا پرشاد کے تعاون سے ایک داستان "طلسم طہمورث دیوبند" کے نام سے لکھی تھی۔ رضا لائبریری رامپور میں اس کا جو نسخہ محفوظ ہے اس کی ضخامت تین سو اٹھانوے ورق کی ہے اور کتابت انبا پرشاد

رسا کے بیٹے غلام رضا نے کی تھی۔ اس کے پہلے صفحے پر یہ اندراج ہے :

"طلسم طہمورث دیو بند — ترکیب دادۂ میر احمد علی صاحب وبعدۂ درست کردۂ
والد ماجد۔"

اس سے دونوں صاحبوں کے کاموں کی نوعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ داستان کا آغاز ان جملوں سے ہوا ہے:

" یہاں سے گزارش کیا جاتا ہے کہ جس وقت فیروز اثر سلطان نامور کا سرزمین باماوران میں بہ مقابلہ خاقان گردوں اساس فروکش ہوا تو اس عرصے میں شاہزادہ خاور شاہ طلسم افراسیاب خاں کو فتح کر کے آچکا ہے اور امیر نے جشنِ چہل روزہ ترتیب دیا ہے اور عین جشن میں شاہزادہ بدیع الزماں اور خاور شاہ سے دنگل رستم کی بابت تکرار واقع ہوتی ہے اور انفصال فی مابین کشتی ہی ہوا ہے۔"

اس اقتباس سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ داستان امیر حمزہ کے باقیات طلسمات میں سے یہ داستان بھی ایک ہے۔ عبارت اس کی عربی اور فارسی آمیز ہونے کے باوجود رواں بھی ہے اور پسندیدہ بھی۔ انبا پرشاد کی داستان کوچک باختر کی دوسری جلد سے متعلق ایک اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان بھی 1270ھ (1853) سے پہلے لکھی جا چکی تھی، اور شاید انبا پرشاد رسا کے رامپور میں پہنچنے سے بھی پہلے۔

رامپور میں پہنچ کر انبا پرشاد رسا نواب محمد سعید خاں بہادر کی سرکار میں داستان گوئی کی خدمت پر مامور ہوئے تھے۔ انھوں نے نواب یوسف علی خاں ناظم اور پھر نواب کلب علی خاں کا بھی زمانہ پایا تھا اور اس طویل مدّت میں یکے بعد دیگرے فارسی سے کئی داستانوں کے ترجمے کیے تھے اور بعض اپنے طور پر تالیف بھی کی تھیں۔ نواب محمد سعید خاں کے دور میں انھوں نے جو داستانیں لکھی تھیں ان میں کوچک باختر کی دو جلدیں بھی تھیں جو 1270ھ (1853) میں تکمیل ہوئی تھیں۔ رضا لائبریری میں ان کے ایک سے زائد نسخے موجود ہیں۔ پہلی جلد 575 اور دوسری 580 اوراق پر محیط ہے۔

انبا پرشاد رسا کی کچھ اور داستانیں جن کے قلمی نسخے رامپور کے کتب خانے میں ملتے ہیں،

درج ذیل ہیں:

| | | | |
|---|---|---|---|
| داستانِ امیر حمزہ | 157 ورق | چہار رنگ | 279 ورق |
| داستان فرخ شاہ سوار قلندر | 105 ورق | داستان ہاشم تیغ زن | 18 ورق |
| داستان سلطانہ فتانہ | 27 ورق | داستان ناہید باغباں | - |

ان کا سب سے بڑا کارنامہ نوشیرواں نامہ کا ترجمہ ہے جو نواب کلب علی خاں بہادر کی فرمائش پر انھوں نے چھ جلدوں میں کیا تھا۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:

"شہنشاہ جم جاہ چراغ لشکر اسلام نے خوش ہو کر تعریف خواجہ سلامت کی کی۔ پس خواجہ سلامت نے جب کہ شاہزادۂ عالم شاہ رومی کو لخلخہ رفع بیہوشی کا سونگھا کر ہوشیار کیا لیکن چونکہ اعضاء شاہزادۂ عالم کا کمند ابریشمی سے خوب مستحکم بندھا تھا تو اس نے آنکھ کھول کر دیکھا کہ میں بارگاہ سلیمانی میں بیٹھا ہوں اور بہ چشم غضب چار طرف دیکھ کر فرمایا کہ کون سا بے ادب مجھ کو یہاں لا کر بٹھلا گیا ہے۔"

زبان اس کی بہت مصنوعی ہے اور اکثر موقعوں پر تعقید کا عیب نمایاں ہے۔ جملوں کی ساخت بھی بہت پسندیدہ نہیں ہے۔

4- ذکی- مہدی علی خاں

مہدی علی خاں نام، ذکی تخلص تھا۔ مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے حالات پہلے لکھے جا چکے ہیں۔ انھوں نے کئی داستانیں لکھی تھیں۔ ان میں سے بعض کے قلمی نسخے رامپور کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں:

| نام | سالِ تصنیف | اوراق |
|---|---|---|
| 1۔ طلسم حکیم قطاس (دو جلد) = خلاصہ بوستان خیال | 1258ھ(=1842) | 597 |
| 2۔ طلسم حیرت کدۂ آصفی = ترجمہ خلاصہ بوستان خیال | 1258ھ(=1842) کتابت میاں کریم اللہ | 420 |

3۔ طلسم سبع سیارع 1258ھ(=1842) 421

= ترجمہ بوستان خیال موسوم بہ مخزنامہ کتابت کریم اللہ و شیخ احمد علی

4۔ طلسم سعید 1258ھ(=1842) 597

= ترجمہ قصہ طلسم جام جم بوستان خیال

5- صارم- سید احمد حسین

سید احمد حسین نام اور صارم تخلص تھا۔ انھوں نے بھی ''خواب وخیال'' کے نام سے ایک داستان 1256ھ (1840) میں لکھی تھی۔ رضا لائبریری رامپور میں اس کا جو قلمی نسخہ ہے اس کی کتابت 1270ھ (1854) میں محمد اصغر علی خاں رامپوری نے کی تھی۔ اس میں کل 145 ورق ہیں۔ یہ اصغر علی خاں خود بھی اردو میں کئی نثری داستانوں کے مصنف اور مترجم تھے۔

6- گرم- محمد مظفر خاں

محمد مظفر خاں نام، گرم تخلص، شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔ رامپور کے ماحول میں رہ کر انھیں بھی داستان نویسی کا شوق ہوا چنانچہ انھوں نے ''قصہ پتلی'' لکھا۔ اس کا جو نسخہ رامپور میں ہے وہ 77 اوراق پر محیط ہے۔

آخر عمر میں انھوں نے ایک اور داستان شروع کی جسے ان کے بیٹے محمد فتحیاب خاں اخگر نے مکمل کیا۔ اس کا نام ''داستان عالم شاہ'' ہے اور یہ 106 صفحوں پر مشتمل ہے۔

گرم کے علاوہ احمد حسن خاں جوش نے بھی اس فن کی طرف توجہ کی تھی۔ ان کا حال پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ان کی تالیفات میں سے ''فسانہ جوش'' چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

# ک - تذکرے

نواب محمد سعید خان بہادر نے رامپور کو مختلف علوم وفنون کے ایک منفرد اور ممتاز مرکز کی حیثیت سے ترقی دینے کی شعوری اور باضابطہ کوشش کی تھی۔ اپنے زمانے کے نام برآوردہ علما، فضلا اور شعرا کو ملک کے اطراف و جوانب سے طلب کر کے بقدر وسعت وحوصلہ انھوں نے بڑی خوبی سے سرپرستی کی تھی۔ نواب مذکور کی قائم کردہ عمدہ روایتوں کو ان کے جانشین نواب یوسف علی خاں ناظم نے بڑی دلچسپی سے جاری رکھا بلکہ اکثر علمی معاملات میں خود بھی عملاً شریک رہے تھے۔ ان کوششوں کا فائدہ یہ ہوا کہ رامپور کے بعض مقامی صاحبانِ علم و ہنر، شاعر اور ادیب بھی قابلِ ذکر بلکہ ممتاز حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن نواب ناظم کے وقت تک ان کی تعداد اتنی نہیں ہو سکی تھی کہ ان کے تذکرے لکھے جاتے۔

روہیل کھنڈ کے خطے میں خصوصاً بدایوں اور مرادآباد وغیرہ مقاموں پر مختلف وجوہ سے ارباب قلم اور صاحبانِ علم ودانش سکونت اختیار کر رہے تھے۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے۔ جنھوں نے ملک کے معروف علمی مراکز کی سیر کی تھی۔ شاعروں کے تذکرے ان کی نظر سے گزر چکے تھے اور انھیں متعدد باصلاحیت شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات کے مواقع بھی مل چکے تھے۔ انھیں اس خطے بلکہ اپنے زمانے میں موجود شاعروں کے احوال اور کلام کو قلمبند کرنے کا خیال

ہوا اور اسی خیال نے تذکرہ نویسی کی صورت اختیار کر لی۔ بہادر شاہ ثانی کی بادشاہت کے آخر زمانے تک روہیل کھنڈ کے خطے میں شاعروں کے کئی تذکرے لکھے جا چکے تھے لیکن وہ سب ابتدائی نوعیت کے تھے یعنی ان کی عبارت فارسی زبان میں تھی۔ ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے تھی اور شاعروں کے حالات کے بیان میں اختصار سے کام لیا گیا تھا۔ بے شک طبیعتوں کے میلان نے کہیں کہیں جدت کا رنگ بھی دکھادیا ہے۔ اس مقام پر یہ ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ساری محنت اور کوشش کے باوجود، روہیل کھنڈ کے تذکرہ نویس اور ان کے تذکرے دہلی اور لکھنو وغیرہ مراکز پر متعارف نہیں ہو سکے تھے۔

1- سحر- احمد حسین

سحر نے تذکرہ بہار بے خزاں میں اپنے حالات مین جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی علمی کارکردگی کا تو اندازہ ہوتا ہے لیکن ان کی شخصیت کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی ہے۔ ان کی تحریر کا اختصار اس طرح ہے :

> ''سحر تخلص کاتب الحروف احمد حسین، از ابتدائے سنِ تمیز تا ایں دم بہ تلاشِ کلامِ موزوں وعمرے بسر کرد وبا اکثرے از شعرائے فی زمانا سرگرم اتحاد پرستی بابودہ........تذکرہ ہائے مبسوط درزبان فارسی وریختہ زاید از پنجاہ جلد دیدہ۔ انچہ ازطبعِ نارسا بہ انتخاب درآمد نقلش برداشتہ.....اتفاقِ موزوں کردنِ اشعار شاذ و نادر افتادہ.......مناسب نمی دانست کہ شعرے موزوں کردۂ خود داخلِ تذکرہ کند......محض بہ تحریر یک غزل کہ سراسر ہزل است اکتفا کردہ......از یں پیش آشفتہ تخلص می کرد، اکنوں بہ نظر ایں کہ خوشہ چین خرمن استفادۂ استادی غلام مینا ساحر ہستم سحر تخلص پسندیدہ ام۔ ''[1]

تعجب ہے کہ سحر نے اپنے استاد ''شیخ فضلِ حق عُرف غلام مینا ساحر تخلص ولد شیخ فضل امام متوطن کاکوری'' کا احوال بھی اپنے تذکرے میں نہیں لکھا ہے۔[2] ڈاکٹر حنیف نقوی نے بہ دلائل اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ سحر کاکوری کے رہنے والے تھے۔[3] تذکرہ بہار بے خزاں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سحر بہت مدت تک کاکوری میں مقیم نہیں رہے تھے۔ وہ اس قصبہ کے زیادہ

شاعروں سے یا تو واقف ہی نہیں یا ان کو قابلِ ذکر نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے کاکوری کے رہنے والے ایک مشہور شاعر مسرور تخلص کے بارے میں بس اتنا لکھا ہے :

''مسرور تخلص، شیخ پیر بخش از سکنائے قصبہ کاکوری است۔ اصلاحِ سخن از مصحفی گرفتہ ملازم سرکار سلیماں شکوہ بود۔''[4]

سحر کے استاد ساحر نے 23 ذیقعدہ 1250ھ (23 مارچ 1835) کو وفات پائی تھی یہ کہنا مشکل ہے کہ سحر نے ان کی شاگردی کب اور کہاں اختیار کی تھی۔ سحر نے اپنے زمانے کے بعض شعرائے لکھنو سے بہتر واقفیت کا اظہار کیا ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ اپنے استاد کی زندگی میں ہی وہ لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔ وہاں سے انھوں نے اکبر آباد وغیرہ مقامات کا سفر کیا اور پھر روہیل کھنڈ کے علاقے میں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم ہوگئے۔ وہ بدایوں اور مراد آباد کے بیشتر شاعروں سے واقف تھے اور ان میں سے کئی کے حالات اپنے تذکرہ بہارِ بےخزاں میں انھوں نے لکھے تھے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے مولوی محی الدین ذوق کاکوروی کا کہا ہوا سحر کی وفات کا قطعہ تاریخ نقل کیا ہے۔ اس کے آخری دو شعر یہ ہیں ؎

| | |
|---|---|
| سرایدزیں دو مصرعِ ذوق در سالِ وفات او | بہ ہجری و بہ فصلی نالۂ موزوں از صریرِ ما |
| چو بکشاد او بشوقِ گلشنِ جاوید بال اینک | بجنت زمزمہ پرداز آمد ہمصفیر ما |
| 1279ف | 1289ھ |

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ سحر نے کس جگہ وفات پائی تھی۔

احمد حسین سحر نے تین تذکرے لکھے تھے۔ ان کے بارے میں جو معلومات حاصل ہو سکی ہیں، مختصراً یہ ہیں :

1۔ آئینۂ حیرت۔ یہ سحر کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر حنیف نقوی نے تحریر کیا ہے :

''اس کی ابتدا ایک مختصر مقدمے سے ہوتی ہے جس میں اس کے اسبابِ تالیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جہاں تک یاد آتا ہے اس میں صرف اردو شاعرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ آخری ورق کی اندرونی جانب زیریں حاشیے پر منشی انوار حسین تسلیم کا یہ قطعہ تاریخ

منقول ہے ؎

چوں تذکرۂ سحر بہ الطاف الٰہی دید آئینہ حال دے از خاتمہ صورت
از غیب ندا شد پے تاریخ تماش آئینہ دلہاست چہ آئینہ حیرت

1258ھ

یہ قطعہ بہ گمان غالب کاتب تذکرہ ہی کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔"[5]

اردو میں شاعرات کا اوّلین تذکرہ یہی معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کا سالِ تکمیل 1258ھ (1842) ہے۔

2۔ طورِ معنی۔ یہ احمد حسین سحر کا لکھا ہوا دوسرا تذکرہ ہے۔ اس کا مقدمہ نسبتاً طویل ہے، اور اس کا خلاصہ اس طرح ہے :

"مولف ایں تذکرہ از ابتدائے سن شعور از صحبت شعرا مستفیض گردیدہ و کلامِ ہر یک از شعرائے سابقین و حال بقدرِ فہم خویش انتخاب زدہ.. از ہر یک (از) سخن سنجان محض بہ لطافت اشعار، گو یک بیت ہم باشد اکتفا کردہ، اشعار شاں دریں تذکرہ کہ موسوم بہ طورِ معنی است.. بہ کمالِ ایجاز و اختصار داخل ساختہ... فصلے در بابِ خاتمۂ کتاب رقم زدۂ کلکِ معنی نگار است کہ کیفیت شاعری شعرائے متاخرین بقیدِ تخلص کہ بطا رعایت حروف تہجی است، بے تکلف سرمہ سائے دیدہ اہل بصیرت شود وایں آشفتہ مزاج، پریشاں روزگار احمد حسین متخلص بہ سحر...... غرض از تالیف تذکرۂ فارسی استفادہ از تلاش و فکرِ عالی اساتذہ فارسی کہ موجد و مخترع ایں فنِ شریف اند موارد۔"[6]

یہ تذکرہ جیسا کہ خود مولف کے الفاظ سے ظاہر ہے ایران اور ہندوستان کے فارسی گو شاعروں کے احوال پر مشتمل ہے اس تذکرے کے لیے بھی منشی انوار حسین تسلیم نے قطعہ تاریخ کہا تھا جو درج ذیل ہے ؎

شدہ ہر شعر تذکرہ دلکش کہ سوادش زطرۂ حور ست
گفتمش فی البدیہہ تاریخش طورِ معنی چو مطلع نور ست

1258ھ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آئینہ حیرت کو مکمل کرنے کے بعد سحر نے یہ تذکرہ 1259ھ (=1843) میں لکھا تھا :

3۔ بہارِ بے خزاں۔ یہ احمد حسین سحر کا تیسرا تذکرہ ہے اور اردو گو شاعروں کے حالات میں ہے۔ اسی تذکرے کی بدولت سحر کا نام اردو دنیا میں متعارف ہوا ہے۔ سحر کے تینوں تذکروں کا ایک ایک نسخہ ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور یہ تینوں ایک ساتھ مجلد ہیں۔ بہارِ بے خزاں کے نسخہ لکھنؤ کی ایک نقل مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں بھی موجود ہے اور اسی کی بنیاد پر اس تذکرے کو اپنے اپنے طور پر ڈاکٹر نعیم احمد اور حفیظ عباسی صاحبان نے اس دعوے کے ساتھ چھاپ دیا ہے کہ متن براہِ راست نسخہ لکھنو پر مبنی ہے۔ ضرورت ہے کہ واقعی نسخہ لکھنؤ کی بنیاد پر مدوّن کر کے اس تذکرے کو شائع کیا جائے۔

بہارِ بے خزاں کے شروع میں بھی مولف نے ایک مقدمہ لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ اس طرح ہے:

> "از اعلیٰ ترین نعمت و دولتِ دارین او یکے ایں است کہ برائے روشنگری انجمن شہود و ایجاد خلقتِ ذاتِ خجستہ صفات نبی العربی المکی الہاشمی محمد بن المصطفیٰ شافع روز جزا و حضرت ائمہ و اہل بیت و خلفائے راشدین ساختہ..... شکستہ دل آشفتہ سر فرق تا قدم داغ برشتہ جگر، احمد حسین متخلص بہ سحر...... می خواست کہ کتابے بطور تذکرہ شعرائے ریختہ گویاں ترتیب دادہ..... ایں تذکرہ لطیف را کہ بجو اشعار رنگین خود رو کش بہار است، بہارِ بے خزاں، نام نہادہ بہ تالیفش پرداخت...... وفصلے جداگانہ در خاتمہ کتاب برائے ذکرِ اشعار شعرائے باقی ماندگان کہ نام و تخلصِ ایشاں بالا ترتیب حروف تہجی باشد افزود...... "7

تذکرہ کا آغاز آتش کے ذکر سے اور اختتام خیرالدین یاس کے نام اور کلام پر ہوا ہے۔ "فصل در خاتمہ" میں عاصی، مذاق، نفیس، سحر (امان علی) کا احوال لکھا ہے اور ان سب کے بعد :

تاریخ تذکرہ از کفایت علی کافی تخلص

جب ہوا یہ تذکرہ تالیف رشکِ گلستاں　یادگارِ شاعرانِ کشورِ ہندوستاں
فکرِ کافی سے ہوئی تاریخ اس کی آشکار　یہ عجب گلزار زیبا ہے بہارِ بے خزاں
1261ھ

ڈاکٹر حنیف نقوی نے منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کی ''ملخصِ تسلیم'' سے ان کی کہی ہوئی تاریخ اس طرح نقل کی ہے :

از مولف بتاریخ تذکرہ احمد حسن کاکوروی

شنیدم بتاریخ ی گفت ہاتف　کہ گلدستۂ نوبہارِ نزاکت
1261ھ

سحر نے اپنے تذکروں میں شاعروں کے تخلصوں کو حروفِ تہجی (ابتث) کے اعتبار سے مرتب کیا ہے۔ بہارِ بے خزاں میں انھوں نے شاعروں کے حالات میں اختصار سے کام لیا ہے لیکن بعض مقاموں پر بڑی اہم باتیں لکھ گئے ہیں مثلاً شیخ ناسخ کے ذکر میں ہے :

''فقیر از زبان سحر بیان واز دیوان پریشانش انچہ شنیدہ ودیدہ مختصر از اں داخل ایں تذکرہ می سازد۔''8

ناسخ کے دوسرے دیوان کا نام ''دفترِ پریشان'' ہے اس کا ذکر کم لوگوں نے کیا ہے۔ سحر نے غالباً دیوانِ پریشان کہہ کر اسی کا حوالہ دیا ہے۔

بہارِ بے خزاں میں امروہہ، مرادآباد، سہسوان، بدایوں، بریلی اور رامپور وغیرہ مقاموں کے بعض ایسے شاعروں کا احوال بھی قلمبند کر دیا ہے جن کے ذکر سے متداول تذکرے خالی ہیں۔ اس اعتبار سے بھی یہ تذکرہ قابلِ قدر ہے۔

آخر میں یہ ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ بہارِ بے خزاں اگرچہ 1261ھ (1845) میں مکمل ہو گیا تھا اس میں ''فصل در خاتمہ'' والے حصہ کا بعد میں اضافہ کیا گیا تھا۔

## 2- نفیس۔　محمد اشرف علی

مولوی محمد اشرف علی نام، نفیس تخلص، مولوی نجف علی کے بیٹے تھے۔ مولوی فضل رسول مست سے علوم رسمی کی تحصیل کی تھی۔ فنِ شعر میں ظہور اللہ خاں سے فیض پایا تھا۔ احمد حسین سحر نے ان کے

تعارف میں لکھا ہے :

''نفیس تخلص، مولوی اشرف علی بدایونی، از رووسائے عظامِ بدایوں است۔
آباواجدادش بہ عظمت واقتدار بر جملہ اقرانِ خویش شرف امتیاز داشتہ۔ اوخود ہم
بہ عہدۂ تحصیلداری و پیشکاری ملازمِ سرکار کمپنی بودہ۔ روزے چند است، کہ ترک
وتجرید پسندیدہ۔ طبعش از حسن پرستی بائے پریرویاں بہ دیوانگی میلے دارد۔
جنون ساختہ او خندہ بر دیوانگی بیسا ختہ می زند۔ فکر نقادش بہ فارسی واردو برقِ
درخشاں است کہ بحر وتصوّر تلاش معنی دلپذیر صد گوہر آبدار از صدف سینہ اش می غلطد۔
بہ قیاس ناقص فقیر ہچو او عالی طبع نقادِ معانی دریں قرب وجوار پیدانہ گردیدہ۔
ازعزیزانِ ظہور اللہ خاں نوا است۔ مثنوی باودیوان بادارد۔ دریں زماں تذکرہ
مبسوط زباں دانانِ اردو بہ تکلفے کہ می باید و بہ لطافتے کہ می شاید بہ وضع تاریخ تالیف
کردہ و بہ تلاش اصناف کلامِ شعرا بلاقید رطب ویابس وردسری برداشتہ۔ از ہر یکے
از انتخاب خودش بہ ایں تذکرہ می نگارم۔'' 9

نفیس کا مذکورہ تذکرہ نہ صرف سحر کی نظر سے گزرا تھا۔ بلکہ اس سے سحر نے کسی قدر استفادہ بھی کیا تھا۔ نفیس نے اپنا تذکرہ'' بہ وضعِ تاریخ '' تالیف کیا تھا اور اس میں مختلف اصنافِ شعری کے اقتباس بھی درج کیے تھے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس تذکرے کے بارے میں لکھا ہے :

''نفیس کے اس تذکرے کا نام ''انتخاب دہر'' تھا۔ یہ نام بظاہر تاریخی معلوم ہوتا ہے۔
اگر یہ قیاس درست ہے تو اس کا سالِ تالیف 1263ھ (=1847) ہوگا۔'' 10

معلوم ہوتا ہے کہ اقتباسِ بالا کی تحریر کے وقت نفیس کا تذکرہ زیرِ تالیف تھا اور اس کا نام اس کی تکمیل کے بعد رکھا گیا تھا۔ شاید یہی سبب ہے کہ سحر نے اپنے تذکرے میں اس کا نام نہیں لکھا ہے:

1857 کے ہنگاموں میں مولوی اشرف علی نفیس کو گرفتار کر کے انگریزوں نے گولی مار کر شہید کر دیا تھا۔

### 3- انوار- انوار حسین

یہ احمد حسین سحر کے دوستوں میں تھے چنانچہ ان کے بارے میں سحر نے جو لکھا ہے مختصراً اس طرح ہے:

> ''انوار تخلص، انوار حسین نام، از روٴسائے قصبہ سہسوان است۔ از مشقِ تازۂ خویش آب ورنگِ سخن معنی طرازانِ کہنہ مشق بہ خاک ریختہ...... کمتر بہ فکرِ شعری پرداز د۔ وحشتِ طبعش عارض ومزاجش بہ سخن پرستی مائل۔ تذکرۂ شعرا جمع کردہ وداد سخن آفرینی بادادہ۔ باراقم سطور اتحادِ دلی دارد..... اکنوں تسلیم تخلص می کند۔''11

تسلیم کے تذکرے کا ذکر کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ سحر نے جس زمانے کا یہ ذکر کیا ہے تسلیم ''تازہ مشق'' تھے۔ اسی زمانے میں یعنی 1261ھ (1845) میں یا اس سے کچھ پہلے تسلیم نے اردو گویوں کا تذکرہ لکھا ہوگا۔ اس کے بارے میں کوئی اور بات معلوم نہیں ہو سکی۔

# ل - مذہبی نثر

## ترجمے

### 1- غلام عباس

غلام عباس نامی کسی شخص نے اعتضاد الدولہ عزیز الملک ولایت حسین خان بہادر قائم جنگ کے حکم سے حدیث مفصل کا اردو نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ ترجمے کے آخر میں ایک قطعہ تاریخ درج ہے جس سے سالِ ترجمہ 1262ھ (1846) معلوم ہوتا ہے۔ اس ترجمے کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ اس کے ترقیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ :

> ''مجاور علی ولد میر قربان علی کربلائی نے نواب صاحب وقبلہ فیاضِ زماں حاتمِ دوراں
> نواب محمد سعید خان بہادر دام اقبالہٗ کے حکم سے 25 ربیع الثانی 1265ھ
> (21 مارچ 1849) کو اس کی کتابت کی تھی۔'' [1]

ترجمہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:

> ''تسبیح کرتا ہے اللہ کی جو کہ آسمان اور زمین میں ہے......روایت کی ہے محمد بن سنان
> نے کہ مفصل بن عمر نے کہا ہے کہ ایک دن میں بعد عصر......الخ ''

اور خاتمہ کے الفاظ اس طرح ہیں :

امیدواری حضرت باری سے یہ ہے کہ دین و دنیا میں نفع تام اس کا عاید بحال فرخندہ مآل جناب محتشم الیہ کے ہو اور اس زلہ ربائے خوان احسان عمیم کو بھی اس ذریعۂ حسنات سے بہ طفیل اُسی جناب کے تکفیر سیئات کے ہووے۔ واللہ مجیب الدعوات وموفق الحسنات ومذہب السیئات۔ وَالحمد للہ اولاً وآخراً۔"

یہ ترجمہ 127 اوراق پر محیط ہے۔ ہر صفحہ میں گیارہ سطریں ہیں۔

## 2- حیدر علی شاہ

سید حیدر علی شاہ ولد سید اسد علی شاہ اپنے وقت کے سُنّی عالموں میں سے تھے۔ انھوں نے قرآن پاک کے آخری پارہ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ وہ عملاً تفسیر کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ خاتمہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کام 5۔ رجب 1270ھ (4۔ اپریل 1854) کو مکمل ہوا تھا۔ اس کا جو مخطوطہ رامپور کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔2 اس میں کُل 186 ورق ہیں۔ بیچ بیچ سے کچھ ورق غائب ہیں۔ ہر صفحہ پر سولہ سطریں ہیں۔ ترجمہ کا آغاز ان کلمات سے ہوتا ہے :

"شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بہت مہربان ہے۔ نہایت رحم والا ہے۔ سورہ عمّ مکّے میں نازل ہوئی۔ 40 آیتیں اور ایک سو ہجتر کلمہ اور 770 حرف ہیں۔ جب حضرت نبی صلعم نے اللہ کی طرف سے پیغمبری کا خلعت پہنا۔ الخ"

## 3- مفتی محمد سعد اللہ

مفتی محمد سعد اللہ نام، آشفتہ تخلص، شیخ نظام الدین مرادآبادی کے بیٹے 1219ھ (1804-05) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی جا کر مفتی صدر الدین آزردہ اور شاہ عبدالعزیز وغیرہ اکابر علما سے کسب فیض کیا۔ پھر لکھنؤ میں مفتی ظہور اللہ وغیرہ عالموں سے استفادہ کیا۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کی دعوت پر رامپور پہنچے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ 14۔ رمضان 1294ھ (1877) کو وہیں وفات پائی۔ تاریخ ہوئی ۔ مات مفتی الانام سعد اللہ

1294ھ

مفتی سعد اللہ شعر بھی کہتے تھے چنانچہ امیر مینائی کے تذکرے میں ہے :

"آشفتہ مولانا واستادنا حاجی مولوی محمد سعد اللہ خلف ارشد مولوی محمد نظام الدین مغفور مرادآبادی، جامعیت فضل وکمال میں مشہور آفاق۔ ہندوستان میں ہزاروں کے استاد۔ مولوی صاحب کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ بعض ناتمام بھی ہیں اور کچھ چھپ گئی ہیں۔ برسوں دہلی اور لکھنو میں رہے۔ اب سرکار فیض آثار کی قدردانی سے بہ اعزاز واکرام منصب حکومت مرافعۂ عدالتین پر مامور ہیں۔ اکہتر برس کی عمر ہے۔"3

مولانا نے ترجمے کا کام بھی کیا تھا۔ امام اعظم ابوحنیفہ کے "فقہ اکبر" کا انھوں نے 1255ھ (1839-40) میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ لکھنؤ سے چند بار چھپ چکا ہے۔ اس کے بارے میں خود مترجم کے الفاظ یہ ہیں :

"یہ کتاب ہے اصل توحید اور اعتقاد صحیح کے بیان میں۔ واجب ہے ہر مسلمان پر کہ سب صدق دل سے یقین لایا میں اللہ پر اور اس کے سب فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور جلا اُٹھانے پر پیچھے مرنے کے، اور خیر وشر کی تقدیر پر کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہے اور حساب ہونا اور تلنا اعمال کا قیامت میں اور بہشت اور دوزخ سب حق ہے اور اللہ تعالیٰ ایک ہے، عدد سے نہیں، پر اس راہ سے اس کا کوئی ساجھی نہیں۔"

اس کتاب کا نام "اصل التوحید وما یصح الاعتقاد علیہ" ترجمہ کا اختتام ان الفاظ پر ہوا ہے:

"نکلنا دجال اور یاجوج اور ماجوج کا اور نکلنا سورج کا مغرب کی طرف سے اور اترنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے اور باقی نشانیوں قیامت کا جیسا وارد ہوا ہے صحیح حدیثوں میں حق ہے، مقرر ہونے والا ہے اور اللہ تعالیٰ ہدایت کرتا ہے جس کو چاہے راہ سیدھی۔"3

مترجم نے اس ترجمے کے ساتھ حل لغات، تشریح مصطلحات، اختلاف نسخ اور بعض دوسری توضیحات پر مشتمل حواشی بھی لکھے ہیں۔ اصل متن پر بخوبی نظر رکھی گئی ہے اور لفظی ترجمہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس سے ترجمے کی زبان بھی متاثر ہوئی ہے۔

### 4- ملا محمد نظام الدین

ملا محمد نظام ابن واجد علی شاہ محب اللہ 1795 (10-1209ھ) میں شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد رامپور چلے گئے۔ پھر دہلی میں علم حدیث کی تکمیل کی۔ 1890 (08-1307ھ) میں شاہجہاں پور میں وفات پائی انھوں نے فارسی سے اردو زبان میں یہ ترجمے کیے تھے :

تحفۃ المسلمین ترجمہ مسائل اربعین، رسالۂ عقیقہ

دونوں ترجمے 1260ھ (1844) میں مکمل ہوئے تھے۔

مسائل اربعین شاہ محمد اسحاق دہلوی کی تالیف ہے۔ مولوی سعد الدین عثمانی نے 1256ھ (41-1840) میں پہلی بار اس کا ترجمہ کیا تھا۔ ملا محمد نظام نے دوسری مرتبہ از سر نو اس کا ترجمہ کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ :

''اس کتاب میں اگر چہ سوال اور حاصل جواب کی عبارت زبان فارسی میں تھی لیکن اردو عربی کی کتابوں کی عبارت یا قرآن کی آیت اور حدیث جو سند کے واسطے مرقوم تھی سو بے ترجمہ تھی۔ تو اس کا سمجھنا فقط فارسی پڑھے آدمی پر تو دشوار تھا ہی، جس کو عربی میں استعداد کم ہو اس کو بھی فائدہ تام نہیں حاصل ہوتا تھا، اس واسطے اس خیر خواہ اسلام محمد نظام شاہجہانپوری نے سن بارہ سو ساٹھ ہجری میں اس کا ترجمہ اردو زبان میں کر دیا تا کہ ہر مسلمان اس سے پورا فائدہ پاوے اور حرف آشنا آدمی بھی پڑھ کر یا محض بے علم سُن کر اس کو اپنی شادی و غمی میں دستور العمل بناوے اور تحفۃ المسلمین ترجمہ مسائل اربعین اس کا نام رکھا۔''

آغاز کے کچھ فقرے یہ ہیں :

''سزاوار حمد وہ خالق بے مثال ہے کہ ہماری تعلیم کے واسطے ایسے نبی آخر الزماں کو پیدا کیا کہ جن کی تعریف میں عجز سے چُپ رہنا عین کمال ہے اور لائق شکر کے وہ قادر ذو الجلال ہے کہ ہماری تربیت کے لیے ایسے رسول اولو العزم کو بھیجا کہ ان کی مدح میں زبان ناطقہ لال ہے۔ سبحان اللہ کیا شان ہے اُس کی کہ واسطے پرورش اولاد کے

ماں باپ کو محبت دلی عطا فرمائی اور بہ زبان رسول مقبول اپنے کے تربیت اور تادیب کی راہ بتائی۔''5

اور کتاب کا خاتمہ ان لفظوں پر ہوا ہے :

مولوی امین الدین صاحب جو ان جوابوں کے لکھنے والے ہیں وہ بھی سید پاک اور دین اسلام کے عقیدے میں چست و چالاک ہیں۔ ساری بدعات سے جو آج کل سادات میں رائج ہیں تائب و بیزار اور ہر خرافات سے دست بردار ہو کر پاک صاف مسلمان ہو گئے ہیں اور علم حدیث میں بہت سی مہارت رکھتے ہیں۔ بہر تقدیر مسلمان کو چاہیے کہ ان مسائل میں کسی طرح کا شبہ اور خیال فاسد دل میں نہ لائے اور آنکھ بند کیے عمل کیے جاوے۔ ''

مترجم نے اس کتاب میں کوشش کی ہے کہ وہ اہل دہلی کے تتبع میں بامحاورہ ترجمہ کریں۔

دوسری کتاب مولوی تراب علی لکھنوی کی تالیف ہے جس کا نام یہ ہے :

'' عجالۃ الدقیقۃ فی مسائل العقیقۃ ''

مترجم نے اس ترجمے میں بعض توضیحی حواشی بھی تحریر کیے ہیں۔ کتاب کا آغاز اس عبارت سے ہوا ہے :

'' یہ خمول و گمنام محمد نظام اس رسالہ کے مطالعہ فرمانے والوں کی خدمت میں بعد سلام سنۃ الاسلام کے یہ عرض کرتا ہے کہ اس عرصے میں ایک رسالہ عقیقے کے بیان میں مولوی تراب علی صاحب کی تالیف کہ انھوں نے بہت سی کتابوں سے تلاش کر کے لکھا ہے..... اس خاکسار کی نظر سے گذرا چونکہ رسالہ مذکور زبان فارسی میں تھا بلکہ اکثر روایات عربیہ کا ترجمہ بھی نہ تھا اور اکثر مسلمانوں کو ان مسائل کی حاجت پڑا کرتی ہے....... یوں بہتر معلوم ہوا کہ اس کو اردو میں لکھ دیا چاہیے....... سو یہ ترجمہ سنہ بارہ سو ساٹھ ہجری مقدسہ علی باجرہا الصلوٰۃ والسلام میں لکھا گیا۔''

کتاب کا اختتام ذیل کی عبارت پر ہوا ہے :

'' مصنف نے اس رسالے کے آخر میں لکھا ہے کہ جو ماں باپ کا حق اولاد پر اور استاد

کا حق شاگرد پر اور پیر کا حق مرید پر ہے اس کا بیان جہادیہ رسالہ میں خوب تشریح سے
ہم نے لکھا ہے۔ اس رسالے میں تطویل کے سبب نہ بیان کیا۔ جس کو دیکھنا ہو تلاش
کر کے اس میں دیکھ لے۔"

ملا محمد نظام کے ان دونوں رسالوں کی نثر نہایت سلیس، فصیح اور رواں ہے۔ یہ تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ اردو نثر کے مؤرخوں نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ شاید اس وجہ سے کہ دلی اور لکھنو کی زبان نے طبیعتوں کو اس طرح مسخر کر لیا تھا کہ دوسروں کے کارناموں کی طرف دیکھنے کی صورت نہ ہو سکی۔

# تالیفات

## 1- قاری فخر اللہ

قاری حافظ حاجی فخر اللہ ابن شیخ اسلم صدیقی رامپوری داماد اور شاگرد تھے قاری حافظ حاجی مولوی محمد نسیم کے اور وہ شاگرد تھے قاری عبید اللہ کے اور وہ مولانا مغربی کے۔ قاری فخر اللہ نے فنِ تجوید سے متعلق اردو میں ایک کتاب فخر المتعلمین کے نام سے لکھی تھی۔[6] اس میں ہے :

> "پس اب کہ سن 1258ھ (1842) میں بہ پاس خاطر دریا مقاطر حاجی حافظ میاں کبیر احمد صاحب دام اشفاقہم کے اور بہ ایمائے عالی استاذی مخدومی مولوی مفتی محمد شرف الدین صاحب دام فیوضہم کے بیچ عہد والی ملک روہیل کھنڈ نواب مستطاب محمد سعید خان بہادر دام اقبالہ و تام افضالہ کے (لکھی)"

کتاب کے آغاز میں مذکور ہے :

> "حمد بے حد و ثنائے بے عد ایسے خالق تئیں سزاوار ہے کہ جس نے پیدا کیا جن اور انس، زمین اور آسمان کو......اور رحمت ہوجیو اوپر چاروں یاروں ان کے کہ وہ وجود اسلام کے بہ منزلہ عناصر اربعہ کے ہیں......بعد حمد اور صلوٰۃ کے کہتا ہے اضعف العباد حاجی حافظ فخر اللہ قاری ولد شیخ اسلم صدیقی مغفور کہ نسبت دامادی اور شاگردی کی ساتھ

حاجی حافظ مولوی قاری محمد نسیم مرحوم کے رکھتا ہے اور وہ شاگرد تھے قاری عبیداللہ کے
اور وہ مولانا مغربی کے۔ بندے نے قاری صاحب مرحوم سے قرآن مجید حفظ کیا اور
علم قرات کا پڑھ کر عمل سیکھا۔"

کتاب میں ایک مقدمہ، بائیس فصلیں اور ایک خاتمہ ہے۔ اس کے مخطوطہ رامپور کا ترقیمہ
اس طرح ہے :

" تمام شد رسالہ فخر المتعلمین در علم تجوید، بہ روز جمعہ بہ تاریخ پنجم شہر ربیع الثانی
1262ھ"

امتیاز علی خاں عرشی کا کہنا ہے کہ" میں اسے مصنف ہی کا نوشتہ مانتا ہوں"اس میں کل
100 ورق ہیں اور ہر صفحہ پر 19 سطریں ہیں۔

## 2- قاضی عبدالسلام

مولوی فقیر محمد جہلمی نے ان کے علمی کارناموں کا بیان اس طرح کیا ہے :

" قاضی عبدالسلام بن عطاء الحق بدایونی۔ اعاظم محدثین اور کبرائے مفسرین میں سے
جامع علوم عقلیہ ونقلیہ تھے۔ تفسیر زاد الآخرہ منظوم آپ کی عمدہ تصانیف میں
1244
سے ہے جس کو آپ نے 1244ھ (=29-1828) میں تقریباً دو لاکھ اشعار آبدار
میں تصنیف کیا اور نام بھی اس کا تاریخی مقرر کیا جس سے وہ اسم بامسمّٰی ہو کر مقبول
خاص وعام ہوئی اور اصول فقہ میں منار کی شرح المسمّٰی بالانشراحات العالیہ تصنیف کی۔
وفات آپ کی 1257ھ (1841) میں ہوئی۔ فخر کاشانہ تاریخ وفات ہے۔" 8
1257

## 3- وزیر علی

ان کے مفصل حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ جو کچھ معلوم ہے یہ ہے کہ ان کا نام محمد وزیر علی تھا
اور یہ شیخ وارث علی وکیل کے بیٹے تھے جو مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ 1263ھ (1847)
میں انھوں نے ایک رسالہ "سراج الحجاج" کے نام سے لکھا تھا۔ 9 اس رسالے کو محمد سعد اللہ نے

مرتب کیا تھا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ذخیرۂ شیرانی میں محفوظ ہے جس کی کتابت محمد ابراہیم نامی کسی شخص نے کی تھی۔ یہ 77 اوراق پر محیط ہے۔

4- مفتی محمد سعد اللہ

مفتی محمد سعد اللہ مرادآبادی کے حالات ترجموں کے سلسلے میں لکھے جاچکے ہیں۔ انھوں نے اردو نثر میں بعض کتابیں تالیف بھی کی تھیں۔ 10 یہاں مختصراً ان کا تعارف کرایا جاتا ہے:

الف۔ رسالہ فضائلِ امام ابوحنیفہ۔

مطبع محمدی لکھنو کے مالک محمد حسین کی خواہش سے مفتی سعد اللہ نے امام ابوحنیفہ کے مختصر سوانح، علمی کمالات اور فضائل پر مشتمل یہ چھوٹا سا لیکن جامع رسالہ 1260ھ (1844) میں لکھا تھا۔ اس رسالہ کو ''ترجمہ فقہ اکبر'' کے شروع میں شامل کردیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں خود مصنف کا بیان یہ ہے:

''...... بعد اس کے جاننا چاہیے کہ کئی برس پہلے اس عاجز نے بعض احباب کی فرمائش سے فقہ اکبر کا ترجمہ اردو زبان میں کیا تھا۔ وہ ترجمہ کئی مرتبہ چھپ چکا ہے..... ان دنوں میں برادر دینی اور دوست قدیمی زبدۂ کونین حاجی محمد حسین صاحب نے اصرار کیا کہ بعضے حالات امام ابوحنیفہ کے بھی تیمناً اور تبرکاً اس ترجمے کے اول میں لکھے جائیں تا اس مرتبہ یہ رسالہ کمالِ صحت کے ساتھ واسطے فائدہ مسلمان بھائیوں کے چھاپہ کیا جائے۔ ہرچند فضل و کمال امام صاحب کے سارے جہان پر روشن ہیں اور صدہا کتابیں آپ کے مناقب میں موافق و مخالف مذہب سے تصنیف ہیں۔''

اس رسالے کے اختتام کی عبارت یہ ہے:

''کہتے ہیں کہ امام صاحب کی تین کتاب تصنیف ہیں۔ باقی زبانی منقول ہیں۔ ایک کتاب العالم والمتعلم، دوسری کتاب آخر رسالہ کہ ابوعثمان تستی کو پہنچی تھی، تیسری کتاب فقہ اکبر کہ آپ کے شاگرد ابومطیع نے روایت کی ہے اور بعض کہتے ہیں کتاب مقصود صرف یہی لکھی ہے۔''

ب۔ زادالسبیل الی دارالخلیل

مفتی محمد سعداللہ 1270ھ (1854) میں حج بیت اللہ شریف کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمراہیوں کی فرمائش سے حج وزیارت کے مسائل سے متعلق انھوں نے یہ رسالہ دورانِ سفر لکھ ڈالا تھا۔اس میں خود کہتے ہیں :

"لما بعد عرض کرتا ہے بندہ سراپا گناہ محمد سعداللہ...... کہ یہ فقیر توفیق الٰہی سے سن 1270ھ میں حج کے ارادے سے جب قصبہ دھولیہ تک پہنچا، یارانِ ہمدم ورفیقانِ راسخ قدم نے التماس کیا، مناسکِ حرمین کو زبان اردو میں لکھنا چاہیے......... لہٰذا اس عاجز نے اسی شب میں لکھنا شروع کیا اور باوجود رواروی اور بے سامانی اور مرض اور ناتوانی کے عین سفر بحر و بر میں کچھ کچھ لکھتا رہا۔ الحمدللہ کہ ہنوز بندر کے تک نہیں پہنچا تھا کہ یہ رسالہ بہ توفیق ایزدی تمام ہوا، لہٰذا اس رسالے کا زادالسبیل الی دارالخلیل نام ہوا۔"

حج ادا کرنے کے بعد مفتی صاحب نے اس رسالے پر نظرِ ثانی کی۔اس کا ذکر انھوں نے حاشیہ پر کیا ہے۔رسالہ کا اختتام ان جملوں پر ہوا ہے :

"پھر گھر میں جا کر دوگانہ تحیۃ المنزل کا پڑھے اور ہمیشہ بقیۃ العمر خیر وصلاح میں پہلے سے زائدتر مشغول رہے کہ یہ علامت ہے حج مبرور کی۔ خداوندا تو اس عاجز کو اور اپنے ساتھ والوں کو ان باتوں کی توفیق دے اور حج مبرور وزیارت مقبول بہ طفیلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نصیب کیجیے اور دارنا پائدار سے باایمان اٹھائیو۔"

یہ رسالہ مطبع مصطفائی لکھنو میں چھپا تھا۔

# م - علمی کتابیں

## 1- مدن پال

بہادر شاہ ثانی کے عہدِ سلطنت میں رامپور میں علوم وفنون سے متعلق تصنیف، تالیف اور ترجمے کے کام کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔ یہاں مثال کے طور پر صرف ایک دو کتابوں کا حال تحریر کیا جاتا ہے۔

الف۔ نگھنٹ

یہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے بمعنی "شبداولی" (=لُغت) خصوصاً وہ جو ویدوں سے متعلق ہو۔ عُرفِ عام میں اس کلمہ کا اطلاق لُغت کے علاوہ قواعد کی کتابوں پر بھی ہوتا ہے۔ سنسکرت زبان میں الگ الگ علوم وفنون کی "نِگھنٹ" موجود ہیں مثلاً :

نکھتر نگھنٹ = علمِ جیوتش سے متعلق

دھونتر نگھنٹ = ویدک اصطلاحوں پر مبنی

نگھنٹ شیش = نباتات کے بارے میں

معمولاً سنسکرت زبان میں نگھنٹ منظوم ہوتی ہیں۔ ان میں مرادف الفاظ کو اس طرح جمع کر دیا جاتا تھا کہ ان کو زبانی یاد کر لینا آسان ہو جائے۔ نگھنٹ کے لکھے جانے کا سلسلہ بہت بعد

تک جاری رہا ہے۔ شاہ عالم ثانی کے آخر زمانے میں یا شاید اکبر شاہ ثانی کے ابتدائی دور میں راجا مدن پال نامی ایک شخص نے ادویہ اور اغذیہ سے متعلق ویدک اصطلاحوں کی ایک نگھنٹ مرتب کی تھی جو کئی ابواب پر منقسم تھی۔ نمیہ کتاب تادیر آیورویدک درسیات میں شامل رہی ہے۔ اس کی تدریسی اور نصابی افادیت کے خیال سے کسی شخص نے اس کو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں منتقل کر دیا تھا۔ اس ترجمہ کا جو نسخہ رامپور کے کتب خانے میں محفوظ ہے وہ اردو نستعلیق اور دیوناگری دونوں خطوں میں لکھا ہوا ہے۔ ترقیمہ بھی سنسکرت اور فارسی دونوں زبانوں میں ہے، اس طرح :

"اِتی سری مدن پال برچتے مدن بنود نگھنٹ اوسرگ برگ سماپتہ نگھنٹ سنپورن سوبھستو۔ بتاریخ ہفتم ذیقعدہ سنہ 1254ھ مطابق سیوم فروری سنہ 1839 عیسوی موافق پنچمی بدی ماہ پھاگن روز یکشنبہ سمبت 1895 صورت، اتمام پذیرفت۔"

اس ترقیمہ کا پہلا (سنسکرت) جز دنگھنٹ کے ہر باب (برگ) کے خاتمہ پر ضروری تبدیلیوں کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔ کتاب میں بعض جگہوں پر کئی کئی سطروں کی سنسکرت عبارت بھی ترجمہ کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔

اس ترجمے کے حاشیوں پر حکیم محمد شریف خاں (متوفی 1231ھ 1816) کی "تالیفِ شریف" کے اقتباس بھی لکھے ہوئے ہیں۔ یہ صورتِ حال اس حقیقت کی صاف غمازی کر رہی ہے کہ آیورویدک طریقۂ علاج آخر آخر تک یونانی طب سے اثر پذیر رہا ہے اور یہی معاملہ یونانی علمِ طب کا بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس نے آیورویدک طریقۂ علاج سے کم و بیش استفادہ کیا ہے۔

## 2- آئینِ سپاہ

کرنل جیمس اسکنر صاحب بہادر نے رجمنٹ اول ہندستانی کے لیے زبانِ فارسی میں "کتاب آئین معمولی" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ کسی شخص نے اس کا ترجمہ اردو زبان میں "کتاب آئینِ سپاہ" کے نام سے کر دیا تھا۔ دیباچے میں اس کے مترجم نے لکھا ہے:

"جناب مستطاب نواب محمد سعید خان بہادر دام ملکہٗ نے بعد جلوس اور زیب فرمائی مسند حکومت کے اس ملک رامپور کو رونق تازہ اور نظارت بے اندازہ آبیاری تدابیر

صائبہ اور حکمتِ بالغہ اپنی سے عنایت کی اور انتظام مالی و ملکی ایسا فرمایا کہ جیسا چاہیے
تھا، علی الخصوص ترتیب فوج پر جب خیال آیا تھوڑی توجہ میں بندوبست سوار اور
پیادوں کا بخوبی قرار واقعی ہو گیا چنانچہ ایک رجمنٹ کا "رسالہ فتح جنگ" پسندِ خاطر
مبارک ہوا۔ اس واسطے قلمبند ہونا ضوابط اور قواعد کل امور متعلقہ رسالہ بہ نظر ہدایت
افسروں اور سپاہیوں کے مناسب متصور ہوا۔ "2

کتاب کے قلمی نسخہ مخزونہ رضا لائبریری کے مطالعہ کے بعد امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے :

"بعید نہیں کہ اس کے کاتب سید امیر شاہ رامپوری ہی نے یہ ترجمہ کیا ہو...کاتب نے
سہ شنبہ 5۔ محرم 1259ھ (7 فروری 1843) تاریخ کتابت لکھی ہے اور نواب سید
محمد سعید خان بہادر 21۔ جمادی الثانیہ 1256ھ (20۔ اگست 1840) کو تخت
نشین ہوئے تھے، اس لیے ترجمہ ان دو تاریخوں کے درمیان کیا جانا چاہیے۔"

ترجمہ کا آغاز ان کلمات سے ہوا ہے :

"بعد حمد منتظم رسالۂ موجودات اور نعت افسر کل کائنات کے صاحبانِ قواعد شناس پر
ظاہر ہو جیو کہ جناب مستطاب نواب صاحب........."

یہ رسالہ کل 28 ورقوں پر محیط ہے اور ہر صفحہ پر تیرہ سطریں ہیں۔

### 3- لب لباب رمل

رضا لائبریری رامپور میں اس کتاب کا جو قلمی نسخہ ہے ناقص الآخر ہے۔ بصورتِ موجودہ اس میں کل 64 ورق ہیں اور ہر صفحہ پر 13 سطریں ہیں۔ 3 دیباچے میں مولف نے اپنے خاندانی حالات اور اپنے بھائی نواب مجید الدین احمد خان بہادر عرف نواب مجو خاں شہید کی اور خود اپنے گھر کی 1857 کی بغاوت میں تباہی کا بیان کیا ہے۔ کتاب کا آغاز ان کلمات سے ہوا ہے:

"الحمد للہ رب العالمین........امابعد ہیچ مداں محمد سعید الدین احمد خاں خلف نواب
محمد الدین احمد خاں صاحب مرحوم مغفور رئیس خاص شہر مراد آباد کا ہے۔ وطن ہمارے
بزرگوں کا شہر بلخ تھا..... الخ"

اس کتاب کے بارے میں امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے جو کچھ لکھا ہے، مختصراً یہ ہے :

" یہ کتاب جس میں ہدایت الرمل، خلاصۃ الرمل، سرخاب اور آفتاب الرمل وغیرہ سے قاعدے ابتدا سے انتہا تک چھانٹ کر اردو زبان میں لکھے گئے ہیں نواب محمد سعید الدین احمد خان بہادر فاروقی مرادآبادی کی تالیف ہے......... مولف نے 11۔ ربیع الثانی اور 8۔ جمادی الاولی 1303ھ ( 27 جنوری و 16۔ فروری 1886 ) کے درمیان انتقال کیا....... نسخے کی ٹیپ ٹاپ بتاتی ہے کہ یہ خود مولف کا نسخہ ہے۔"

کتاب کا سال تالیف معلوم نہیں ہے۔ اس کے دیباچے کے بارے میں ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ 1857 کے بعد لکھا گیا تھا۔

# ن - مطبعے

نواب یوسف علی خاں ناظم کے حال میں امیر مینائی نے ضمناً رامپور کے ایک قدیم لیکن موقر مطبع کا ذکر اس طرح کر دیا ہے :

"دوبارآپ (نواب ناظم) کے نتائج افکار مطبع حسنی رامپور میں طبع ہوئے ہیں۔ اوّل مرتبہ دیوان مختصر جو صرف مرزا اسد اللہ خان غالب کا دیکھا ہوا تھا چھپا ہے اور دوسری مرتبہ وہ کلام جو منشی مظفر علی خاں صاحب اسیر کی نظر سے گذرا ہوا تھا کلامِ اوّلیں میں شریک ہو کر طبع ہوا ہے۔"1

اقتباس بالا میں جس پہلے ایڈیشن کا ذکر ہے وہ 1278ھ (62-1861) میں چھپا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مطبع حسنی 1861 سے پہلے کسی وقت جاری ہوا تھا۔ اس کے مالک محمد حسن خاں نامی ایک شخص تھے۔ حافظ احمد علی خاں شوق کے تذکرے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اخبار دبدبۂ سکندری کے مالک تھے اور بنگلہ آزاد خاں کے محلّے میں رہتے تھے۔2 یہ مطبع بھی وہیں تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں غالباً اسی مطبع کا نام "مطبع دبدبۂ سکندری" ہو گیا تھا۔3

مطبع حسنی سے پہلے رامپور میں صرف ایک مطبع کا پتہ چلتا ہے جس کا نام مطبع سعیدی تھا۔ یہ نواب محمد سعید خان بہادر کے وقت کا سرکاری مطبع تھا اور بہت بعد تک کام کرتا رہا تھا۔ اس مطبع کی چھپی ہوئی کئی کتابوں کا ذکر تذکرہ کاملانِ رامپور میں موجود ہے۔

# حواشی

## الف - غزل

رامپور

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | انتخاب یادگار | | ص68تا69 |
| 2- | مخطوطات رامپور، اردو | جلد1 | ص7تا8 |
| 3- | انتخاب یادگار | | ص224 |
| 4- | ایضاً | | ص265 |
| 5- | ایضاً | | ص337 |
| 6- | ایضاً | | ص338 |

| | | |
|---|---|---|
| 1- | سخن شعرا | ص498 |
| 2- | انتخاب یادگار | ص30 |
| 3- | ایضاً | ص384 |
| 4- | ایضاً | ص386 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| -5 | ایضاً | | ص25تا26 |
| -6 | دیوان ذوق | | ص199تا200 |
| -7 | ایضاً | | ص98 |
| -8 | گلستان سخن | جلد2 | ص310تا311 |
| -9 | انتخاب یادگار | | ص76 |
| -10 | گلستان سخن | جلد1 | ص338تا338 |
| -11 | انتخاب یادگار | | ص90 |
| -12 | گلستان سخن | جلد1 | ص314 |
| -13 | انتخاب یادگار | | ص81تا82 |
| -14 | ایضاً | | ص115 |
| -15 | خمخانہ جاوید | جلد2 | ص464 |
| -16 | گلستان سخن | جلد2 | ص319 |
| -17 | انتخاب یادگار | | ص318 |

## بریلی

| | | | |
|---|---|---|---|
| -1 | انتخاب یادگار | | ص33 |
| -2 | سراپا سخن | | ص14 |
| -3 | خمخانہ جاوید | جلد3 | ص333 |
| -4 | مجاہد شعرا | | ص237 |
| -5 | سراپا سخن | | ص87 |
| -6 | خمخانہ جاوید | جلد2 | ص286 |
| -7 | مجاہد شعرا | | ص337تا362 |

## بدایوں

| | | | |
|---|---|---|---|
| -1 | انتخاب یادگار | | ص17 |

| | | |
|---|---|---|
| 2- بہارِ بے خزاں | | ص52 |
| 3- مجاہد شعرا | | ص230 تا 243 |
| 4- بہارِ بے خزاں | | ص71 |
| 5- خمخانۂ جاوید | جلد 4 | ص498 |
| 6- بہارِ بے خزاں | | ص129 |
| 7- روزِ روشن | | ص619 تا 621 |
| 8- بہارِ بے خزاں | | ص85 |
| 9- سراپا سخن | | ص22 |
| 10- خوش معرکۂ زیبا | جلد 1 | ص413 |
| 11- سراپا سخن | | ص247 |

## مرادآباد

| | | |
|---|---|---|
| 1- خمخانۂ جاوید | جلد 2 | ص151 |
| 2- مجاہد شعرا | | ص291 تا 296 |
| 3- خوش معرکۂ زیبا | جلد 1 | ص39 |
| 4- سراپا سخن | | ص158، 376 |
| 5- انتخابِ یادگار | | ص140 |
| 6- مجاہد شعرا | | ص401 تا 405 |

## شاہجہان پور

| | | |
|---|---|---|
| 1- سراپا سخن | | ص |
| 2- بہارِ بے خزاں | | ص52 |
| 3- سراپا سخن | | ص128 |
| 4- خمخانۂ جاوید | جلد 2 | ص464 |
| 5- گلستانِ سخن | جلد 2 | ص16 تا 17 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 6- | ایضاً | جلد2 | ص268 |

## ب - نعت

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | انتخاب یادگار | | ص120 |
| 2- | گلستان سخن | جلد1 | ص414 |
| 3- | گلشن بے خار | | ص91 |
| 4- | کاملانِ رامپور | | ص352 |
| 5- | دیوان ذوق | | ص98تا99 |
| 6- | گلستان سخن | جلد2 | ص80تا81 |
| 7- | خمخانہ جاوید | جلد5 | ص218 |
| 8- | انتخاب یادگار | | ص219 |
| 9- | ایضاً | | ص218 |
| 10- | نعت گویان بریلی | | ص98 |
| 11- | سخن شعرا | | ص395 |
| 12- | نعت گویان بریلی | | ص113 |
| 13- | اردو مخطوطات آصفیہ | جلدا | ص72 |
| 14- | اردو مخطوطات علی گڑھ | | ص381 |

## ج - مثنوی

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | انتخاب یادگار | | ص8تا9 |
| 2- | ایضاً | | ص53 |
| 3- | سراپا سخن | | ص182 |
| 4- | انتخاب یادگار | | ص74 |
| 5- | کاملانِ رامپور | | ص115 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 6- | ایضاً | | ص352 |
| 7- | ذخیرۂ شیرانی | | ص18 |
| 8- | مجاہد شعرا | | ص333 |
| 9- | مجموعۂ سخن | حصہ 1 | ص2 |
| 10- | قاموس الکتب | جلد 1 | ص1010 |
| 11- | انتخاب یادگار | | ص298 |
| 12- | کاملان رامپور | | 290 تا 291 |
| 13- | خمخانۂ جاوید | جلد 2 | ص70 |

د - نوحہ وسلام

| | | |
|---|---|---|
| 1- | انتخاب یادگار | ص65 |
| 2- | ایضاً | ص68 |
| 3- | ایضاً | ص116 تا 117 |
| 4- | ریاض الفصحا | ص295 |
| 5- | انتخاب یادگار | ص7 |
| 6- | ایضاً | ص303 |
| 7- | ایضاً | ص151 |
| 8- | ایضاً | ص175 تا 176 |
| 9،10- | مغنیان ہندوستان | ص27 |

ہ - قصیدہ

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | انتخاب یادگار | | ص55 |
| 2- | جواہر سخن | جلد 3 | ص432 |

ز - مخمس

| | | |
|---|---|---|
| 1- | انتخاب یادگار | ص128 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 2- | ایضاً | | ص147 |

## ح - تاریخ گوئی

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | انتخاب یادگار | | ص115 |
| 2- | ایضاً | | ص171 |
| 3- | خمخانہ جاوید | جلد3 | ص254 |
| 4- | خوش معرکہ زیبا | جلد1 | ص39 |
| 5- | سراپا سخن | | ص376 |
| 6- | گلستان سخن | جلد1 | ص530 |
| 7- | انتخاب یادگار | | ص205 |
| 8- | انتخاب یادگار | | ص280 |
| 9- | کاملان رامپور | | ص8تا9 |

## ط - کبت وغیرہ

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | عجائب القصص | | ص367 |
| 2- | انتخاب یادگار | | ص84 |
| 3- | ایضاً | | ص26تا27 |
| 4- | ایضاً | | ص320تا321 |
| 5- | ایضاً | | ص57تا58 |

## ی - داستانیں

اس جزو کے لیے ڈاکٹر سہیل بخاری کی کتاب ''اردو داستان'' سے استفادہ کیا گیا ہے۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | انتخاب یادگار | | ص111 |
| 2- | گلستان سخن | جلد1 | ص |
| 3- | انتخاب یادگار | | ص146 |
| 4- | خمخانہ جاوید | جلد3 | ص383تا384 |

5- انتخاب یادگار ص147

6- اردو داستان ص213

7- انتخاب یادگار ص150

8- ترجمہ ہائے متون فارسی ص268

## ک - تذکرے

1- بہار بے خزاں ص67

2- ریاض الفصحا ص132 تا 133

3- تلاش و تعارف ص39 تا 42

4- بہار بے خزاں ص84

5- تلاش و تعارف ص58

6- ایضاً ص58 تا 60

7- بہار بے خزاں ص5 تا 7

8- ایضاً ص112

9- ایضاً ص138

10- تلاش و تعارف ص58

11- بہار بے خزاں ص44

## ل - مذہبی نثر

### ترجمے

1- فہرست مخطوطات اردو رامپور ص38

2- ایضاً ص23

3- انتخاب یادگار ص1 تا 3

4- علما کا حصہ ص467 تا 469

5- ایضاً ص485 تا 495

### تالیفات

| | | |
|---|---|---|
| -6 | علما کا حصہ | ص479تا481 |
| -7 | فہرست مخطوطات اردو رامپور | ص5تا7 |
| -8 | حدایق الحنفیہ | ص491 |
| -9 | ذخیرہ شیرانی | ص14 |
| -10 | نثر میں علما کا حصہ | ص469تا475 |

### م - علمی کتابیں

| | | |
|---|---|---|
| -1 | فہرست مخطوطات اردو رامپور | ص199تا200 |
| -2 | ایضاً | ص229تا231 |
| -3 | ایضاً | ص216تا217 |

### ن - مطبعے

| | | |
|---|---|---|
| -1 | انتخاب یادگار | ص70 |
| -2 | کاملان رامپور | ص310 |
| -3 | ایضاً | ص156 |
| -4 | ایضاً | ص75وغیرہ |

# 2- ضلع فرخ آباد

i چھبرامئو
ii فتح گڑھ
iii فرخ آباد
iv قائم گنج
v شمس آباد
vi حواشی

فرخ آباد - ماحول 157

الف - شاعری 159

1- ظفر- نواب تجمل حسین خاں 159

2- رضوان- نواب واجد علی خاں 160

3- سعید- نواب غضنفر حسین خاں 161

چھبرامئو 163

1- امیر- مولوی امیر علی 163

2- راحت- پنڈت کشن لال 163

3- سید- میر بہادر علی 163

4- وصل- سید کرار حسین 164

فتح گڑھ 165

1- عزیز- لالا دیبی پرشاد 165

2- تمیز- منشی کالی رائے 165

3- عشق- قاسم علی 165

فرخ آباد 167

1- تاثیر- لالا کنہیالال 167

| | | | |
|---|---|---|---|
| -2 | توقیر- | لالانراین داس | 167 |
| -3 | ثنا - | ثناءاللہ خاں | 167 |
| -4 | حکیم- | محمد حسین | 168 |
| -5 | خادم- | خادم علی خاں | 168 |
| -6 | صفدر- | میر فرزند حیدر | 168 |
| -7 | طاہر- | طاہر علی | 169 |
| -8 | فقیر - | مولوی فتح علی خاں | 169 |
| -9 | طبیب- | حکیم محمد حسن خاں | 169 |
| -10 | فوق- | میر ولد حسن | 169 |
| -11 | متین- | میر بہادر علی | 170 |
| -12 | مجذوب- | لالا گوری شنکر | 171 |
| -13 | محو- | شیخ فیض اللہ | 171 |
| | | قائم گنج | 173 |
| -1 | احقر- | لالا بلدیو پرشاد | 173 |
| -2 | ناطق- | لالا جگن ناتھ | 173 |
| -3 | زاہد- | عادل شاہ | 174 |
| -4 | عاصی- | منشی جمعیت رائے | 174 |
| | | شمس آباد | 175 |
| -1 | انور- | نواب محمد علی خاں | 176 |
| -2 | نمود- | سید محمد حسین خاں | 179 |
| -3 | شور- | بابو مدن لال | 180 |
| -4 | ناظم- | بابو درگا پرشاد | 180 |
| -5 | عرفان- | مولوی سید عرفان علی | 181 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 6- | صادق- | تہور بیگ | 181 |
| 7- | علوی- | مولوی عبداللہ خاں | 182 |
| 8- | مشتاق- | شیخ امین الدین | 183 |
| | | ب - مثنوی | 185 |
| 1- | آفریں- | شیخ غلام حسین | 185 |
| 2- | خبیر- | غلام محمد خاں | 187 |
| | | ج - تاریخ گوئی | 189 |
| 1- | گردھاری لال | | 189 |
| 2- | شیخ کرامت علی | | 190 |
| | | د - قواعد ولُغت | 193 |
| 1- | خبیر- | مولوی غلام محمد خاں | 193 |
| 2- | طبیب- | اصغر حسین | 195 |
| | | ہ - مذہبی نثر | 197 |
| 1- | احمد یار خاں | | 197 |
| 2- | سید ولی حیدر | | 198 |
| 3- | غلام حسین | | 199 |
| | | و - علمی کتابیں | 201 |
| 1- | کالی رائے | | 201 |
| 2- | نامعلوم | | 201 |
| | حواشی | | 203 |

# فرخ آباد - ماحول

نواب محمد قائم خان بہادر قائم جنگ کے بعد نواب محمد احمد خان بہادر غالب جنگ نے فرخ آباد میں بنگشوں کی ریاست کو بڑی جانفشانی سے استحکام عطا کیا تھا لیکن ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی زوال کی صورت ظاہر ہونے لگی تھی۔ نواب دلیر ہمت خان بہادر مظفر جنگ شروع میں نواب آصف الدولہ بہادر کے تابع رہے تھے لیکن پھر :

> " اُنھوں نے کئی مرتبہ انگریزوں سے بھی شکست کھائی۔ آخر کو حسب قرارداد 6 آنے انگریزوں کو دیتے تھے اور باقی نواب صاحب کا حصہ رہا۔" 1

رفتہ رفتہ قائم گنج، قنوج اور چھبرامئو وغیرہ کی رونقیں ماند پڑنے لگیں۔

نواب خادم حسین خان بہادر شوکت جنگ نے 29 شوال 1238ھ (1823) میں ایک شیر خوار بچہ، جس کا نام تجمل حسین خاں رکھا گیا تھا، چھوڑ کر وفات پائی تھی۔ اس بچہ کی ولادت غرّہ جمادی الآخر 1237ھ (شروع 1822) کی بتائی گئی ہے۔ دوسرا بیٹا سخاوت حسین خاں اپنے والد کی وفات کے چند روز بعد پیدا ہوا تھا۔ انگریزوں کو موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ انھوں نے ریاست کے انتظامات کے لیے ایک کونسل بنادی جس کے صدر نشین موقع بہ موقع بدلتے رہے، یہاں تک کہ نواب احمد یار خاں فرزند نواب ذوالفقار خاں بہادر ابن حافظ رحمت خاں مرحوم

اس منصب پر فائز ہوئے۔نواب احمد یار خاں صاحب سیف وقلم تھے۔ان کی قلمی کاوشوں کا ذکر آگے آئے گا۔

موجودہ اتر پردیش کے اس وسطی علاقے میں انگریزوں نے دو ''اہم کیمپ'' (= فوجی چھاؤنی) قائم کر لیے تھے۔ان میں بڑا کیمپ یا کنپو، کانپور کا تھا اور دوسرا فرخ آباد کا۔اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ؎

وہ کنپو جو تھا فرخ آباد کا    بنا تھا وہ آتش کا اور باد کا

کچھ مدت کے بعد یہ ''کیمپ فتح گڑھ'' کے نام سے معروف ہو گیا۔

حالات کے نشیب وفراز نے اہل فرخ آباد کے دلوں میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ لکھنؤ والوں کے خلاف بھی دشمنی اور نفرت کے جذبات کو برانگیختہ کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ وقتاً فوقتاً اس صورت حال کا اظہار بھی ہوتا رہا ہے۔

فرخ آباد کے تہذیبی اور علمی ماحول کو بنانے والوں میں امیر خاں انجام، مرزا محمد رفیع سودا، میر سوز، سید انشا وغیرہ اساتذۂ دہلی تھے۔بے شک آخر زمانے میں نواب سید محمد خاں رند اور میر علی اوسط رشک وغیرہ باکمال بھی لکھنؤ سے اس طرف آئے تھے اور یہاں کے بعض نومشقوں نے ان کے سامنے زانوے تلمذ بھی تہہ کیا تھا لیکن غالباً سیاسی حالات نے یہاں کے شعری حلقوں میں ان کا اثر بہت زیادہ نہیں ہونے دیا تھا۔کنپو (فوجی چھاؤنی) کے علاقہ میں البتہ شعروشاعری کا چلن نسبتاً کمتر ہوا تھا۔

ضلع فرخ آباد کے سبھی شاعر بنیادی طور پر غزل گو تھے۔دوسری اصناف کی طرف انھوں نے کم سے کم توجہ کی تھی۔بعض نے تاریخ گوئی سے بھی دلچسپی لی تھی۔آخر زمانے میں نثر لکھنے کا بھی رواج ہو گیا تھا لیکن اس کا بھی دائرہ محدود تھا۔کہا جانا چاہیے کہ بطور مجموعی اس خطے کو کچھ زیادہ ترقی حاصل نہیں ہوئی تھی چنانچہ 1857 کے ہنگاموں سے پہلے تک یہاں کسی مطبعے کا قیام بھی عمل میں نہیں آیا تھا۔

# الف - شاعری

## 1- ظفر- نواب تجمل حسین خاں

نواب تجمل حسین خاں کے سر سے والد کا سایہ عالمِ شیر خوارگی میں ہی اُٹھ گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ منتظمینِ ریاست نے تعلیم و تربیت کا اچھا انتظام کیا تھا۔ قدرت نے عمدہ صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ طبیعت بھی رسا تھی۔ جلدی ہی شعر کہنے لگے تھے۔ دہلی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ان کے ہم جد تھے۔ سنِ تمیز کو پہنچ کر، جب عنانِ ریاست ہاتھ میں لی تو نواب تجمل حسین خاں ان سے بھی ملاقات کے لیے 1847 میں دہلی گئے۔ شیفتہ کے احباب میں سر فہرست نام مرزا اسداللہ خان غالب کا تھا۔ نوعمر نواب کی خوشنودی کے لیے انھوں نے اپنی وہ مشہور غزل پڑھی جس کا ایک مصرع یہ ہے ؎

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ اس ''ادائے خاص'' کے صلے میں مرزا کو کیا حاصل ہوا۔

نواب کی عمر، شوق اور معیارِ سخن گوئی سے متعلق لالا سری رام نے اپنے تذکرے میں جو لکھا ہے، اس طرح ہے :

''ظفر نواب نصیر الدولہ معین الملک تجمل حسین خان بہادر ظفر جنگ معروف بہ حشمت جنگ مسند آرائے فرخ آباد۔ اپنے چھوٹے بھائی نواب سخاوت حسین خاں کے

مشورے سے شعر کہتے تھے۔ بڑے سیر چشم، عالی حوصلہ، دریادل امیر تھے۔
علم موسیقی میں اچھا دخل تھا۔ 1262ھ (1846) میں چوبیس سال کی عمر میں
انتقال کیا..."2

نواب نے شمسی حساب سے چوبیس اور قمری اعتبار سے پچیس برس کی عمر پائی تھی۔ جس زمانے میں انھوں نے شعر کہنا شروع کیا ہوگا، چھوٹے بھائی کی عمر اتنی کم ہوگی کہ وہ شاید ہی مشورہ دینے کے لائق رہے ہوں۔ لالا سری رام کے مشورہ (اصلاح) سے متعلق بیان کی صحت کو تسلیم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ محسن نے بھی ان کے بارے میں کوئی مفید اطلاع قلمبند نہیں کی ہے۔ لکھا ہے:

"نواب نصیر الدولہ...ظفر جنگ ظفر تخلص خلف نواب شوکت جنگ بن نواب ناصر
جنگ مسند آرائے فرخ آباد۔ سید اسماعیل منیر ان کے ملازم تھے۔ ان کے واسطے سے
یہ غزل آئی ہے۔

سلجھایئے نہ گیسوِ خمدار ہاتھ سے — جاتے رہینگے مفت خریدار ہاتھ سے
اچھا نہیں ہے دامنِ محشر کا پھیلنا — چھوڑو نہ پائینچے دمِ رفتار ہاتھ سے" 3

کلام سے خوش مشقی ظاہر ہے۔ سامنے کے مضامین سیدھی سادی بول چال کی زبان میں نظم کرتے رہے ہیں۔ اس کلام کو سن کر بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ

ع بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

ان کی سرپرستی میں شعر و سخن کا معیار جن بلندیوں تک پہنچ سکتا تھا ظاہر ہے۔

اب فرخ آباد کے حکمراں بنگش خاندان کے اسی زمانے کے چند او رافراد کا احوال مختصراً لکھا جاتا ہے۔

## 2- رضوان- نواب واجد علی خاں

سعادت خاں ناصر کے تذکرے میں ان کا حال اس طرح درج ہے:

"صاحب شوکت و شان، نواب واجد علی خان، تخلص رضوان، نواسۂ نواب مظفر جنگ
مسند آرائے فرخ آباد، شاگرد منیر" 4

محسن نے ان کے والد کا نام "نواب نجابت علی خان بہادر" بتایا ہے 5 اور لالا سری رام نے ان کے احوال میں مفید اضافے کیے ہیں اور لکھا ہے :

"رضوان نگاری والا ولد نجابت علی خان بہادر خلف نواب سید محمد خان بہادر غضنفر جنگ بادن ہزاری، فرماں روائے فرخ آباد........ نیکوکاری میں مصروف رہنا اپنا خاص شیوہ قرار دیا تھا۔ نثر و نظم اردو فارسی دونوں خوب لکھتے تھے۔ طبیعت بہت عالی پائی تھی۔ 1291ھ (1874) میں انتقال کیا......" 6

کلام میں محاورات وغیرہ کے صَرف کرنے کا بہت شوق معلوم ہوتا ہے، چنانچہ کہتے ہیں ۔

میری بغل سے وہ گل رعنا نکل گیا　　دل پکڑے پھر رہا ہوں، کلیجہ نکل گیا

کسی روز مری آہ دُہائی نہیں دیتی　　آواز تری تا شنوائی نہیں دیتی

3- سعید- نواب غضنفر حسین خاں

مولانا امداد صابری نے ان کے تعارف میں تحریر کیا ہے :

"سعید، نواب غضنفر حسین خاں فرخ آبادی، ان کو اردو، فارسی کے علاوہ سنسکرت میں بھی کافی دخل تھا۔ نواب تجمل حسین خاں کے حقیقی بھائی ہونے کی وجہ سے شعر و سخن سے اور زیادہ دلچسپی تھی۔" 7

اول تو یہ بات صحیح نہیں کہ یہ تجمل حسین خاں کے حقیقی بھائی تھے۔ دوسرا اگر ایسا ہوتا تو بھی اس سے ان کی شعر و سخن سے دلچسپی میں ہرگز اضافہ کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ مولانا امداد صابری نے ہی "میرتِ فرخ آباد" کے حوالے سے سعید کے بارے میں نقل کیا ہے:

"صاحب سخن، دقیقہ یاب و خود بیں بود۔ اسم پدرش نواب علی حسین خاں بود و لقب نواب غضنفر حسین خاں، ہزبر جنگ بود۔ پدرش عالی وقار رئیس اعظم بود۔ شعرا دوست بود........ تخلص او سعید بود۔"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تجمل حسین خاں کے ہم جد رہے ہوں گے۔ ان کی شخصیت موقر اور موثر تھی چنانچہ انگریزوں نے 1857 کے ہنگاموں کی پاداش میں ان کو بھی پھانسی دے دی تھی۔ مولانا صابری نے ان کے نام سے یہ دو شعر نقل کیے ہیں ۔

نہ تڑپاؤ دل کو یہ مجبور ہے    محبت سے تیری یہ دل چور ہے
سعید اپنی مرضی بھلا کب چلے    وہ سنتا نہیں میری، مغرور ہے

کلام سے اس زمانے کے حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ زبان ان کی صاف اور سلیس ہے یعنی ادق الفاظ اور تراکیب کا صرف کم سے کم کرتے تھے۔

فرخ آباد کے ضلع میں علمی سرگرمیوں خصوصاً غزل گوئی کے چھوٹے بڑے کئی مرکز بن گئے تھے۔ چنانچہ یہاں ہر ایک کا الگ الگ مجملاً ذکر کیا جاتا ہے۔

## چھبر امئو

تمل زبان میں "شپرا" (چھبرا) بھیڑ (بکری وغیرہ) کو کہتے ہیں اور کلمہ مئو خطہ یا علاقے کے معنی میں آتا ہے۔ یہ اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ دراوڑ نسل کے گڈریوں وغیرہ کی بستی رہی ہوگی۔ لسانی نقطہ نظر سے یہاں کے عوام کی بول چال کا تجزیہ دلچسپ اور نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ اس بستی کے چند معروف شاعر یہ تھے۔ ان کا احوال تذکرۂ نادر سے نقل کیا جاتا ہے۔

1- امیر- مولوی امیر علی

"امیر، مولوی امیر علی خلف شیخ محمد عاشوری ساکن سکندر پور، پرگنہ چھبر امئو، مقیم امیٹھی متصل فرخ آباد۔

جس کو کہ حُب بہ دل ہو جناب امیر سے　　کیا خوف اُس کو جرمِ صغیر و کبیر سے" 8

2- راحت- پنڈت کشن لال

"پنڈت کشن لال متوطن متھرا، تحصیلدار پرگنہ چھبر امئو، ضلع فرخ آباد۔

دل کو سامان ہوا بے سرو سامانی سے　　خوش گذرنے لگی اب جامۂ عریانی سے" 9

3- سید- میر بہادر علی

"سید، میر بہادر علی خلف سید مردان علی متوطن چھبر امئو، ضلع فرخ آباد، جوان تیز فہم

است، وخوب می گوید ۔

شمع روخانۂ تاریک میں یاد آئے بہت  ظلمتِ گوشۂ مدفن سے جو گھبرائے بہت"10

## 4- وصل- سید کرار حسین

"وصل سید کرار حسین خلف سید رحم علی خوشنویس، متوطن جھبر امئو، ضلع فرخ آباد ۔

کہتے ہیں وہ کہ بظاہر میں کوئی بات رہے  ہم سے اور آپ سے چوری کی ملاقات رہے"11

معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی کے شاعر عموماً مذہبی اور روایت پسند تھے ۔

# فتح گڑھ

یہ کمپ (= کمپو) انگریزی افواج کا مسکن تھا۔ یہاں موثر اور موقر ہندوستانیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ رہی ہوگی چنانچہ شاعر بھی گنتی ہی کے ہوں گے۔ ان میں سے ایک دو یہ ہیں:

1- عزیز- لالا دیبی پرشاد

''عزیز لالا دیبی پرشاد خلف لالا مکھن لال متوطن قدیم ضلع شاہجہانپور، مقیم فتح گڑھ

اب دل میں ہے خیال جو گیسوے یار کا		عالم ہے روزِ ہجر میں شبہاے تار کا''[12]

عزیز کے گھرانے کا امتیاز یہ تھا کہ ان کا بیٹا بھی شاعر ہوا اور اس نے ڈپٹی کلب حسین خاں نادر سے تلمذ اختیار کیا تھا چنانچہ انھوں نے خود لکھا ہے:

2- تمیز- منشی کالی رائے

'' تمیز منشی کالی رائے ابن لالا دیبی پرشاد عزیز متوطن فتح گڑھ، یکے از دوستانِ جامع

ایں اوراق۔ ''[13]

آمد یہ صحنِ باغ میں کس گلبدن کی ہے		جو روح باغ باغ نسیمِ چمن کی ہے

3- عشق- قاسم علی

'' قاسم علی تخلص عشق، ساکن فرخ آباد۔ منشی رسالہ دہم انگریزی ۔

فراقِ ساقی میں دیدے کب آب روتے ہیں　　جگر کے ٹکڑے بہ رنگ کباب روتے ہیں"14۔

انگریزی رسالے سے متعلق ہونے کی وجہ سے اپنے ہم وطنوں کی تکالیف کا احساس ان کو زیادہ تھا۔

# فرخ آباد

ضلع کا صدر مقام اور نوابین بنگش کا مستقر ہونے کی وجہ سے شعرا، ادبا اور علما کا اس خطہ میں سب سے بڑا مرکز یہی تھا۔ طوالت کے خوف سے یہاں کے صرف چند شاعروں کا تعارف مختصراً تحریر کیا جاتا ہے۔

1- تاثیر- لالا کنہیا لال

''لالا کنہیا لال، تخلص تاثیر، ولد کیول کشن، باشندۂ فرخ آباد شاگرد منیر ۔

تیرے گلے میں پڑ نہ سکے ایک بار ہاتھ شاخ خزاں رسیدہ ہیں اے گلعذار ہاتھ''15

2- توقیر- لالا نراین داس

'' لالا نراین داس توقیر ولد لالا پھول چند، باشندۂ فرخ آباد، شاگرد منیر ۔

آئینے سے بھی ہے وہ چند صفا ہاتھوں میں مکھ نظر آتا ہے اے ماہ لقا ہاتھوں میں''16

ان کی زبان پر مقامی بول چال کا اثر نسبتاً زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

3- ثنا- ثناء اللہ خاں

کلب حسین خاں نادر نے ان کے بارے میں لکھا ہے :

'' ثنا، ثناء اللہ خاں ابن متور خاں، باشندۂ بھیکم پورہ من محالات شہر فرخ آباد شاگرد

حضرت آتش مرحوم ؎

ایک ہچکی بھی نہ آئی دلِ ناشاد مجھے ‌ ‌ ‌ بھول کر بھی نہ کیا اُس نے کبھی یاد مجھے"17

اور اس کے برخلاف لالا سری رام کا کہنا ہے کہ

"منشی ثناء اللہ خاں فرخ آبادی، بڑے طباع اور ذہین شخص تھے۔ غالب، ذوق، مومن کے روشناس اور شیخ ناسخ کے شاگردوں میں تھے۔ عرصے تک مرزا سخاوت علی بیگ ضیا کی تحصیلداری کے زمانے میں ان کے پاس ایٹہ میں رہے۔ یہ 1853 (1269ھ) کا ذکر ہے۔"18

## 4- حکیم- محمد حسین

" حکیم محمد حسین عرف بجھلے صاحب خلف الرشید سید امداد علی متوطن فرخ آباد ؎

الجھے ہوئے ہیں بال جو اے جان تمھارے ‌ ‌ ‌ بکھرے ہوئے پھرتے ہیں پریشان تمھارے"19

سامنے کے مضامین اپنی بول چال کی زبان میں نظم کرتے تھے۔ بیان میں دقت اور پیچیدگی نہیں ہوتی تھی۔

## 5- خادم- خادم علی خاں

" خادم علی خاں، خادم تخلص، باشندہ فرخ آباد، استاد نواب ناصر جنگ بنگش۔ بیشتر فارسی کہتے تھے ؎

تجھ کو کہتے ہیں کہ چل باہر ہو ‌ ‌ ‌ آپ کے کہنے سے کب باہر ہو"20

اپنے زمانے کے استادوں میں سے تھے۔ محاوروں کے نظم کرنے کا انھیں شوق معلوم ہوتا ہے۔

## 6- صفدر- میر فرزند حیدر

" میر فرزند حیدر صفدر، خلف منشی میر امیر حیدر، باشندۂ فرخ آباد، صاحب دیوان، شاگرد منیر ؎

منہ دیکھے کی اے جان محبت نہیں اچھی ‌ ‌ ‌ رہنے دو تم اپنی یہ عنایت، نہیں اچھی"21

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے اس کے برخلاف ان کو "رئیس فرخ آباد، شاگرد رشک"

لکھا ہے۔22؎ شاید پہلے رشک کے شاگرد رہے ہوں گے۔ جب وہ عراق چلے گئے تو منیر سے اصلاح لینے لگے ہوں گے۔ محسن نے ان کی دو غزلیں لکھی ہیں۔ ان کے مطالعے یہ ہیں ؎

افشاں سے خوب چمکے ہیں زلفِ دوتا کے بال　　ہیں کوڑیالے سانپ مرے دل ربا کے بال

دستِ موسیٰ کی طرح روشن ہیں سارے ہاتھ پاؤں　　شاخِ نخلِ طور ہیں گویا تمھارے ہاتھ پاؤں

7- طاہر- طاہر علی

''طاہر تخلص، طاہر علی خلف سید اطہر علی فرخ آبادی شاگرد امداد حسین صفیر ؎

دل آپ کی مانند مکدر نہیں اپنا　　اس آئینہ میں دیکھیے زنگار کہاں ہے''23؎

8- فقیر- مولوی فتح علی خاں

پرانے شاعر تھے۔ ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

''مولوی فتح علی خاں ابن خیرات علی خاں انصاری، ہمن اولاد نواب ہادی داد خان بہادر متوطن فرخ آباد ؎

اے عشق کس مکاں میں وہ جانِ جہاں نہ تھا　　چشم و دل و دماغ و جگر میں کہاں نہ تھا''24؎

9- طبیب- حکیم محمد حسن خاں

ان کے ایک صاحبزادے بھی اپنے وقت کے معروف شاعر تھے چنانچہ محسن نے ان کا احوال اس طرح قلمبند کیا ہے:

''طبیب تخلص، حکیم محمد حسن خاں ولد فتح خاں، باشندہ فرخ آباد، شاگرد رشید اسمٰعیل حسین منیر''25؎

نادر نے ان کی جس غزل کا انتخاب کیا ہے، اس کا مطلع یہ ہے ؎

سروِ گلشن جو ترے قد کے برابر نکلے　　کچھ نہ کچھ شاخ بھی اے رشکِ صنوبر نکلے

10- فوق- میر ولد حسن

یہ بھی معروف شاعروں میں سے تھے۔ محسن کے تذکرے میں ان کا نام اور کلام اس طرح درج ہے:

''میر ولد حسن فوق خلف میر مولود علی، باشندۂ فرخ آباد، مقیم لکھنؤ، صاحب دیوان،
شاگرد رشید میر وزیر صبا''26؎

علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں ان کا قلمی کلیات محفوظ ہے۔ اُس کی کیفیت اس طرح ہے:

کلیاتِ فوق فرخ آبادی اوراق 200 18 سطرفی صفحہ 27؎

سال کتابت 1273ھ (57-1856)

آغاز نہ بتکدہ ہے، نہ ہے کلیسا، نہ گھر ہے بیت الحرام تیرا
جہاں میں ڈھونڈھا جو ہم نے تجھ کو، تو دل میں پایا مقام تیرا

خاتمہ قسم جو کھایئے الفت کی تو کہے خاموش
نہ قسمیں کھا دمحبت کی جھوٹی جھوٹی جوش
تمھارا کرتا نہیں اعتبار میرا دل

اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ تضمینیں وغیرہ بھی ہیں۔ بظاہر فوق قادر الکلام شاعر تھے۔
سعادت خاں ناصر نے فوق کا نام اس طرح لکھا ہے :

''سخنوری کا اسے ذوق وشوق، میر بندہ حسن تخلص فوق، شاگرد میر وزیر صبا'' لیکن ان کا
صحیح نام وہی معلوم ہوتا ہے جو محسن نے لکھا ہے۔''28؎

## 11- متین- میر بہادر علی

سعادت خاں ناصر کے تذکرے میں ان کا ذکر اس طرح آیا ہے :

''خوش وضع، نیک آئین، میر بہادر علی، تخلص متین، ساکن فرخ آباد۔ میر علی اوسط کی
زبانی معلوم ہوا کہ چند غزل اس کی میری نظر سے گذری ہیں، اس واسطے تلامذہ میں
میر صاحب کے لکھا گیا۔ من کلامہ ؎

یہ عالم یادِ چشم مست میں ہے خوں فشانی کا کہ گویا مینہ برستا ہے شراب ارغوانی کا''29؎

معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی باقاعدہ شاگرد منیر ہی کے تھے چنانچہ نادر نے لکھا ہے:

''حافظ بہادر علی رئیس فرخ آباد ولد سید قطب علی شاگرد منیر''30؎

## 12- مجذوب- لالا گوری شنکر

ملازمت پیشہ تھے۔ کہنہ مشق تھے اور اپنے وقت کے معروف شاعروں میں سے تھے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے :

'' مجذوب تخلص ، لالا گوری شنکر فرخ آبادی، پیشکار تحصیل ہزارہ ، خلف خیراتی لال''31

معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مدت کے بعد ترقی پا کر دفتر کلکٹری میں پہنچ گئے تھے چنانچہ کلب حسین خاں نادر کے تذکرے میں ہے :

''منشی گوری شنکر متوطن فرخ آباد، اہلکار کلکٹری، خلف رائے خیراتی لال'' محاورہ بندی کا ان کو زیادہ شوق تھا چنانچہ اکثر شعر ایسے ہی ہوتے تھے مثلاً ؎

ٹلے ہم اُس پری رو کے نہ گھر سے نہ اترا سایہ دیوار سر سے
ترش ہوکر دیا بوسہ دہن کا ہوئے دانت آج کھٹے اس ثمر سے''32

اس علاقے میں مجذوب بعض نومشقوں کو اصلاح بھی دیتے تھے چنانچہ ان کے ایک شاگرد کا حال اس طرح لکھا ہے :

''شمس تخلص، لالا سورج پرشاد ولد لالا چنی لال باشندۂ فرخ آباد، شاگرد مجذوب ؎
واللہ منکرانِ قیامت کو اے صنم قائل اگر کیا تو تمھاری ہی چال نے ''33

دوسرے مصرع میں لفظ'' چال'' بہت خوب نظم کیا ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ شعر اسی لفظ کی وجہ سے کہا گیا ہے۔

## 13- محو- شیخ فیض اللہ

سعادت خاں ناصر نے ان کے ذکر میں تحریر کیا ہے :

'' شیخ فیض اللہ شاگرد منیر، تخلص محو، قدم بہ قدم استاد، بلکہ یک دوگام زیادہ۔ موقع و محل سمجھ کر یہ نثر'' گلستاں'' کی لکھی جاتی ہے۔

''بنیادِ ظلم اول اندک بود'' ہر کہ آمد برآں مزید کرد، بدیں غایت رسید، قصہ مختصر۔''34

نادر نے ان کا اور ان کے والد کا نام اس طرح لکھا ہے :

''شیخ فیض الدین ابن شیخ عبدالایزد وکیل، باشندۂ فرخ آباد۔''35 لیکن صحیح وہ معلوم ہوتا ہے جو محسن کے تذکرے میں ہے یعنی :

''محو شیخ فیض الدین ولد محمد فخرالدین وکیل فرخ آباد، شاگرد سید اسماعیل حسین منیر''36

ان کے دو مطلع یہ ہیں ؎

آتی ہے کس کے زلفِ گرہ گیر ہاتھ میں بازو میں ہے کمند، تو زنجیر ہاتھ میں

سینے میں برقِ آہ سے یہ نور ہوگیا روشن چراغِ دیدۂ ناسور ہوگیا

شعرگوئی کے لیے محوؔ کا گھرانا بھی ممتاز تھا چنانچہ ان کے ایک بیٹے کا ذکر اس طرح آیا ہے

''ہوش، شیخ عزیزالدین خلف شیخ فیض الدین محوؔ فرخ آبادی''37

ان کا ایک مطلع یہ ہے ؎

گلے سے وہ پلکیں لگائے ہوئے ہیں رگِ جاں سے نشتر ملائے ہوئے ہیں

ان چند کے علاوہ جانکی پرشاد مریخ شاگرد نواب عاشور علی خان بہادر ابن جنگل کشور 38 اور مولوی احمد حسین مشتہر شاگرد حافظ قطب الدین مشیر وغیرہ بھی شعرائے فرخ آباد میں معروف تھے۔39

سطورِ بالا سے یہ حقیقت بخوبی ظاہر ہے کہ فرخ آباد میں اس زمانے میں لکھنوی طرزِ شاعری رواج پا رہا تھا۔

# قائم گنج

ضلع فرخ آباد کی ایک مشہور تحصیل قائم گنج ہے۔اس کا ایک قابل توجہ امتیاز یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہاں ہندو شاعروں کی کثرت رہی ہے۔ یہاں محض چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

1- احقر- لالا بلدیو پرشاد

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے مختصراً ان کے بارے میں تحریر کیا ہے :

''احقر، لالا بلدیو پرشاد خلف مہا سکھ رائے متوطن عطائی پور، تحصیل قائم گنج، ضلع فرخ آباد ۔

اٹھایا اُس پری نے ناگہاں گوشہ جو گھونگھٹ کا     دلِ دیوانہ اپنا شانہ ساں زلفوں میں جا لٹکا''40

احقر کو مشکل قافیوں میں شعر کہنے کا شوق معلوم ہوتا ہے اور وہ عموماً مضامینِ خیالی نظم کرتے تھے۔

2- ناطق- لالا جگن ناتھ

اسی عطائی پور کے یہ بھی رہنے والے تھے چنانچہ نادری کے تذکرے میں ہے :

''ناطق، لالا جگن ناتھ پرشاد خلف نالالال جی متوطن عطائی پور، تحصیل قائم گنج، ضلع فرخ آباد ۔

جب تلک خانۂ دل درد سے آباد نہ ہو عمر بھر خاطر عشاق کبھی شاد نہ ہو

بحث رہتی ہے جسے ہر کہہ و مہہ سے ناطق خام ہی خام ہے وہ صاحب ارشاد نہ ہو"41

حال ان کی شاعری کا بھی ویسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

3- زاہد- عادل شاہ

"زاہد عادل شاہ خاں خلف گل داد خاں، باشندہ رائے پور، تحصیل قائم گنج، ضلع فرخ آباد۔

تشریف وہ نہ لائے، نہ بھیجی خبر کبھی اے آہ کچھ کیا بھی نہ تو نے اثر کبھی

زاہد نبی کے روضۂ والا میں جائیں گے فرصت ملے گی بیت خدا سے اگر کبھی"42

سامنے کی باتیں سیدھی سادی شریفانہ زبان میں خوب نظم کرتے تھے۔

4- عاصی- منشی جمعیت رائے

ملازمت پیشہ شخص تھے اور اپنے وقت کے معروف شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ نادر کے تذکرے میں ہے :

"عاصی، منشی جمعیت رائے نائب سررشتہ دار فوجداری ضلع فرخ آباد، ابن لالا کیسری داس، باشندۂ موضع اُدگر پور، تحصیل قائم گنج۔

دیکھے جو جذب اس دل خانہ خراب کے گوشے الٹ دیے ہیں انھوں نے نقاب کے

عاصی خدا کے فضل سے ہم بخشے جائیں گے اندیشہ کچھ نہیں ہمیں روز حساب کے"43

# شمس آباد

شمالی ہند کی قدیم ترین آبادیوں میں قنوج بھی ہے۔ گیارھویں صدی ہجری (= سترھویں صدی عیسوی) کے اواسط میں بھی اس علاقے کو صوفیوں اور مذہبی عالموں وغیرہ کے مستقر کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس زمانے کے نام برآوردہ اور ممتاز علما میں شیخ عبدالصمد قنوجی کرمانی اور علامہ سید محمد قنوجی وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہوئے ہیں۔ ان کے فیوض کا سلسلہ تادیر جاری رہا ہے چنانچہ بعض کا ذکر اپنے موقع پر کیا جائے گا۔

اسی قنوج سے متصل ایک چھوٹی سی بستی ''شمس آباد'' بھی تھی۔ یہاں بھی بزرگانِ قنوج کے واسطے سے درس و تدریس اور رشد و ہدایت کے سلسلے جاری تھے۔ اس باب میں سید قطب الدین شمس آبادی کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ مولوی فقیر محمد جہلمی نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے :

> ''سید قطب الدین شمس آبادی، قطب العلما اور مدار الفضلا تھے۔ اصل میں آپ سادات امیٹھی سے تھے جو پورب میں واقع ہے، جہاں سے آپ شمس آباد متعلقہ قنوج میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ علوم ملا قطب الدین وغیرہ اساتذۂ عصر سے حاصل کیے اور اخیر عمر تک تدریس میں مشغول رہے۔ آپ سے خلقِ کثیر نے تلمذ حاصل کیا۔ آپ

باوجودیکہ ایسے تنگ دست تھے کہ گھر میں آگ تک روشن کرنے کی دستگاہ نہ رکھتے تھے۔ مگر بڑے قانع تھے اور اپنی حاجات کو کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے اور بڑی کشادہ پیشانی وکشادہ زبان وحالت سے تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ ستر سال کی عمر میں 1121ھ (1709) میں فوت ہوئے۔

عفت شعار
1121

تاریخ وفات ہے۔'' 44

ان کے شاگردوں میں قاضی قوام الدین مارہروی وغیرہ کا نام مشہور ہے۔ تاریخ فرخ آباد میں ''سید محمد عمر متولد قصبہ کمپل از تواجِ شمس آباد'' اور قاضی شہاب الدین گوپاموی وغیرہ کا احوال بھی درج ہے۔ اس ذکر سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ بستی متداول مذہبی علوم اور فنون کی روشنی سے خالی نہیں رہی ہے۔ کسی خود بین اور خود سر نے بر بنائے تعصب، اختلافِ مذہب، یا بے علمی اس بستی کے لیے اگر برعکس بات کہی ہے تو اُس کے قولِ قبیح کو نظر انداز کر دینا لازم ہے۔

1- انور- نواب محمد علی خاں

یہ تخلص ہے نواب محمد علی خاں عُرف نواب دولھا کا۔ ان کے گھرانے کا تعارف کراتے ہوئے آغا محمد شرف نے کہا ہے ؎

جو تھے اعتماد اور دولہ وزیر　　اُنھیں کے جگر بند ہیں یہ امیر
زمانے میں ان کے تو افسانے ہیں　　یہ بزمِ خلافت کے پروانے ہیں
جو شاہ میرزا خاں نمودار تھے　　رئیسوں میں سید تھے ابرار تھے
سفر خلد کا جب کیا اختیار　　رہے ان کے دنیا میں فرزند چار
وہ چاروں زمانے میں ہیں نامور　　جہاں آشنا ایک سے خوش سیر
محمد علی خاں تو نواب ہیں　　مہیا امیرانہ اسباب ہیں
وہ فضلِ علی خاں کے داماد ہیں　　وہ ذی منصب شمس آباد ہیں

جو یہ منجھلے صاحب ہیں خوش انصرام　　عمایذ ہیں، سید مسیحا ہے نام
سخی و جری و دلاور دلیر　　گریزاں کے سایے سے کرتے ہیں شیر
یہ ہیں سنجھلے صاحب جو عالی جناب　　جواں مرد، سید ابوتراب
بڑے صاحب حوصلہ دل غنی　　یہ اہلِ وفا ، بات کے ہیں دھنی
جو ہیں چھوٹے صاحب یہ اک نامور　　وفا دار شیریں سخن، خوش سیر
عمائد یہ سب اہلِ اخلاق ہیں　　وفا ومحبت کے مشتاق ہیں'' 45

ان چار بھائیوں میں سے دو یعنی اول وآخر، محمد علی اور محمد حسین تو شاعر تھے لیکن باقی دو کے بارے میں کسی بات کچھ معلوم نہیں۔

میر سیف اللہ مخاطب بہ حکیم شاہ میرزا خاں کا پہلا بیٹا سید محمد علی خاں دہلی کے کوچہ چیلان میں 29 شعبان 1222ھ (1807) کو بروز دوشنبہ پیدا ہوا تھا۔ 46 کوئی بیس بائیس برس کے بعد سیف اللہ مع اہل وعیال لکھنؤ میں منتقل ہو گئے۔ نصیرالدین حیدر بادشاہ دوم کے عہد میں 1252ھ (1836) میں محمد علی کی شادی اعتمادالدولہ ضیاءالملک میر فضل علی خان بہادر سہراب جنگ کی چھوٹی بیٹی جعفری بیگم کے ساتھ ہوگئی۔ محمد علی کو خانہ داماد کا درجہ حاصل ہوا اور وہ نواب دولھا کے نام سے معروف ہوے۔ شمس آباد میں نواب فضل علی خاں کی جاگیر تھی وہیں ان کے لیے محل سرائے تعمیر ہوئی۔ بادشاہ کی وفات کے بعد 18/ جمادی الآخر 1254ھ (1838) کو نواب دولھا اپنی اس محل سرائے میں منتقل ہو گئے۔ سسر کی وفات کے بعد ان کی املاک کے یہی مالک ہوئے۔ 70 برس سے زیادہ عمر پا کر صفر 1294ھ (فروری 1877) میں نواب دولھا نے وفات پائی۔

ابتدائی مشق کے زمانے میں مجرم تخلص کرتے تھے۔ پھر تخلص انور پسند کیا۔ کلب حسین خاں نادر نے لکھا ہے :

> ''انور، نواب نامدار فلک اقتدار جناب سید محمد علی خان بہادر عرف نواب دولھا، رئیس شمس آباد، داماد وزیرالممالک اعتمادالدولہ بہادر ''47

ان کی ایک غزل کے کچھ شعر یہ ہیں ۔

یارب کبھی کسی کا بتوں پر نہ آئے دل — اورآئے تو نہ ہجر کے صدمے اٹھائے دل
سب کچھ لیا بتوں نے، بچائے اسے خدا — ممکن نہیں کہ ہاتھ سے جاکر پھرآئے دل
میں جاں بلب ہوں تجھ کو جوآنا ہے،آمسیح — کب تک مرے بہلنے کو باتیں بنائے دل
کعبہ کا ہے خیال ہمیں، اُس کو دیر کا — کچھ مختلف ہے ان دنوں اپنی سے رائے دل
مشکل کشا کا نام جو وردِ زباں رہے — انور یقیں ہے جلد مراد اپنی پائے دل

ان کی تصنیف، تالیف اور ترجمہ کی ہوئی کتابوں کا احوال محمد صادق صفوی شمس آبادی نے اس طرح قلمبند کیا ہے :

الف۔علمِ طب سے متعلق.......48

آبِ حیات (اردو) درطب۔اردو میں اس موضوع سے متعلق اتنی جامع کتاب شاید کوئی اور نہیں ہے۔دوبار چھپ چکی ہے۔

عجائب التاثیر (فارسی واردو)۔ادویہ، اغذیہ اور ادعیہ وغیرہ سے متعلق ۔نسخہ دست نویس مولف درکتابخانہ راقم۔

ب۔تاریخ،سوانح،رسوم وغیرہ ____

تاریخِ جدولی (فارسی)۔تاریخِ عالم ۔نسخہ دست نویس مولف درکتابخانہ راقم انقلابِ نصیری (فارسی) - تاریخ چہ فترتِ لکھنو بعد رحلتِ نصیرالدین حیدر (بادشاہِ دوم) - نسخہ دست نویس مولف درکتابخانہ راقم۔

شجرۂ طیبہ (فارسی) - نسب نامۂ مولف ____ چند بار چھپ چکا ہے۔

رسمِ دنیا (فارسی) - ولادت سے مرنے تک کی رسمیں، بالتفصیل ____ گذشتہ صدی میں شرفائے دہلی ولکھنو کے گھروں کے آداب و رسوم ____ نسخہ دست نویس مولف، درکتاب خانہ راقم

ج۔وظائف،اعمال،محاورات ____

ذخیرۂ عقبیٰ (اردو) - وظائف واعمال وغیرہ ___ نسخہ دست نویس مولف درکتاب خانہ راقم۔

محاوراتِ تحقیقی (فارسی) - فرہنگ عربی و فارسی - نسخہ دست نویس مولف - در کتاب خانہ راقم

د۔ متفرقات

مرغوب دل (اردو) - یہ اسم تاریخی ہے۔ سالِ تالیف 1282ھ (66-1865) ہے۔ مشتملات ___ تاریخ، تذکرہ، فنون وحرفت، انتخابِ نثر و نظم فارسی و اردو (غیر مطبوعہ) - نسخہ دست نویس مولف ___ در کتابخانہ راقم

لذت الافہام (فارسی و اردو) - یہ بھی اسم تاریخی ہے سالِ تالیف 1288ھ (1871) ہے۔ مشتمل بر کلام نثر و نظم ___ نسخہ چاپی و خطی در کتاب خانہ راقم

اس مقام پر یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نواب دولھا کے ''مجموعۂ رسائل'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے مسکن کو ''شمس آباد جہالت بنیاد'' کہتے اور لکھتے تھے۔ وجہ جو بھی ہو لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس بستی اور اس کے مضافات سے بھی مدت تک رشد و ہدایت اور تعلیم و تعلم کے سلسلے جاری رہے ہیں۔ خود نواب دولھا کے زمانے میں یہاں ایسے شاعر اور نثر نگار بھی تھے جن کے نام اور کلام کی شہرت دہلی اور لکھنؤ سے گذر کر کلکتہ تک پہنچ گئی تھی۔

نواب دولھا کی جن کتابوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ان کے علاوہ ان کی ایک اور ابتدائی زمانے کی کتاب کا پتہ چلتا ہے جس کا نام ''انور نفائس'' تھا۔ گردھاری لال نامی ایک شخص نے اس کی تاریخ اس طرح کہی تھی 49۔

بگو ایں نسخہ انور نفائس

1262ھ

اس کتاب کے بارے میں بھی مزید کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی ہے۔

2- نمود- سید محمد حسین خاں

یہ نواب دولھا کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے ان کے بارے میں لکھا ہے :

''نمود، سید محمد حسین خاں عرف چھوٹے صاحب کہ جامع اوراق سے نسبت مصاہرت رکھتے ہیں اور برادر نواب دولھا محمد علی خان بہادر رئیس شمس آباد کے ہیں ۔

حصول مطلب دل کو خدا شتاب کرے    مجھے وصال کی دولت سے کامیاب کرے"50

ان کے بھی مزید حالات معلوم نہیں ہو سکے

جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہے شمس آباد کی جاگیر کی اصل مالک جعفری بیگم صاحبہ تھیں جو نواب دولھا کی زوجہ تھیں۔ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ اب اُن کی سرکار کے بعض ملازمین اور متوسلین کا بھی ذکر کیا جائے۔

3- شور-    بابو مدن لال

یہ شخص ملازمت پیشہ اور پڑھے لکھے ہندو گھرانے کا فرد تھا۔ نادر نے اس کے بارے میں تحریر کیا ہے:

"شور، بابو مدن لال اہلکار کچہری صاحب کنٹونمنٹ مجسٹریٹ چھاونی فتح گڑھ خلف لالا چھدامی لال مختار و اہلکار قدیم ذی اختیار سرکار نواب جعفری بیگم صاحبہ رئیسہ شمس آباد۔"51

اس میں جعفری بیگم کو "رئیسہ شمس آباد" اور ان کی سرکار کو "ذی اختیار" کہا گیا ہے دوسرے شخص کی حیثیت اس آبادی میں ضمنی یا ثانوی تھی۔ شور کے والد اسی "ذی اختیار سرکار کے اہلکار بلکہ مختار ہونے کی وجہ سے موثر اور موقر تھے۔ شور کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے

ہم کو آبادی سے مطلب ہے، نہ ویرانے سے    رات دن غم میں پھرا کرتے ہیں دیوانے سے
شور کو تم سے، تمھیں اُس سے تھی رغبت کیا کیا    لو خفا ہو گئے تم غیر کے بہکانے سے

4- ناظم-    بابو درگا پرشاد

یہ ناظم بھی اُسی سرکار سے متعلق تھے چنانچہ نادر نے ان کے ذکر میں تحریر کیا ہے :

"ناظم، بابو درگا پرشاد خلف بابو چھوٹے لال مدار المہام سرکار نواب جعفری بیگم صاحبہ رئیسہ شمس آباد، دختر نیک اختر نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خان بہادر وزیر و نایب السلطنت مرزا نصیر الدین حیدر شاہ بادشاہ ملک اودھ۔

اگر شمشیر ہو، روکوں سپر سے    بچاؤں دل کو کیا تیرِ نظر سے"52

اپنے منصب کے بدولت ناظم کے والد کی شخصیت اس بستی میں بہت اہم تھی لیکن افسوس

ہے کہ ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ ناظم کے درج ذیل مقطع سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نادر سے کسبِ فیض کرتے تھے ؎

تجھے تو فیض نادر سے ہے ناظم  نہ غفلت چاہیے کسبِ ہنر سے

5- عرفان- مولوی سید عرفان علی

شمس آباد کی علمی شخصیتوں میں شاید سب سے زیادہ موثر یہی تھے۔ نادر نے ان کے ذکر میں لکھا ہے:

''عرفان، مولوی سید عرفان علی ابنِ قربان علی متوطن بریلی، استادِ اولادِ امجاد نواب محمد علی خان بہادر، رئیس شمس آباد، صاحب تصانیف کثیرہ وعلوم وغیرہ۔''53

تلاش کے باوجود ان کے حالات اور تصانیف کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔ ان کا ایک مطلع اس طرح ہے ؎

مہِ انور کو کچھ نسبت نہیں ہے روے جاناں سے  ضیا اُس کے کفِ پا میں ہے افزوں ماہِ تاباں سے

صاحب علم شخص معلوم ہوتے ہیں۔ کلام کو پُر شکوہ الفاظ اور تراکیب سے مزیّن کرنے کا انھیں شوق تھا۔

6- صادق- تہور بیگ

شمس آباد کے بعض حوصلہ مند تلاشِ معاش میں اپنے وطن کو چھوڑ کر پایۂ تخت دہلی تک بھی جاتے رہے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ دہلی کی بول چال اور معاشرت اس بستی میں براہِ راست پہنچتی رہتی تھی۔ مرزا قادر بخش صابر کے تذکرے میں ایک شاعر صادق کا مذکور اس طرح آیا ہے :

''صادق تخلص، تہور بیگ...... وطن آبا و اجداد کا اس نیک نہاد کے شمس آباد ہے کہ ایک معمورہ ہے قریب فرخ آباد کے، مسکن و موطن افاغنہ اور مولد اس کا شاہجہاں آباد، سُنا گیا کہ زمرۂ سواران بادشاہی میں منسلک ہے۔ شعر ریختہ کہتا ہے۔ یہ ایک شعر اس کی غزل سے منتخب ہوا ؎

آوارگانِ عشق کو مانندِ گردباد  اک جا قرار ہو تو کوئی جستجو کرے''54

صابر کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ شمس آباد میں مسلمانوں کی اکثریت افغانوں پر مشتمل تھی جو نہایت جری اور جاں باز ہوتے تھے۔ ان لوگوں کو کسبِ علوم سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی تھی، غالباً یہی وجہ تھی کہ نواب دولھا اس معمورہ کو "جہالت بنیاد" کہہ کر اپنے دل کو خوش کر لیتے تھے۔ یہ ویسی ہی بات تھی جیسے "اُزبک" کو بیوقوف کا مرادف مشہور کر دیا گیا ہے۔ جو بھی ہو ان افغان شاعروں کے پیشِ نظر زبان و بیان کے ضابطے اور شاعری کے اصول و معیار خالص دہلوی تھے اور اسی اعتبار سے ان کے کلام کی اہمیت تھی۔

7- علوی- مولوی عبداللہ خاں

اپنے زمانے میں، دہلی کے مسلّم الثبوت عالموں اور استادوں میں سے تھے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ شیخ امام بخش صہبائی جیسا بے مثال شخص ان کا شاگرد تھا۔ مرزا قادر بخش صابر نے ان کے حالات میں جو کچھ لکھا ہے اس کا اختصار اس طرح ہے :

"علوی تخلص جناب فیض مآب، اسوۂ کملائے نامدار، قدوۂ اکابر شہر و دیار...... مولوی عبداللہ خاں...... از بس تدریس کتبِ فارسی اور تتبع محاورات زبانِ دری اور مشق انشائے نثر و ابداعِ نظم کی طرف میل طبیعت بیشتر تھا، عوام یہ سمجھتے تھے کہ اس جناب کی آستین استعداد کا طراز یہی فنون ہیں..... اصنافِ سخن کو اصناف طرز سے مزین کرنا ایک اعجاز ہے کہ خدائے عز و جل نے اسی خاتم نبوت سخن میں ودیعت رکھا تھا........ ایک مثنوی ناتمام کہ آٹھ سات جزو کے قریب ضخامت ہے تحفۃ العراقین کی بحر میں، دوسری مثنوی قریب دو تین جزو کے گل کشتی میر نجات کے وزن میں کمال قدرتِ سخنوری پر دال ہے...... انشائے صفیر بلبل نام نثر متین و مغلق اور صحت نامۂ علوی عبارت سلیس و شستہ میں ایسی ہیں کہ ارباب انصاف ان کو سینۂ صافی کی بیاض پر تحریر کریں۔ تلامذہ کے اشعار حک و اصلاح سے لباسِ تازہ پہنتے اور خلعتِ نو بہم پہنچاتے....... یہ حدیقہ طراز جب گل زمین طب کی باغبانی کی طرف متوجہ ہوا، کیا کیا گل کھلائے...... از بس کہ حصول روزی گردشِ آسیائے گردوں پر منحصر ہے، اتفاقاً فرخ آباد کا سفر درپیش ہوا اور اس اطراف کے باشندے اس کے چشمۂ فیض سے

سیراب ہوے۔ مرزا دولھا نامی رئیس شمس آباد نے کہ نواحِ فرخ آباد میں ایک معمورہ ہے دلچسپ، کمال دل گرمی سے نان جویں پر قانع کیا اور اِس طرح محبت وخدمت گزاری سے پیش آیا کہ رئیس مذکور کی رفاقت کا خیال اس حضرت کے دل میں مستحکم ہوگیا۔ اس عرصے میں کئی موزوں طبع اس کے مایۂ فیض سے پایۂ شاعری کو پہنچ گئے اور کتنے طالبانِ کمال منافع علمی اور فوائد دانش سے بہرہ مند ہوگئے....... 1262ھ ☆ (1846) میں بکشادہ پیشانی چمنستانِ عالمِ قدس کی گلگشت کا قصد مصمم کر کے سمندِ عزم کو گرمِ جولاں کیا۔ صہبائی نے کہ اس جنابِ مغفور کے ساتھ نسبتِ تلمذ رکھتے ہیں، تاریخ وفات یہ پائی ؎

ہاتف گفتا ____ فنادِ بنیادِ سخن

1262ھ

....... گاہ گاہ کسی مخلصِ قدیم کی تحریک سے دو چار شعر ریختہ بھی موزوں کرتے تھے ؎

مضموں کا فکر کیا کریں اس کے دہن میں ہم     گم ہیں خیالِ تنگیِ کنجِ دہن میں ہم" 55

عبداللہ خاں علوی کے شمس آبادی شاگردوں کا حال معلوم نہیں ہوسکا، بہرنوع اتنی بات میں شبہ کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس بستی میں ان کے اثر سے بھی اہل دہلی کے طرزِ فکر و بیان کی کم و بیش ترویج ہوئی تھی۔

## 8- مشتاق- شیخ امین الدین

کہا جا چکا کہ شمس آباد کی سرزمین پر بھی علوم وفنون کی ترویج واشاعت کے سلسلے مدت سے جاری تھے چنانچہ یہاں کے آب و گِل سے بھی بعض شاعر اٹھے تھے۔ ان نوخیز شاعروں میں سے نادر کے ایک شاگرد کے بارے میں لکھا ہے :

"مشتاق شیخ امین الدین ابن مولوی سراج الدین شمس آبادی، یکے از دوستانِ جامعِ ایں اوراق ؎

گلِ رخسار کو بلبل نے گلِ تر جانا     قدِ آزاد کو قمری نے صنوبر جانا" 56

☆ اصل: 1268- جو غلط ہے چنانچہ صہبائی کے مصرع تاریخ سے ظاہر ہے

# ب - مثنوی

نواب محمد ناصر خاں بنگش نے فارسی زبان میں ایک اچھی مثنوی ''لیلیٰ ومجنوں'' لکھی تھی جو اپنے وقت میں خاصی مقبول رہی تھی لیکن اس جوار کی اردو شاعری پر اس کا کچھ زیادہ اثر معلوم نہیں ہوتا ہے۔ اس زمانے کی فرخ آباد کی اردو شاعری کے سرسری جائزے سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہاں کے شاعروں کو عموماً مثنوی کی صنف سے دلچسپی کم رہی ہے۔ ایک دو شاعروں کی جو مثنویاں دست بُردِ زمانہ سے بچ رہی ہیں، ان کا موضوع کبھی عشق اور کبھی مذہب ہے۔ معیار بھی ان مثنویوں کا کچھ زیادہ بلند نہیں ہے، پھر بھی ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

1- آفریں- شیخ غلام حسین

یہ کوئی غیر معروف شاعر تھا جس کے ذکر سے تقریباً سبھی معاصر تذکرے خالی معلوم ہوتے ہیں، لیکن مقبولیت ایک جوہر خداداد ہے۔ اس شاعر نے ایک مثنوی ''بحرالعشق'' کے نام سے لکھی تھی۔ اپنے نام کے فیض سے یہ مثنوی ایسی مقبول ہوئی کہ شمال اور جنوب کے بڑے کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے محفوظ رہ گئے ہیں اور ان کے واسطے سے خود شاعر کا نام بھی باقی اور موجود ہے۔

الف۔ مخطوطہ کتب خانہ خدا بخش پٹنہ :

| | | | |
|---|---|---|---|
| تخلص و نام شاعر | آفریں، غلام حسین | نام مثنوی | مثنوی بحر العشق |
| 21 ورق، | 12 سطر فی صفحہ، | کاتب | سیتارام |
| سال کتابت: | 1874 | (1291ھ) | |

ب۔ نسخہ کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد، دکن 1

| | | |
|---|---|---|
| آفریں، شیخ غلام حسین | مثنوی بحر العشق | 29 صفحات |
| 17 سطر فی صفحہ | زمانہ تصنیف۔ مابعد | 1200ھ (1786) |

مثنوی کے شروع میں مختصری فارسی عبارت ہے، اس طرح :

''بعد حمد خدائے پاک و نعت صاحب لولاک، بندہ خاکسار کونین شیخ غلام حسین، متخلص بہ آفریں، ساکن قصبہ تیونجہ، پرگنہ بھوج پور، ضلع فرخ آباد، بخدمت ارباب استعداد عرض می دہم......''

اس تمہید کے بعد مثنوی کا آغاز ان شعروں سے ہوتا ہے ؎

بنارس ہے عجب یک شہر رنگیں　　کہ چیں مانے ہے جس سے کشور چیں
بنارس خطۂ جنت نشاں ہے　　پے گلگشت سعدی بوستاں ہے
غبار اُس کا ہے سرمۂ چشم عشاق　　جوں کا اُس کے یک عالم ہے مشتاق

اس طور پر بنارس کی تعریف کرنے کے بعد شاعر نے ایک عشقیہ قصہ کو نظم کیا ہے اور آخر میں بتایا ہے کہ جس طرح لیلیٰ و مجنوں، شیریں فرہاد وغیرہ کا انجام ہوا یہ عاشق و معشوق بھی محروم وصال رہ کر اس دنیا سے چلے گئے۔ قصہ کا خلاصہ اس طرح ہے :

''شہر بنارس میں ایک مہاجن کی دختر نہایت حسین تھی۔ نام اس کا سندری تھا۔ ایک روز وہ بام پر کھڑی تھی کہ ایک نوجوان عاشق مزاج کی اس پر نظر پڑی اور وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ آخر بڑی صعوبتیں اٹھا کر راہی عالم بقا ہوا۔''

مثنوی کا خاتمہ ان شعروں پر ہوا ہے ؎

کیا برباد آخر عشق نے آہ گئے دنیا سے دونوں یار دلخواہ
سمجھتا عشق کوئی آفریں خوب نہ طالب اس سے بچتا ہے نہ مطلوب

اس نسخہ کا ترقیمہ یہ ہے :

'' تمام شد مثنوی بحرالعشق من تصنیف شیخ غلام حسین متخلص بہ آفریں، ساکن قصبہ تیونجہ ضلع فرخ آباد۔ اللھم احفظ قاریھا وناظرھا و کاتبھا وسامعھا بحق احمد مجتبیٰ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم وبحق حضرت ابابکر صدیق و حضرت عمر فاروق و حضرت عثمان بن عفان و حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم ''

کاتب نے اپنا نام وغیرہ اور سالِ کتابت بھی ظاہر نہیں کیا ہے۔ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے عشرۂ ہفتم میں یہ لکھی گئی ہوگی۔

## 2- خبیر- غلام محمد خاں

مولوی غلام محمد خاں خٹک، خبیر تخلص، میر علی اوسط رشک کے شاگرد تھے۔ لالہ سری رام نے ان کی تصانیف میں ''مثنوی دریائے عشق'' کا بھی ذکر کیا ہے۔[2] لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے اس مثنوی کے بارے میں کوئی بھی ضروری بات قلمبند نہیں کی اور نہ اس کا کوئی شعر نقل ہی کیا ہے۔ جناب مشفق خواجہ نے خبیر کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ :

''خریطۂ سرور کے نام سے خبیر نے نوطرز مرصع کی کہانیوں کو منظوم کیا تھا۔ یہ کتاب 1875 (1292ھ) میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ خریطۂ سرور تاریخی نام معلوم ہوتا ہے۔ اس سے سنہ 1290ھ (74-1873) برآمد ہوتا ہے۔''[3]

بظاہر یہ خریطہ سرور مثنوی دریائے عشق سے مختلف ہے اور اسے بھی خبیر کی چھوٹی بڑی مثنویوں کا مجموعہ خیال کیا جانا چاہیے۔

# ج - تاریخ گوئی

جیسا کہ مذکور ہوا نواب محمد علی خاں عرف نواب دولھا انور تخلص کی دو ایک کتابوں کے نام تاریخی بھی ہیں۔ خیال کیا جاسکتا ہے کہ یہ نام شاید اُنھوں نے خود مقرر کیے ہوں گے۔ اگر ایسا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ نواب کو کسی حد تک فنِ تاریخ گوئی سے بھی دلچسپی تھی۔

## 1- گردھاری لال

شمس آباد کے نواب دولھا کے کارندوں میں گردھاری لال نامی ایک شخص تھا جس کے تفصیلی حالات تو نہیں مل سکے۔ افسر صدیقی امروہوی نے البتہ اس سے متعلق بعض مفید اطلاعات قلمبند کی ہیں :

> ''یہ ساںڈی ضلع ہردوئی کے رہنے والے ایک خوشخط شخص تھے۔ اپنے آقا کے حکم سے انھوں نے کچھ کتابیں نقل کی تھیں۔ ان میں ایک قلمی نسخہ ''گلزار نسیم'' کا بھی تھا۔ اس کے آخر میں گردھاری لال نے اپنی طرف سے فارسی میں چھتیس ابیات کی ایک مثنوی لکھی ہے۔ اس مثنوی میں اس نے اپنے آقا کے نام اور سنہ کتابت کی تشریح کی ہے اور ہجری کے ساتھ عیسوی اور بکری سنہ بھی بیان کر دیے ہیں، اس طرح :

| | | |
|---|---|---|
| ہجری | 28۔ جمادی الاول | 1263 بروز جمعہ |
| عیسوی | 14۔ مئی | 1847 |
| بکری | 14۔ جیٹھ | 1904 |

گردھاری لال کو تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ آخری ورق پر ان کی تصنیف کی ہوئی چار تاریخیں ہیں۔ ان میں تین تاریخیں اُس باغ کی ہیں جو نواب دولھا نے شمس آباد میں 1263ھ میں لگایا تھا۔ جو مادے اس نے نظم کیے ہیں، یہ ہیں :

الف۔ باغ کرم
1263

ب۔ زہے باغ اقبال نواب دولہ
1263

اور ج۔ آباد باد باغ مراد
1263

اور ایک قطعہ تاریخ نواب دولھا انور کی تصنیف "انور نفائس" کا ہے۔"[1]

افسوس ہے کہ کوشش کے باوجود گردھاری لال کا احوال اور ان کا تخلص بھی معلوم نہیں ہو سکا۔

## 2- مولوی شیخ کرامت علی

تاریخ گوئی کے سلسلے میں اظہر کو خصوصیت حاصل رہی ہے۔ سعادت خاں ناصر نے اپنے تذکرے میں ان کا احوال کسی قدر وضاحت سے لکھا ہے۔ اس کا اختصار درج ذیل ہے :

"مرد نام آور، شاعر بہتر، تاریخ گوئی میں مشہور تر، سعید ازلی، مولوی شیخ کرامت علی تخلص اظہر، خلف الصدق مولوی امانت علی مرحوم، ساکن موضع شیخ پور توابع فرخ آباد، وارد لکھنؤ، شاگرد رشید شاہ نصیر دہلوی...... مدت سی سال سے مولف کا آشنا...... یہ احقر محرم راز بلکہ دم ساز تھا۔ المختصر یہ چند تاریخ اور دو چار اشعار اس بزرگوار سے یادگار......

تاریخ سریر آرائی شاہ دہلی یعنی بادشاہ جمجاہ بہادر شاہ خلد اللہ ملکہ، ؎

اظہر تو بگو چراغ دہلی"[2]

1253ھ

تاریخ گو کی حیثیت سے ان کے امتیاز کا اعتراف محسن نے بھی کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

''مولوی کرامت علی مرحوم اظہر تاریخ گو، ولد امانت علی باشندہ شیخ پور توابع ضلع فرخ آباد، مقیم لکھنؤ، صاحب دیوان، شاگرد شاہ نصیر نصیر دہلوی۔''[3]

واقعہ یہ ہے کہ تاریخیں موزوں کرنے میں ان کو عجیب مہارت حاصل تھی۔ بات بات میں تاریخ کہتے تھے اور نہایت برمحل کہتے تھے۔ اس زمانے کی بہت سی کتابوں پر ان کی کہی ہوئی تاریخیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ فسانۂ عجائب کی طباعت کی تاریخ انھوں نے اس طرح کہی تھی ؎

خامۂ اظہر پے تاریخ وقتِ انطباع شد رقم از طبع باشد جانِ عالم پُر سرور

1259ھ

# د - قواعد ولُغت

وہ زمانہ تھا جب عروض، قواعد اور لغت کو شعر گوئی کے لیے بنیادی اہمیت حاصل تھی ہر شاعر کے لیے ان کے اصول وضوابط سے واقفیت ضروری تھی۔ فرخ آباد کے صاحبانِ علم نے بھی مبتدیوں کی تعلیم اور تدریس کے لیے ان موضوعات سے متعلق کتابیں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ وہ ابتدائی کتابیں تھیں اس لیے ان کی ضخامت ہی نہیں معیار بھی کچھ زیادہ بلند نہیں تھا، پھر بھی ان کی تاریخی اہمیت اور عمومی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

1 - خبیر- مولوی غلام محمد خاں

مولوی غلام محمد خاں خٹک فرخ آبادی، خبیر تخلص صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کا دیوان کوئی ساڑھے چار سو صفحات پر محیط ہے۔ ان کے دیوان کے نسخۂ سالار جنگ حیدر آباد کے مشمولات اس طرح بتائے گئے ہیں :

| | |
|---|---|
| ایک فارسی عرضی 1 | ، مختصر دیباچہ |
| ایک فارسی قصیدہ | ، اردو قصیدے (حمد و نعت میں) |
| کئی قصیدے افضل الدولہ کی مدح میں | ، اردو غزلیں (ردیف وار) |
| فارسی غزلیں | ، اردو رباعیات |

فارسی رباعیات ، چند قطعاتِ تاریخ

ایک مخمس

یہ دیوان 1274ھ (56-1855) میں مرتب کیا گیا تھا اور یہی اس کا سالِ کتابت بھی ہے۔ صفدر فرخ آبادی نے اس کے لیے جو قطعہ تاریخ کہا تھا اس کا آخری شعر یہ ہے :

زد رقم سالِ عیسوی صفدر کلیاتِ خبیر روشن دل

1863 (80-1279ھ)

یہ بہ گمانِ غالب کتاب کا سالِ طباعت ہوگا۔

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے خبیر کو "صاحب دواوین ہندی وفارسی و عروض" بتایا ہے۔2

لالہ سری رام نے ان کے حالات کو کسی قدر وضاحت سے لکھا ہے، اس طرح :

"خبیر، مولوی غلام محمد خاں خنک خبیر فرخ آبادی، حضرت رشک کے تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کے بزرگ رؤسائے بنگش کی سرکار میں ملازم تھے اور غلام قادر خاں ان کے والد مہاراجا سیندھیا کی فوج میں رسالہ دار تھے۔ یہ خود ایک عرصہ تک نواب کلب علی خاں والیِ رامپور کے مصاحب رہے تھے۔ صاحب دیوان ومثنوی دریائے عشق و سخنِ فیض ہیں۔"3

خبیر معلمی پیشہ شخص تھے۔ ان کی تصانیف عموماً دستیاب نہیں ہیں۔

نادر اور سری رام کے بیانوں کو اگر جمع کریں تو خیال ہوتا ہے کہ "سخنِ فیض" علمِ عروض سے متعلق خبیر کی ایک تالیف ہے۔ اپنے استاد میر رشک سے اس بارے میں انھوں نے جو کچھ سیکھا تھا، اس کتاب میں اسی کو قلمبند کر دیا ہوگا اور اسی اعتبار سے کتاب کا نام سخنِ فیض بہت مناسب رکھا ہے۔ خبیر نے رامپور کے اُس ماحول میں جہاں امیر اللغات جیسی مبسوط لُغت کی تالیف کا کام کیا گیا تھا طالب علموں کے فائدہ کے لیے ایک چھوٹی سی لُغت بھی مرتب کی تھی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتاب خانہ رامپور میں محفوظ ہے۔ اس کی کیفیت اس طرح ہے :

نامِ کتاب۔ نصابِ خبیر

مولف۔ غلام محمد خاں افغان خبیر فرخ آبادی

اوراق۔ 36

## 2- طبیب- اصغر حسین

طبیب تخلص، اصغر حسین نام، فرخ آباد کے رہنے والے ایک صاحب علم شخص تھے۔ عربی سے بھی اچھی طرح واقف تھے چنانچہ "خلاصۃ الصرف" کے نام سے اس زبان کی ایک مفید کتاب لکھی تھی۔ افادیت کے خیال سے بعد میں اس کتاب کے مطالب کو انھوں نے اردو میں بھی لکھ دیا تھا اور اس ترجمے کا بھی وہی نام رکھا تھا۔

مولانا احسن مارہروی نے 1313ھ (1895ء) میں اس اردو کی کتاب کو تیرہ سطری مسطر پر نقل کیا تھا۔4 ضخامت اس کی صرف چونتیس ورق کی ہے۔ اس کی ابتدا ان لفظوں سے ہوتی ہے:

> "بعد حمد خدائے عز و جل و نعت نبی اکملؐ کے التماس کرتا ہے راجی الی مغفرۃ ربّ المشرقین اصغر حسین فرخ آبادی الملقب بہ طبیب کہ ہر چند اس ہیچمداں نے پاستان ایک رسالہ مختصر علم صرف میں بطور متون کے موسوم بہ خلاصۃ الصرف زبان عربی میں لکھا تھا....."5

افسوس کی بات ہے کہ نہ تو طبیب کے حالات مل سکے اور نہ اس ترجمے کا سال ہی دریافت ہوسکا ہے۔ زبان کی صفائی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ کام 1857 (74-1273ھ) کے آس پاس کیا گیا ہوگا۔ کتاب کا خاتمہ اس عبارت پر ہوا ہے:

> "....... جو بہ اعتبار ضرورت لفظی کے واقع ہوتے ہیں وہ تیرہ ہیں.......
>
> (1) التقاء ساکنین، (2) ابتدا بہ سکون، (3) وقف
>
> (4)......، (12) حذف، (13) سکون
>
> ہے کہ اس کی تشریح بھی اوپر کی گئی۔"

# ۵ - مذہبی نثر

فرخ آباد افغانوں کی بستی تھی جن کے مزاج میں مذہبیت رچی بسی ہوئی تھی چنانچہ اس خطہ میں بیشتر مذہبی کتابیں لکھی گئی تھیں۔ یہاں ان میں سے صرف بعض کا مجملاً ذکر کیا جاتا ہے۔

## 1- احمد یار خاں

ان کے حالات تو معلوم نہیں، البتہ ان کی ''مولود شریف'' نے انھیں زندگی جاوید عطا کر دی ہے۔ اس کتاب کے ایک سے زائد نسخے آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ انگد رائے نامی کاتب کا 1842 (1258ھ) کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں یہ کتاب ہندوؤں میں بھی پڑھی اور سُنی جاتی تھی۔ اس کی ضخامت اکیاون ورق کی ہے۔ ابتدا اس طرح ہوئی ہے :

> ''حمد اور شکر اس ذات واجب الوجود کو لائق ہے کہ جس نے سب سے پہلے نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو نور احدیت سے پیدا کیا۔'' 1

اور اختتام ان لفظوں پر ہوا ہے۔

> ''محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ان کی آل و اصحاب اور اہل سنت کی دیوے اور سب مرادیں دنیاوی و دینیہ حاصل کرے۔''

اور :

''......اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو توفیق خیر کی نصیب کرے خصوصاً اس رسالہ کے جمع

کرنے والے احمد یار خاں گنہگار کو۔'' 2

## 2- سید ولی حیدر

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے شاعر کی حیثیت سے ان کا اس طرح ذکر کیا ہے :

'' حیدر مولوی سید ولی حیدر ابن منشی سید امیر حیدر، رئیس فرخ آباد ۔

عمر خضر کیا ہو گوارا ہمیں، آب بقا سے ہے کنارا ہمیں'' 3

لیکن ان کی اصل دلچسپی مذہبیات سے تھی چنانچہ مولانا سید محمد ولی اللہ فرخ آبادی کی کتاب ''اذکار النجات.... ترجمہ ورد التقریب وحزب التوسل الی سید الانبیاء والرسل'' کو 1281ھ (1864) میں انھوں نے نقل کیا تھا۔ 4

خود کو بھی تصنیف وتالیف کا شوق تھا چنانچہ ان کی ایک کتاب کا قلمی نسخہ علی گڑھ میں محفوظ ہے۔اس کی کیفیت یہ ہے :

'' اذکارِ محمدی، از: محمد ولی حیدر حسینی ترمذی فرخ آبادی

کاتب: محمد اعظم علی قنوجی اوراق۔659 سطر فی صفحہ۔19

سنہ تصنیف/ کتابت 74-1273ھ'' 5

ابتدا :نحمدلله لااله الّا هو الحیّ القیوم ونشکره، الّذی لا تاخذهٗ سِنَةٌ وّلانوم.........

اور خاتمہ کی عبارت اس طرح ہے :

'' اور وہ لوگ کہ صدقہ اُن پر حرام ہے اہل بیت ہیں اور بیان فضائل اور مناقب ان حضرات کا ہو چکا۔ واللہ اعلم بالصدق بالصواب....... ''

کتاب کے آخر میں مصنف کی مہر ہے اور اس کے نیچے کاتب کی یہ تحریر ہے :

''نقل ثانی کتاب اذکار محمدی صلعم کہ یہ بھی بطور مسودہ ہے''

شروع میں سات صفحوں پر فہرست مشمولات ہے۔

ممکن ہے کہ ان کی تصانیف اور بھی ہوں لیکن ان کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔

### 3- غلام حسین

کہا جا چکا کہ قنوج زمانہ قدیم سے بزرگان مذہب کا مستقر رہا ہے چنانچہ شیخ عمادالدین کرمانی صاحب فصول عمادیہ کی اولاد میں شیخ علی اصغر بن شیخ عبدالصمد قنوجی بکری کرمانی ہوئے ہیں جو

> ''فقہ، حدیث، تفسیر، صرف، نحو، منطق، معانی میں وحید العصر، فرید الدہر، تصوف وسلوک میں امام وقت تھے۔''6

مولانا عبدالباسط بن مولوی رستم علی بن ملا علی اصغر قنوجی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے جن کے بارے میں لکھا ہے کہ :

> ''قنوج کے علمائے کبار اور فضلائے مشاہیر نامدار سے فقہ و حدیث و تفسیر اور فروع واصول میں ایک آیت منجملہ آیات الٰہی تھے اور اپنے عہد میں تمام علما اور فضلا پر سخن بالا اور مرتبہ والا رکھتے تھے۔''7

انھیں کے پوتے مولوی غلام حسین بن مولوی حسین علی بن شیخ علامہ عبدالباسط قنوجی تھے۔ ان کے حالات مختصراً اس طرح منقول ہیں :

> ''فقیہ فاضل، محدث کامل، مفسر اکمل، جامع علوم و فنون تھے۔ 1221ھ (1806) میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام غلام حلیم (1221) ہے۔ علوم نقلیہ و عقلیہ شیخ عالم محمد سعادت خاں فرخ آبادی مشہور متوکل سے پڑھے اور 1236ھ (=1821) میں علم حدیث و تفسیر کو علامہ محمد ولی اللہ مفتی فرخ آبادی سے اخذ کیا اور براہ بڑودہ حرمین شریفین کو تشریف لے گئے اور 1255ھ (1839) میں واپس آئے۔ دوبارہ حج کے لیے گئے اور واپسی کے بعد بیمار رہ کر 1280ھ (64-1863) میں وفات پائی۔ اپنے دادا کی کتاب منازل الاثنا عشر کا حاشیہ تصنیف کیا جس کی تکمیل میں آپ نے بڑی محنت برداشت کی۔''8

مذہبیات کی تاریخ میں فرخ آباد کے اس خاندان کی خدمات بلاشبہ نہایت قابل قدر ہیں۔

# و - علمی کتابیں

فرخ آباد کے علاقے میں غیر مذہبی موضوعات سے کم سے کم دلچسپی لی گئی تھی چنانچہ وہاں مختلف علوم وفنون سے متعلق نثری کتابیں بھی کم لکھی گئیں۔

1- کالی رائے

انھوں نے ضلع فرخ آباد کی تاریخ لکھی تھی اور اس کا نام انھوں نے ''تواریخ ضلع فرخ آباد موسوم بہ فتح گڑھ نامہ'' رکھا تھا۔ دو سو چار صفحوں کی یہ کتاب دہلی میں 1849 میں چھپی تھی۔

2- نامعلوم

فرخ آباد کے علاقے میں ہندو اہل قلم خاصی تعداد میں تھے۔ وہ فارسی اور اردو کے علاوہ سنسکرت وغیرہ زبانوں سے بھی دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ ان زبانوں کے علمی سرمایہ کو بھی اپنے حلقے میں رواج دینے کی کم و بیش کوشش کرتے رہتے تھے۔ تصنیف، تالیف اور ترجمے کے علاوہ سنسکرت علوم وعقائد پر مشتمل کتابوں کی بھی وہ لوگ نقلیں بھی تیار کرتے رہتے تھے۔ مسلمان صاحبانِ علم بھی اس باب میں ان کے دوش بدوش مصروف رہتے تھے۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ صرف ایک قلمی نسخے کا نمونہ کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے :

گوسٹِ راجا دَھرم اور راجا جُدِ سٹر 2

کاتب۔ ...... ساکن شمس آباد اوراق چھ

سطر فی صفحہ چودہ سنہ کتابت۔ 1914 سمبت (1273۔74=1857)

آغاز۔ گوسٹِ (= گوشٹھی) راجا دَھرم اور راجا جُدِ سٹر (= جُدِ ھشٹر) کا کہ راجا دھرم سُرگ (= سُورگ) لوک سے آ کے راجا جدسٹر لڑ کے اپنے سے کہا تھا........

اختتام۔ ......کہ اے راجا جنم جہ راجا دھرم آشیرباد کر کے روانہ سُرگ (سورگ) لوک ہوئے۔"

یہ نکتہ بھی خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ اس قسم کی کتابوں کو اُس زمانے میں بھی نقل کیا جارہا تھا جب پورا ملک بہ شمول فرخ آباد انقلاب آفریں ہنگاموں میں مبتلا تھا اور اردو، فارسی کے اربابِ علم عموماً اپنی جان اور مال کے لیے جائے پناہ تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

# حواشی

## الف - شاعری

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | تواریخ نادر العصر | | ص65 |
| 2- | خم خانہ جاوید | جلد5 | ص478 |
| 3- | سراپا سخن | | ص210 |
| 4- | خوش معرکہ زیبا | جلد2 | ص618 |
| 5- | سراپا سخن | | ص101 |
| 6- | خم خانہ جاوید | جلد3 | ص450 |
| 7- | مجامع شعرا | | ص250تا251 |
| 8- | تذکرہ نادر | | ص33 |
| 9- | ایضاً | | ص70 |
| 10- | ایضاً | | ص84 |
| | اور تاریخ فرخ آباد | | |
| 11- | تذکرہ نادر | | ص176 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| -12 | ایضاً | | ص112 |
| -13 | ایضاً | | ص49 |
| -14 | خوش معرکۂ زیبا | جلد2 | ص543 |
| -15 | سراپا سخن | | ص18 |
| -16 | ایضاً | | ص213 |
| -17 | تذکرہ نادر | | ص50 |
| -18 | خمخانہ جاوید | جلد2 | ص192 |
| -19 | تذکرہ نادر | | ص58 |
| -20 | سخن شعرا | | ص146 |
| -21 | سراپا سخن | | ص29 |
| -22 | تذکرہ نادر | | ص98 |
| -23 | سخن شعرا | | ص301 |
| -24 | تذکرہ نادر | | ص122 |
| -25 | سراپا سخن | | ص264 |
| -26 | ایضاً | | ص295 |
| -27 | اردو مخطوطات علی گڑھ | | ص211 |
| -28 | خوش معرکۂ زیبا | جلد2 | ص89 |
| -29 | ایضاً | جلد2 | ص367 |
| -30 | تذکرہ نادر | | ص136 |
| -31 | سخن شعرا | | ص412 |
| -32 | تذکرہ نادر | | ص136 |
| -33 | سخن شعرا | | ص252 |
| -34 | خوش معرکۂ زیبا | جلد2 | ص618 |
| -35 | تذکرہ نادر | | ص140 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 36- | سراپا سخن | | ص196 |
| 37- | تذکرہ نادر | | ص180 |
| 38- | سراپا سخن | | ص80 |
| 39- | گلستان سخن | جلد2 | ص364 |
| 40- | تذکرہ نادر | | ص20 |
| 41- | ایضاً | | ص257 |
| 42- | ایضاً | | ص76 |
| 43- | ایضاً | | ص110 |
| 44- | حدائق الحنفیہ | | ص453 |
| 45- | افسانہ لکھنو | | ص |
| 46- | دبیر اور شمس آباد | | ص6 |
| 47- | تذکرہ نادر | | ص37 |
| 48- | دبیر اور شمس آباد | | ص8تا9 |
| 49- | اردو مخطوطات انجمن کراچی | جلد5 | ص221 |
| 50- | تذکرہ نادر | | ص |
| 51- | ایضاً | | ص91 |
| 52- | ایضاً | | ص157 |
| 53- | ایضاً | | ص110 |
| 54- | گلستان سخن | جلد2 | ص122 |
| 55- | ایضاً | جلد2 | ص222تا227 |
| 56- | تذکرہ نادر | | ص142 |

## مثنوی

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | مخطوطات آصفیہ | جلد2 | ص323تا324 |
| 2- | خم خانہ جاوید | جلد3 | ص12 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 3- | جائزہ مخطوطات | جلد 1 | ص471 |

## تاریخ گوئی

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | اردو مخطوطات انجمن کراچی | جلد 5 | ص219 تا 221 |
| 2- | خوش معرکہ زیبا | جلد 2 | ص154 تا 156 |
| 3- | سراپا سخن | | ص124 وغیرہ |

## قواعد و لغت

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | جائزہ مخطوطات | جلد 1 | ص470 |
| 2- | تذکرہ نادر | | ص62 |
| 3- | خم خانہ جاوید | جلد 3 | ص12 |
| 4- | مخطوطات ذخیرۂ احسن | | ص156 |
| 5- | اردو مخطوطات علی گڑھ | | ص331 تا 332 |

## مذہبی نثر

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | مخطوطات اردو علی گڑھ | | ص56 |
| 2- | ایضا | | ص303 |
| 3- | تذکرہ نادر | | ص60 |
| 4- | مخطوطات اردو علی گڑھ | | ص47 |
| 5- | ایضا | | ص54 |
| 6- | حدایق الحنفیہ | | ص456 |
| 7- | ایضاً | | ص482 |
| 8- | ایضاً | | ص498 |

## علمی کتابیں

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | قاموس الکتب | جلد 2 | ص432 |
| 2- | مخطوطات اردو علی گڑھ | | ص7 |

# 3- کانپور

حواشی

| | | | |
|---|---|---|---|
| | کانپور کی آبادی | | 213 |
| -1 | انگریزی چھاؤنی | | 213 |
| -2 | چھوٹی امت | | 217 |
| | ماحول | | 229 |
| -1 | مہر۔ | امین الدولہ | 230 |
| -2 | سید۔ | نظام الدولہ | 262 |
| -3 | ساحر۔ | معین الدولہ | 274 |
| -4 | شمس۔ | محمد علی خاں | 282 |
| -5 | تمنا۔ | علی حسین خاں | 289 |
| | الف - شاعری، غزل | | 299 |
| -1 | عیش۔ | ابو محمد | 300 |
| -2 | غنی۔ | غنی محمد | 301 |
| -3 | مجروح۔ | غلام سعد | 302 |
| -3 | عشق۔ | شیخ الٰہی بخش | 304 |
| | ب - مثنوی | | 307 |
| -1 | صغیر۔ | شیخ حیدر علی | 308 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| -2 | شائق- | منشی فتح علی | 309 |
| -3 | مجروح- | غلام سعد | 310 |
| -4 | ہلال- | امیر علی خاں | 310 |
| | | ج - سلام و مرثیے | 313 |
| -1 | گریاں و سوزاں | | 313 |
| -2 | تمنا- | سید علی حسین خاں | 314 |
| -3 | مقبل- | اکبر علی | 315 |
| -4 | تنویر- | میر کاظم حسین | 316 |
| -5 | صغیر- | شیخ حیدر علی | 317 |
| -6 | ببر- | علی مرثیہ خواں | 318 |
| -7 | [illegible]- | علی رزم خواں | 319 |
| | | د - قصیدہ | 321 |
| | | ہ - تاریخ گوئی | 325 |
| -1 | رشک- | میر علی اوسط | 326 |
| -2 | بہار- | گلشن الدولہ | 329 |
| -3 | عشق- | شیخ الٰہی بخش | 330 |
| -4 | منیر- | سید اسمٰعیل حسین | 331 |
| -5 | ہلال- | امیر علی خاں | 332 |
| -6 | شوق- | حکیم سید علی ضامن | 332 |
| | | و - معمّا | 333 |
| | | ز - عروض | 335 |
| -1 | منشی- | بشارت علی خاں | 336 |
| -2 | تمکین- | میر ہدایت علی | 338 |

3- تنویر- سید کاظم حسین 338
4- سیفی- سید وارث علی 339
5- شوق- سید علی ضامن 340
6- سید- محمد علی حکیم 341
7- سالک- سید احمد حسین خاں 342
8- نامعلوم 342
ح - قواعد ولغت 345
1- اصول عجیبہ 345
2- رسالہ افضل 346
3- تعلیم الصبیان 347
4- صفوۃ المصادر 348
5- نفس اللغہ 348
ط - تذکرے 353
1- سراپا سخن 353
2- ترجمہ مخزن نکات 360
3- گلستانِ مسرت 364
نثر 365
الف - خطوط 365
1- شوق- شیخ الٰہی بخش 366
2- عطا- مسیح الزماں فاروقی 267
ب - مذہبی نثر 371
1- عاشق- عباس علی فاروقی 371
ج - میلا نامہ 377

| | | | |
|---|---|---|---|
| -1 | شاکر- | عبدالرحمٰن | 377 |
| -2 | عیش- | ابومحمد فاروقی | 377 |
| -3 | غنی- | غنی احمد | 378 |
| -4 | سیفی- | وارث علی | 379 |
| | ک - مطبعے | | 383 |
| -1 | کانپور ایڈورٹائزر | | 383 |
| -2 | مطبع مسیحائی | | 384 |
| -3 | مطبع مصطفائی | | 384 |
| -4 | مطبع محمدی | | 384 |
| -5 | مطبع مسیحائی | | 386 |
| -6 | مطبع نظامی | | 387 |
| | حواشی | | 390 |

# کانپور کی آبادی

## 1- انگریزی چھاؤنی

نصیرالدین حیدر باشاہِ اودھ کے زمانے میں وزیراعظم نواب معتمد الدولہ آغا میر معزول ہو کر نظر بند کر دیے گئے۔ پھر 1245ھ (30-1829) میں انھیں لکھنؤ سے کانپور چلے جانے کی اجازت مل گئی۔ اس شہر کے بارے میں منشی درگا ہی لال نے لکھا ہے:

> ''ماہ مارچ 1778 میں (اس جگہ) فوج سرکار آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی چھاؤنی ہوئی۔ دسویں نومبر 1801 کو نواب سعادت علی خاں وزیرالممالک اودھ نے یہ ملک (کانپور) سرکار موصوف کو تفویض کیا۔''1

چھاؤنی کے لیے انگریزی میں لفظ کیمپ (CAMP) بھی آتا ہے۔ انگریزی افواج کے قیام کا مرکز بن جانے کی وجہ سے اس مقام کو اسی نام سے جانا جانے لگا۔ ہندوستانیوں کی زبانوں پر تلفظ میں تبدیلی کے ساتھ یہ کئی طرح جاری ہوا یعنی کمپ، کیپ، کپو اور کنپو

بانکے بہاری شجاعت نے کم وبیش اُسی زمانے میں کہا تھا:

لکھنؤ اک تختۂ گلزار ہے اب بھلا کپو میں کب آتے ہیں ہم

کثرتِ استعمال سے لفظ کپو بھی تبدیلیوں سے گزرتا رہا اور تحریر میں اس کی جو صورتیں رائج ہوئیں یہ تھیں:

کپو،کپور، کنپور ، کانپور ، کانہہ پور( کانے پور)

پورب کے مسافروں کی زبان سے کانپور کے ریلوے اسٹیشن پر اب بھی پہلی اور آخری صورت سننے میں آجاتی ہے۔

فوجی چھاؤنی ہونے کی وجہ سے اس مقام پر رہائش کے لیے انگریزوں کی ضرورتوں، طریقوں اور ان کے مزاج کے مطابق جو عمارتیں بنوائی گئیں، اصطلاح میں ان کو بارک (BARRACK) کہتے تھے۔ان بارکوں کی وضع کا بیان میرعلی اوسط رشک نے اس طرح کیا ہے:

''بارک مکانات مانندِ فوجِ انگریزی را گویند کہ طولانی بود و دریچہ ہا دارد۔لغتِ انگریزی است۔''2

ان بارکوں کے تعلق سے انگریزی فوج کی بہ کثرت اصطلاحیں وہاں کے رہنے والوں کی زبانوں پر جاری ہوگئی تھیں۔

مثلاً ٹرپ(جماعت ہشتادسواراں)،ٹرم(منر بارفوجِ انگریزاں)

انگریز حکام کی رہائش کے لیے جو مکان ہوتے تھے ان کو بنگلہ (BANGLOW) کہتے تھے۔ان کی کیفیت کا بیان میر رشک نے ان لفظوں میں کیا ہے۔

'' بنگلا.......... مکانِ مربع کہ از سفالہ خواہ از کاہ پوشند و بیشتر اماکن نصارا چنیں بود......و نامِ فیض آباد است کہ نواب شجاع الدولہ مرحوم اول اماکن گاہے آنجا ساختہ بودند، بعدازاں آباد شدہ۔''3

اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ کانپور کے بنگلے،نسبتاً بہتر اور زیادہ آرام دہ ہوتے تھے۔ان میں ''بوچھاری'' وغیرہ بھی بناتے تھے جو کینوں کو بارش کی بوچھار سے محفوظ رکھتی تھیں۔ میر رشک کے لغت میں اُسارا، اُساری، اولتی اور رانا وغیرہ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ان بنگلوں میں ''الماری'' (صندوقے باشد استادہ، میانِ آں تختہ ہا مانند خانہ درعرض نصب کنند......و در دو دیوار ہم تختہ ہا در عرض نصب کنند و دو پارہ در برروئے آن نصب کردہ اسباب دراں بند سازند) اور ''بکس (BOX صندوقچۂ اسباب) اور ''بوتل'' ( چیزے سازند مانند شیشہ......) وغیرہ اشیائے ضروری کے رکھنے کے لیے ہوتی تھیں۔کواڑوں کے تختوں میں ''پام'' ( یک پہلو خالی کردہ

بر پہلوئے خالی کردہ تختۂ دوم چسپانیدہ) بناتے تھے اور جہاں ضرورت ہوتی تھی "پوٹین" (روغنے باشد کے درز ہائے چوب بداں بند کنند) بھرتے تھے۔

انگریزوں کے بچوں کی پرورش کے لیے "آیا" ہوتی تھی اور ان کے لیے جو مخصوص مدرسے ہوتے تھے ان کو اسکول (SCHOOL) کہتے تھے۔ عیسائی مذہب کے عالم "پادری" کہلاتے تھے۔ "بٹ ٹرائی" (امتحان سنگ ترازو) کا نظام جاری ہو چکا تھا۔ تاجروں سے محصول لینے کے محکمہ کو پرمٹ (PERMIT) اور اپیلانٹ" (مدعی مرافعۂ ثانی) وغیرہ رواج پا چکی تھی۔ ایک نیا لیکن قابلِ تحسین نظام پنشن کا تھا جسے انگلس کہتے تھے۔ میر رشک نے لکھا ہے:

"انگلس مشاہرہ باشد کہ بیماراں و پیراں ملازم انگریزاں تادم زندگی یابند و آں نیم مشاہرۂ سابق ایں کس باشد۔" 4

"انگلسیا" کسیکہ چنیں مشاہرہ یابد بر دولغت انگریزی ست۔"

انگریزوں کی کھانے پینے کی چیزیں بھی الگ ہوتی تھی مثال کے طور پر "بسکٹ" کے بارے میں لکھا ہے:

"بسکٹ۔ قرصے بود کے آرد در آب تاڑیا آب درخت خرما خمیر کردہ پزند و ایں از غذاہائے انگریزاں است و لغت انگریزی ست" 5

کانپور ملکِ نصارا کہلاتا تھا اس میں بعض محلوں کے نام انگریزی تھے جیسے پریڈ، پرمٹ وغیرہ اور کئی کے ناموں میں ہندستانی لاحقے لائے جاتے ہیں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ بیشتر ناموں میں گنج" کا لاحقہ آیا ہے چنانچہ ہیکن گنج، جنرل گنج، فیتھ فل گنج، اور کرنیل گنج وغیرہ۔

بعض نام زیادہ دلچسپ ہیں جیسے بوچڑ (BUTCHER) خانہ۔

اس ملکِ نصارا میں انگریزوں کی سواریاں وغیرہ بھی خاص تھیں مثلاً بگھی جس کے بارے میں لکھا ہے: "بگھی۔ بہل انگریزی بود و اقسام بسیار دارد و بجائے نرگاواں اسپاں ی کشند و سواری انگریزی ست۔ 6

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دہلی میں بھی ان کے استعمال میں تھی۔ شیخ ذوق نے کہا ہے ؎

نہیں بگھی میں وہ فرنگی زاد ماہ ہے منزلِ ہوائی میں

اس کا ایک اہم حصہ ''بم'' ہوتا تھا جس میں گھوڑے جوتے جاتے تھے۔

پالکی کی قسم کی ایک سواری پنس تھی جسے کہار اٹھاتے تھے۔ ہندستانی امرا بھی یہ سواری رکھنے لگے تھے۔

کانپور شہر گنگا کے کنارے پر بسا تھا۔ اسی میں سیر و شکار کے لیے بھی انگریزوں نے مختلف چیزیں بنائی تھیں مثلاً

''بجرا بروزن صحرا نادے باشد مصنوعِ انگریزاں کہ کوتاہ تر از جہاز باشد و سقف مکانات دارد و مرکب امیرانست۔''7

''اگن بوٹ۔ ناو دخانی باشد کہ از صنعتِ انگریزاں بہ زور دود در دریا رود و برائے راندن آں حاجتِ ملاحاں نہ شود۔''8

انگریز حکام نے اپنی آسائش کے لیے جدید طریقوں کے مطابق بجلی اور پانی وغیرہ کا بھی انتظام کیا تھا۔ یہ دونوں اس زمانے میں بڑے سائنسی کرشمے تھے اور ان سے دتی اور لکھنؤ دونوں مراکز کے باشندے عملاً ناواقف تھے۔ میر علی اوسط رشک نے بھی جو لکھنؤ کے معززین میں سے تھے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''بجلی حکیماں چیزے از سیماب ساختہ اند، آں چناں است کہ چند ظروف شیشہ بود، یک زنجیر طولانی دارد و کسانیکہ زنجیر را در دست گیرد بہ سبب گردشِ آں آلات آں چناں صدمہ بر انگشتاں رسد کہ بہ لرزند۔''9

''پانی بنانا۔ صاف کردنِ آب از حکمت عملی بہ لوے کہ کرم ہا در آب نماند و آں آب ہاضم بود و در کوٹھی انگریز کنارِ گنگ در کانپور ساختہ می شود و بہ قیمتِ گراں می آید۔''10

انگریزوں کے شفاخانے بھی ہندستانیوں کے لیے انوکھے تھے۔ ان کے لیے ہسپتال یا اسپتال اور معالج کے واسطے ڈاکٹر کی اصطلاح رائج تھی۔ غرض یہ ''ملکِ نصارا'' مقامی باشندوں کے واسطے عملاً عجائب خانہ بنا ہوا تھا۔ انگریزوں کی ضرورت اور استعمال کی طرح طرح کی چیزیں

یہاں بنائی اور تیار کی جاتی تھیں۔ بعض چیزوں کا اوپر ذکر کیا گیا۔ ان کے علاوہ باراں کوٹ (جو برسات کے علاوہ سردی سے بھی بچاتا تھا)، بوٹ (نوعے از پاپوش کہ انگریزاں پوشند) اور بابرینٹ (قسمے از قماش مصنوعی انگریزاں) اور خدا جانے کتنی چیزوں کا یہ شہر صنعتی مرکز بن گیا تھا۔

## 2- چھوٹی امت

مرزا رجب علی بیگ سرور جب پہلی مرتبہ لکھنو سے نکل کر کانپور میں پہنچے تو انھیں شدید مایوسی ہوئی۔ انگریزوں کی بستی اور محلوں میں تو رہنے کا بہ گمانِ غالب موقع نہیں ملا تھا۔ وہ جن ہندوستانیوں کے درمیان مقیم تھے ان میں سے بیشتر وہ لوگ تھے جو مزدوری اور نوکری پر بسر کر رہے تھے۔ ان کا ذکر سرور نے اس طرح کیا ہے:

> ''ربیع الثانی کے مہینے میں سن ہجری نبوی صلی اللہ علیہ و آلہٖ و اصحابہ وسلم بارہ سے چالیس تھے کہ اتفاق مجبور کو روہ کانپور میں آنے کا ہوا۔ بسکہ یہ بستی پوچ و لچر ہے۔ اشراف عنقا صفت ناپیدا ہیں۔ احیاناً جو ہوں گے تو گوشہ نشیں عزلت گزیں، مگر چھوٹی امت کی بڑی کثرت دیکھی۔ یہ طور جو نظر آیا دل وحشت منزل سخت گھبرایا کلیجہ منہ کو آیا۔''11

جلال لکھنوی نے ''چھوٹی امت'' کی وضاحت اس طور پر کی ہے:

> ''چھوٹی امت کنایہ ہے مردمِ فرومایہ و رذیل سے مانند دھنئے جلاہے، کنجڑے کبڑوے وغیرہ کے''

کانپور کے محلوں کے نام سرور کے مذکورہ بیان کی توثیق کرتے ہیں۔ مثلاً گھوسیانہ (گھوسیوں کا محلّہ)، کوریانہ (کوریوں کا محلّہ)، تیلیانہ (تیلیوں کا محلّہ)، چھیپانہ (چھیپیوں کا محلّہ)، گڈریاں محال، سرکی محال، کنگھی محال، بہنا جھابڑ وغیرہ اور تو اور نواب معتمد الدولہ آغا میر نے مکان خرید کر جس محلّہ میں سکونت اختیار کی تھی وہ گوال ٹولی ہے ان ناموں پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ کانپور کی مقامی آبادی میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ مسلمانوں میں بیشتر وہ لوگ تھے جو لکھنو سے خارج البلد ہو کر آئے تھے۔ ان میں جو ''اشراف'' تھے وہ بقول سرور گوشہ نشیں عزلت گزیں تھے۔ باقی میں سے بعض نے چوری سینہ زوری اور لوٹ مار کو شیوہ بنالیا تھا اور اس معاملہ میں انھوں نے

بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ میر علی اوسط رشک کا ایک شعر ہے ؎

سینے سے دل چُرا کے، چُراتے نہیں نظر　　یہ بُت بھی کانپور کے چوروں سے کم نہیں

اس سے کانپور کے چوروں کے امتیاز دو معلوم ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ انتہائی محفوظ جگہ سے بھی یہ جس چیز کو چاہتے ہیں چرا لیتے ہیں۔ دوم یہ کہ اپنی اس حرکت پر وہ شرمندہ نہیں ہوتے اور اپنی نظریں نہیں چراتے ہیں یعنی نہایت ڈھیٹ ہیں۔ یہ چھوٹی امت جھونپڑیوں اور چھپروں وغیرہ میں بسر کرتی ہوگی۔ رات میں پوال بچھا کر سو رہتے ہوں گے وغیرہ ان کی زبانوں پر گالی گلوج کے ساتھ بہ کثرت مبتذل الفاظ جاری رہے ہوں گے۔ میر رشک کے لُغت میں ایسے بہت لفظ آئے ہیں۔ فحش کلمات سے قطع نظر کچھ الفاظ یہ ہیں:

آکا، آبے، اَبے تَبے، اَنٹا غفیل، اوت، بچونگڑا، پُتر یا پلپل ٹھیکری

ہندو عوام کے ساتھ لین دین اور ربط ضبط کے نتیجہ میں بھی ان کی بول چال، رسم و رواج، پوجا پاٹ وغیرہ سے متعلق بہت الفاظ شہر کانپور کی نظم و نثر میں داخل ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں کچھ الفاظ میر رشک کے لُغت سے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

ذات پات وغیرہ: باجپئی، بامھن، بامھنی، بھاٹ، بھرتری، اگروالہ، اوجھا، اہیر

مہینے وغیرہ۔ اساڑھ، اگھن، بیساکھ، بھادوں

راگ راگنی وغیرہ۔ الھیا، باگیسری، دوہرا، کُنڈلی، بِرہا، آلھا

زیور وغیرہ۔ بچھوا، انوٹ۔

تہوار، رسوم اور متعلقات۔ آٹھوں، ہولی، اوتار، آسَن، ارتھی، بھنڈارا

متفرقات۔ اَن کہی (کلمہ طیبہ)، اَلٹوانسی کبیر کی، بالا (سید سالار مسعود)

بیاز (بیاج، سود)، بیازد (بیاجو، سودی) بیپاری (بیوپاری، تاجر) اَنّ (غلہ)

اڈیاں (دپاپوش ٹاٹ بانی کہ چار چہ ہائے بانات بجائے پاشنہ دوزند)، اوگی (انچہ بر اس ٹاٹ بانی کردہ بر کفش بادوزند)

کانپور میں "ٹاٹ بانی اور اس قبیل کے بہ کثرت مرکب کلمات زبان پر جاری تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں کے باشندے عربی، فارسی کے لفظوں کے ساتھ ہندی اور انگریزی کے

کلمات کو لاحقہ یا سابقہ کی صورت میں !! نے کو درست سمجھتے تھے۔

نواب معتمد الدولہ آغا میر جس زمانے میں کانپور میں پہنچے تھے، اس شہر کی جو حالت تھی میر علی اوسط رشک کی اس غزل سے اس کا اندازہ کیا جانا چاہیے جس کے دو شعر یہ ہیں۔۔

اے کارساز خانۂ کنبو خراب ہو　　جو آ گیا، خراب ہوا کانپور میں

اے رشک جُز غبارِ پریشاں نہیں ہے خاک　　مٹی ہوئی خراب ، رہا کانپور میں

کانپور کے غُربا طرح طرح کی امیدیں لے کر لکھنو سے آنے والوں کے گرد جمع ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ شیخ ناسخ نے اس صورتِ حال کا بیان اس طرح کیا ہے۔

یہ نوچے کھاتے ہیں زندوں کو کانپور کے لوگ　　کہ جیسے کھاتے ہیں مُردوں کو زاغ گنگا میں

یہ سب درست ہے لیکن یہ امر واقعی ہے کہ یہ بستی شرفا سے خالی نہیں تھی چنانچہ جس وقت مرزا رجب علی بیگ سرور یہاں پہنچے، انھیں ایک کرم فرما مل گئے تھے چنانچہ لکھتے ہیں۔

''بشریت عنایت و مجموں شفقت، ارسطو فطرت، بقراط حکمت حکیم سید اسد علی صاحب شیر بیشۂ علم و کمال سخن فہم ظریف خوشحال طبع سودا خیز او سر جنوں انگیز کو آرام و تسکین حاصل ہوئی۔ وہ حال فقیر دلگیر پر الطاف و کرم فرماتے تھے...... یہ بھی کہا کہ ایک کہانی لکھا چاہتا ہوں۔ سُن کر فرمایا بیکار مباش کچھ کیا کر۔''13

چنانچہ ان حکیم صاحب کی تحریک کے نتیجہ میں ''فسانۂ عجائب'' لکھا گیا۔

جب یہ فسانۂ عجائب مکمل ہو گیا تو آغا نوازش کی نظر سے گذرا اور انھوں نے ''بعد اصلاح شاگرد نوازی فرما کر'' قطعہ تاریخ بھی کہا۔ نوازش کے احوال میں سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

''خدیو ملک سخن رانی نوازش حسین خاں عرف مرزا خانی خلف حسین علی خاں ابن نواب ناصر خاں صوبہ دار کابل تخلص نوازش.......... چندروز سے بہ سبب خرید کرنے دیہات نیلام کے کانپور میں تشریف رکھتے ہیں۔ گاہے گاہے لکھنو میں بھی آ جاتے ہیں''14

خریداری دیہات کے سلسلے میں مرزا نوازش کو یہاں کے امیر غریب، شریف رذیل ہر طبقے کے لوگوں سے معاملہ رہا تھا۔ خریداری کے بعد دیہات کے مالک کی حیثیت سے ان کی شخصیت

اس علاقے میں مقتدر اور موثر ہو جاتی تھی۔ ان کے اثر سے اس جوار میں شعر و سخن کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کے علاوہ سعادت خاں ناصر نے اپنے تذکرے میں نوازش کے ایک شاگرد کے تعارف میں لکھا ہے:

"کلام اس کا بامزا، وافع صفرا، شیخ اظہر علی تخلص اظہر، ساکن کانپور، شاگرد نوازش" 15

اور محسن نے بھی ان کے ایک اور کانپوری شاگرد کا ذکر کیا ہے:

"وکیل عدالت دیوانی ضلع کانپور میر مہدی حسین تخلص خلف سید دلیر علی متوطن دارالخلافہ جہاں آباد مقیم کانپور، صاحب دیوان شاگرد مرزا اغائی نوازش" 16

یہ نہیں معلوم کہ ان دونوں نے شعر گوئی کب سے شروع کی تھی البتہ ثانی الذکر کے بارے میں قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ دیہات کی خریداری کے سلسلے میں نوازش کو عدالتِ دیوانی میں جانا پڑتا ہوگا۔ وہیں تخلص کے ساتھ رابطہ کی صورت پیدا ہوگی۔

مرزا رجب علی بیگ سرور نے 1240ھ (25-1824) میں ایک اور شاعر کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

"ایک دوست بندے کے زمانے کے تعلق سے مثل سرو آزاد لالہ درگا پرشاد تھے۔ ہنر میں عیب پوش تخلص مدہوش، خم محبت سے بے الفت جوش میں آئی، تاریخ مستانہ زیب فسانہ فرمائی۔" 17

یہ پندرہ شعر کا قطعہ ہے جس میں قصہ کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ آخری شعر میں تاریخ اس طرح کہی ہے ؎

ہوئی جو مدہوش کو یہ خواہش کہ سال تاریخ اس کا لکھئے
تو کھینچ کر آہ دل سے نکلا خزاں سے رنگ بہار دیکھا۔

1240ھ = 1246 -6

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ تخرجہ کے ساتھ یہ تاریخ بہت اچھی کہی ہے ایسے شاعر کی موجودگی کی کانپور کے اُس ماحول میں یقیناً اہمیت تھی۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ سیاسی مصلحتوں سے ان لوگوں کو جن کو کسی وجہ سے دیس نکالا ملتا تھا،

انگریز حکام پناہ دے کر اپنی عملداری یعنی کانپور میں رہنے بسنے کی اجازت دے دیتے تھے۔ کانپور میں یہ "دیس نکالا" کی ترکیب عام طور سے مروج رہی ہے۔ میر رشک نے اسی قبیل کے ایک اور محاورہ کی نشاندہی کی ہے یعنی:

"پانی ناپنا۔ سزائے مجرماں باشد از حکم نصارا بدیں صورت کہ آں گنہگار را بہ دریائے مغرب بفرستند کہ آب پیائی کند تلمذ ت معین"18

عمائد لکھنؤ میں سے جلا وطن ہو کر کانپور بھیجے جانے والوں میں غالباً پہلی نہایت موقر شخصیت نواب قمرالدین احمد خاں بہادر عرف مرزا حاجی ابن مرزا جعفر کی تھی۔ وہ مرزا قتیل کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ قمر تخلص کرتے تھے۔ شاعر نواز بھی تھے لیکن کانپور میں پہنچ کر خود کسمپرسی میں دن کاٹ رہے تھے۔ لکھنؤ سے آنے والے بیشتر امرا اور شعرا کا کم وبیش یہی حال ہوتا تھا۔ ان کے اثر سے کانپور کے ماحول میں بہتری کی صورت کم ہی پیدا ہو سکتی تھی۔

نواب معتمد الدولہ آغا میر 17 / ربیع الثانی 1245ھ مطابق 17 / اکتوبر 1828 کو رہا ہو کر اپنے اعزا، اقربا، متوسلین، مقربین اور نوکروں چاکروں کے ساتھ کانپور میں وارد ہوئے یہ صحیح ہے کہ لکھنؤ کی سیاست نے انھیں جلا وطن ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا لیکن سرکار انگریزی میں ان کا رسوخ اور وقار ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ جوہی کے میدان میں "کوٹھی صبادا" کے قریب مقیم ہوئے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں نصیرالدین حیدر بادشاہ اودھ نے گورنر جنرل سے ملاقات کے سلسلے میں آ کر قیام کیا تھا۔ اس میدان میں نواب معتمد الدولہ کے خیمے نصب ہو گئے تھے اور چند روز تک وہ ریذیڈنٹ بہادر کے مہمان رہے تھے۔ شروع شروع میں کیفیت یہ تھی ؎

یہاں اے رشک دام ودد بھی آتے ہیں تو کہتے ہیں　　کہ ہے جائے غم وخوف وخطر میدان جوہی کا

کچھ دن کے بعد وحشت دور ہو گئی اور صورت حال بقول رشک یہ ہو گئی کہ ؏

لوگ جوہی میں تماشائے چمن کرتے ہیں

نواب معتمد الدولہ نے محلّہ گوال ٹولی میں بخشی گرانٹ کا بنگلہ خرید کر اپنے لیے اس میں آسائش کے تمام اسباب درست کر لیے۔ ان کے رفیق اور نوکر چاکر بھی اپنی اپنی سہولت کے مطابق شہر کے

مختلف علاقوں میں مقیم ہو گئے۔نواب کا دربار آراستہ ہو گیا۔ میلے ٹھیلے رونقیں دکھانے لگے۔شعر وسخن کی محفلیں سجنے لگیں۔ کچھ ہی مدت کے بعد اس شہر میں شاعروں کا جمگھٹ ہو گیا۔ دیارِ مشرق کے تقریباً سبھی بڑے استادوں کے شاگرد کانپور میں رہنے لگے تھے۔ ذیل میں ان کی ایک سرسری فہرست درج کی جاتی ہے۔:

الف۔شاگردانِ مصحفی:

اہل خطہ عبدالرحیم مرحوم رعنا ولد خواجہ سخی تاجر پشمینہ، باشندۂ لکھنو، مقیم کانپور (محسن)

شیخ فضل علی مرحوم شاد، صاحب دیوان، وارد کانپور (ناصر)

وحیدالدین خاں عرف مولوی خدا بخش خاں فرد ولد محسن خاں، قوم افغان یوسف زئی معلم پیشہ دستار بند۔اس شہر میں بہت شاگردان کے ہیں اور خود استادی کا دم مارتے ہیں اور شاعروں میں اپنے تئیں سب سے اونچا جانتے ہیں، صاحب دیوان۔ باشندۂ دربھنگا، مقیم کانپور (محسن)

ب۔شاگردانِ فرد:

طبع اس کی سالم، شیخ فاضل علی خادم مقیم کانپور (ناصر)

ترک سوار سلطان علی خاں غم ولد عبداللہ خاں باشندۂ کانپور شاگرد فرد (محسن)

مست تخلص عالم علی خاں باشندۂ کلکتہ، آٹھ برس ہوئے کانپور میں جا کر انتقال کیا (نساخ)

ممنون جویائے مضمون قاضی محمد علی مقیم کانپور (ناصر)

منظور بابو خاں دستار بند ولد شاکر خاں صوبیدار پلٹنِ انگریزی، باشندۂ کانپور (محسن)

ج۔شاگردِ شعور (شاگردِ مصحفی):

مرد قابل اسکول ماسٹر، شیخ احمد علی کامل ولد مولوی عنایت احمد، اولاد میں حضرت شاہ پیر محمد علیہ الرحمہ کے، باشندۂ لکھنؤ، مقیم کانپور، صاحب دیوان (محسن، ناصر)

د۔شاگردانِ کامل:

فروغ عنایت علی خاں ولد قادر علی خاں عظیم آبادی پدر خواندۂ آتو صاحبۂ قدسیہ محل، باشندہ عظیم آباد مقیم کانپور (محسن)

قاضی تخلص شیخ قادر بخش ساکن کانپور (نساخ)

وحشت مخدوم بخش ولد شیخ خدا بخش باشندۂ کانپور (محسن)

یہاں تک شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے سلسلے کے شاگرد ہیں ان میں سے صرف چند ایسے ہیں جو کانپور کے رہنے والے تھے۔

کانپور کے شعری اور علمی ماحول پر شیخ امام بخش ناسخ کے سلسلے کے شاعر چھائے ہوئے تھے۔ یہاں خود ناسخ بھی مقیم رہے تھے۔ آغا میر بذات خود بھی ان کے عقیدت مند بلکہ بقول بعض شاگرد تھے اور ان کے بڑے صاحبزادے بھی شیخ ناسخ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ میر رشک بھی شیخ صاحب کے نہایت مخلص شاگرد بلکہ ان کے جانشیں تھے۔ ان کے علاوہ کانپور میں مقیم ناسخ کے چند شاگرد یہ ہیں:

ہ۔ شاگردان ناسخ:

سیفی میر وارث علی خوشنویس ولد میر بشارت علی باشندۂ نواب گنج تو ابع فرخ آباد مقیم کانپور (محسن)

شائق لالہ (فتح چند ولد لالہ بستی رام لکھنوی شاگرد ناسخ، صاحب دیوان (نساخ) مقیم کانپور، پہلے شاگرد مرزا علی نظر وشیخ مصحفی کے (ناصر)

و۔ شاگردان وزیر:

تقی محمد تقی خاں ولد بہادر خاں باشندۂ لکھنو مقیم کانپور، اول شاگرد محمد رضا معجز کے، بعدہٗ خواجہ وزیر سے اصلاح لی (محسن)

معجز منشی مرزا محمد رضا ولد مرزا اکبر علی باشندۂ لکھنؤ۔ بہ سبب رفاقت نواب دولھا بہادر خویش نواب معتمد الدولہ مقیم کانپور، صاحب دیوان اول شاگرد محمد علی خاں مسیحا کے، بعدہٗ خواجہ وزیر کے۔

ز۔ شاگردان بیخود (شاگرد وزیر):

اشرف حسین اشرف شاگرد ہادی علی بیخود عزیزوں میں خادم حسین خاں صدالصدور کانپور کے، باشندہ بنارس (نساخ)

صادق تخلص حکیم سید محمد صادق عرف صادق مرزا ولد حکیم سید محمد حسن خاں نبیرۂ روشن علی خاں برادر معتمد الدولہ باشندۂ لکھنو، مقیم کانپور (نساخ)

ح۔شاگردانِ رشک:

آرزو، مرزا علی محمد ولد مرزا ابو جعفر تحصیلدار اوریہ ضلع کانپور، باشندہ لکھنؤ، صاحب دیوان (محسن)

اوج، محبوبہ سخنوری کا زوج میر محمد جان مرحوم ولد میر جواد شاہ رضوی، عزیزوں میں خاص محل نواب معتمد الدولہ بہادر کے، صاحب دیوان، باشندہ لکھنؤ مقیم کانپور (ناصر)

بسمل پنڈت سندر لال برہمن، کشمیری سرشتہ دار محکمۂ پرمٹ کانپور، ولد بخشی ٹیکا رام صاحب دیوان (محسن)

توقیر۔ میر عبداللہ متوطن بلدۂ کانپور مقیم عظیم آباد حال وارد شہر بنارس (محسن)

جنوں میر مہدی حسین مرحوم خلف، میر عباس عرف میر مغل فیض آبادی، برادر خرد میر رضی رہا وارد کانپور۔ ان کی غزلیات در باعیات مشہور ہیں (محسن)

جویا شیخ علی حسن ولد شیخ فتح علی جو قدسیہ محل کی آتو صاحبہ کے داماد تھے۔ عظیم آباد سے وارد لکھنو ہوئے۔ چندے کانپور میں مقیم رہے، صاحب دیوان (محسن)

خورشید خوشوقت علی خاں ولد داود خاں تھانیدار باشندہ اکبر آباد۔ کانپور میں میر رشک کے شاگرد ہوئے۔ لکھنؤ میں جب آئے مرزا برق سے اصلاح لی (محسن)

دریا معنی آشنا پنڈت رتن ناتھ خلف پنڈت امرناتھ، شعلہ، دیوان سبحان علی خاں کنبوہ مقیم کانپور (محسن)

رہا میر رضی مرحوم ولد میر عباس عرف میر مغل باشندہ فیض آباد، مقیم کانپور، صاحب دیوان پہلے تخلص ان کا شوق تھا (محسن)

ساحل مرزا اکبر علی ولد مرزا باقر علی دہلوی خویش منشی محمد حسین کے ہیں۔ اس سبب سے لکھنؤ میں آئے۔ بعدۂ کانپور میں چند سال مقیم رہے۔ بہ طرز شوکت بخاری شعر فرماتے ہیں (محسن)

سعادت خاں تھانیدار کرنیل گنج کانپور ولد جہاں خاں ساکن اعظم گڑھ (محسن)

شرف شیخ شرف الدین تھانیدار کانپور خلف شیخ شہاب الدین باشندہ علی گڑھ، صاحب دیوان (محسن)

شوق حکیم اور فاضل میر علی ضامن خاں خلف وشاگرد رشک، صاحب دیوان (محسن)

عروج منشی احمد حسن خاں خلف الرشید منشی محمد حسن خاں، وطن بزرگوں کا قصبہ اسیون، بہ سبب رفاقت نواب روشن الدولہ مقیم کانپور (محسن)

عشقی شاعر خوشگوار شیخ الٰہی بخش ولد شیخ محمد بخش مقیم کانپور (محسن)

عیش شیخ ابو محمد فاروقی قاضی زادہ جاج مؤ ولد شیخ نور اللہ، عزیزوں میں قاضی امین اللہ مغفور جاجمؤی باشندہ کانپور صاحب دیوان (محسن)

غنی معرکہ شعر کا دھنی غنی احمد ولد ابو محمد عیش باشندہ جاجمؤ پرگنہ ضلع کانپور، خویش مولوی عباس علی عاشق، بہ مؤی جن کا رسالہ صولت الضغیم ہے۔ شاگرد رشک وشوکت (ناصر)

فریاد صاحب ارشاد، پیشہ طبابت میں استاد، میر محمد باقر تخلص فریاد مقیم کانپور (ناصر)

قائل۔ ایجاد کا استاد، سید علی خاں ولد میر فضل علی خاں عرف میر بڈھن ساکن عظیم آباد، مقیم کانپور، راہ کربلا میں گوشہ نشینِ گور ہوئے صاحب دیوان (نساخ) بہ سبب قرابت شیخ فتح علی داروغۂ نواب قدسیہ محل لکھنؤ میں آئے۔ بلند گویوں میں سب سے اونچے شاگرد میر علی اوسط رشک

مجروح غلام سعد ساکن جاجمؤ پرگنہ کانپور

محرور شیخ ہادی حسن خلف منشی علی حسین تحصیلدار ضلع کانپور باشندہ کاکوری، متعلقہ لکھنؤ (محسن)

محسن سید محسن علی موسوی ولد شاہ حسین حقیقت لکھنوی ابن سید عرب شاہ، اولاد میں سید امیر کلال علیہ الرحمہ کی، وطن بزرگوں کا خوست، توابع غور، مولد ومسکن لکھنؤ شاگرد وزیر ودرشک (محسن)

منیر سید اسماعیل حسین شکوہ آبادی رفیق نظام الدولہ مقیم کانپور

ط۔ شاگردانِ نادر:

قربان شیخ قربان علی متوطن بلہور ضلع کانپور شاگرد ڈپٹی کلب حسین خاں نادر

معظم محمد معظم خاں مدرس انگریزی ڈیراپور ضلع کانپور خلف وزیر عالم خاں الہ آبادی

ی۔ شاگردانِ منیر:

فہیم صاحب طبع سلیم پنڈت سندر لال ولد پنڈت بدری ناتھ باشندۂ لکھنؤ، مقیم کانپور (ناصر)

غنی شیخ عبدالغنی ولد شیخ عبدالصمد ساکن کانپور، شاگرد ہادی علی اشک (محسن)

ک۔ شاگردانِ صبا:

شہر کانپور میں خواجہ حیدر علی آتش کے معروف شاگرد میر وزیر علی صبا کے بھی بعض شاگردوں کی موجودگی قابلِ توجہ ہے۔

قدر مرد خوش آئین میر نصیر الدین مقیم کانپور، شاگرد میر وزیر صبا (ناصر)

وصف شمع شبستانِ دوستی میر محمود علی ولد میر محمد حسین فیض آباد ساکن کانپور، وارد لکھنؤ شاگرد صبا (ناصر)

ل۔ شاگردانِ انیس:

اس شہر کے مضافات میں بعض شاعر میر انیس وغیرہ کے شاگرد بھی تھے مثلاً

سلیس تخلص سید محب علی متوطن کانپور شاگرد مونس مرثیہ گو (نساخ)

معزز تخلص سید محمد علی ملازم راجا پٹیالہ باشندہ مکن پور شاگرد انیس مرثیہ گو (نساخ)

راسخ تخلص غلام مصطفیٰ بن شیخ عبدالرحیم باشندہ مکن پور پرگنہ بلھور ضلع کانپور (نساخ)

ان سب کے علاوہ شہر کانپور میں اور بھی کئی شاعر مقیم تھے۔ بعض یہ ہیں

آسان کانپوری مولوی سید محمد جعفر نام

آغا تخلص آغا مرزا خلف مرزا ابراہیم شوکت، چالیس پینتالیس کا سن و سال اور مرد بااقبال ہے۔ سنا گیا کہ اصل میں باشندہ شاہ جہاں آباد ہے لیکن بالفعل سواد کانپور اس کی اقامت سے بہشتِ بریں پر نازاں (صابر)

اختر قاضی محمد صادق خاں، بعد برہی عہد دولت حضرت خلد مکاں ضلع کانپور میں نوزدہ سال عہدۂ تحصیلداری پر مامور رہے۔ (محسن)

شاغل اشرف حسین خلف الرشید اور شاگرد کاشف علی کاشف باشندۂ لکھنؤ، مقیم کانپور (محسن)

کاشف، شیخ کاشف علی ولد شیخ محمد علی باشندۂ لکھنو، مقیم کانپور، شاگرد چھوٹے مرزا مذنب (محسن)

فکر۔ محمد باقر کانپوری

لئیق، منشی لالتا پرشاد مقیم کانپور۔

مشتاق میر سالار بخش ولد مبارک علی باشندہ قصبہ لاڈھ متعلقہ کانپور (نساخ)

محسن تخلص، محسن علی ولد ڈاکٹر احسان علی کانپور شاگرد مولوی عصمت اللہ انتخ، باشندۂ مونگیر (نساخ)

مضطر منشی عبدالکریم خلف محمد عیدو، متوطن کانپور (نساخ)

شہر کانپور کے شاعروں کی یہ فہرست سرسری ہے۔ مختلف ضروری ماخذ کی مدد سے اس میں خاصا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس مختصری فہرست میں بھی غریب امیر، مسلمان ہندو، مقامی غیر مقامی ہر طبقہ سے متعلق شاعروں کے نام شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اردو میں نثری تصانیف بھی چھوڑی ہیں۔ ان کے موضوعات میں تنوع بھی ہے۔

یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ کانپور کے علاقے میں مختلف قسم کی صنعتوں وغیرہ سے بھی دلچسپی لی جارہی تھی۔ جس زمانے میں یہاں تصنیف وتالیف کا چلن ہوا، اہل علم کو بعض صنعتوں سے متعلق کتابوں کی بھی تلاش ہوئی۔ جو مل سکیں ان کی نقلیں تیار کروائیں۔ اس زمانے میں میرزا فداعلی مشہدی نامی ایک شخص تھے۔ انھوں نے کاغذ اور چمڑے کی رنگائی سے متعلق ایک پرانی کتاب کو نقل کیا تھا۔ وہ قلمی نسخہ قومی عجائب گھر کراچی میں محفوظ ہے۔ سید عارف نوشاہی نے اس کے تعارف میں لکھا ہے:

”نگارید۔ احمد علی بن محمد خلیل جونپوری درسال 1204ھ مطابق

1789-90 نگاشت تراکیب رنگ کردن کاغذ وپارچہ

کتابت میرزا فداعلی مشہدی 17۔ ذی قعدہ 1261ھ در کانپور

26 صفحے

آغاز۔ سپاس بیقیاس صانعے را کہ عالم بہ رنگہائے گوناگوں............ساخت“ 19

یہ بات قابل ذکر ہے کہ زمانۂ مابعد میں کانپور شہر کو چمڑے کی صنعت کے لیے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی تھی۔

# ماحول

غازی الدین حیدر بادشاہ کے وقت سے ہی شیخ امام بخش ناسخ کو لکھنؤ چھوڑ کر آس پاس کے مقاموں میں وقتاً فوقتاً جانا پڑتا تھا۔ نواب معتمد الدولہ آغا میر کے شہر کانپور میں سکونت اختیار کر لینے کے بعد، قیام کے لیے شیخ ناسخ کو ایک اچھی جگہ مل گئی تھی کیونکہ بقول مولانا محمد حسین آزاد نواب ''ان کے بااخلاص شاگرد تھے'' اس زمانے میں لکھنؤ سے باہر رہنے کے باوجود شیخ ناسخ ڈاک کے ذریعہ سے اپنے شاگردوں سے رابطہ قائم رکھ سکتے تھے۔ میر علی اوسط رشک نے ایک چھوٹی سی مثنوی میں ایک کلوار کے بچہ کے قتل کے واقعہ کو نظم کیا ہے۔

اس میں مذکور ہے کہ ؎

ان دنوں تھے کانپور میں ناگہاں  تھے مرے مرشد ناسخ معجز بیاں

انھوں نے مذکورہ واقعہ سُن کر رشک کو لکھا کہ اس واقعہ کو نظم کر دینا چاہیے رشک نے استاد کے حکم کی تعمیل کی۔ واقعہ کو مثنوی کی صورت میں نظم کر دینے کے بعد آخری شعر میں ہجری اور عیسوی سنوں میں تاریخیں بھی کہیں، اس طرح

مارڈالا بچہ اک کلوار کا  خارجی سولی پہ اب کھینچا گیا

586 + 1831=1245

+1=1246ھ

نواب معتمد الدولہ بہادر کی وفات کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے امین الدولہ آغا علی خاں مہر خاندان کے سربراہ ہوئے۔ میر علی اوسط رشک ان کے استاد تھے۔ اور وہی کانپور میں شعروادب کے سالارِ کارواں ہوئے۔ شہر کانپور میں ان کے شاگردوں کی تعداد سب سے زیادہ (کل کی ایک تہائی سے بھی زائد) تھی چنانچہ اس شہر کا شعری اور علمی ماحول انھیں کے فکر و خیال کے سانچے میں ڈھلتا چلا گیا۔

1- مہر- امین الدولہ

نواب معتمد الدولہ آغا میر کے بڑے بیٹے تھے۔ پیدائش کا صحیح سال معلوم نہیں البتہ اس بنا پر کہ ان کا بڑا بیٹا 1245ھ (30-1829) میں پیدا ہوا تھا، قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ یہ خود 1225 (1810) میں یا اس سے کچھ پہلے پیدا ہوئے ہوں گے۔ یہ نواب معتمد الدولہ کی خُرد محل نواب بی جان کے بطن سے تھے۔ والدین نے ان کا نام "آغا" رکھا تھا۔

آغا علی کی ولادت کے چند سال بعد نواب سعادت علی خاں نے وفات پائی۔ غازی الدین حیدر ان کی جگہ مسند نشیں ہوئے تو معتمد الدولہ کو ان کی نیابت ملی۔ چند سال بعد جب غازی الدین حیدر بادشاہ ہوئے تو معتمد الدولہ ان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ بادشاہ نے ان کے بیٹے آغا علی کو بھی ان خطابوں سے سرفراز کیا:

"امین الدولہ، سیف الملک، نواب، سید آغا علی، خان بہادر، فیروز جنگ"1

بادشاہ نے اپنے ولی عہد نصیر الدین حیدر کی شادی دہلی کے شاہزادے مرزا سلیمان شکوہ بہادر کی صاحبزادی رقیہ بیگم سے کی تو معتمد الدولہ نے بھی اپنے بیٹے آغا علی کا رشتہ نواب شاہ میر خاں ابنِ آغا نصیر نیشاپوری کی بیٹی ننھی بیگم سے چاہا لیکن بقول حکیم نجم الدین الغنی خاں:

> "یہ شاہ میر خاں بیگم کے خاندان سے تھے۔ چونکہ یہ نسبت شاہ میر خاں کی قدر و منزلت کے خلاف تھی انھوں نے معتمد الدولہ کی درخواست کے وقت شادی سے انکار کر دیا"2

وہ زمانہ معتمد الدولہ کے عروج کا تھا۔ ناچار شاہ میر خاں اس ظلم کے خلاف چارہ جوئی کے مقصد سے کلکتہ گئے وہاں کامیابی نہ ہوئی تو لندن گئے۔ وہاں بھی کسی نے نہ سنا تو دل برداشتہ ہو کر

مصر میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں سے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ ان کی بیٹی ہی بیگم لکھنؤ میں تھی۔ بادشاہ نے اسے مبارک محل کے حوالے کیا کہ اسے اپنی بیٹی سمجھ کر اس کی شادی معتمد الدولہ کے بیٹے کے ساتھ کر دیں۔ اس وقت آغا علی خاں کی عمر پندرہ برس کے قریب رہی ہوگی۔

مبارک محل ایک انگریز خاتون تھیں۔ معتمد الدولہ نے غازی الدین حیدر کے ساتھ ان کی شادی کرائی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ان کے واسطے سے بادشاہ کے مزاج میں رسوخ پیدا کریں۔ آغا علی کی شادی کا اہتمام مبارک محل کے سپرد معتمد الدولہ ہی کی خواہش سے ہوا ہوگا۔ شادی کے بعد آغا علی خاں تمام عمر مبارک محل کا نہایت احترام کرتے رہے۔ مبارک محل نے 8 شعبان 1265ھ (جون 1849) کو انتقال کیا۔ میر رشک نے تاریخ کہی ؎

افسوس مبارک محل ایں مریم عصر — رو کرد سوئے گلشن رضواں اے ہائے
تاریخ وفات خانہ رشک نوشت — ہشتم بودہ ز ماہ شعبان اے ہائے

1265ھ

اپنے استاد شیخ ناسخ کی سراج نظم میر رشک نے مرتب کر کے 1265ھ میں چھپوادی تھی۔

1254

اس میں آغا علی خاں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ع

ساتھ اُن کے جو لکھنؤ آیا

معلوم ہوتا ہے کہ مبارک محل کی علالت کی خبر سن کر آغا علی خاں کانپور سے لکھنؤ آئے تھے۔ مبارک محل کے واسطے سے لکھنؤ میں ان کی بڑی آن بان تھی چنانچہ میر رشک نے کہا ہے ؎

بحر میں کیونکر آئیں نام و خطاب — کوزے میں کیا سمائیں نام و خطاب

شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ ہی بیگم سسرال میں "نواب بی" اور "نواب بیگم" کہلائیں۔ اس شادی سے شاہ میر خاں کے گھرانے کے بھی افراد آزردہ تھے۔ معتمد الدولہ نے ان کی دلجمعی اور تسلی خاطر کے لیے مختلف اقدام کیے تھے۔ حکیم نجم الغنی کا بیان ہے:

"محمد تقی خاں کہ لکھنؤ اور فیض آباد میں رہتے تھے وہ شاہ میر خاں کی بحث سے خفا ہو کر عملداری انگریزی میں چلے گئے لیکن ریذیڈنٹ لکھنؤ نے ان کو واپس بلا لیا اور

معتمد الدولہ نے ان کے چھوٹے بھائی مرزا ابجو کو وزیر چہارم مقرر کیا اور صمصام☆
الدولہ خطاب دیا"۔3

اس قسم کی نوازشات کے باوجود شاہ میر خاں کے اخلاف کی ناراضی دور نہ ہوسکی اور ان میں سے بعض نے لکھنؤ کی سکونت بھی موقع ملنے کے بعد، ترک کردی۔ شاہ میر خاں کے ایک بیٹے صاحب مرزا شناور نے جلدی ہی رحلت کی چنانچہ سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

"گوہر بحرِ شرافت، معدنِ نجابت، سخنورِ نامور، صاحب مرزا تخلص شناور خلف الصدق شاہ میر خاں ابن آغا نصر خاں فیض آبادی، شاگرد آتش۔ افسوس کہ عین موسم میں نہال اس کی زندگی کا صدمۂ بادِ تندِ خزاں سے مرجھا گیا۔"4

ان کے دوسرے بیٹے نورالدولہ آغا محمد احسن عرف نادر مرزا اصفا رامپور چلے گئے تھے۔5 شاہ میر خاں کے بھائی کی اولاد میں آغا برہان الدین حیدر حیدر تخلص بھی رامپور میں جا کر سکونت پذیر ہوگئے تھے۔6

میر علی اوسط رشک کے مطبوعہ دیوان میں کسی "نواب محل" کے مرنے کا قطعۂ تاریخ اس طرح درج ہے ؎

فاطمہ بیگم کہ بُد خوشدامنِ نواب من سوے جنت رفت و برلب می رسد صد حیف آہ
یافتم از غیب این تاریخ صوری معنوی وائے ذی حجہ نہم روز احد صد حیف آہ

1262ھ

دوسری اور چھوٹی ہونے کے سبب سے فاطمہ بیگم کی صاحبزادی کو امین الدولہ کی "خُرد محل" کا درجہ حاصل تھا۔

17/ ربیع الثانی 1245ھ (17/ اکتوبر 1829) کو نواب معتمد الدولہ رہا ہو کر لکھنؤ سے کانپور پہنچے۔ اسی زمانے میں نواب امین الدولہ کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔ جلا وطنی کے اس عالم میں اسے نیک شگون سمجھا گیا۔ شیخ امام بخش ناسخ نے موقع کی مناسبت سے تاریخ کہی ؎

---

☆ صمصام الدولہ کے دو بیٹے شاعر تھے یعنی:
جلیس نواب مہدی علی خاں اور قیس نواب ہادی علی خاں

مولدِ پورِ مہین پورِ وزیر کردشاداں خاطرِ برناوپیر
گفت تاریخ سالِ میلادش بخواب صبح طالع شد بر آمد آفتاب

1245ھ

یعنی پوتے کی پیدائش کی خوشی تو تھی لیکن دیس نکالا ملنے کا غم بھی تھا۔ نواب معتمد الدولہ کانپور میں نہایت آرام و آسائش سے اپنے متعلقین کے ساتھ بسر کر رہے تھے لیکن جس درجے کے آدمی سے انھوں نے شکست کھائی تھی اس کا خیال نہایت روح فرسا تھا۔ صحت بگڑنے لگی۔ آخر جب مایوسی کی صورت ہوئی تو انھوں نے اپنے بڑے بیٹے امین الدولہ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ اس موقع پر بڑا جشن ہوا میر رشک نے تاریخ کہی ؎

از ثروتِ نواب امین الدولہ شادوخرم شدند جملہ کہہ و مہ
از ناخنِ جودو کرمِ خود بکشود ہر کس کہ بدل داشت زافلاس گرہ
از تیغِ حوادث ہمہ تن محفوظیم فیض دمِش کرد بما کارِ زرہ
اے رشک نوشتیم چہ تاریخِ جلوس ذیحجہ ویوم اوّل سہ شنبہ

1247ھ

یہ سچ ہے کہ امین الدولہ ایک معزول اور جلاوطن امیر کے بیٹے تھے لیکن کانپور کی اس بستی میں جہاں چھوٹی اُمت کی بڑی کثرت تھی۔ انھوں نے بڑی حیثیت حاصل کر لی تھی چنانچہ مذکورہ قطعہ سے بھی اس حقیقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

امین الدولہ کے جشنِ مسند نشینی کے صرف چار روز بعد نواب معتمد الدولہ نے رحلت کی۔ میر رشک نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا ؎

یارب ایں معتمد الدولہ چہ شد مُردِ دستورِ کبیر اے افسوس
گفت تاریخِ وفاتش ہاتف زیں جہاں رفت وزیر اے افسوس

1247ھ

ان کی وفات کے بعد خاندان کے سرپرست کی حیثیت سے مشترکہ املاک اور جائداد کی نگہداشت اور تمام خاندانی معاملات و مسائل کی ذمہ داری امین الدولہ کے سر آ گئی تھی۔ انھوں نے

بطور احسن جملہ متعلقین اور متوسلین کی سرپرستی کی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شیخ امام بخش ناسخ کو معتمد الدولہ کی وفات سے زیادہ صدمہ پہنچا تھا۔ انھوں نے شہر کانپور کو اب پھر "دشت" کہہ کر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے ؎

دشت سے کب وطن میں پہنچوں گا　　　کہ چھٹا اب تو سال آپہنچا

ناسخ کی قسمت سے 7 ربیع الآخر 1248ھ (ستمبر 1832) کو لکھنؤ میں منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں معزول ہوئے تو ناسخ کو کانپور سے لکھنؤ چلے جانے کا موقع مل گیا۔ یا تو ناسخ بڑی عجلت میں لکھنو کے لیے روانہ ہوئے تھے یا پھر میر رشک کہیں اس طور پر مصروف تھے کہ وہ ناسخ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے۔ سات شعر کے قطعۂ تاریخ میں انھوں نے اپنی اس محرومی پر ماتم کیا ہے ؎

استادِ زماں نے لکھنؤ کو　　　فرمایا ٠ کانپور سے جب کوچ
ہونے بھی نہ پائے ہم قدمبوس　　　اے طالعِ بد یہ تھا عجب کوچ
کیا سُنسان ہوگیا شہر　　　کیا کرگیا لوگ سب کے سب کوچ
نہ نزع ہے یا فراقِ استاد　　　جی کا ہے سرائے تن سے اب کوچ
لوں بوسۂ آستانِ ناسخ　　　یارب کروں میں بھی جاں بلب کوچ
اس کوچ کی عیسوی ہے تاریخ　　　یکشنبہ دغرۂ رجب کوچ

1832

لکھنؤ میں امین الدولہ نے اپنے پدر والاقدر کا عروج و اقتدار دیکھا تھا۔ اولوالعزمی ان سے بھی ویسا ہی کچھ چاہتی تھی۔ وہ لکھنؤ میں اپنے لیے حالات کے سازگار ہو جانے کی کوشش اور انتظار کرتے رہے اور اس اعتبار سے وہ خود کو "مبتلائے فراقِ لکھنؤ" ظاہر و ثابت بھی کرتے رہے چنانچہ ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں ؎

فرقتِ لکھنؤ کی ہے تاریخ　　　مہر سچ ہے، ہوں مبتلائے فراق

1248ھ

لیکن قسمت نے کانپور کو ان کا مسکن بنا دیا تھا اور اب اس شہر کی جملہ نعمتیں ان کے لیے تھیں اور وہ بذاتِ خود اس شہر کی عزت و رونق میں اضافے کا سبب تھے۔ بہ حد امکان و وسائل انھوں نے

اس شہر کو ترقی دینے سے دلچسپی لی۔ یہاں انھوں نے تعمیرات کا سلسلہ شروع کیا۔ نصر اللہ خاں خویشگی نے ''دولت سرائے'' بنوانے کا ذکر کیا ہے۔7

معتمد الدولہ جس مکان میں رہتے تھے اسی کے صحن میں وہ مدفون ہوئے تھے۔ اس کو امین الدولہ نے خاندانی مقبرہ اور عزا خانہ کی حیثیت دے دی تھی۔ آج تک اس کی وہی حیثیت قائم ہے۔ میر رشک نے تاریخ کہی تھی ؎

| | |
|---|---|
| بہ غمِ معتمدالدولہ مختار الملک | آصفِ عہدِ سلیماں حشم اسکندر جاہ |
| چہ نصارا ے و چہ گبر و چہ مسلمان و یہود | می نمودند فغان و قلق و نالہ و آہ |
| آں مکاں کز پےِ آسائش خود ساختہ بود | دفن گردید دراں عشرت و آسائش گاہ |
| خانۂ ماتمِ شبیر مقرر گردید | مسکن و مدفن مغفورِ حقیقت آگاہ |
| رشک تاریخ عزاخانہ مدفن بنوشت | ہم عزاخانہ وہم مقبرہ اے وادیلاہ |

1247ھ

کچھ مدت کے بعد امین الدولہ نے ایک ''عبادت سرائے'' بھی بنوائی رشک نے اس کی تاریخ کا قطعہ اس طرح کہا ؎

| | |
|---|---|
| عبادت سرائے چوں ترتیب یافت | زفرمانِ مہر این دستورِ شاہ |
| زارشادِ عقل و زفضلِ خدا | عبادت ہمی کردشام وپگاہ |
| رفیقاں بہ تقلید آں راہبر | شب وروز مصروفِ ذکرِ الہٰ |
| خدا یا دہش از گنہ اجتناب | بکنج خود وبہرِ این خانقاہ |
| چنیں گفت مصراع تاریخ رشک | محلِ نماز است وتعقیب گاہ |

1251ھ

اس قطعہ سے ظاہر ہے کہ شہر کانپور میں امین الدولہ کی حیثیت ''راہبر'' کی بھی تھی۔ اہل شہر اکثر معاملات میں ان کی ''تقلید'' کرتے تھے چنانچہ چند سال کے اندر ہی اس شہر میں لکھنو والوں کی طرز اور مزاج و مذاق کے مطابق کئی عمارتیں وجود میں آگئی تھیں۔

اس مقام پر یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ 1853 (1269ھ) سے پہلے اس ملک

نصارا میں کم سے کم دو ناچ گھر موجود تھے۔ ناچ گھر قدیم محلہ جرنیل گنج سے متصل تھا۔ امین الدولہ نے اپنے اکثر شعروں میں ناچ رنگ کا ذکر کیا ہے۔ ایک مقطع یہ ہے ؎

مہر کی تاریخ سیر گنگ و بزم عیش ہے جام مئے مطرب، شب مہ، دلبر و دریائے گنگ

1249

اس قسم کے مقطعوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناچ گھر قدیم کی عمارت گنگا کے کنارے پر واقع تھی۔

امین الدولہ کی ''دولت سرائے'' کے قریب ہی دریائے گنگا بہتا تھا۔ نواب نے ''سیرِ گنگا'' کے لیے ایک خوبصورت کشتی بنوائی تھی۔ میر رشک نے اس کی تاریخ کہی تھی ؎

یہ کشتی نواب امین الدولہ تحفہ کشتی بنی ہے ماشاء اللہ
تاریخ کہی رشک نے اس کشتی کی اب کیا کشتی بنی ہے ماشاء اللہ

1249ھ

نواب امین الدولہ کی توجہ سے دریا کے گھاٹوں کو بھی رونقیں حاصل ہونے لگی تھیں۔ رفتہ رفتہ گنگا میں مختلف قسم کی کشتیاں نظر آنے لگی تھیں مثلاً۔

ناؤ دخانی، بوٹ اگن بوٹ اور بجرا وغیرہ

دریا کے کناروں کو ایسی ترقی ہوئی کہ باید و شاید ان کی آرائشیں ایسی تھیں کہ شاعران سے متعلق غزلیں کہنے لگے تھے۔ یہاں محض نمونہ کے طور پر میر علی اوسط رشک کی ایک غزل کے کچھ شعر لکھے جاتے ہیں ؎

ہوتا نہیں ایسا کسی دریا کا کنارا بہتر لب کوثر سے ہے گنگا کا کنارا
جنّت بھی جو پاؤں، نہ اُٹھوں کوے بتاں سے یہ ابر وہاں ہے، نہ یہ دریا کا کنارا
جُز ملکِ عدم چین نہیں بحرِ جہاں میں محفوظ ہے آفات سے دریا کا کنارا

شوق بڑھتا گیا اور دریا کی سیر کرتے ہوئے نواب اپنی دولت سرائے سے گزرتے ہوئے دور دور تک جانے لگے اس کا فائدہ یہ ہوا کہ گنگا کے دور تک گھاٹ ترقی کرنے لگے چنانچہ میر رشک نے ٹھور کا بھی ذکر کیا ہے ؎

گھاٹ ہے گنگا کے گھاٹوں میں بھور      جانب مغرب ، قریب کانپور

اپنے لغت میں انھوں نے اس کے بارے میں تحریر کیا ہے:

"بھور نام معبدِ ہنود بود کنارِ گنگا جانب مغرب متصل کانپور"

اس جگہ سید زین العابدین نام کے کسی شخص نے شاہ عالم ثانی کے عہد میں ایک مسجد بنوادی تھی جس کی تاریخ اس طرح کہی گئی تھی۔ ع

تاریخ گفت خضر کہ قد قامت الصلوٰۃ

1202ھ

بھور کے بارے میں یہ عقیدہ زمانۂ قدیم سے چلا آتا تھا کہ اس جگہ برہم (برھما) کی کیلی گڑی ہوئی ہے اور اُسی پر یہ دنیا قائم ہے۔ اسی کیلی کی مناسبت سے اسے "برھماورت" بھی کہتے ہیں۔ یہاں میلا لگتا تھا۔ جب امین الدولہ کا بجرا وہاں تک پہنچنے لگا تو بھور کے میلے کی دھوم دھام بھی بہت زیادہ ہوگئی۔ امین الدولہ کے دیوان میں اس میلے سے متعلق کئی غزلیں ہیں۔ دو غزلوں کے تاریخی مقطعے یہ ہیں ؎

اس ماہوش نے مجھ سے یہ تاریخ میں کہا      اے مہر لو پری ہے یہ میلا بھور کا

1249ھ

اور ؎

تاریخ عیسوی میں یہ مصرع ہوا ہے مہر      کیا ہی پسند آیا ہے تیرت بھور کا

1833

اس موقع کی ایک اور غزل کے چند شعر یہ ہیں ؎

تیرا جلوا بھور میں دیکھا      کیا کہیں کیا بھور میں دیکھا

چاند شرمندہ جس سے ہے، ایسا      ماہ سیما بھور میں دیکھا

جب اٹھاتا چنے کو وہ خوش قد      حشر برپا بھور میں دیکھا

پشتے اے تیغ ناز کشتوں کے تھے      گھاٹ تیرا بھور میں دیکھا

اِن بتوں سے خدائے عالم کا      کارخانہ بھور میں دیکھا

جس سے بازار مصر شرمائے ایسا میلا بٹھور میں دیکھا
مجھ کو سمجھا وہ آشنائے بتاں جس نے بجرا بٹھور میں دیکھا
دورے، وصلِ یار، آبِ رواں سب مہیا بٹھور میں دیکھا
جھک گئے آسمان تیرے حضور چرخ پوجا بٹھور میں دیکھا
مہر نے ایک ماہ کامل کو جلوہ فرما بٹھور میں دیکھا

ناچ رنگ، حسینوں، مہ جبینوں کے جمگھٹ اور ان سب کے ساتھ ''چرخ پوجا'' بٹھور کے میلے کی خاص چیز تھی۔ امین الدولہ نے یہ کہہ کر کہ جس نے بھی اس مقام پر میرے بجرے کو دیکھا اس نے مجھے ''آشنائے بتاں'' خیال کرلیا، اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس میلے میں عشق وعاشقی کے تمام اسباب مہیا تھے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ اُسی بٹھور کا ذکر ہے جس کے بارے میں محض چند سال پیشتر خود امین الدولہ کے استاد شیخ امام بخش ناسخ نے یہ کہا تھا ؎

بٹھور ایسا مصیبت زا ہے قصبہ کہ اس میں دَم بدم کہتا ہوں اے وائے
نظر آتا ہے ہر سو شیو کا لنگ میں مومن ہوں جنگ آیا ہوں اے وائے

اس بستی کو جو ایک مخصوص طبقے کی عبادت گاہ کی حیثیت رکھتی تھی امین الدولہ کی توجہ نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے نہایت پُرکشش بنادیا تھا اور اس کی رونقیں ایسی تھیں کہ ان سے بازارِ مصر بھی شرما رہا تھا۔ معتمد الدولہ کی آمد کے بعد کانپور شہر میں ایک ایسی معاشرت پھلنے پھولنے لگی تھی جس میں ہندو اور مسلمان ہی نہیں، انگریز بھی برابر کے شریک تھے۔ ان کے بعد ان کے جانشین امین الدولہ کی دلچسپیوں کے فیض سے اس ملی جلی تہذیب اور طرزِ زندگی کو تیزی سے پروان چڑھنے کے مواقع ملتے رہے۔ اس زمانے میں کانپور کے تقریباً ہر شاعر کے دیوان میں گنگا اور بٹھور وغیرہ سے متعلق تھوڑے بہت اشعار ضرور مل جاتے ہیں۔

کانپور کے میلوں ٹھیلوں سے کماحقہٗ دلچسپی کے باوجود امین الدولہ لکھنؤ میں رونما ہونے والے سیاسی اُتار چڑھاؤ سے بھی غافل نہیں رہے تھے۔ جیسے ہی امید کی کرن نظر آئی انھوں نے لکھنؤ میں اپنے والد کی متروکہ جائداد اور املاک کے واگذاشت کرانے کے لیے جدوجہد شروع کردی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ 1250ھ (1834) کے قریب انجیر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی تھی

اور لکھنو کی املاک کی دیکھ بھال اور انتظامات کے لیے انھوں نے میر علی اوسط رشک کو کارکن مقرر دیا تھا۔ ابنِ طوفان نے رشک کے بارے میں لکھا ہے:

''چوں کارکن واستادِ امین الدولہ مہر تخلص پسر مبین نواب معتمد الدولہ مرحوم است،

در لکھنو گہگاہ رونق افروزی شد''

معلوم ہوتا ہے کہ میر رشک وقتاً فوقتاً کانپور سے لکھنؤ آتے جاتے رہتے تھے۔ 1253ھ میں رشک لکھنو میں تھے کہ 26۔ رمضان المبارک کو منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں نے وفات پائی تو انھوں نے یہ تاریخ کہی ؎

زیں جہاں منتظم الدولہ حکیم    سفرِ منزلِ عقبیٰ فرمود
بود ماہِ رمضان ماہِ وفات    خرمی کم شد وماتم افزود
مہ وتاریخِ وفاتش گفتم    از نہم بست وششم ہے ہے بود

1253ھ

اس کے بعد شیخ ناسخ کو پھر لکھنؤ میں آنے کا موقع ملا۔ ان کی آمد کا قطعۂ تاریخ یہ ہے ؎

از آمدنِ جناب ناسخ بہ وطن    دیدم اے رشک روئے عیش و بہبود
صوری ومعنوی نوشتم تاریخ    شہر شوال بود، یکشنبہ بود

1253ھ

امین الدولہ مہر قادر الکلام اور فصیح البیان شاعر تو تھے ہی، لیکن ایک قابلِ ذکر خوبی ان کی غزل کی یہ بھی تھی کہ پوری غزل ایک خاص موضوع سے متعلق ہوتی تھی۔ باوجود یہ کہ ہر شعر بجائے خود مکمل اور اور معنی کے اعتبار سے دوسرے شعر کا غیر محتاج ہوتا ہے، دوسرے شعر سے مربوط اور متعلق بھی ہوتا ہے۔ مطلع سے مقطع تک پوری غزل میں فضا کی یکسانی اور مطالب میں ایسی ہم آہنگی ہوتی ہے کہ اگر اس کے لیے مناسب عنوان قائم کر دیا جائے تو وہ اچھی خاصی نظم معلوم ہونے لگے گی۔ ایسی غزل نما نظم یا ''غزلہائے نظم طور'' لکھنے کا اس کانپور میں جہاں امین الدولہ ''راہبر'' تھے اور ان کے متعلقین اور متوسلین ان کی تقلید کرتے تھے بہت جلد رواج عام ہو گیا۔ بلکہ اہلِ کانپور کے اثر سے آگرے اور لکھنو میں بھی بعض شاعروں نے اسی طور پر کچھ کچھ غزلیں کہی تھیں۔ ان غزلوں کی ایک

خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے شعروں میں تشبیہات اور تلمیحات بھی مقامی امور، معاملات، رسوم اور اشیا سے ماخوذ ہیں۔ یہ مقامی اثر اس زمانے کے کلام پر اس حد تک ہے کہ اگر صحیح طور سے تجزیہ کیا جا سکے تو شہر کانپور کی آبادکاری، وہاں کی معاشرت اور زندگی کے معاملات و معمولات کا بھی کم و بیش علم حاصل ہو سکتا ہے۔

امین الدولہ اور ان کے متوسّل شعرا کی غزل ہائے نظم طور کے بارے میں یہ کہنا تو بالکل بھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ یہ انگریزی شاعری کا براہِ راست اثر ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ انگریزوں کی عملداری میں رہنے کی وجہ سے ان کے طرزِ فکر، اندازِ بیان اور طریقۂ شعر گوئی کا بالواسطہ طور پر کسی قدر اثر پڑ جانا خلافِ قیاس نہیں ہے۔ امین الدولہ مہر کے دیوان کے مطالعہ سے ان کی زندگی سے متعلق اہم اور غیر اہم بعض واقعات کا پتہ چلتا ہے مثلاً پانچ شعر کی ایک مختصر سی غزل میں انھوں نے اپنے کسی بچے کی ''بسم اللہ'' کی تقریب سے متعلق بعض قابلِ توجہ باتیں نظم کی ہیں۔ یہاں اس کے صرف تین شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

سارے عالم کو مبارک ہو تری بسم اللہ — لوح پر لکھے قلم آج یہی بسم اللہ
حرف ان پر ہے، نہ ہوں آج جو مشغولِ طرب — اس طرح کی نہیں دیکھی ہے کبھی بسم اللہ
ہے دعا مہر کی، آئے تجھے لکھنا پڑھنا — یہ مبارک کریں اللہ و نبیؐ بسم اللہ

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ کس بچے کی بسم اللہ تھی۔ غالباً امین الدولہ کے اس پہلے بیٹے کی تھی جو 1245 ہجری میں پیدا ہوا تھا اور جس کی ولادت کی تاریخ شیخ ناسخ نے کہی تھی۔ پہلی تقریب ہونے کی وجہ سے اس میں دھوم دھام زیادہ تھی۔ کانپور میں شاید کوئی شخص ایسا بھی تھا جو اس موقع پر ''مشغولِ طرب'' نہیں ہوا تھا اور جس کی وجہ سے امین الدولہ کو ملال ہوا تھا۔

امین الدولہ کے دیوان میں ایک غزل ماتمی بھی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی کسی بیٹی کے مرجانے پر تاسف کا اظہار کیا ہے۔ یہ غزل فارسی میں ہے۔ مقطع میں شاعر نے تاریخ بھی نظم کر دی ہے۔

امروز سیاہ است جہاں درنظر ما — مدفون شدہ پُرنور زنورِ نظر ما
چوں چرخ بہ کوکب شدہ اے بخت مکدّر — از داغ دیں رنج دلِ ما جگرِ ما

بربست چو رخت سفر اے مہر ز دنیا — ایں دختر ما، راحت شام وسحر ما
بوداے فلک از شہر صفر لیل دہم حیف — شدہ مصرع تاریخ غروب قمر ما

1253ھ

بوقتِ وفات اس ''دختر'' کی عمر کیا تھی یہ بات معلوم نہیں ہوسکی۔

امین الدولہ کا ایک اور بیٹا 7/ جمادی الاول 1257ھ (جون 1841) کو پیدا ہوا تھا۔ اس کی ولادت کے موقع پر بہت خوشی منائی گئی۔ میر رشک نے بھی کئی قطعاتِ تاریخ کہے۔ ایک یہ ہے۔ ؎

فرزند بہ مہر غیرتِ بدرِ دُجا — پیدا شدہ درماہ جمادی الاولا
ایں صوری معنوی است تاریخ اے رشک — یوم اثنین ہفتم مہِ زیبا

1257ھ

ایک دوسرے قطعہ میں رشک نے اس نومولود کے لیے چند تاریخی نام تجویز کیے تھے، اس طرح ؎

میر معصوم علی خاں نام تاریخی ہے ایک — ایک فضل الدولہ نواب بہادر آس پاس
1257 — 1257

نادر آغا خوبصورت مختصر سا نام ہے — پائے عمرِ خضر، لائے خدا یہ نام راس
1257

جشن کا جو ''سامان بے حد وقیاس'' ہو رہا تھا اس کے بارے میں شاعر کا کہنا ہے ؎

صرف زر ایسا نہیں ہے جس کی گنتی ہو سکے — ہوں چھ چیزیں جیسے جمع ہیں پانچوں حواس

ان چھ چیزوں کا بیان آخری شعر میں کیا ہے اور انھیں چھ سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ اس تاریخ کے بارے میں رشک کا کہنا ہے کہ چونکہ اس کی پیدائش ''ملکِ نصارا'' میں ہوئی ہے اس کی رعایت بھی ضروری ہے ؎

مصرع تاریخ سامانِ طرب ہے عیسوی — ناچ، رنگ، انعام، کھانا، دھوم کی خلعت، لباس

1871

قیصر التواریخ میں نواب امین الدولہ کے دو بیٹوں کا نام آیا ہے:

احمد آغا اور نادر آغا

ان ناموں میں قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ باپ ''آغا علی'' کے نام کا جُز واوّل جو جُز واصلی بھی ہے دونوں بیٹوں کے نام میں جزِ آخر کے طور پر شامل ہے۔ ممکن ہے کہ نام کی ترکیب کی یہ صورت بھی ملکِ نصارا میں قیام کا اثر ہو۔

اس ملکِ نصارا میں شروع زمانے میں قصیدہ گوئی کا رواج نہیں تھا۔ قصیدے کے موقع پر عموماً قطعات کہے جاتے تھے چنانچہ میر رشک نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ نادر آغا کی پیدائش کے موقع پر چونکہ بڑا جشن ہوا تھا، رشک نے ایک طویل قطعہ بھی لکھا تھا اس کے مطالب اور طرزِ بیان وغیرہ کی روشنی میں اسے ایک مختصر قصیدہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں کُل اٹھارہ شعر ہیں۔ پہلا مطلع یہ ہے

ہر چند ہے عالَم مری تقریر کا مشتاق      پُر مشقِ خموشی سے ہے اظہارِ سخن شاق

اس مطلع کی مناسبت سے تشبیب کے لیے بہت خوب مضامین صَرف کیے ہیں۔ ان میں اپنے اور نواب کے مابین معاملات کا بڑے سلیقے سے بیان کیا ہے۔ ۔

کہنا ہو قصیدہ بھی تو کس پر لکھوں بیتیں      کُل سات ہیں ایّامِ مہ و سال کے اوراق

میں ذرّہ ہوں، ذرّہ سے ہے ناچیز مری فکر      گو پرورشِ مہر سے ہوں شہرۂ آفاق

کیوں مدح و ذمِ مَردمِ دنیا میں ہوں مصروف      روزی مجھے بے فکر دیا کرتا ہے رزّاق

نوکر بھی ہوں اس کا کہ جو تقریب کوئی ہو      تکلیف نہ دے قطعہ کی، اللہ رے اخلاق

میر رشک نے تذکیر و تانیث اور وحدت و جمع کے اصول و ضوابط بھی مرتب کیے تھے۔ اس قطعہ میں بھی دوسرے شعر میں لفظ ''فکر'' کو مونث باندھا ہے۔ دلّی میں شیخ ذوق کا بھی یہی مسلک تھا۔

مندرجہ بالا آخری شعر اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ اس زمانے میں کانپور اور پھر لکھنؤ میں بھی عموماً قصیدے کی جگہ قطعہ نے لے لی تھی اور معمولاً مختلف تقریبوں میں قطعہ (قطعۂ تاریخ) کے کہہ لینے کو کافی سمجھا جانے لگا تھا۔

اس مختصر سے قصیدے میں گریز کا حصہ طویل لیکن دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ اس سے اُس وقت کے شعری مزاج پر بھی کم وبیش روشنی پڑتی ہے۔ ؎

ہاتف نے جو پُچکا مجھے پایا تو پکارا　　اے رشک گزرتی ہے تری کم سخنی شاق
نواب کے گھر نجم درخشندہ ہوا ہے　　اس بات میں ہم ہیں ترے اشعار کے مشتاق
منظور اگر ہے کہ خوشامد میں نہ ہو جھوٹ　　عاجز نہیں اِس طرز سے بھی نظم کے مشّاق
جو بات کہ سچی ہو چھپانا نہیں اچھا　　ممنوع ہے اُلحق سخنِ کذب کا الحاق
لختِ جگرِ مہر کو کہنا مہِ انور　　کچھ شاعری اس میں ہے، نہ جھوٹ اس میں، نہ اغراق
فرمودۂ ہاتف نے ہدایت جو مجھے کی　　تاریخ کا قطعہ بھی بڑھا یا پے الصاق

وہ مذہب پسندی کا دور تھا۔ شاعری کو معمولاً جھوٹ اور اغراق کا مرادف سمجھا جاتا تھا اور اسی لیے "مشقِ خموشی" کو ترجیح دیتے تھے۔ جھوٹ سے خود کو بچا لینا رشک ہی کا امتیاز نہیں تھا۔ امین الدولہ مہر کا بھی یہی معاملہ تھا۔ ان کی ایک غزل کا مقطع یہ ہے ؎

نہیں ہے طرح کا یہ جھوٹ مصرع تاریخ　　ہُوا ہے مہر کو سچ عشقِ مہوشاں پیدا

1250ھ

بعد کے زمانے میں جب انگریزوں کی سرپرستی میں اردو شاعری کی اصلاح کی تحریک شروع ہوئی تو مولانا الطاف حسین حالی نے بھی اپنی نظم "شعر سے خطاب" میں یہی بات اس طرح کہی تھی۔ ؎

وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری　　قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کچھ نماز تو

مولانا حالی کا یہ خیال کہ زمانۂ ماضی میں جھوٹ کو "ایمانِ شاعری" کا درجہ حاصل تھا "اغراق" کی قبیل سے ہے اور اس کو حقیقت سمجھ لینا صحیح نہیں ہے۔

میر رشک نے مدح کے جُزو کو مختصر کر کے مطلعِ ثانی پر موقوف کر دیا ہے۔ خوبی یہ ہے کہ اس میں بھی "سخنِ کذب" سے زبان وقلم کو آلودہ نہیں ہونے دیا ہے ؎

صد شکر وہ موجود ہُوا جس کے تھے مشتاق　　ہے خانۂ دل موردِ آسائش آفاق

اس کے بعد دعاؤں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ دعائیں بھی قابلِ توجہ ہیں۔ تین شعر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

عمرِ صدوسی سال خدائے دوجہاں دے دادا کی ملے داد و دہش، باپ کے اخلاق
آسودہ رہے سایۂ دامانِ پدر میں شاعر ہو یہ ایسا کہ مضامین کا خلاق
عیش وطرب ولطف ومسرت سے رہے زوج علم وعمل وطاقت وقوت میں رہے طاق

پہلے شعر میں معتمد الدولہ اور امین الدولہ کے امتیازی اوصاف کا بیان کر کے، دعا کی ہے کہ یہ خوبیاں اس بچے کو بھی عطا ہوں۔

دوسرے شعر میں بچے کے لیے دعا کی ہے کہ وہ شاعر ہو اور ایسا شاعر کہ ''مضامین کا خلاق'' اس دعا کو امین الدولہ اور ان کے متعلقین کا پسند کرنا اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ اہلِ کانپور کا عام عقیدہ یہ تھا کہ شاعری محض فنِ شریف نہیں ہے بلکہ یہ وہ جوہر ہے جو انسان کو خدا کے فضل سے ہی حاصل ہوتا ہے، اور جس شخص کو یہ خوبی من جانب اللہ ودیعت ہو وہ ممتاز اور لائقِ احترام ہوتا ہے کانپور میں شاعری کا مزاج اور اندازِ فکر بھی بدل رہا تھا۔ یہاں قافیہ پیمائی، صنائع بدائع کے صَرف، زباں دانی اور بندشِ الفاظ کے لطف اور طرزِ بیان کی خوبی پر ہی شاعری کو منحصر خیال نہیں کرتے تھے۔ ان خوبیوں کی یہاں ثانوی حیثیت رہ گئی تھی۔ یہاں شاعری کی سب سے بڑی خوبی مضامین کی خلاقی کو سمجھا جانے لگا تھا۔ اس مقام پر یہ اعتراف ضروری ہے کہ 1857 کے انقلاب کے نتیجہ میں اگر حالات کا رخ بدل نہ گیا ہوتا تو کانپور کے اس ماحول میں اردو زبان وشعر کو جس طور پر ترقی ملی ہوتی، آج اس کا تصور کر لینا بھی آسان نہیں ہے۔

میر رشک نے ''حُسنِ کذب'' کا ذکر کر کے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی واقعہ، معاملہ یا حقیقت کو من وعن پیش کر دینا شاعری نہیں ہے۔ بات اس طرح کہی جانی چاہیے کہ اس سے کوئی عمدہ مطلب یا نتیجہ یا فائدہ بھی حاصل ہو۔ غور کریں تو یہی مضمون کی خلاقی ہے۔ اس کے لیے شاعر کو حقیقت سے تجاوز بلکہ بعض صورتوں میں انحراف بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس عمل میں شاعری اغراق اور جھوٹ سے مماثل بلکہ کبھی کبھی ان کے قریب تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ قادر الکلام، باشعور اور صاحب استعداد شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ شاعری کی حدوں کو پہچانے اور اسے ''کذب'' نہ بن جانے دے۔

دعاؤں کا سلسلہ جاری رہا اور اس قطعہ یا قصیدے کا اختتام اس شعر پر ہوا ہے ۔

کس نور کا ہے مصرعِ تاریخِ ولادت پیدا ہوا ساعت میں قمر کی مہِ آفاق

1257ھ

چھوٹے بڑے واقعات کی تاریخیں کہنے کا جتنا اہتمام اہلِ کانپور نے کیا ہے۔ اتنا کسی دوسرے مرکز پر نہیں کیا گیا ہے۔ یہ صورت حال اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ اس شہر میں تاریخی شعور بھی بیدار ہو چکا تھا۔

کسی وجہ سے نواب معتمد الدولہ کی دونوں بیگمات میں اَن بَن ہوگئی تھی۔ نادر آغا کی چھٹی کے موقع پر دونوں کے مابین صلح ہوگئی اور اس طرح اس موقع کی خوشی دو چند ہوگئی۔ اس بڑی خوشی کی تاریخ رشک نے اس طرح کہی ہے

ہم ان کے پوتے کو کیونکر نہ صلح کل ٹھیرائیں خدا کا شکر، ہوا امتزاج دادیوں میں

ہزار سال دلِ مادرو پدر رہیں شاد خدا کرے، کرے بچہ یہ راج دادیوں میں

چھٹی میں صلح ہوئی، رشک نے کہی تاریخ چھٹی کے ساتھ ہوئی صلح کاج دادیوں میں

1257ھ

نادر آغا نو برس کا ہوا تو اُس کا ختنہ ہوا۔ اس موقع پر بھی ''جشنِ مہین'' ہوا۔ میر رشک کے تیسرے دیوان میں اس سے متعلق ایک قطعہ (غزل کی ہیئت میں) اس طرح درج ہے۔

''در شادیِ ختنۂ نواب نادر آغا خلف نواب امین الدولہ بہادر''

مبارک ایں ختانِ نادر آغا بُدہ جشنِ مہیں شادیِ ختنہ

زدورِ حکم ابراہیم تاحال نشد گاہے چنیں شادیِ ختنہ

کلامِ مردِ مانِ کانپور است بیا عیسا، ببیں شادیِ ختنہ

نوشتم عیسوی تاریخ اے رشک ہمایوں باشد ایں شادیِ ختنہ

1850

کانپور کی سرزمین پر بھلا ایسے جشن کس نے منائے ہوں گے میر رشک کا یہ دعویٰ کہ ایسا جشن کبھی نہیں ہوا حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ ملک نصارا میں ''بیا عیسا'' کہنا اور پھر عیسوی سَن میں تاریخ نظم کرنا زیادہ پُر لطف ہوگیا ہے۔

امین الدولہ کے والد نواب معتمد الدولہ ''فیاض جہاں'' کہے گئے تھے۔ امین الدولہ کی نہ تو وہ حیثیت تھی اور نہ انھیں وہ وسعت ہی حاصل تھی۔ باوجود اس کے ان کی خواہش ہی نہیں کوشش بھی یہی تھی کہ اپنے والد کی روایت کو زندہ اور جاری رکھیں۔ میر علی اوسط رشک نے اپنے استاد شیخ ناسخ کی سراج نظم میں ضمناً امین الدولہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس میں دو شعر یہ ہیں ؎

حاتم اس دور میں اگر ہوتا دور گردوں غیاب پر ہوتا
نذر اہلِ کمال کرتے ہیں باثمر کو نہال کرتے ہیں

امین الدولہ کی داد و دہش اور سخاوت سے متعلق زیادہ واقعات اب ہمارے علم میں نہیں ہیں البتہ میر رشک کے دیوان میں جو قطعات درج ہیں ان میں سے کچھ یہاں نقل کیے جاتے ہیں ؎

عطا شد بہ رشک از کمالِ عنایت قلمدان وقط گیر ومقراض وچاقو
بعینہ ہمیں عیسوی بود تاریخ <u>قلمدان وقط گیرو مقراض وچاقو</u>

1833

دیگر ؎

بمن داد نواب آقا علی خاں چواز فرطِ ہمت قلمدان سیمیں
پے نذر تاریخ فوراً نوشتم <u>زہے شد عنایت قلمدانِ سیمیں</u>

1252ھ

دیگر ؎

عنایت شداز فرطِ جود و سخاوت چوخوشخط، دل افروز زادالمعادی
پے نذر اے رشک تاریخ گفتم <u>عنایت شدامروز زاد المعادی</u>

1257ھ

امین الدولہ اگر چہ کانپور میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے، وہ اس بستی کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنا سمجھتے تھے اور اسی خیال کے مطابق وہ ان سب کی خوشیوں میں بہ ذاتِ خود شرکت کرتے تھے۔ اوپر گنگا کی میر اور بٹھور کے میلے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ وہ ہولی وغیرہ ہندوؤں کے تیوہاروں کی بھی بخوبی سرپرستی کرتے تھے چنانچہ میر رشک کے اس قطعہ سے ظاہر ہے ؎

ہولی ونوروز جمع شدند دریں ماہ　　مہر دوبہ مہر فلک جناب مبارک
مصرع تاریخ جشن یافتم اے رشک　　ہولی و تحویل آفتاب مبارک

1258ھ

امین الدولہ مختلف تقریبوں، تہواروں وغیرہ میں نہ صرف شرکت کرتے تھے بلکہ حسب مواقع اپنے متوسلوں اور ملازموں کو خلعتوں اور انعاموں سے بھی نوازتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی معتمدالدولہ کی بیگمات کی طرف سے بھی خلعت وغیرہ عطا ہوتے تھے۔ ان تمام معاملات کا نتیجہ یہ تھا کہ کانپور کی زندگی نہایت خوشگوار اور اس شہر کا ماحول بارونق اور دل خوش کن ہوگیا تھا۔ میر رشک کے دیوان میں یہ قطعہ توجہ طلب ہے ؎

یوں تو خلعت دیا کیے نوآب　　کوئی تقریب ہو، ہوا خلعت
پرجناب معظمہ نے کبھی　　یوں کسی کو دیا نہ تھا خلعت
میرے خلعت کے ہے یہی تاریخ　　بے طلب آج مل گیا خلعت

1258ھ

اس سے دو امور سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ جناب معظمہ نے یہ خلعت ''بے طلب'' عطا کیا تھا۔ دوسرا یہ کہ نواب ہر تقریب پر اپنے ملازموں کو انعام وخلعت سے شاد کرتے رہتے تھے۔

امین الدولہ کو ان کے والد نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ ان کی لیاقتوں اور خوبیوں کے سبب ان کی دونوں مائیں ان سے خوش تھیں۔ کسی موقع پر ان کی والدہ نے ان کو بھی خلعت سے شاد کیا تھا۔ میر رشک نے تاریخ کہی تھی ؎

خلعت زیبندہ چو نوآب یافت　　از طرف والدہ باعزّ وجاہ
رشک چنیں مصرع تاریخ گفت　　خلعتِ زیبندۂ نوآب واہ

1249ھ

اس قسم کی تقریبوں سے کانپور شہر کا یہ حال ہوگیا تھا کہ یہاں ہر روز روزِ عید تھا اور ہر شب شب برأت، چند سال میں یہاں کی ''چھوٹی امّت'' کو بھی ایسی خوشحالی میسر آگئی تھی کہ پھر کسی نے مرزا رجب علی بیگ سرور کی طرح ان کی مذمّت نہیں کی بلکہ اس شہر کے حالات ومعاملات کی

ہر شخص تعریف کرتا معلوم ہوتا ہے۔ میر رشک کا تو یہ حال تھا کہ یہاں سے لکھنؤ جانے کو بھی اب ان کا دل نہیں چاہتا تھا۔ کہتے تھے ؂

اے رشک لکھنؤ کو نہ جا اور کچھ دنوں ترسائے رشکِ مہر و مہِ کانپور دیکھ

اور ؂

تم کانپور میں کس کے مقلد ہوئے بتو واللہ لکھنو میں بھی ایسی ہے کم تراش

اس کانپور میں جہاں کبھی خاک اُڑتی تھی اب وہ ٹھنڈی سڑک بن گئی تھی جس کی توصیف میں کہا گیا ہے کہ ؂

لکھتے ہیں کانپور کی ٹھنڈی سڑک کے وصف چھڑکاو کا ہو پانی تو سرخی دوات میں

رجب علی بیگ سرور نے کہا تھا ''کانپور کی برسات ہیہات ہیہات'' اب برسات کے لیے ہر قسم کا ضروری سامان اسی کانپور میں میسر آ سکتا تھا۔ دریائی سفر کے لیے سب سے زیادہ اہم اور مفید چیز ''بجرا'' تھی جس پر چھت بھی ہوتی تھی۔ واجد علی شاہ بادشاہ لکھنو کو جب کلکتہ کا سفر درپیش ہوا تو برسات کا انتظام کرنے کے لیے انھیں لکھنؤ سے اسی شہر کانپور میں آ کر مقیم ہونا پڑا تھا۔

کانپور میں امین الدولہ نہایت اعلیٰ ذوق اور بہت عمدہ صلاحیتوں کا ثبوت پیش کر چکے تھے۔ 1258ھ (1842) میں محمد علی شاہ کا انتقال ہوا اور امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو امین الدولہ نے ان کی خدمت میں چند منظوم عرضداشتیں روانہ کیں جو اُن کے دیوان میں غزل کی صورت میں مندرج ہیں۔ ایک یہ ہے ؂

خدا کے فضل سے آقا مرادہ شاہِ شاہاں ہے کہ جس کا ہر ملازم (کذا) رتبے میں فغفور و خاقاں ہے
شجاعت میں، ہنر میں، فضل میں، ثانی نہیں اس کا دلاور ہے، بہادر ہے، سخن گو ہے، سخنداں ہے
عطا و بذل و جود و سلطنت میراث اس کی ہے سخی ابن سخی ہے اور سلطان ابنِ سلطاں ہے
ہمارے شاہ سے اسکندر و دارا کو کیا نسبت رعیت پرور و حاجت روائے مستمنداں ہے
سُنا ہم نے کوئی ایسا، نہ دیکھا آج تک ایسا عجب خاقانِ باذل ہے، عجب سلطان ذیشاں ہے
نہیں وستِ گدا میں درہم و دینار، جُز گوہر سحابِ دستِ گوہر بار ہے یا ابرِ نیساں ہے
جو کچھ اوصافِ حضرت ہیں کرامات ان کو کہتے ہیں لکھے تعریف کیا کوئی، کہاں یارائے انساں ہے

مناسب ہے کہ عرضِ حال پہنچے سمعِ اقدس کو
یہی تدبیر میرے دردِ بے درماں کی درماں ہے

طلب کی آرزو ہے، یاد فرمانے کی حسرت ہے
سوا اس کے کہاں فدوی کو کچھ امیدواراں ہے

تمنا ہے نگاہِ رحم کی ، عفوِ جرائم کی
کہ تیری ذاتِ اطہر سایۂ غفار و رحماں ہے

یہی شام و سحر وردِ زبانِ مہرِ عاجز ہے
میں مجرم ہوں، گدا ہوں، تو رحیم اے شاہِ شاہاں ہے

اس غزل میں امین الدولہ نے اپنے بادشاہ کو ''سلطان ابنِ سلطان'' کہا ہے اس کا اطلاق امجد علی شاہ ابنِ محمد علی شاہ پر ہی ہو سکتا ہے جن کے بارے میں مورخین کی رائے ہے کہ ''وہ بادشاہ کے مقابلے میں ملا یا مذہبی پیشوا زیادہ تھے'' اور امین الدولہ نے بھی اپنی غزل میں ان کی شخصیت کے اسی پہلو پر زیادہ زور دیا ہے۔

کم و بیش اسی زمانے میں امین الدولہ نے اپنے استاد ناسخ کی زمین میں بھی دو غزلیں کہی تھیں۔ پہلی غزل اٹھارہ شعر کی ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں ؎

دَم بھرا کرتا ہے مرا ہردَم برائے لکھنو
لکھنو مجھ کو دکھا دے اے خدائے لکھنو

لکھنو کا میں ہوں عاشق، عشق میں ہوتا ہے جذب
کیا تعجب ہے اگر مجھ کو بُلائے لکھنو

بادشاہِ لکھنو کی ایک زر بخشی یہ ہے
قیصر و فغفور و خاقاں ہیں گدائے لکھنو

آرزو ہے تجھ سے اے فرماں روائے کائنات
مہر پر ہو مہرباں فرماں روائے لکھنو

اور دوسری غزل گیارہ شعر کی ہیں۔ اس کے دو شعر یہ ہیں۔

کانپور میں ہے یہ میری زندگی کا سبب
جسم کو لگ جاتی ہے اکثر ہوائے لکھنو

یاالٰہٗ العالمین جلدی کسی دن مہر پر
مہرِ سلطانِ جہاں ہو رہنمائے لکھنو

یہ دونوں غزلیں ایک قسم کی منظوم عرضداشت ہیں۔ ان میں شاعرانہ انداز سے فرماں روائے لکھنؤ سے مہربان ہونے اور شاعر کو لکھنؤ میں طلب کر لینے کی درخواست کی گئی ہے۔ دونوں غزلوں کے مقطعوں میں شاعر نے اپنے تخلص سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔

اپنی جدوجہد میں جب کسی قدر کامیابی کی صورت نظر آئی تو امین الدولہ نے خوش ہو کر ایک اور ''غزلِ نظم طور'' کہی اور اس میں اپنے مطلب کا بڑے سلیقے سے اظہار بھی کیا۔ غزلِ مذکور یہ ہے ؎

غیرتِ صحرائے ایمن لکھنؤ ہوجائے گا　　مہر کے جانے سے روشن لکھنؤ ہوجائے گا
زمزمے میرے کرینگے جس گھڑی گل ریزیاں　　عندلیبو رشکِ گلشن لکھنؤ ہوجائے گا
روندڈالوں گا خدا کا فضل اگر شامل رہا　　زیرِ نقشِ لعلِ توسن لکھنؤ ہوجائے گا
بلبلِ اقبال کو کھینچے گا جب حُبِّ وطن　　صورتِ شاخِ نشیمن لکھنؤ ہوجائے گا
دوستی مجھ سے یہ رکھتاہے اگر دیکھا مجھے　　لکھنؤ والوں کا دشمن لکھنؤ ہوجائے گا
جب کریگا یاد مجھ کو بادشاہِ لکھنؤ　　ظلم اُٹھ جائے گا، مامن لکھنؤ ہوجائے گا
سیرِ بزمِ مہوشاں اے مہر کب ہوگی نصیب　　ہائے کس دن میرا مسکن لکھنؤ ہوجائے گا

ان سبھی غزلوں میں فضا کی ہمواری، خیالوں میں ربط اور بیان کے انداز میں یکسانی موجود ہے۔غزل کا ایک شعر بھی بے اصل اور بے بنیاد خیالوں پر مشتمل نہیں ہے۔شاعر نے ہر شعر میں اپنے دل کی بات صراحت کے ساتھ اور مدلل انداز سے کہی ہے۔امین الدولہ کو اپنی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔کانپور کی رونقیں اس پر شاہد تھیں اس لیے ان کا دعویٰ تھا کہ اگر اقتدار حاصل ہوگیا تو لکھنؤ پہنچنے کے بعد ان کی کوششوں سے وہ شہر بھی روشن ہوجائے گا۔کانپور میں رہ کر وہ اس دن کے منتظر تھے جب ''خدا کے فضل سے'' وہ لکھنؤ میں عزت اور اقتدار کے ساتھ ''سوارِ توسن'' ہوں۔انھیں یقین تھا کہ اگر بادشاہِ لکھنؤ کی عنایت سے انھیں وہ منصب مل گیا جس کے وہ متمنی تھے تو لکھنؤ سے ظلم مٹ جائے گا۔

اپنی کوششوں میں امین الدولہ کو اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ انھیں لکھنؤ جانے کی اجازت مل گئی اور 1260ھ (1844) میں وہ کانپور سے وہاں پہنچے۔اس آمد سے بڑی خوشی منائی گئی۔ رشک نے تاریخ کہی ؎

لکھنؤ میں جو آئے سیف الملک　　ہوئے شاداں بزرگ وخُرد سبھی
کہی تاریخ رشک نے اُسی وقت　　لائے تشریف لکھنؤ میں ابھی

1260ھ

لکھنو پہنچنے کے بعد امین الدولہ نے ''اپنے کارآبائی'' کے حصول کے لیے کوشش شروع کی۔ اپنی ایک غزل میں انھوں نے کہا ہے ؎

حیدر آباد اور دلّی کی حقیقت کون سی وسعتِ ملکِ صفاہاں ہے نثارِ لکھنؤ
مجھ کو میرا کارِ آبائی ملے پھر اے خدا پھر بُلائے شاہِ گردوں اقتدارِ لکھنو

میر رشک نے جوان کے کارکن اور استاد بھی تھے اس کارِ آبائی کی اپنے ایک مقطع میں اس طرح وضاحت کی ہے ۔

وزیرِ ہند ہوں نواب مستطاب اے رشک غرض جو ہے تو یہ ہے بادشاہ سے ہم کو

لیکن اس کوشش میں کامیابی نہیں ملی ۔ ناچار وہ پھر کانپور میں واپس آ گئے ۔

26 ۔صفر 1263ھ ( فروری 1847 ) کو امجد علی شاہ نے وفات پائی ۔ ان کی نوازشات کے سبب امین الدولہ کو ان سے تعلقِ خاطر تھا ۔ رشک نے تاریخ کہی ۔ مصرع تاریخ یہ ہے ۔

بود سلطانِ خوش عقیدہ آہ

1263ھ

نئے بادشاہ واجد علی شاہ ہوئے ۔ تمام توقعات ان کی ذات سے وابستہ ہو گئیں ۔ رشک نے ان کے جلوس کی تاریخ کہی ۔

نشست حق بہ مرکز حمد واحد

1263ھ

واجد علی شاہ نے معاملات پر قابو حاصل کرنے کی غرض سے اخراجات میں کمی کی جب اطمینان ہوا تو علوم وفنون کی طرف متوجہ ہوئے ۔ امین الدولہ میر رشک کو ساتھ لے کر لکھنؤ آئے ۔ اسی زمانے میں ملکہ مبارک محل نے وفات پائی جس سے امین الدولہ کو نہایت رنج ہوا ۔

امین الدولہ نے بادشاہ تک رسائی ضرور حاصل کر لی تھی لیکن انھیں بہ گمانِ غالب کوئی خدمت نہیں مل سکی ۔ بادشاہ نے اپنی کتاب ''بنی'' میں ان کا نام ایک سے زائد مقاموں پر لیا ہے ۔ ایک جگہ ان کا یہ مطلع بھی نقل کیا ہے ۔

''مہر ابنِ معتمد الدولہ مطلع

روز بالیدہ خوشی سے تنِ دلبر دیکھوں مثلِ گل تازہ و تر گلشنِ دلبر دیکھوں''

اسی زمانہ میں نواب معتمد الدولہ کی بڑی صاحبزادی نواب عالیہ بیگم نے وفات پائی ۔ پھر ان

کی والدہ نواب بیگم (خاص محل) نے بھی رحلت کی ان واقعات نے بہت صدمہ پہنچایا۔ لکھنؤ میں "کارآبائی" کے ملنے کی بھی امید نظر نہیں آئی تھی اس لیے مایوس ہوکر وہ 6 رذی الحجہ 1267ھ (ستمبر 1851) کو کربلائے معلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ ان کے اعزا اور متوسلین کا ایک چھوٹا سا قافلہ بھی تھا، جس میں میر رشک، حافظ محمد حسین نابینا خلف مجتہد لکھنو وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بارہ دن کے سفر کے بعد وہ آگرہ پہنچے رشک نے تاریخ کہی ؎

درشہر آگرہ چو رسیدم زلکھنو بُد مدتِ سفرز ششم تا بہ ہجدہم
تاریخ وروز، ماہ وسن اے رشک بود ایں بودہ سہ شنبہ مہِ ذی الحجہ ہجدہم

1267ھ

نواب امین الدولہ نے بمبئی پہنچ کر چندروز وہاں قیام کیا۔ گورنر بمبئی سے بھی ملاقات ہوئی۔ تاریخ یہ کہی گئی ع

شدہ با مہر ملاقاتِ گورنر بمراد

1852

وہاں سے رخصت ہوکر عراق میں پہنچے شاید سفر کی صعوبتوں یا آب وہوا کی تبدیلیوں کے سبب صحت بگڑ گئی۔ ایک برس وہاں رہ کر رحلت کی۔ صغیر شاگرد رشک نے یہ تاریخ کہی ؎

"تاریخ وفاتِ نواب آغا علی خاں امین الدولہ بہادر ابنِ معتمد الدولہ بہادر"

چلا جو ہند سے ابن وزیرِ شاہِ اودھ جنازہ صحنِ رواقِ حُسین میں آیا
کہی صغیر نے تاریخ جب سُنی یہ خبر پیامِ مہدِ اجل کا ظمین میں آیا

1269ھ

وہیں کچھ مدت کے بعد امین الدولہ کی والدہ نے بھی وفات سے پہلے، متروکہ امین الدولہ کے دونوں بیٹوں کو جو وہیں تھے تقسیم کیا۔ سید کمال الدین حیدر نے لکھا ہے:

"متروکہ: دونوں اپنے پوتوں آغا علی خاں کے بیٹوں احمد آغا وغیرہ کو دے گئیں۔ نیک نام ہوئیں"[10]

معتمد الدولہ کے وقت میں جو وثیقہ مقرر ہوا تھا، اُنیسویں صدی کے آٹھویں عشرہ میں اس کی

تقسیم بقول منشی درگا ہی لال اس طرح ہوئی تھی۔

''نواب ممدوح کے چار بیٹے تھے۔ بڑے امین الدولہ صاحب، وہ مرگئے۔ ان کے بیٹے لکھنؤ میں ہیں۔'' 11

دوسرے نواب نظام الدولہ صاحب، ان کے اوپر بار قرضہ کا اس قدر ہو گیا ہے کہ اس سے سبکدوش ہونا دشوار ہے۔ تیسرے نواب باقر علی صاحب، انھوں نے 1874 میں انتقال کیا۔ ان کے تین بیٹے ہیں۔ ان کا انتظام بہت درست ہے اور ان کو عدالت سے سروکار نہیں رہتا ہے۔ چوتھے نواب محمد علی خاں عرف ننھے نواب صاحب تھے.........اب تقسیم زر وثیقہ کی بموجب شرائط مندرجۂ عہد نامۂ مذکور مابین ورثای القایم بہ قاعدۂ شرع مذہب کے حسب تفصیل ذیل ہوتی ہے:

| | |
|---|---|
| وارثانِ نواب امین الدولہ صاحب | سمہ6(6500/-) |
| نواب نظام الدولہ صاحب | للعمہ 6/(4500/-) |
| وارثان نواب محمد علی خاں صاحب | للعمہ 6/(4500/-) |
| وارثان نواب باقر علی خاں صاحب | للعمہ 6/(4500/-) |
| نواب دولھا صاحب | اعہ 6/(2200/-) |

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی دادی کے وفات کے بعد وارثانِ امین الدولہ لکھنو میں آگئے تھے۔

نواب امین الدولہ نے شیخ امام بخش ناسخ اور پھر میر علی اوسط رشک کی آغوشِ تربیت میں آنکھیں کھولی تھیں۔

شعر وسخن سے ان کی دلچسپی قدرتی تھی۔ ناسخ شعرگوئی کے لیے ''میر لغات'' کو ضروری سمجھتے تھے ؎

شام سے تا صبح ہے مجھ کو جو اَب سیرِ لغات　　سامنے رکھتا ہوں اپنے نسخۂ فرہنگ وشمع

یہی عمل امین الدولہ مہر کا بھی تھا۔ کہتے تھے ؎

خدا کے فضل سے شوقِ لغت ہے مہر کو اتنا　　دھرے رہتے ہیں پہروں نسخۂ فرہنگ سینے پر

راقم نے نواب حیدر علی خاں اور نواب قیصر حسین خاں کی کتابوں میں قابلِ لحاظ تعداد میں لُغتیں دیکھی تھیں، ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس گھرانے کے مختلف افراد کو لُغت بینی کا شغف رہا ہے اور ناسخ نے مطالعہ و تحقیق کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ کانپور میں تادیر جاری رہا۔

امین الدولہ نے رواج زمانہ کے مطابق فارسی زبان وادب کی تعلیم پائی تھی۔ جب وہ شعر کہنے کے لائق ہوئے تو اساتذۂ فارسی کے کلام سے بھی اپنی لیاقت کے مطابق اکتساب اور استفادہ کرتے رہے تھے۔ اپنے بعض مقطعوں میں انھوں نے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثلاً

ے من شاعرِ سعدی وشم، مانندِ حافظ سرخوشم　　اے مہر ہر دم میکشم ، جامِ مے شیراز را

ے خالی نہ کوئی شعر ہو بندش کے نور سے　　اے مہر عالمِ غزلِ انوری رہے

ے مہر طرزِ نو یہ ہے، موزوں ہو ایسی اک غزل　　ترجمہ ظاہر ہو قولِ ایزدِ وہاب کا

امین الدولہ نے شعر کہنا کب شروع کیا تھا، یہ متعین نہیں ہے البتہ ان کے دیوان میں ایک قطعہ تاریخی 1248ھ (1832) کا ہے جو صریحاً اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ اس وقت تک وہ اتنی ترقی کر چکے تھے کہ تاریخیں بھی کہنے لگے تھے۔ یہاں مثالاً کچھ تاریخی مقطعے درج کیے جاتے ہیں۔

ے ہے یہ مصرع یادِ رقصِ یار کی تاریخ میں　　مہر اک محبوب کا وہ ہم کو یاد آتا ہے رقص

1249ھ

تاریخ طرح و داغ کی یہ عیسوی کہی　　کیوں مہر ہیں بجا یہ ہمارے بدن میں داغ

1834

یہ ہے تاریخ داغ وطرح اے مہر　　دل میں بس آفتاب روشن ہے

1252ھ

نواب کی اتباع میں شہر کانپور میں تاریخی مقطعے کہنے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ اس شہر میں ایک سے زائد شاعر ایسے تھے جو اپنی غزل میں اس کا التزام کرتے تھے۔ چنانچہ علی ضامن شوق پسرِ رشک 13 اور امیر علی خاں ہلال شاگردِ رشک کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی ہر غزل کا مقطع تاریخی ہوتا ہے۔ جن دنوں راقم مہر وغیرہ شعرا کے کلام کا مطالعہ کر رہا تھا، اس شہر کے نام بر آوردہ

شاعر جناب نشور واحدی نے ان تاریخی مقطعوں کو دیکھ کر فرمایا کہ" کتنے باشعور تھے یہ شاعر" راقم نے تفصیل چاہی تو فرمایا کہ:

"ان کے دواوین سے ان کے عہد کی ادبی اور معاشرتی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے"

اس میں شبہ نہیں کہ ان شاعروں کی صلاحیتوں اور ان کے فکر وفن کے ارتقا کو سمجھنے کے لیے یہ تاریخی مقطعے نہایت مفید اور معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

شیخ امام بخش ناسخ 1243ھ (1827) میں لکھنؤ سے نکلے تھے۔ اگر امین الدولہ نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا ہو تو انھیں استاد سے براہِ راست استفادے کا موقع بہت زیادہ نہیں ملا تھا۔ ناسخ کے لکھنو چھوڑنے کے بعد امین الدولہ بذریعۂ مراسلت اصلاح لیتے ہوں گے۔ ناسخ کی استاد کی حیثیت سے اس زمانے میں دھوم تھی۔ ان کی اصلاحیں جب لکھنؤ میں پہنچتی ہوں گی تو لوگ بہت شوق سے ان کو دیکھتے ہوں گے اور ان کا چرچا ہوتا ہوگا۔ منتظم الدولہ کے مقربین میں ایک شخص سید حسین احمد رضوی تاسف تخلص بھی تھا۔ منتظم الدولہ کی خوشنودی کے لیے یہ شخص معتمد الدولہ، ان کے گھرانے اور متوسلین سے بھی کد رکھتا تھا۔ اس کو امین الدولہ کے ایک شعر پر ناسخ کی اصلاح کا حال معلوم ہوا تو اپنے دیوان کے مقدمے میں اس نے اس کا ذکر اس طرح کیا:

"صاحبانِ فہم سے امید یہ ہے کہ بہ چشم انصاف ملاحظہ کریں کہ حال اس شخص (ناسخ) کی اصلاح کا یہ ہے کہ ایک غزل اپنی نوابِ امین الدولہ نے اس کے پاس بھیجی کہ مطلع اس کا یہ تھا۔

قبر تاریک ہے داغِ غمِ ہجراں مدد ے　　سایہ مرقد پہ نہیں گنبدِ گرداں مدد ے

اس شاعر نے کہیں کہیں اس میں اصلاح دی چنانچہ مطلع میں دو لفظ بدل دیے۔ مصرع اول میں بجائے غم کے شب اور مصرع ثانی میں بجائے مرقد کے مدفن بنایا، اس طرح سے۔ اصلاح

قبر تاریک ہے داغِ شبِ ہجراں مدد ے　　سایہ مدفن پہ نہیں گنبدِ گرداں مدد ے

دیکھیے کہ اس اصلاح سے الفاظ کی درستی ہوگئی لیکن معنوں کی خرابی پر نہ نظر کی جیسا کہ یہ مطلع بے معنی تھا ویسا ہی رہا کیونکہ اگر یہ عاشق اپنے ساتھ داغِ شبِ ہجراں لے گیا تو

لازم ہے کہ قبر روشن ہو، تاریک نہ ہو۔ پھر اس صورت میں مدد اس سے چاہنا تحصیل حاصل ہے اور جو ہمراہ اس کو نہیں لے گیا تو یہ عجب عاشق ہے کہ آپ اندر اور دل باہر۔ اب حالتِ ترکِ عشق میں طلب مدد اس سے لاحاصل ہے اور درصورتے کہ گنبد گرداں کا وجود ثابت ہے۔ پس لابد ہے کہ سایہ بھی موجود ہو، اس لیے کہ یہ دونوں آپس میں لازم وملزوم ہیں، پھر گنبد سے سایہ طلب کرنا تحصیل حاصل ہے اور جو اس کے مدفن پر سایہ نہیں ہے تو چاہیے کہ گنبد بھی نہ ہو، پھر کس سے مدد چاہتا ہے۔ واہ واہ سبحان اللہ کیا کہنا ہے اور کیا پوچھنا ہے کہ خود شیخ (ناسخ) صاحب کے کلام کا وہ حال اور شاگرد کے کلام پر اصلاح کا یہ حال اور اس احوال پر دعویٰ یہ کہ ہم چو ما دیگرے نیست بلکہ متقدمین میں بھی مثل ہمارے کوئی نہ تھا۔ وہ سب غلط گو تھے۔ اب دیوان ان کے منسوخ ہیں اور دیوان اپنا ناسخ ہے جیسا قرآن ناسخ ہوا اور سب کتب آسانی منسوخ ہوئیں۔ دیکھیے کہ اس بیہودہ گو نے تمام شعرائے ہندوستان پر افترا غلط گوئی کا صحیح کیا ہے اور تصرفاتِ اہلِ اردو کا نام غلطی رکھا ہے۔"

اس اقتباس میں تاسف نے استاد (ناسخ) کے ساتھ شاگرد (مہر) کو بھی ہدف بنایا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے اعتراضوں میں کچھ وزن نہیں ہے۔ پہلے مصرع میں قبر کی تاریکی سے وحشت ہوئی تو "داغِ شبِ ہجراں" سے مدد کی طلب کی ہے کہ وہی اس اندھیرے کو دور کرنے کی لیاقت رکھتا ہے۔ دوسرے مصرع میں "گنبدِ گرداں" سے سایہ کی طلب کا بھی یہی معاملہ ہے۔ دونوں مصرعے نوخیز، نومشق آغا علی خاں مہر کی خوش فکری پر بخوبی دلالت کرتے ہیں۔ استاد کی اصلاح کے بارے میں خود تاسف نے یہ اعتراف کیا ہے کہ "اس سے الفاظ کی درستی ہوگئی۔" استاد کا کام یہی ہے کہ شاگرد کی صلاحیتوں کو ترقی دے اور اس کے لیے یہ لازم ہے کہ اس میں خود اعتمادی کا جوہر پیدا کردے۔ جو استاد شاگرد کے شعر کے بدلے میں خود شعر کہہ کر اسے دے دیتے یا اس کے بیشتر لفظوں کو بدل دیتے ہیں وہ غیر ارادی طور پر اسے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ناسخ اپنے زمانے کے کامیاب ترین استادوں میں سے تھے۔ وہ شاگرد کے کلام میں محض "کہیں کہیں" اصلاح دیتے تھے۔ اس سے دو فائدے حاصل ہوتے تھے۔

اول یہ کہ شاگرد کو بہتر شعر کہنے کا حوصلہ ہوتا تھا اور اس میں وہ خود اعتمادی پیدا ہوتی تھی جو ترقی کے لیے ضروری ہے دوم یہ کہ اصلاح کے بعد بھی شاگرد کا کلام اس کے معیار، مزاج اور فکر کا آئینہ دار ہوتا تھا۔

امین الدولہ جب اپنے والد کے ساتھ کانپور پہنچے تو ناسخ بھی وہیں تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے استاد سے براہ راست اور بالمشافہ کسب فیض کیا۔ جب وہ لکھنو چلے گئے تو ان کی ایما سے امین الدولہ میر رشک سے اصلاح لینے لگے قابل ذکر بات یہ تھی کہ رشک کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرنے کے بعد بھی مہر نے اپنے قدیمی استاد (ناسخ) سے نہ روگردانی کی اور نہ ان کے احترام میں کبھی کمی کی۔ واقعہ یہ ہے کہ استاد سے عقیدت محض زبانی نہیں تھی، دل کی گہرائیوں سے تھی۔ وہ استاد کے کلام کو آنکھوں سے لگاتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد بھی کہتے تھے ؎

پوچھتے ہو مجھ سے کیا اے مہر آہ  نام تھا ناسخ مرے استاد کا
کیوں نہ آنسوں سے لگائے مصرع ناسخ کو مہر  چشم جاناں اور ہے، چشم غزالاں اور ہے

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ کانپور کے مخصوص ماحول میں امین الدولہ اور ان کے متعلقین اکثر حسب حال اور حسب موقع ایسی غزلیں کہتے تھے جن میں مطلع سے مقطع تک کسی متعین موضوع سے متعلق اشعار ہوتے تھے مثلاً ''دیس نکالا'' سے متعلق خود امین الدولہ کی ایک غزل کے دو شعر یہ ہیں ؎

ہم کو شہا دیس نکالا بھلا  تابہ گدا دیس نکالا ملا

اسی موضوع سے متعلق ایک اور غزل دیوان مہر میں ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

بے جرم و بے گناہ غریب الوطن کیا  ہم کو وطن سے شاہ غریب الوطن کیا

امین الدولہ نے الہ آباد اور بنارس وغیرہ مقاموں کے سفر بھی کیے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی ردیفوں کے انتخاب اور اختیار کا رواج وہاں بھی ہوا۔ امین الدولہ اور ان کے ساتھ میر رشک کو بھی ان مقاموں پر نئے نئے موضوعات ملے مثال کے طور پر میر رشک کی ایک غزل کے یہ شعر ہیں۔ ؎

جیسا کوئی پتھر نہیں پارس کے برابر  تیرتھ نہیں دنیا میں بنارس کے برابر
ہر گھاٹ کے پتھر ہوئے پارس کے برابر  بجرا اترا پہنچا جو بنارس کے برابر

تشبیہ سوادِ ختن ورنگِ خطا ہے — ہر کوچۂ گیسو ہے بنارس کے برابر
کیونکر نہ ہوں گھر کانِ طلا لکھ پتیوں کے — ہر سنگ بنارس میں ہے پارس کے برابر
پھولوں میں کہاں اے گُلِ تر تیری لطافت — ہر صبح نہیں صبحِ بنارس کے برابر

اسی طرح الہ آباد میں انھوں نے ایک غزل کہی جس میں نواب امین الدولہ کی عنایت سے متعلق یہ شعر کہا ؂

سنگم کی سیر دولتِ نواب سے ملی — کاشی کی مچھلیاں نظر آئیں پراگ میں

غور کریں تو شائستگی اور متانت کے باوجود امین الدولہ اور ان کے رفقا نے اس قسم کی غزلیں کہہ کر موضوع اور مطالب کے اعتبار سے اردو غزل کے دامن کو نہایت وسیع کر دیا اور ہر قسم کے معاملات و مسائل اور واقعات و واردات کی پیش کش کی لیاقت صحیح معنوں میں اردو غزل میں انھیں کی کوشش سے پیدا ہوئی تھی۔

کانپور میں چند سال کے قیام کے بعد جب امین الدولہ کو لکھنؤ جانے کی اجازت مل گئی تو اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ اس شاہ نشیں شہر میں ان کو وہ حیثیت حاصل نہیں تھی کہ جو کانپور میں تھی۔ وہاں وہ خود بھی مجبور تھے کہ لکھنو کے مخصوص شعری ماحول کے مطابق اپنی قدرتِ کلام کا اظہار کر کے خود کو متعارف کرائیں۔ وہاں لطفِ زبان، قافیہ پیمائی اور مضمون آفرینی کا زور تھا۔ امین الدولہ نے بھی اسی قسم کے کئی دوغزلے کہہ کر اپنی مشاقی اور مہارت کا ثبوت پیش کیا لیکن خود ان کا کہنا تھا کہ یہ سب بہ ضرورت تھا، تاکہ سامعین محظوظ ہوں اس سلسلے میں ان کی یہ غزلیں لائق توجہ ہیں۔ ؂

اے مہر اب غزل میں اشعار ہوں مقفاً — کچھ سامعوں کو ہم نے محوِ سخن نہ دیکھا

اور ؂

غزل سنائی جو تو نے ہم کو اُسے بھی اے مہر کر مقفا — ابھی تو اچھی طرح شگفتہ گلِ ریاضِ سخن نہ دیکھا

قافیہ پیمائی میں بھی امین الدولہ کی ایجاد پسند طبیعت نے بعض بڑی دلچسپ صورتیں نکال لیں مثلاً ایک غزل کے مصرعِ ثانی کو ایک فقرے کی تکرار سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی بعض شعروں کے پہلے مصرع میں چند مفرد الفاظ جمع کیے ہیں۔ ان قیود کے ساتھ بامعنی شعر کہہ لینا مشکل تھا۔ مہر کی ایسی غزل کے تین شعر یہ ہیں ؂

مرغِ جاں نے جو تجھ کو دیکھا ہے　　دم پھڑکتا ہے، دم پھڑکتا ہے
کبک ،بلبل ،پتنگ ، قمری کو　　دھیان تیرا ہے، دھیان تیرا ہے
چشم وابرو کا،عارض ولب کا　　مہر شیدا ہے، مہر شیدا ہے

امین الدولہ نے بیان ومعانی کے اصولوں کی پوری پابندی کے ساتھ شعر کہہ کر اپنی صلاحیتوں کو اہل لکھنؤ سے منوالیا تھا۔ حکیم نجم الغنی خان نے اکثر دقت طلب مسائل کے لیے اپنی ضخیم تالیف ''بحر الفصاحت'' میں ان کے کلام سے مثالیں پیش کی ہیں مثلاً۔

''14 آغا علی خاں مہر نے اس غزل کے مصرع ثانی میں پانچ چیزوں کے ذکر کا التزام کیا ہے اور مطلع کے دونوں مصرعوں میں بھی یہ رعایت ہے۔ ؎

تیرے لب ہیں سرخ ایسے جن سے اُڑ جاتا ہے رنگ　　لعل ومرجان وعقیق ولالہ وعنّاب کا
میری چشم اشک افشاں نے مٹایا نام تک　　نہر کا، چشمے کا، یم کا،حوض کا، تالاب کا
تیرے گریاں کو نہیں ڈر ہجر کی برسات میں　　برق کا، اولوں کا، مینہ کا، ہدم کا، سیلاب کا

اس سے بھی زیادہ دلچسپ وہ غزل ہے جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے ؎

اس بات میں حواسِ بشر پانچوں ایک ہیں　　احمدؐ سے تاشبیر وشبر پانچوں ایک ہیں
اس مہ سے بدحواسی دلبستگی میں مہر　　شم،ذوق،لمس،سمع،بصر پانچوں ایک ہیں

ایک اور غزل میں مہر نے سات سات چیزوں کو ایک ایک شعر میں جمع کیا ہے۔ اس کا مقطع یہ ہے۔ ؎

مطرب وساقی و مے، نہر وچمن ، شاہد ومہر　　اے خدا فرق نہ آئے کبھی ان ساتوں میں

قافیہ پیائی کے میدان میں بھی امین الدولہ نے اپنے زورِ طبیعت کے اظہار کے لیے نئی نئی صورتیں اختیار کی ہیں۔ تعداد وشمار کے بعد ظرف اور مظروف کے تعلق کا مشاہدہ ان کی اس غزل میں کیا جائے جس کا مقطع یہ ہے ؎

دکھاوں مہر میں اب زورِ بحرِ طبع رواں　　ردیف وقافیہ باندھوں حباب دریا میں

ایک غزل میں ایک سے زائد اوزان کی رعایت کا التزام کر کے شاعر نے عروض کے نکات ومسائل پر غیر معمولی دسترس کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس کا مطلع اور مقطع یہ ہے ؎

داغ ہے شمع شب تارِ فراق　　فرق ہے مجھ کو سرِ خارِ فراق
جب نظر آتا ہوں میں لوگوں کو مہر　　کہتے ہیں مجھ کو سبھی زارِ فراق

حکیم نجم الغنی خاں نے لکھا ہے کہ 15 "یہ اشعار تین وزنوں میں ہیں:

ایک۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلان

دوسرا۔ مفتعلن مفتعلن فاعلان

تیسرا۔ فاعلاتن فاعلاتن فعلان

قدرتِ کلام کے مختلف اور متعدد دلچسپ اور نادر مظاہر پیش کرنے کے بعد امین الدولہ نے اپنی استعداد کو منوالیا اور پھر تعلی اور خودستائی کے مضامین بھی نظم کیے مثلاً کہتے ہیں۔

کیوں نہ اے مہر فصاحت ہو مری باتوں میں　　کہ زبانوں میں ہے اردوے معلا سے غرض

اور

مہر پر ختم ہیں مضمونِ محبت انگیز　　یوں تو اشعار میں کیا کیا شعرا کہتے ہیں

امین الدولہ اور میر رشک کا لکھنؤ سے جو تعلق رہا تھا اس کے سبب سے ان کے لکھنوی کہے جانے پر کسی کو تامل نہیں ہو سکتا تھا لیکن ان کی زبان اور ان کا طرز بیان وفکر بھی بطور مجموعی لکھنو والوں سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس فرق وامتیاز کے اظہار کے لیے "خاندان" کی اصطلاح کا سہارا لیا گیا۔ پھر تو یہ اصطلاح ایسی رائج ہوئی کہ لکھنو کی زبان خاندانوں میں تقسیم ہو گئی مثلاً میر انیس کے خاندان کی زبان، مرزا برق کے خاندان کی زبان وغیرہ۔ میر رشک کے خاندان کی زبان سب سے الگ رہی۔ لکھنو میں ان خاندانوں کی زبانوں کے جھگڑے بھی چلتے رہے۔ بعض لوگوں نے ان پر خیال کر کے قصے اور لطیفے بھی گڑھ لیے۔ آغا اشہر لکھنوی نے بھی لکھا ہے:

"شاہی زمانہ میں آغا علی خاں شاگرد میر علی اوسط رشک مرحوم نے ایک بہت بڑا مشاعرہ کیا۔ تمام شعرائے شہر جمع تھے۔ آغا علی خاں سے میر انیس سے قدیمی چشمک تھی اس لیے خود تو نہ گئے۔ جناب آغا حیدر نیشاپوری کے وسیلہ سے آپ کو بلوایا۔ میر صاحب جناب تعشق کو ساتھ لیکر پہنچے۔ دیکھا مشاعرہ شاعروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ چوبدار سے دو کرسیاں منگوا کر باہر بیٹھے۔ آغا حیدر صاحب اور میر علی اوسط رشک

صاحب کو معلوم ہوا کہ میر صاحب آئے ہیں۔ فوراً اٹھے اور آواز دی" آیئے بھائی صاحب" انھوں نے کہا" اندر جگہ نہیں۔ جب میری باری آئیگی چلا آونگا۔" مگر انھوں نے نہ مانا اور اندر بلا لیا۔ یہ اندر جا کر بیٹھے۔ ایک شعر پر آغا علی خاں نے کہا' جناب نے تو اس زمین کا خاتمہ کر دیا۔ گویا یہ فقرہ طنز آمیز تھا۔ میر انیس نے فوراً جیب میں غزل رکھ لی۔ آغا علی خاں اور دیگر حضرات نے کہا:

" کیوں کیوں، فرمایئے فرمایئے" آغا علی خاں سے تو کچھ نہیں کہا۔ دوسروں کی طرف میر صاحب نے خطاب کر کے کہا کہ" آپ کے فرمانے کے مطابق میں نے اس زمین کا خاتمہ کر دیا اور آپ نے تعریف کا خاتمہ کر دیا۔ اب کیا پڑھوں"16

راقم کو اس قصے کے واقعی ہونے میں کئی وجہ سے شبہ ہے۔

1۔ میر انیس، مہر اور رشک تینوں ناسخ کے شاگرد تھے۔ باوجود اس کے میر انیس اور مہر کے مابین اگر قدیمی چشمک تھی تو میر انیس کا مہر کے مشاعرے میں آجانا محل تعجب ہے۔ ان کو طلب کر لینے کے بعد ان کے معاملے میں آغا علی خاں مہر کے لیے محتاط رہنا ضروری تھا۔

2۔ اپنے گھر پر بلا کر میر انیس پر طنز کرنا نہایت مذموم بلکہ ناشائستہ بات تھی جس کی آغا علی خاں سے بالکل توقع نہیں کی جا سکتی۔

3۔ طنزاً جو بات بھی کہی جائے اس کا جواب اگر بدیہی طور پر ایسا ہو جس سے طنز کرنے والے کی سبکی ہو تو ہر ہوش مند شخص ایسا طنز کرنے سے اجتناب برتے گا۔ اس حکایت میں طنز کی جو صورت ہے وہ طفلانہ ہے۔ یہ حکایت اغلب ہے کہ میر انیس کے کردار کو محمد تقی میر کا مماثل بنا دینے کے خیال سے اختراع کی گئی ہے اور اس کی کچھ اصل نہیں معلوم ہوتی ہے۔

شاعر کی حیثیت سے امین الدولہ مہر کا ذکر سب سے پہلے ابن امین الدولہ طوفان کے تذکرے میں آیا ہے لیکن اس سے ان کی شخصیت یا شاعری کے بارے میں کوئی مفید بات معلوم نہیں ہوتی ہے۔ نصر اللہ خاں خویشگی نے البتہ اتنا لکھا ہے۔

" مہر تخلص آغا علی خاں۔ از امرایان لکھنو۔ گویند کہ بالفعل در کانپور دولت سرائے ساختہ است طبع خوشے دارد۔ از معدن طبعش گوہر آبدار در چار سوئے عالم رسیدہ

است، نے نے بگر رسائش ابر نیسانے ست کہ درغرر گوہر ہائے شاہوار بر سر عالمے

رسیدہ است۔"17

احمد حسین سحران کی شاعری کا مداح معلوم ہوتا ہے۔ ان کا ذکر اس نے اس طرح کیا ہے۔

"مہر تخلص......از لطافت طبع مضامین رنگیں در شعر بندد، طبعش رو کش فصلِ بہار است

وہر مضمون تازہ را بہ دل خرید۔"18

نواب امین الدولہ مہر کا ایک دیوان چھپ گیا ہے۔ سرورق پر لکھا ہے کہ "در 1263ھ (1847) حلیۂ طبع پوشیدہ" اسی سرورق پر قطعہ تاریخ بھی ہے جس سے 1263 کے عدد برآمد ہوتے ہیں۔ صفحہ 2 سے غزلیں ردیف وار لکھی ہیں۔ صفحہ 401 پر وہ ختم ہوتی ہیں اور میر رشک کا کہا ہوا قطعہ تاریخ درج ہے۔ اس سے بھی 1263ھ سال تکمیل معلوم ہوتا ہے۔ صفحہ 402 پر "صحت نامۂ اغلاط ہے"

قاضی عبدالودود صاحب کا کہنا تھا کہ ان کا ایک دیوان اور بھی تھا لیکن اس کے بارے میں راقم کو کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔

امین الدولہ کے والد نواب معتمد الدولہ نے اپنے دور اقتدار میں مرثیہ کی جس طرح سرپرستی کی تھی اس کا حال معلوم ہے لیکن وہ بھی مرثیہ کو لکھنو میں رہ گئے۔ کانپور میں جو شاعر آئے تقریباً سب غزل گو تھے۔ غالباً خود امین الدولہ نے بھی مرثیہ نہیں کہا تھا۔ بعض مرثیے جو شعرائے کانپور نے لکھے ہوں گے چھپ نہیں سکے۔

امین الدولہ کے ہجرت کر جانے کے بعد ان کے بھائیوں نے شہر کانپور کی رونقوں میں اضافہ کرنے اور یہاں کی شعری اور علمی فضا کو برقرار رکھنے کے لیے بحد امکان کوشش کی لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ انقلاب برپا ہوگیا جس کی زد میں پورا ملک آگیا اور کانپور "ملکِ نصارا" ہونے کی وجہ سے اس کا مرکز بن گیا تھا۔ تاریخ کا ایک دور تھا جو گزر گیا۔

"باقی رہے نام اللہ کا"

2- سید- نظام الدولہ

ان کا اصل نام "سید علی" تھا۔ نواب معتمد الدولہ آغا میر کی خاص محل نواب بیگم صاحبہ کے بطن

سے تھے اور اپنے مختلف البطن بھائی نواب امین الدولہ آغا علی خاں مہر سے تقریباً چھ برس چھوٹے تھے۔ ان کے ایک ہمنام بھتیجے نواب سید علی خاں ابن معین الدولہ کی قلمی بیاض میں ان سے متعلق یہ اندراج ملتا ہے۔

''ازروئے حساب تاریخ 6/ مارچ 1816 نواب نظام الدولہ بہادر تولد شدند۔ از کاغذات نواب شرف النسا بیگم

نواب شرف النسا بیگم اس خاندان کی کوئی ایسی بزرگ خاتون معلوم ہوتی ہیں جن سے نظام الدولہ کے سالِ ولادت سے واقف ہونے کی توقع کی جاسکتی تھی۔ وہ پڑھی لکھی اور باشعور خاتون تھیں اور انھوں نے اس اندراج میں مہینہ اور تاریخ کو بھی شامل کرلیا تھا۔ اس اندراج کی روشنی میں نظام الدولہ کا ازروئے تقویم ربیع الاول 1231 ھ میں پیدا ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ان کی ولادت ان کے والد کے لئے مبارک ثابت ہوئی کیونکہ اسی زمانے میں ان کو نواب غازی الدین حیدر کی نیابت سے دوسری بار سرفرازی ملی تھی۔

نظام الدولہ کا مولد لکھنؤ تھا۔ ابتدائی تعلیم وتربیت اسی شہر میں ہوئی تھی۔ جب یہ تین برس کے ہوئے تو غازی الدین حیدر نے بادشاہت کا اعلان کیا۔ نواب معتمد الدولہ کو وزارت ملی اور ان کے دوسرے بیٹے سید علی کو ان خطابوں سے معزز وممتاز کیا گیا:

نظام الدولہ، امیر الملک، نواب سید علی خان بہادر دلاور جنگ''

یہ آٹھ برس کے ہوئے تو 1239ھ (24-1823) میں ان کا ختنہ ہوا۔ وہ زمانہ معتمد الدولہ کے عروج کا تھا بڑی خوشی منائی گئی۔ ''سیم وزر'' لٹایا گیا۔ ناسخ نواب کے مقرب خاص تھے۔ انھوں نے قطعہ تاریخ کہہ کر نذر کیا۔

نشاطِ ختنۂ سید علی خاں    بہ آقائے جہاں مسعود بادا
زدستِ جود سیم و زر فشاندن    بہ فیاضِ جہاں مسعود بادا
فزوں ہر بزم بود حشمت الٰہی    بگویم ہر زماں مسعود بادا
شدہ ازواشدِ دلہا ہمہ بزم    برنگِ بوستاں مسعود بادا

زرعبِ صیحۂ کوسِ شکوہش عدو شد بے نشاں مسعود بادا
برائے سالِ تاریخ ہمایوں بگو تاریخ خناں مسعود بادا

1239ھ

محرم 1241ھ مطابق اگست 1925 کو جو عہد نامہ سرکار کمپنی بہادر اور بادشاہ غازی الدین حیدر کے مابین ہوا تھا اس میں نظام الدولہ کے لیے الگ تنخواہ مقرر نہیں ہوئی تھی۔ اس بنا پر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے صرف دو برس بعد معتمد الدولہ معزول ہو کر نظر بند ہو گئے تھے۔ اس لیے نظام الدولہ کی پہلی شادی معتمد الدولہ کے شہر کانپور میں پہنچ جانے کے بعد کسی وقت ہوئی ہوگی اور یہ خاندان ہی کی کسی لڑکی سے ہوئی ہوگی۔ نواب سید علی خاں کی بیاض میں ایک اندراج یہ ہے:

> "نواب بہو بیگم صاحبہ، محل نواب نظام الدولہ، دختر نواب روشن الدولہ بہادر وزیر شاہ اودھ"

یہ نظام الدولہ کی دوسری بیگم تھی۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ لکھنو کے قیام کے زمانہ میں نواب روشن الدولہ بن مظفر علی خاں کے ساتھ معتمد الدولہ کے اچھے مراسم تھے بلکہ روشن الدولہ ان کے مقرب اور دوست تھے۔ ان کی کوششوں سے روشن الدولہ کو وقار حاصل ہوا تھا۔ حکیم نجم الغنی خاں نے لکھا ہے:

> "(معتمد الدولہ نے) مرزا محمد حسن پسر نواب روشن الدولہ کو سلیمان شکوہ کی دوسری بیٹی کے ساتھ بہ زور و ظلم منعقد کیا۔"19

اس رشتہ سے روشن الدولہ کا ایک طرف دہلی کے شاہی خاندان سے سمدھیانہ ہو گیا اور دوسری طرف اس بنا پر کہ سلیمان شکوہ کی ایک بیٹی کی غازی الدین حیدر کے ولی عہد نصیر الدین حیدر سے شادی ہوئی تھی، روشن الدولہ کا بیٹا لکھنؤ کے ولی عہد کا ہم زلف بھی ہو گیا۔ بعد کے زمانے میں جب روشن الدولہ کو عروج ہوا تو انھوں نے اس احسان کا بدلہ اس طرح دیا کہ اپنی اس بیٹی کی جو ان کی منکوحہ کے بطن سے تھی معتمد الدولہ کے دوسرے بیٹے نظام الدولہ کے ساتھ شادی کر دی۔ سسرال میں آ کر یہ "نواب بہو بیگم" کہلائی۔

اپنے والد کی رحلت کے وقت نظام الدولہ کی عمر سولہ برس سے کچھ زیادہ تھی۔ چند سال تک انھوں نے اپنے بڑے بھائی آغا علی خاں کے ساتھ بسر کی۔ تعلیم و تربیت بھی انھیں کی نگرانی میں ہوئی ہوگی۔ لکھنؤ کی سیاست میں اتار چڑھاؤ آتے رہے۔

منتظم الدولہ کے معزول ہو جانے کے بعد وزارت نواب روشن الدولہ کو ملی۔ نجم الغنی نے لکھا ہے:

> ''14 جمادی الآخر 1248ھ مطابق ماہ نومبر 1833 کو روشن الدولہ وزیر ہوئے ان کا نام محمد حسین خاں اور عرف مرزا نقو اور خطاب روشن الدولہ، منیر الملک محمد حسین خاں بہادر قایم جنگ ہے اور بعض نے صولت جنگ لکھا ہے۔''20

روشن الدولہ کو یہ منصب نواب قدسیہ محل بیگم کی سعی و سفارش سے ملا تھا۔ ابھی دو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ بیگم صاحبہ نے رحلت کی۔ اس سے روشن الدولہ کو بھی دھچکا لگا۔ رشک نے اپنے قطعہ تاریخ میں کہا تھا۔ ؎

دلِ عالم از یں غمِ جانکاہ    شد ملول و شکستہ خاطر ہائے

اور تاریخ اس مصرعے سے نکالی ۔    نیمہ ماہِ ربیع آخر ہائے

1250ھ

روشن الدولہ نے دانائی سے کام لے کر 12۔ رجب 1250ھ (نومبر 1834) کو اپنی سگی بہن گمانی خانم کی بیٹی قمر طلعت بیگم کی شادی نصیر الدین حیدر کے ساتھ کرادی اس کے بعد نصیر الدین حیدر خود کو روشن الدولہ کے دامادوں میں شمار کرنے لگے۔ ان کی خاطر سے محبوبن کسبی کو سرفراز محل خطاب عطا کیا اور اس کے بیٹے مرزا محمد حسن کو شاہی لشکر کا جرنیل بنادیا۔ حکیم نجم الغنی کا بیان ہے:

> ''جب روشن الدولہ کی وزارت کو بخوبی استقلال حاصل ہوگیا تو جرنیلی کا خلعت اپنے بڑے بیٹے مرزا محمد حسن کو دیا اور اس کی نیابت پر راجا لالجی آتو جی کی سفارش سے مقرر ہوا اور سبحان علی خاں کے ہاتھ میں وزارت کے تمام کاموں کا حل وعقد تھا''21

معتمد الدولہ کے احسانات اور قرابت پر خیال کر کے روشن الدولہ نے نظام الدولہ اور ان کے بھائیوں کے لیے بھی ضرور کوشش کی ہوگی لیکن غالباً نصیرالدین حیدر ان کو کوئی منصب دینے کے لیے رضامند نہ ہو سکے۔ اتنا ضرور ہوا کہ معتمد الدولہ کی جو املاک اور جائداد لکھنؤ میں تھی وہ ان کے بیٹوں کے حق میں واگذاشت ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جائداد کے معاملوں میں نظام الدولہ کی جو اس وقت وزیر اودھ کے داماد بھی تھے بڑے بھائی امین الدولہ سے کچھ اَن بَن ہوگئی۔ بڑی اچھی بات یہ ہوئی کہ دونوں بھائیوں نے معاملات کو آپس کی بات چیت سے طے کر لیا اور جو فیصلے ہوئے ان کو تحریری شکل دے دی گئی۔ اس موقع پر بڑے بھائی نے چھوٹے کو صلح کا خلعت بھی عطا کیا۔ میر رشک نے کہ جو دونوں کے استاد اور بہی خواہ بھی تھے خوش ہو کر اس صلح سے متعلق چند قطعات تاریخ کہے۔ ایک یہ ہے۔

مل گئے آپس میں یہ دو مہر وماہ — ہوگیا تحریر سے ملنا سند
صلح کا نواب نے خلعت دیا — رہ گئے کھاتے ہوئے حاسد حسد
مصرع تاریخ لکھا رشک نے — آج ہوا خلعتِ صلحِ ابد

1251ھ

معلوم ہوتا ہے بعض لوگ ان بھائیوں کے میل جول اور اتفاق و اتحاد کی وجہ سے حسد رکھتے تھے اور انھیں کی ریشہ دوانیوں سے وہ فتنہ پیدا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ صلح کرانے میں میر رشک کی کوششوں کو بھی دخل رہا ہو۔

یہ صلح اس اعتبار سے بھی بہت اچھی رہی کہ کچھ ہی مدت کے بعد روشن الدولہ معزول ہوئے اور محمد علی شاہ کے حکم سے جلاوطن ہو کر کانپور میں آگئے۔ مشہور تھا کہ ملک کی آمدنی کا پانچواں حصہ روشن الدولہ کی جیب میں آتا تھا۔ انھوں نے بہت دولت جمع کر لی تھی۔ کانپور میں کچھ عرصے تک وہ عیش سے رہے اور بعض شاعروں کی سرپرستی بھی کرتے رہے لیکن پھر ان کے بیٹے نے ان کی دولت پر قبضہ کر لیا اور کانپور میں ایک محلّہ جرنیل گنج آباد کیا۔

روشن الدولہ نے ساٹھ برس کی عمر پا کر مفلسی میں 12رجب 1269ھ مطابق 23اپریل 1853 کو وفات پائی۔ جنازہ کانپور سے لکھنو لا کر دفن کیا گیا۔

روشن الدولہ کی طرف سے بھی نظام الدولہ کو بہت کچھ ملا ہوگا چنانچہ وہ بھی کانپور میں بڑی آن بان سے بسر کرتے تھے۔ منیر شکوہ آبادی ان کے متوسّل تھے۔ ان کے پہلے دیوان میں نظام الدولہ کے دوسرے بیٹے کی ولادت سے متعلق تین قطعات تاریخ درج ہیں۔ ایک یہ ہے:-

"تاریخِ تولدِ فرزند بہ مشکوے حضورِ پُر نور نواب نظام الدولہ بہادر"

حق نے دیا حضور کو فرزند دوسرا　　یہ گوہرِ گرامیِ دریائے جود ہے

تاریخ یہ منیر نے اس ماہ کی کہی　　نورِ جہانِ قدرتِ ربِّ ودود ہے

1256ھ

قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ پہلا بیٹا 1254ھ (1838) میں یا اس سے پہلے پیدا ہوا ہوگا۔ باقی اولادیں بعد کی ہوں گی۔ نواب سید حیدر علی خاں نے ان کے نام اس طرح بتائے تھے۔

| | | |
|---|---|---|
| نواب سلطان بیگم | نواب رئیس بیگم | نواب رضا علی خاں بہادر |
| نواب سیدہ بیگم | نواب بیگم | نواب احمد علی خاں بہادر |
| نواب امیر علی خان بہادر | | |

یہ نہیں معلوم کہ ان میں بڑا اور چھوٹا کون تھا۔

ان میں سے نواب حیدر علی خاں نے آخر الذکر یعنی امیر علی خاں کی اولاد کے نام اس طرح بتائے تھے۔

| | | |
|---|---|---|
| نواب حسن علی خاں بہادر | نواب حیدر علی خان بہادر | نواب طاہر النسا بیگم |
| نواب زینت بیگم | نواب خدیجۃ الکبریٰ بیگم | نواب حیدری بیگم |

نظام الدولہ نے شاعری کی ابتدا شہر کانپور میں کی ہوگی۔ یہاں چونکہ ناسخ موجود تھے۔ یہ شروع شروع میں انھیں سے کسبِ فیض کرتے رہے لیکن بعد میں میر رشک کے شاگرد ہو گئے تھے۔ شاعری اور زباندانی کے ساتھ ساتھ شاگردوں کی تربیت اور اصلاح کے باب میں بھی رشک ناسخ کے شاگرد رشید تھے چنانچہ منیر شکوہ آبادی نے اعتراف کیا ہے کہ۔

تصحیح میں ہیں رشکِ گروہِ معاصرین　　تحقیق میں ہیں فخر اماثل جنابِ رشک

شاگرد پروری میں ہیں استادِ بے نظیر　　حل کر گئے ہیں عقدۂ مشکل جنابِ رشک

وہ اپنے شاگردوں سے واقعی محبت کرتے تھے اور ان کی بہتری کے لیے ہر طرح کوشاں رہتے تھے۔ واقعات شاہد ہیں کہ کلام کی اصلاح سے قطع نظر وہ اپنے شاگردوں کی خوشی اور ترقی سے بہت خوش اور ان کی پریشانی کی خبر سے نہایت ملول ہوتے تھے ان کے والد اور بڑے بھائی کی وجہ سے نظام الدولہ کے ساتھ میر رشک کو خصوصیت تھی۔ استاد کے فیضِ تربیت سے نظام الدولہ کا شمار جلدی ہی اس زمانے کے قابلِ ذکر شاعروں میں ہونے لگا تھا۔ سعادت خاں ناصر نے اپنے تذکرے میں ان کی کئی غزلوں کے اشعار درج کیے ہیں کچھ شعر یہ ہیں۔

چٹکی لی، جاں کسی کی نکلی — یہ نئی وضع ہنسی کی نکلی
ایک بھی زخم پہ چھڑکا نہ نمک — ہر جفا آپ کی پھیکی نکلی

بتخانوں میں بھری ہوئی خلقت خدا کی ہے — بُت بھی خدائی کرتے ہیں، قدرت خدا کی ہے
عالم جدا یہاں ہے دو عالم سے اے بُتو — پردے میں دل کے اور ہی خلقت خدا کی ہے
بیجا نہیں حسینوں کی یہ لَن ترانیاں — اے غافلو یہ حسن امانت خدا کی ہے

چھلے کا کھاے تیرے گل اے یار ہاتھ میں — گلدستہ ہے کہ پھولا ہے گلزار ہاتھ میں
ابرو سے خونِ خلق کرے کیوں نہ چشم یار — دیتا ہے کوئی مست کے تلوار ہاتھ میں
اللہ رے فیضِ دست کہ چھوتے ہی ہو گیا — پھولوں کا ہار موتیوں کا ہار ہاتھ میں
کیونکر نہ دست بستہ رہوں پیش چشم یار — رکھنا ضرور ہے دلِ بیمار ہاتھ میں
سید کبھی نہ طالب اکسیر ہوں جو آئے — خاکِ مزارِ حیدر کرّار ہاتھ میں

ان شعروں سے مذہب اور خدا پرستی کی طرف شاعر کی طبیعت کا رجحان صاف جھلکتا ہے دوسری غزل کی ردیف اور تیسری غزل کا مقطع اس اعتبار سے توجہ طلب ہے۔ کانپور کے مخصوص ماحول میں جس قسم کی ردیفوں کے اختیار کا چلن تھا وہی صورت نظام الدولہ کی ان غزلوں میں بھی ہے۔ پہلی غزل کے دوسرے شعر میں قافیہ کی ندرت داد طلب ہے۔ تمام شعر معنی آفرینی اور تلاشِ مضمونِ تازہ کے شوق کے آئینہ دار ہیں۔ نو عمری میں نظام الدولہ کو رعایت لفظی سے بہت دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔

نظام الدولہ کے وثیقہ کی رقم ان کے بڑے بھائی امین الدولہ کے مقابلے میں کم تھی۔ ان کی جائداد اور املاک بھی نسبتاً کم رہی ہوگی البتہ سسرال سے جو ملا ہوگا اس نے وقتی طور پر اس کمی کو ضرور پورا کر دیا ہوگا۔ انھوں نے اپنے والد کا عروج و اقتدار بھی کم دیکھا تھا۔ باوجود اس کے مزاج رئیسانہ پایا تھا۔ حوصلے بلند تھے۔ اپنے بڑے بھائی کی طرح شہر کانپور کی رونقوں کے لیے ہمیشہ ساعی رہے۔ امین الدولہ کی والدہ یعنی نواب خرد محل (بی جان) صاحبہ بھی ان کے ساتھ شفقت سے پیش آتی تھیں۔ 1255ھ (1839) میں انھوں نے خلعت عطا کیا۔ منیر شکوہ آبادی نے قطعہ تاریخ کہا:

''تاریخ خلعت یافتن امیر کبیر نواب نظام الدولہ بہادر از نواب خرد محل صاحبہ''

آخری شعر اس قطعہ کا یہ ہے ؎

چنیں گفت تاریخ خلعت منیر　　ہمایوں بود خلعت داوج وجاہ

1255ھ

منیر نے اس خلعت کے ملنے کی تقریب کا بیان نہیں کیا ہے۔ بہر حال اس سے اتنی بات متعین ہو جاتی ہے کہ 1255ھ (1839) میں یا اس سے پہلے منیر نے نظام الدولہ کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اس ملازمت کے بارے میں انھوں نے خود لکھا ہے کہ:

''ملازمت و علاقۂ مصاحبت امیر کبیر نواب نظام الدولہ خلفِ اوسط نواب معتمد الدولہ بہادر مرحوم از گوشۂ ابر زدہ ابر آمدہ سر از گریبان ارتفاع برآوردم۔'' 22

نظام الدولہ کی ملازمت سے فائدہ ہوا کہ کانپور کے سبھی روسا منیر سے بخوبی متعارف ہو گئے اور بعد میں ان میں سے بیشتر نے اپنے اپنے طور پر ان کی سرپرستی کی۔ یہ بھی ہوا کہ محسن کے تذکرہ سراپا سخن کے لیے کانپور میں مشاعرے ہوتے تھے ان میں سے کم سے کم ایک کا اہتمام منیر نے کیا تھا۔ اس تذکرہ میں ہے:

''طرح کانپور، مشاعرۂ سید اسماعیل منیر ع روشن ابھی ہو جائیگا نقشا مرے دل کا'' 23

محسن کے تذکرے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نظام الدولہ کی سرپرستی میں بعض شاعر اور بھی

تھے مثلاً

''داروغۂ سرکار نظام الدولہ بہادر، میر علی حسین، روشن خلف میر جلیل فیض آبادی مقیم،

لکھنو،صاحب دیوان شاگرد رشید مولوی محمد بخش شہید''24

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر کی شادی روشن الدولہ کی ایک بیٹی سے ہوئی تھی جو محبوبن کسی کے بطن سے تھی۔ اس رشتے سے وہ نظام الدولہ کے ہم زلف ہوتے تھے۔ بخوبی ممکن ہے کہ اس تعلق سے وہ بھی کانپور آتے جاتے رہے ہوں۔ کانپور کے تفریحی مشاغل میں بھی نظام الدولہ حسب موقع حصہ لیتے تھے۔ وہ دریا کی سیر بھی کرتے تھے۔ انھوں نے بجرے کی سواری کی تو منیر نے یہ قطعہ تاریخ نذر کیا:

''تاریخ سواری نواب نظام الدولہ بہادر در بجرہ''

نواب نامدار جو بجرے میں ہیں سوار مدحت سرا زبان ہے ہر شیخ و شاب کی
اب عرض کر جلوس کی تاریخ اے منیر ہے آج برج حوت میں جا آفتاب کی

1256ھ

یہ افسوس کی بات ہے کہ معاصر تذکرہ نویسوں نے خوش معرکۂ زیبا کے اندراج پر نہ کوئی اضافہ کیا اور نہ نظام الدولہ کا نیا کلام ہی نقل کیا ہے۔ محسن نے البتہ یہ اطلاع دی ہے کہ وہ ''صاحب دیوان'' تھے۔ نہیں معلوم کہ ان کا دیوان چھپ سکا تھا یا نہیں۔

نظام الدولہ بھی اپنے والد کی طرح باشعور اور بیدار مغز شخص تھے۔ کانپور میں رہ کر انھوں نے اس زمانے کی انگریزوں کی مختلف تنظیموں سے متعلق نہ صرف واقفیت حاصل کر لی تھی بلکہ بعض سے بذاتِ خود تعلق بھی پیدا کر لیا تھا۔ مقامی تنظیموں اور کلبوں وغیرہ کے علاوہ اس زمانے میں ایک زبردست بین الاقوامی تنظیم ''فری میَسن'' (FREE-MASON) کے نام سے تھی جسے ہندستانی عام طور سے ''فری مشن'' کہتے تھے اور عام خیال یہ تھا کہ یہ ایک خفیہ تحریک تھی جس کے اراکین سرکار انگریزی کے بہت معتمد اور خاص لوگ ہوتے تھے اور یہ شرط تھی کہ کوئی رکن تنظیم کے راز فاش نہیں کریگا۔ ہر رکن پر بہ شرطِ استطاعت دوسرے رکن کی مدد لازم تھی۔ نظام الدولہ بھی اس تنظیم کے رکن ہوگئے تھے اور اس واسطے سے بھی سرکار انگریزی میں ان کا اثر، اعتبار اور رسوخ زیادہ ہوگیا تھا۔ اس قسم کی تحریکوں سے متعلق ہونے کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے

معمولات میں انگریزی تمدن اور معاملات خاصی حد تک دخیل ہو گئے تھے۔ قیاس چاہتا ہے کہ براہ راست نہ سہی، بالواسطہ طور سے وہ انگریزی زبان وادب سے بھی کسی قدر ضرور واقف رہے ہوں گے۔ ان تمام امور کو شہر کانپور کے فیوض میں ہی شمار کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ لکھنو کا ماحول مختلف تھا۔ مرزا محمد ہادی رسوا نے لکھا ہے:

''اس شہر (لکھنؤ) میں کسی نئی بات کا رواج مشکل سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً اب تمام عالم حرکتِ ارض کا قائل ہے مگر آپ کو ہر گلی کوچے میں ایسے کٹ مُلا مل جائیں گے جو ابطالِ حرکتِ ارض پر بحث کرنے بیٹھیں تو دماغ پریشان کر دیں...... خیالات کی آزادی اور علم کی ترقی کے اسباب زمانے نے فراہم کر دیئے مگر یہاں اس کا کوئی اثر محسوس نہیں ہو سکتا۔ کوئی کتاب لکھیے کوئی اخبار نکالیے، اس شہر میں کوئی پوچھنے والا نہ نکلے گا، اس لیے کہ یہ خیال دلوں میں سمایا ہوا ہے کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں، پھر ہمیں کچھ لکھنے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے.......... پرانے خیالات کی تاریکی نے آنکھوں پر غفلت کے جو پردے ڈال دیے ہیں ان کا اٹھنا محال ہے۔''25ے

شہر کانپور نیا آباد ہوا تھا۔ انگریزوں کی عملداری ہونے کے سبب یہاں سات سمندر پار کی ایجادیں، وہاں کے خیالات، وہاں کی زبان، وہاں کی معاشرت اپنا اثر جما رہی تھی۔ شہر کی تعمیرات وغیرہ میں بھی ان سب کو دخل تھا چنانچہ لکھنو کے امیروں اور رئیس زادوں کے لیے بھی اس شہر میں بڑی کشش تھی۔ وزیر السلطان محمد امیر علی خاں بہادر یہاں آئے نواب نظام الدولہ سے ملاقات کی۔ بہت متاثر ہوئے۔ لکھتے ہیں:

''چوں از اکبرآباد مراجعت نمودم، گذرم بہ کانپور افتاد۔ حکّامِ والا مقام نہر اندریں شہر باکمال خوبی آوردہ اند۔ آبش نہایت لطیف است ومقامِ عساکر سرکاری نیز نہایت پُر فضا ونظیف وخوشنما اگرچہ شہر کلاں نیست فاما صاف وآبادان خیلے است بملاقات نواب نظام الدولہ بہادر خلف الصدق نواب معتمد الدولہ مرحوم سرمایۂ مسرت بہرہ اندوختم کہ مکارمِ اشفاق آں یگانۂ آفاق را تا زندہ ام بہ یاد دارم۔''25ے

خیال کرنے کی بات ہے کہ یہ وہی کانپور ہے جسے چند سال پیشتر مرزا رجب علی بیگ سرور نے "کوردہ" کہا تھا اس اقتباس میں مقامِ عساکرِ سرکاری سے مراد جوہی کا علاقہ ہے جس کی رونقوں کا اندازہ میر رشک کے اس مصرعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ ع

لوگ جوہی میں تماشائے چمن کرتے ہیں

کانپور میں ایک محلہ جرنیل گنج تھا جس میں نواب روشن الدولہ کی دولت صرف ہوئی تھی اور جہاں ناچ گھر قدیم بھی واقع تھا۔ ایک پرانا محلہ گوال ٹولی تھا جہاں نظام الدولہ اور ان کے اقربا وغیرہ رہتے تھے۔ یہاں وزیر السلطان نے بجلی اور پانی کے نظام کے علاوہ اور بھی بعض نئی انگریزی مصنوعات ملاحظہ کی ہوں گی۔ ایک محلہ پٹکاپور تھا جہاں نواب دولہا کا محل اب بھی زبانِ حال سے اپنی عظمت کی داستاں سنا رہا ہے۔ کانپور کے اس زمانے کے محلوں میں گلشن بازار، سرسیا گھاٹ، نیا چوک وغیرہ بھی قابلِ ذکر تھے۔

جولائی 1856 (شوال 1272ھ) میں واجد علی شاہ بادشاہِ لکھنؤ بہ نفسِ نفیس یہاں تشریف لائے۔ نظام الدولہ کے مہمان ہوئے۔ کمال الدین حیدر نے لکھا ہے:

"بادشاہ کانپور میں مہمان نظام الدولہ ہوئے۔ بعد دو تین دن کے سامان برسات درست کر کے الہ آباد کو چلے" 27

انگریزوں کی بعض مصنوعات کا جو برسات کے موسم میں کام آنے والی تھیں مثلاً باراں کوٹ وغیرہ کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ چیزیں اسی صنعتی شہر میں بہ آسانی مل سکتی تھیں۔ دریائی سفر کے لیے بھی یہاں بہ آسانی تمام ضروری اشیا دستیاب ہو سکتی تھیں۔ یہ سب انتظام نظام الدولہ نے کیا اور پھر بادشاہ کو ان کی منزل تک پہنچانے کے لیے کلکتہ تک تشریف لے گئے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے لکھا ہے:

"سید تخلص نظام الدولہ سید علی خان............خلف معتمد الدولہ باشندۂ لکھنو مقیم کانپور شاگرد رشک۔ اٹھارہ سو چھپن عیسوی میں کلکتے میں آئے تھے۔ صاحب دیوان ہیں" 28

نظام الدولہ کی کلکتہ سے واپسی کا حال کمال الدین حیدر نے اس طرح بیان کیا ہے:

"نظام الدولہ سید علی خاں بیٹے نواب معتمد الدولہ کے کانپور سے کلکتہ فقط اپنے خلوص

محبت سے گئے تھے۔ ایک دن سید حسین پسر محتوب شاہی کو بےخبری سے اپنی گاڑی میں
سوار ہوکر جا رہے تھے کہ داخل درِ دولت ہوں۔ دربان نے منع کیا کہ آپ کے واسطے حکم
حاضر ہونے کا نہیں ہے۔ گفتگو ہوئی۔ آخر بددماغ ہوکر چلے گئے۔ حضورِ عالم سے
رخصت ہوکر کانپور چلے آئے۔ ہر چند بادشاہ نے کہا کہ ان کے لیے ممانعت نہیں تھی
لیکن وضع داری پر کام فرمایا۔ پندرہ ہزار کے عبث زیرِ بار ہوئے۔''29

اس واقعہ سے نظام الدولہ کی خودداری، وضعداری مہر و مروّت کے ساتھ ساتھ اُن کی آن بان کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

نظام الدولہ کو کانپور آئے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ غدر ہو گیا۔ یہ شہر انگریزوں کی عملداری میں تھا اس لیے یہاں ہنگامہ کا زیادہ زور رہا۔ حفاظت کے خیال سے نظام الدولہ اور ان کے بیشتر اعزا لکھنؤ چلے گئے۔ حکومتِ انگریزی کو استقلال ہوا تو سارے ہی ہندستانی عتاب میں آئے۔ نظام الدولہ بھی پکڑے گئے بقول کمال الدین حیدر:

''نواب نظام الدولہ سید علی خاں اس ہنگامہ میں لکھنؤ چلے آئے تھے۔ جب کانپور گئے
بہ ہزار خرابی بعد کئی برس کے وثیقہ جاری ہوا۔ ایک وجہ اور بھی تھی کہ یہ فریمشن تھے۔
اس جہت سے اس فرقۂ خاص میں طریق حق برادری ایک دوسرے پر بہ شرط اختیار
لازم ہوتا ہے''30

نظام الدولہ بہت شاہ خرچ تھے۔ بات بھی صحیح تھی۔ خودداری، وضعداری بغیر دولت کے صَرف کے نہیں نبھ سکتی۔ وثیقہ کی مد سے انھیں کُل ساڑھے چار ہزار روپے ملتے تھے۔ کچھ کانپور اور لکھنؤ کی املاک سے بھی یافت ہو جاتی ہوگی لیکن مصارف کی زیادتی سے آخر زمانے میں قرضوں سے گراں بار ہو گئے تھے۔ ان کی ادائیگی کی فکروں میں مبتلا رہ کر پیرانہ سالی میں وفات پائی۔ نواب سید علی خاں پسر معین الدولہ کی بیاض میں لکھا ہے:

''تاریخ ہفتم ہم ذی الحجہ 1304ھ مطابق 6 ستمبر 1887 عیسوی شب چہارشنبہ
وقت نہ و نیم ساعت سرکار فیض آثار امیر الملک نواب نظام الدولہ سید علی خان بہادر
دلاور جنگ جنت مقام عازم دار البقا شدند۔ عمر شریف 72 سال۔''31

3- ساحر- معین الدولہ

یہ نواب معتمد الدولہ آغا میر کے تیسرے بیٹے اور نظام الدولہ کے سگے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کا اصلی نام باقر علی تھا۔ یہ نظام الدولہ سے اگر دو برس چھوٹے ہوں تو ان کا سال ولادت 1233ھ (1818) ہوگا۔ غازی الدین حیدر کے اعلانِ بادشاہت کے وقت ان کی عمر کوئی ایک برس کی تھی۔ اسی زمانے میں ان کو یہ خطاب عطا ہوئے تھے:

''معین الدولہ نواب انتظام الملک سید باقر علی خاں بہادر ظفر جنگ''

معین الدولہ بہ مشکل چودہ برس کے تھے جب یتیم ہو گئے تھے۔ مختلف البطن بڑے بھائی نواب امین الدولہ نے اپنی سرپرستی میں ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ انھوں نے لکھنؤ کے شاہی دربار کی شان و شوکت نہ دیکھنے کے برابر دیکھی تھی۔ شہر کانپور میں جہاں ''نصارا کا عمل'' تھا ہوش سنبھالا تھا۔ اس شہر سے ان کو جو تعلقِ خاطر ہو سکتا تھا وہ لکھنؤ سے نہیں تھا۔ یہیں ان کے والد کا مقبرہ بھی تھا جس سے جذباتی لگاؤ کا ہونا قدرتی تھا۔

1251ھ (1835) میں جب بھائیوں کے مابین بات چیت کے ذریعہ معاملات طے ہو کر تحریر میں آ گئے، معین الدولہ بھی اپنے حصے کی املاک کے ذمہ دار ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ برس کے قریب تھی۔ غالباً اسی زمانے میں ان کے نام الگ سے وثیقہ جاری ہو گیا اور انھیں اپنی صلاحیتوں کو روبکار لانے کے مواقع مل گئے ہوں گے۔

معین الدولہ کے تین بیٹے تھے:

نواب سید علی خان بہادر       نواب جعفر علی خان بہادر

اور تیسرے کا نام نواب حیدر علی خان بہادر کو یاد نہیں رہا۔ جس زمانے میں معین الدولہ غدر کے ہنگاموں کی پاداش میں قید تھے، ان کے یہ تیسرے صاحبزادے کمسنی میں 75-1274ھ (1858) میں فوت ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں معین الدولہ نے جو مصیبتیں جھیلی تھیں ان کی تفصیل اس طرح ہے:

''یہ (معین الدولہ) بھی لکھنؤ چلے آئے تھے اور سب کے ساتھ جان بچا کر بھاگے تھے۔ بہ وقت امان لکھنؤ سے گرفتار ہو، بہ سواری اونٹ بہ ہزار ذلت کانپور گئے۔

حاکم عدالت نے بعد روبکاری کے مقید کیا۔ گھر کا اسباب ضبط ہو کر نیلام ہو گیا۔ کئی مہینے تک قید رہے۔ بہت سی تکلیفیں اٹھائیں۔ اسی قید میں ان کا بیٹا بھی مر گیا۔ ننھے نواب نے چاہا کچھ میں مدد کروں۔ اپنی غیرت نے قبول نہ کیا۔ پھیر دیا اور کسی عزیز کے شرمندۂ احسان نہ ہوئے۔ ایک مہاجن ان کا بقدر کفاف یومیہ دیا کرتا تھا بہ امید انشاء اللہ۔ اسی میں گزران کیا کرتے تھے اور بہ ظاہر صاحب عدالت کے خلاف ہونے سے صورت نجات مشکل معلوم ہوتی تھی۔ آخر احمد علی خاں وکیل عدالت اور نیجر صاحب نے ایک صورت نکالی۔ اسی عرصہ میں نواب خُردمحل نے کربلا سے جوشش مادری سے چھ ہزار خرچ کو باب رہائی میں بھیجے۔ بعد کئی مہینے کی روبکاری کے بہ حکم کچھ تخفیف زنداں ہوئی۔ آخر بے جُرمی ثابت ہوئی۔ صاحب عدالت کو بہ سبب نافہمی مقدمہ الزام ہوا۔ مستحق پانے اپنے وثیقہ کے ہوئے۔ پھر لکھنؤ چلے گئے۔ مزاج میں تمکنت وغرور امارت بہت تھا اور اپنی قابلیتِ علمی کو سب سے بہتر سمجھتے تھے۔ آخر انتقال کیا۔ دو بیٹے ہیں آپس میں اتفاق رکھتے ہیں۔ ایک صاحب کربلا بھی ہو آئے ہیں۔ صحبت بہت معقول ہے۔ لوگ ان کے چلن کی ہر طرح سے تعریف کرتے ہیں۔''32

غدر کی تباہی اور مصیبتوں کو معین الدولہ نے جس استقلال سے برداشت کیا اس کی مثال کم ملے گی۔ ننھے نواب مختلف البطن اور چھوٹے بھائی تھے۔ ان سے مدد قبول نہ کی البتہ ان کی ماں یعنی نواب خردمحل کے پاس سے جو رقم آئی اسے منظور کر لیا کہ وہ سوتیلی سہی لیکن ماں تھیں اور ان کی یہ دل سے عزت کرتے تھے۔ انگریزی حکومت کے معاملات کے سلسلے میں یہ واقعہ توجہ طلب ہے کہ اگر چہ وہ ابتلا کا دور تھا اور معین الدولہ پر بغاوت کرنے اور باغیوں کو مدد دینے کا الزام تھا، جب ثبوت مل گیا تو صاحب عدالت کو بھی نافہمی مقدمہ کے لیے الزام ہوا۔ تعصّبات کے باوجود اس حکومت میں حاکمِ عدالت کے لیے بے انصافی کرنا آسان نہیں تھا۔ نواب معین الدولہ کی رہائی کی خبر سُن کر منیر شکوہ آبادی نے دو قطعے نذر کیے، ایک یہ ہے:

''تاریخ رہائی نواب معین الدولہ باقر علی خان''

جب ہوئے آپ جدا گوشہ تنہائی سے　　　غل ہوا یوسف، تو چاہِ محن سے نکلا
میرے دل نے یہ کہا مصرع تاریخ منیر　　　ہوگئی آج خوشی، چاند گہن سے نکلا

1275ھ

اوران کے دوسرے قطعہ کا مصرع تاریخ اس طرح ہے ؎

دائم ایں حشمت واقبال مبارک بادا

1275ھ

نواب معین الدولہ ذی علم اور علم دوست شخص تھے۔ انھوں نے عمر کچھ زیادہ نہیں پائی تھی۔ کل اٹھاون برس کے سن میں رحلت کی۔ اس میں بھی کئی برس پریشانیوں اور مصیبتوں میں گذر گئے تھے۔ منیر شکوہ آبادی نے ان کی وفات کا قطعہ تاریخ اس طرح کہا تھا:

''تاریخ رحلت نواب معین الدولہ باقر علی خاں بہادر ظفر جنگ''

خلفِ معتمدالدولہ معین الدولہ　　　نام باقر علی و خان وظفر جنگ خطاب
صاحب علم و سخن سنج و تخلص ساحر　　　نظم تو نظم، نہیں نثر کا بھی ان کی جواب
فارسی گولیوں میں تھے اہلِ زباں کی مانند　　　قدردانِ علما، مجمع علم و آداب
شاعرو زاہدو دیندارو امیرِ نامی　　　حصرِ اوصاف وفضایل کو ہے درکار کتاب
آج دنیا سے گئے سوئے عدم وا سفا　　　کانپور آتشِ اندوہ سے ہے سینہ کباب
بخش دے آلِ محمدؐ کے طفیل ان کو خدا　　　عیش وعشرت سے رہیں خلد میں تا روزِ حساب
خواب میں ہاتھ لگا مصرع تاریخ منیر　　　واردِ گلشنِ فردوس گرامی نواب

1291ھ

اس قطعہ کو کلیاتِ منیر سے نقل کر کے راقم نے نواب حیدر علی خان بہادر نبیرۂ معین الدولہ مرحوم کی خدمت میں پیش کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں اسے دادا جان (معین الدولہ) کی قبر پر کندہ کرادونگا لیکن اس کی نوبت نہ آنے پائی تھی کہ نواب حیدر علی خاں خود ہی اللہ کو پیارے ہوگئے اور معین الدولہ کی قبر بدستور بے نشاں رہ گئی بلکہ اب اس کا جاننے والا بھی شاید کوئی نہیں ہے۔

منیر کے اس قطعہ سے نواب مرحوم کی کئی خوبیوں کا پتہ چلتا ہے۔ وہ دیندار شخص تھے اور عتباتِ عالیات کی زیارت سے مشرف ہوآئے تھے۔ وہ اردو ہی نہیں فارسی پر بھی پوری قدرت رکھتے تھے۔ دونوں زبانوں میں نثر اور نظم لکھنے پر بخوبی قادر تھے۔ افسوس ہے کہ منیر نے نواب مرحوم کی کسی تصنیف یا تالیف کا پتہ نہیں دیا ہے البتہ ان کے کلّیات میں ایک ''بیاضِ اشعار'' کی تیاری سے متعلق جو قطعاتِ تاریخ مندرج ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

''تاریخ طیاری بیاضِ اشعار''

نواب خوش محاورہ باقر حسین خاں  شہرت ہے اہلِ فہم میں جن کے شعور کی

اشعار انھوں نے جمع کیے ہیں بیاض میں  ہر صفحہ اے منیر ہے تصویر حور کی

تاریخ میں نے جلد کے بندھتے ہی یہ کہی  زہے بندہ اب بیاضِ مطلا ہے نور کی

1275ھ

مرتب کا نام اس میں باقر علی کے بجائے ''باقر حسین'' نظم ہوا ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ کسی اور شخص کی بیاض ہو۔ واللہ اعلم۔ اس کی ترتیب سے متعلق دوسرے قطعہ میں مصرع تاریخ یہ ہے۔ ؎ حُسنِ بیاض صبح بہارِ جدید ہے

1275ھ

اپنے ایک قطعہ میں منیر نے معین الدولہ کے بارے میں یہ بھی کہا ہے کہ وہ تھے

ع  فنِ شعر وطب میں نہایت رسا

راقم نے ان کے پوتے نواب سید حیدر علی خاں کے ذخیرۂ کتب میں علمِ طب سے متعلق متعدد کتابیں دیکھی ہیں مثلاً چند یہ ہیں:

1- الفاظ الادویہ  نور الدین محمد عبداللہ الحکیم عین الملک شیرازی۔ بہ عہد شاہجہاں بادشاہ  21 رجب 1272ھ  مطبع مرتضوی

2- کفایہ منصوری درسالہ چوب چینی  منصور بن محمد بن یوسف بن احمد بن الیاس  ربیع الثانی 1290ھ (بار دوم)  مطبع نولکشور لکھنو

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| 3- میزان الطب | - | 2 رصفر 1268ھ (بار دیگر) | در شہر کانپور | |
| 4- اکسیر اعظم جلد ثالث | حکیم محمد اعظم خاں | شعبان 1289ھ | مطبع نظامی کانپور 775ھ | |
| 5- قرابادین کبیر جلد دوم | حکیم سید محمد حسین خاں | شوال 1272ھ | 1218 صفحے | |
| 6- مخزن الادویہ | | رجب 1278ھ | مطبع احمدی شاہدرہ دلہائی 767 صفحے | |

ان سے منیر کے اس قول کی کہ معین الدولہ طب میں ''نہایت رسا'' تھے تائید ہوتی ہے۔ شاعری میں وہ خود منیر کے شاگرد تھے اور ساحر تخلص کرتے تھے۔ موقع بہ موقع عنایتوں سے وہ اپنے استاد کو سرفراز بھی کرتے رہتے تھے چنانچہ اپنے کلیات میں منیر نے اس حقیقت کا اس طرح اعتراف کیا ہے:

> ''التفاتِ ملازمانِ نواب معین الدولہ سید باقر علی خاں بہادر ظفر جنگ خلف ثالث نواب معتمد الدولہ مرحوم از بارگرانِ دیں سبکدوش فرمودہ، از لکھنؤ بہ کانپور آوردہ درظلِ رافتِ خویشم جاداد، ہنوز نفسے راست نہ کشیدہ کہ باز بہ روزِ سیاہ دشمن کامیہا نشستم''33

یہ کہا جا چکا ہے کہ معین الدولہ کو شہر کانپور سے نسبتاً زیادہ لگاؤ تھا۔ انھوں نے اس شہر میں اپنے وسائل کی حد تک مختلف علوم وفنون کے ماہروں کی سرپرستی کی تھی اور اسی لیے منیر نے ان کو ''قدردانِ علما'' بھی کہا ہے۔ خود منیر کا معاملہ یہ تھا کہ ابتدا میں وہ معین الدولہ کے بڑے بھائی نظام الدولہ کے ملازم تھے پھر لکھنؤ جا کر ظفر الدولہ کے نوکر ہو گئے لیکن اس زمانے میں وہ بہت مقروض ہو گئے تھے۔ معین الدولہ کو خبر ہوئی تو انھوں نے منیر کا تمام قرضہ خود ادا کر دیا اور انھیں اپنے پاس طلب کر لیا۔ اس موقع پر منیر نے درج ذیل قطعہ تاریخ کہہ کر نذر کیا ؎

ظفر جنگ باقر علی خان امیر — مہِ آسمانِ علوم و عطا

جگر بندِ دستور شاہِ اودھ — فنِ شعر و طب میں نہایت رسا

انھوں نے بُلایا سوئے کانپور    کیا قرض ہمت سے میرا ادا
مکرر کیا لکھنو سے طلب    مرانام اہلِ سخن میں لکھا
کہی میں نے تاریخ اس کی منیر    ادا قرض نوآب نے اب کیا

1257ھ

اگر چہ مصرع آخر کے نیچے 1257 چھپا ہوا ہے، اس سے 1259 کے عدد برآمد ہوتے ہیں۔ جو بھی ہو یہ نواب معین الدولہ کی نوعمری کا زمانہ تھا۔ اس وقت طبیعت کا جوش اور شعر گوئی کا شوق بھی شباب پر تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بڑے ذوق وشوق سے منیر کو طلب کر کے نواب نے ان کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔

لکھنؤ شاہ نشیں شہر تھا۔ وہاں ترقی کے مواقع بہت بہتر معلوم ہو رہے تھے اس لیے نوعمر نواب کی ساری عنایتوں کے باوجود منیر کانپور میں دلجمعی سے نہ رہ سکے اور لکھنو چلے جانے کی اجازت کے لیے نواب سے اصرار کرتے رہے۔ نواب معین الدولہ کو بھی اپنے وسائل کا بخوبی اندازہ تھا، اس لیے انھوں نے بالآخر اجازت دے ہی دی۔ جشنِ عید کے موقع پر منیر نے ان کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا جس کا عنوان اس طرح ہے:

''قصیدہ نذر جشن عید بہ مدح امیر خورشید تنویر نواب معین الدولہ، انتظام الملک سید باقر علی خان بہادر ظفر جنگ خلفِ نواب معتمد الدولہ بہادر مغفور و مبرور''

اس قصیدے کے یہ تین شعر توجہ طلب ہیں ؎

شاعرِ معجز بیان وقدردانِ شاعراں    شعر جس کا مطلعِ مہ سے دوبالا ہوگیا
ہے وہ نوابِ معین الدولہ فیاض جہاں    دستِ حاتم نقشِ پا جس کا سراپا ہوگیا
لکھنؤ کی مجھ کو رخصت ہو عنایت آج کل    دھوم ہو یہ مدعا' میرا پذیرا ہوگیا

اس طرح منیر پھر لکھنؤ چلے گئے۔

لکھنؤ میں محمد علی شاہ اور پھر امجد علی شاہ دونوں مذہب پسند بادشاہ تھے شعر وشاعری کی طرف ان کا میلان زیادہ نہیں تھا اس لیے چند سال کے بعد منیر کو پھر کانپور آنا پڑا۔ نوابِ باوقار نے وضعداری سے کام لیا اور منیر کو استادی کا خلعت عطا کیا۔ منیر نے یہ قطعہ تاریخ نذر کیا:

''تاریخ عطائے خلعت استادی از حضور نواب صاحب بہادر دام اقبالہ ''

میرے شاگرد اگر چہ تھے نوآب لطف توقیر لیکن آج ملا
خلعتِ آبروئے استادی سر عزّت کو مثلِ تاج ملا
میں نے تاریخ نظم کی یہ منیر خلعتِ عزّو جاہ آج ملا

1267ھ

کانپور کے قیام کے زمانے میں منیر نواب معین الدولہ کی خوب خوب تعریفیں کرتے رہے ان کے کلیات میں اس قسم کے متعدد اشعار مل سکتے ہیں۔

خوب کر تعریفِ نوآب ظفر جنگ اے منیر کام آجائیگی یہ آقا پرستی ایک دن
منیرا زفیضِ نواب معین الدولہ ی بالد ہمانا ذرۂ مہر جہاں تاب ست پنداری
جنت سے بہرہ ور ہوں ظفر جنگ اے منیر جو جو تھی آرزو میرے دل میں، نکل گئی

نواب معین الدولہ کا کوئی دیوان چھپ سکا یا نہیں، اس بارے میں وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ نواب حیدر علی خاں سے بھی اس بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ افسوس اس کا بھی ہے کہ معین الدولہ کا کلام بھی دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔

منیر شکوہ آبادی کے بیان کے مطابق معین الدولہ شعرا کے علاوہ علما کے بھی قدر دان تھے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس سلسلے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔ مفتی علامہ میر عباس شوستری کے بارے میں البتہ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں وہ کانپور میں مقیم تھے، معین الدولہ کے پاس رہے تھے بعد میں وہ واجد علی شاہ کی خدمت میں مٹیا برج میں چلے گئے تھے۔ سید آغا اشہر لکھنوی نے لکھا ہے:

''مفتی میر عباس صاحب قبلہ شوستری موعظ مع اشاراتِ ذکر حسینؑ وہ بھی کبھی کبھی، بیان میں مطائب کا لطف بھی ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ماہِ صیام میں آخر وقت موعظ فرماتے فرماتے ارشاد ہوا،' یہ عصر کا وقت ہے یہ نچوڑ کا وقت ہے' جو مشہور ہو گیا''34

انھوں نے شاہ عبدالعزیز دہلوی کی مشہور زمانہ کتاب کا جواب '' جواہر عبقریہ فی ردِ تحفۂ اثنا عشریہ'' کے نام سے محمد علی شاہ کے عہد میں لکھنا شروع کیا تھا۔ بادشاہ کی سرپرستی اور خوشنودی کے

خیال سے اس کے آغاز کی تاریخ خَلَدَ اللہ سَلطَنَۃٗ سے نکالی تین برس کی محنت میں ربیع الآخر

1254ھ

1257ھ (1841) میں اسے مکمل کیا یہ کتاب نواب معین الدولہ کی فرمائش سے چھپی تھی۔ سید عارف نوشاہی نے اس کے تعارف میں لکھا ہے:

"جواہر عبقریہ فی ردِ تحفۂ اثنا عشریہ از مفتی میر عباس بن سید علی اکبر در ربیع الآخر 1257ھ/ 1841م، بہ پایاں رسانیدہ است۔ خلد اللہ سلطنۃ تاریخ

1254ھ

آغاز تالیف را نشاں می دہد، بہ نام محمد علی شاہ پادشاہ۔

آغاز۔ الحمد للہ المنعام الّذی نصر الایمان وَالاسلام أولاً لمحمد سید الانَامَ ونشره ثانیاً بَعلیٍ وَاله الکرام..........اماّ بعداز آنجا که رحمتِ نامتناهی از سجال افضال الٰهی۔

بفرمائش نواب باقر علی خان بہادر ظفر جنگ، کارخانۂ آغا جان 1271ھ/ 1854-55م۔ 372ص، 16/5، 17س م'35"

معین الدولہ کو تعمیرات کا بھی شوق تھا چنانچہ نواب سید علی خاں بیان کرتے تھے کہ معتمد الدولہ کے مقبرہ کی عمارت کو معین الدولہ نے آصف الدولہ کے امام باڑے کے نقشے پر تعمیر کروانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اپنی زندگی میں وہ صرف ایک مینار بنوا سکے تھے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے نواب سید علی خان بہادر (پدر نواب حیدر علی) نے اپنے والد کے منصوبہ کی تکمیل کی فکر کی۔ کام کا سلسلہ جاری تھا کہ کسی مفسد نے چند ایرانی قالین چوری کر لیے۔ نواب نے اس چوری کی تفتیش کا ارادہ ظاہر کیا تو رات کو آگ لگا دی گئی۔ رات بھر آگ اندر ہی اندر پھیلتی رہی۔ صبح کو اطلاع ہوئی تو نواب نے آگ کے بجھانے کا حکم دیا لیکن حکم کی تعمیل ہونے تک عمارت کا سارا اثاثہ ہی نہیں، خود عمارت بھی جل کر خاک سیاہ ہو چکی تھی۔ اس کے بعد یہ بھی ممکن نہ ہوا کہ پوری عمارت کی چھتیں ہی ڈلوائی جائیں۔ دیواریں کھڑی زبان بے زبانی سے اس سانحہ کی داستان سناتی رہتی ہیں۔ ایک باہری حصہ کو برآمدے کی صورت دے دی گئی ہے، اس میں نواب معین الدولہ آرام

فرما رہے ہیں۔ وہ وسطی وسیع کمرہ جس میں نواب معتمد الدولہ کی قبر ہے اب اس مقبرے کا اندرونی صحن ہے تمام قبریں مسطح ہیں۔ اوپر سے ان کو پختہ کرا دیا گیا ہے۔ محرم کی مجلسوں میں شریک ہونے والوں کے لیے یہ صاف پختہ فرش کا کام کرتی ہیں۔

نواب سید علی خاں بہادر ابنِ معین الدولہ کے بیٹوں کے نام یہ بتائے گئے ہیں۔

نواب منصور علی خان بہادر ، نواب باسط علی خان بہادر

نواب حیدر علی خاں بہادر ، نواب اکبر علی خاں بہادر

نواب حسین علی خاں بہادر ، نواب محمد علی خان بہادر

نواب عابد علی خان بہادر، نواب کرّار علی خان بہادر نواب وکرّار تخلص

کرار صاحب دیوان بتائے گئے ہیں لیکن ان کے دیوان کو چھپنا نصیب نہیں ہوا۔

نواب حیدر علی خان بہادر جن سے راقم نے استفادہ کیا ہے، کے دو بیٹے تھے:

نواب اسد علی خان بہادر اور نواب غضنفر علی خان بہادر

نواب سید علی خاں بہادر نے اپنے شہر کانپور ہی میں وفات پائی تھی تاریخ یہ ہے

تاریخِ انتقال نواب سید علی خان بہادر نبیرۂ نواب معتمد الدولہ بہادر رئیس اعظم کانپور:

ع والاحشم نواب ما سید علی خاں آہ آہ

بہ روز جمعہ 21 / جمادی الآخر 1333ھ (7 / مئی 1915)

4- شمس- محمد علی خاں

نواب معتمد الدولہ آغا میر کی مُرد کِل نواب بی جان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے محمد علی تھے جو پیار میں ننھے نواب کہے جاتے تھے نواب سید علی خاں کی بیاض میں ان کی ولادت کی تاریخ اس طرح لکھی ہے:

''ولادتِ عموی کوچک نواب محمد علی خان بہادر مرحوم...... ماہ رجب 1247ھ مطابق 1831''

تقویم سے پتہ چلتا ہے کہ ان ننھے نواب کی پیدائش آخر دسمبر اور شروع رجب کا واقعہ تھی۔ اس وقت اگرچہ معتمد الدولہ جلاوطنی کے عالم میں کانپور میں زندگی کے آخری دن گذار رہے تھے۔

اس ولادت کی بہت خوشی منائی گئی۔ شیخ امام بخش ناسخ وہیں موجود تھے۔ انھوں نے یہ قطعۂ تاریخ کہہ کر نذر کیا ؎

زہے نوآب فیاضِ زمانہ　　کہ شُد شائستۂ عالم پناہی
خدادادست اورا پور چارم　　زہے شد عُزّی ہاتابہ ماہی
مبارک سالِ مولودش نوشتم　　شود باحشمت واقبال الٰہی

1247ھ

ننھے نواب ابھی صرف پانچ مہینے کے ہوئے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ان کے سگے بڑے بھائی نواب امین الدولہ نے خاندان کے سرپرست کی حیثیت سے ان کی پرورش، تربیت اور کفالت کی۔ منجھلے نواب نے کانپور میں جہاں انگریزوں کی عملداری تھی آنکھیں کھولی تھیں اس لیے انگریزی معاشرت اور تمدن کے بیش از بیش اثرات قبول کیے تھے۔ قیاس چاہتا ہے کہ ان کی تعلیم کے لیے بھی بہتر سے بہتر انتظام کیا گیا ہوگا اور انھوں نے انگریزی اسکول میں تعلیم پائی ہوگی۔ گمانِ غالب ہے کہ یہ انگریزی زبان سے بھی کم وبیش واقف رہے ہوں گے۔

اپنے والد کے متروکہ میں سے انھیں بھی دوسرے بھائیوں کے برابر وثیقہ ملتا تھا اور شاہی وثیقہ دار کی حیثیت سے ان کے نام کے ساتھ بھی ''نواب'' اور ''خان بہادر'' کے اعزازی کلمات شامل کیے جاتے تھے، یہ اور بات ہے کہ انھوں نے والد کے عروج واقبال کی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔

ننھے نواب طبعاً بہت ذہین تھے۔ کم عمری میں ہی اپنے بھائیوں کی طرح شعر کہنے لگے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے ہونے کے باوجود ان کے حوصلے بڑے تھے۔ اپنے بڑے بھائی کے تخلص کی مناسبت سے اپنے لیے انھوں نے ''شمس'' تخلص پسند کیا تھا۔ غالباً 1260ھ (1844) میں یہ اپنے بڑے بھائی امین الدولہ کے ساتھ لکھنو گئے تھے وہاں کمسنی کے باوجود خواجہ حیدر علی آتش کے معروف شاگرد میر دوست علی خلیل کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ سعادت خاں ناصر نے اپنے تذکرے میں ان کا تعارف ان لفظوں میں کرایا ہے:

> '' خلاصۂ خاندانِ عالی شان نواب محمد علی خاں بہادر عرف ننھے نواب پسرِ نواب معتمد الدولہ بہادر، تخلص شمس شاگرد میر دوست علی خلیل''36

خلیل اپنے زمانے کے نام برآوردہ شاعروں میں سے تھے۔ انھیں مذہبی حلقوں میں بھی عزت حاصل تھی دہلی کے بادشاہ بہادر شاہ ثانی المتخلص بہ ظفر کی تبدیلیٔ مذہب سے متعلق افواہ کی تردید میں مرزا غالب نے ایک مثنوی لکھی تھی۔ مفتی میر محمد عباس شوستری کی رہنمائی میں میر دوست علی خلیل نے اس مثنوی کا جواب اس عنوان سے نظم کیا تھا:

''مثنوی شیعیانِ علی دررد مثنوی جعلی دہلی''

خلیل کی اس مثنوی کا جواب الجواب شیخ امام بخش صہبائی نے لکھا تھا راقم نے نواب حیدر علی خاں کی کتابوں میں صہبائی کی مذکورہ مثنوی ''خطابِ فاصل'' مصنفۂ 1271ھ کا مطبع مجمع البحرین لودھیانہ میں 1286ھ کا مطبوعہ نسخہ دیکھا ہے۔ اس ذکر سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ ننھے نواب کو کم عمری میں ہی لکھنؤ اور دہلی کے باکمالوں کے ناموں اور ان کے تصنیفی کارناموں سے کم و بیش مطلع ہو جانے کے مواقع حاصل تھے۔ سعادت خاں ناصر نے ننھے نواب کے بہت شعر اپنے تذکرے میں اس عنوان سے درج کیے ہیں:

''یہ اشعار اس ذوی الاقتدار سے یادگار''

ان پر نظر ڈالنے سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے یہ ہے کہ ننھے نواب کو قافیہ پیمائی کا شوق تھا۔ اپنی قوتِ مشق کے اظہار کے لیے وہ ایک ہی قافیے کو بار بار نظم کرتے تھے اور ان کی غزلیں عموماً بارہ تیرہ شعروں کی ہوتی تھیں۔ ایک غزل یہ ہے

ترا جمال جو پیشِ نظر نہیں رکھتے وہ مثلِ دیدۂ نرگس بصر نہیں رکھتے
ہمارے دل کی طپش سے خبر نہیں رکھتے وہ آ کے ہاتھ کبھی سینے پر نہیں رکھتے
تمھارے نامہ بروں کا ہے عرش پر یہ دماغ سروں پہ اپنے ہما کے بھی پر نہیں رکھتے
خموش رہتے ہیں مانندِ طائر تصویر زبان عاشقِ شوریدہ سر نہیں رکھتے
صبا پیام یہ کہنا مری طرف سے اُسے تم اپنے بے خبروں کی خبر نہیں رکھتے
کیا ہے حُسنِ جوانی نے یہ انھیں بدمست ہماری کیا کہ وہ اپنی خبر نہیں رکھتے
نظیر تا نظر آئے نہ اپنی صورت کا وہ آئینے کو بھی پیشِ نظر نہیں رکھتے

یقین مرگ شب ہجر میں جو رہتا ہے — تو شام ہی سے اُمید سحر نہیں رکھتے
الٰہی کیوں نہیں سُنتے ہیں وہ مری فریاد — گُلوں کی طرح وہ گوش کر نہیں رکھتے
کیا ہے جب سے انھیں بادشاہِ حُسن و جمال — وہ مجھ فقیر کے تکیہ پہ سر نہیں رکھتے
شب فراق میں اپنا توذکر کیا کیجیے — امیدِ صبح خروسِ سحر نہیں رکھتے
فقیر اس شہِ خوباں کے ہیں یہ بے پروا — کبھی ہما کے بھی تکیے میں پر نہیں رکھتے
خدا ہی جانے وہ رشکِ قمر کہاں ہے شمس — سحر سے آج ہم اُس کی خبر نہیں رکھتے

گمان غالب ہے کہ یہ غزل استاد کی اصلاح سے مزین ہے، باوجود اس کے بعض شعروں کے مضامین ہی نہیں، ان کی زبان بھی شاعر کی نومشقی پر صاف دلالت کر رہی ہے۔ دوسرے مطلع میں ''طپش کی خبر'' کے بجائے ''سے خبر'' اور پانچویں شعر میں ''اُسے کہنا'' بجائے ''اس سے کہنا'' نظم ہوا ہے۔ اسی طرح پہلے مطلع میں لفظ ''بصر'' اور نویں شعر میں لفظ ''کر'' کا استعمال بھی توجہ طلب ہے۔ اس نوعمری میں کلام کو مختلف صنعتوں سے آراستہ کر دینے کا شوق بھی لائق توجہ حقیقت ہے۔ مضامین عموماً خیالی ہیں جو اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ نوخیز شاعر محنت اور غور و فکر کے ساتھ شعر کہتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ نئی سے نئی بات پیش کی جائے اور اس اعتبار سے غزل کے کئی شعر داد طلب ہیں۔ ناصر ہی کے تذکرے سے یہ چند شعر بھی یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

ہُوا نہیں ترے چہرے پہ خط عیاں صیاد — ابھی ہے دامِ اسیری بر انہاں صیاد
قفس میں پھول کی رکھے پیالیاں صیاد — جو عندلیب کا ہووے مزاج داں صیاد

قافیہ پیمائی کے شوق کا ہی یہ فائدہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی غزلوں میں عموماً ایک سے زائد مطلعے کہے ہیں۔ اس کمسنی کے عالم میں ننھے نواب نے جس وقت یہ پہلا مصرع پڑھا ہوگا مشاعرے کا جو حال ہوا ہوگا، اس کا صرف تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے مطلعے میں ''پھول کی پیالیاں'' شاعر کی خوبیِ فکر کی مظہر ہیں اور سامع وقاری سے داد طلب ہیں۔

ابرو کے پاس گیسوِ پُرخم کو لائیے — اک دن تو اس کمان پہ چلّہ چڑھائیے

بات کوئی خاص نہیں ہے لیکن اس چلّہ چڑھانے نے یقینی طور پر قیامت کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

یہ الفت ہوئی یار ۔ جانی تمھاری    وظیفہ ہے میرا کہانی تمھاری
دَم آنکھوں میں آیا بس اب مُنہ دکھاؤ    بہت سُن چکے لن ترانی تمھاری
نہیں دیتے چھلا تو چھلّے کا گُل دو    رہے پاس کچھ تو نشانی تمھاری

یہ آخری شعر ذہن کو بیساختہ ذوق دہلوی کے اس مطلع کی طرف متوجہ کردیتا ہے۔

چھلا نہیں تو چھلّے کا گُل اے نگار دے    پر کچھ نشانی اپنی ہمیں یادگار دے

چھوٹی بحر میں ننھے نواب نے یہ اچھے شعر نکالے ہیں۔ان کے کچھ اور شعر یہ ہیں۔

دل عاشق زلف ورُخِ جاناں نہ ہُوا ہے    پھر قابلِ زنجیر یہ دیوانہ ہوا ہے
اے شمس حسینوں کا جو رہتا ہے تصوّر    آئینۂ دل رشکِ پری خانہ ہوا ہے
گلا کٹتا ہے،دَم رکتا ہے،میرے طایرِجاں کا    کٹے پھندا الٰہی الفتِ زلفِ پریشاں کا
ہمارا دم فنا ہوگا،نقاب اُلٹو نہ چہرے سے    تمھاری بے حجابی میں ہے عالم تیغِ عریاں کا

ننھے نواب نے شعر گوئی کی ابتدا لکھنؤ میں کی تھی،ان کے کلام میں کانپور کی اُس شاعری کا بالکل اثر نہیں معلوم ہوتا ہے جس کا حال امین الدولہ کے سلسلے میں بیان کیا جاچکا ہے۔ردیفوں کے انتخاب میں بھی ان کے یہاں وہ بات نہیں ہے بلکہ ان کا جو کلام اوپر نقل ہوا ہے اس میں ایک مطلع تو ایسا ہے جس میں ردیف ہے ہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ننھے نواب کی طبیعت کلام کو ردیف کی خوبیوں سے آراستہ کرنے کی طرف مائل نہیں تھی۔عموماً انھوں نے طویل ردیفوں سے اجتناب کیا ہے۔ان کی توجہ قافیہ کی طرف زیادہ تھی اور عموماً غور وفکر سے انھوں نے انھیں سے نئے نئے مضامین نکالنے کی کوشش کی ہے۔

ننھے نواب کا وہ کلام جو پختگی کے زمانے کا تھا،دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔لالہ سری رام کو بھی ان کا نیا کلام بالکل نہیں مل سکا تھا۔انھوں نے اپنے تذکرے میں پہلی غزل کے صرف چار شعر نقل کردینے پر اکتفا کی ہے اور انھیں شعروں کی روشنی میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''شمس منشی محمد علی عرف ننھے صاحب،شاگرد دوست علی خلیل۔کلام پختہ ہوتا تھا۔زبان صاف تھی۔''37

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لالا سری رام کو ننھے نواب کے حالات کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

ننھے نواب نے ہوش سنبھالا تو خود کو یتیم پایا تھا زندگی میں بڑی کلفتیں اٹھائی تھیں پھر بھی ہمت اور حوصلہ کے آدمی تھے۔ نواب سید حیدر علی خاں ان کا یہ مقطع پڑھتے تھے اور ان کو یاد کیا کرتے تھے ؎

بیٹھو نہ پاؤں توڑ کے، ہمت کو ہار کے اے شمس مل ہی جائے گا ڈھونڈھو جو یار کو

اور واقعی معلوم ہوتا ہے کہ وہ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے والوں میں سے نہیں تھے۔ باوجودیکہ انگریزوں کی عملداری میں پیدا ہوئے تھے۔ 1857 کے ہنگاموں میں انھوں نے اہلِ وطن کا بخوبی ساتھ دیا تھا۔ نواب قیصر حسین خاں فرماتے تھے۔

> ''1857 میں یہ کانپور کے نانا صاحب کی فوج کے کمانڈر تھے۔ انگریزوں نے غدر کے بعد ان کے پھانسی کا حکم دے دیا تھا۔ بڑی مشکل سے جان بچ سکی تھی۔''

لیکن سید کمال الدین حیدر نے بالکل مختلف بات لکھی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ:

> ''نواب محمد علی خاں عُرف ننھے نواب کے گھر کو فوج نے خوب لوٹا۔ چاہتی تھی کہ مارڈالیں، کس واسطے کہ پہلے انھوں نے کچھ بیبیوں اور صاحب کو گھر میں چھپایا تھا لیکن پیشوا نے رئیس اور امیر جان کر منع کیا۔ اقربا نے نواب معتمد الدولہ کے مالدار اہلِ وثیقہ سمجھ کر لوٹا''38

لفظوں کی معمولی سی ردوبدل کے ساتھ دوسرے مقام پر یہی بات اس نے اس طرح قلمبند کی ہے:

> ''نواب محمد علی خاں عرف ننھے نواب کا گھر پہلے فوج باغی نے خوب لوٹا۔ گرفتار کیا۔ چاہتی تھی کہ مارڈالیں، بہ علت چھپانے میم وصاحب کے، مگر راناراو نے سردار اور امیر سمجھ کر فوج سے بچایا۔ جب انتظام کانپور ہوا، بہ ہزار خرابی بہت سی روبکاری کے بعد مجھو نے اپنی بے جُرمی کی طرح ثابت کی۔ وثیقہ بدستور جاری ہوا۔ روانۂ عتبات عالیات ہوکر مجاورت اختیار کی۔ کئی سال بعد وہیں

انتقال کیا۔ گھوڑ دوڑ کا بہت شوق تھا۔ ہر سال بمبئی میں آیا کرتے تھے۔ پھر چلے جاتے تھے۔"39

خیال کرنے کی بات ہے کہ کیسے سخت حالات تھے۔ ہندستانی فوج کا ریلا آیا تو اس نے لوٹ لیا۔ کسی طرح اس سے جان بچی، پھر انگریزوں کا تسلط ہوا تو وہ جان کے دشمن ہو گئے اور اب جبکہ حالات پھر بدل چکے ہیں، ان کی وطن دوستی پر پھر شبہ کیا جانے لگا ہے۔ آغا جو شرف نے معتمد الدولہ کے اخلاف پر جو گذری تھی مختصراً اس کا ذکر اس طرح کیا تھا ۔

جو فرزند تھے معتمد الدولہ کے — بچی جان ان کی ، طلب ہو گئے

جو سید علی خاں تھے عالی جناب — وہ باقر علی خان داہلِ خطاب

وہ نواب دولھا، سب ان کے عزیز — مع نھنے نواب سب با تمیز

بُلائے گئے روبکاری ہوئی — ہوے مطمئن زرنگاری ہوئی

ان حالات نے خوش باش اور خوش مزاج نھنے نواب کو بہت مایوس کر دیا اس لیے وہ یہاں سے ہجرت کر گئے۔ منشی درگا ہی لال نے لکھا ہے کہ:

"نواب محمد علی خاں عُرف نھنے نواب صاحب جو 1861 میں کربلا چلے گئے تھے اور 12 رجولائی 1870 کو کربلا میں وفات پائی ان کی زوجگان اور دختران کربلا میں ہیں"40

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کے طریقہ کے مطابق نھنے نواب نے بھی ایک سے زائد شادیاں کی تھیں اور پسماندگان میں دو یا زائد بیٹیاں چھوڑی تھیں۔ جس وقت وہ کربلا پہنچے ان کی والدہ نواب خُرد محل صاحبہ کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کا متروکہ نواب امین الدولہ کے بیٹوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔

نھنے نواب نے اپنے اس نام کی مناسبت سے بھائیوں کے مقابلے میں سب سے کم عمر پائی تھی یعنی صرف چالیس برس کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ان کی وفات کی صحیح تاریخ نواب سید علی خاں کی بیاض میں اس طرح مندرج ہے:

"تاریخ رحلت آں مرحوم (نھنے نواب)۔ 13۔ ربیع الاول 1287ھ مطابق 14۔ جون 1870 بہ عارضۂ دنبل بغل بہ رحمت خدا پیوست"

اس کی تائید نواب حیدر علی خاں کی مملوکہ ایک دوسری بیاض سے ہوتی ہے جس میں یہی بات ان لفظوں میں لکھی ہوئی ہے:

''تاریخ انتقال نواب محمد علی خاں صاحب۔ 14 جون 1870 مطابق 13۔
ربیع الاول 1287ھ بہ مقام بغداد شریف''

اس اندراج سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ننھے نواب کا قیام بغداد میں صرف نو برس کے قریب رہا تھا۔

## 5- تمنا- نواب علی حسین خاں

غازی الدین حیدر کے اعلانِ بادشاہت کے بعد جب نواب معتمد الدولہ آغا میر کو اودھ کے پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے استقلال حاصل ہو گیا تو انھوں نے دوراندیشی سے کام لے کر اپنے اور بادشاہ کے اخلاف کے لیے وثیقہ کی ایک صورت نکالی۔ منشی درگا ہی لال نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

''غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ نے ایک کروڑ روپیہ آزجملہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو واسطے مدام کے قرض دیا۔ اس قرضہ کا سود حساب فی صدی پانچ روپیہ سالانہ کے .......... سالانہ پانچ لاکھ روپے تھا۔ 17۔ اگست 1825 (یکم محرم 1241ھ) کو ایک عہد نامہ مابین بادشاہ اور گورنمنٹ کے مقام لکھنو میں لکھا گیا۔ عہد نامۂ مذکور میں منجملہ پانچ لاکھ روپیہ سود کے نواب معتمد الدولہ بہادر کو جو اس وقت وزیر بادشاہ کے تھے حسب تفصیل ذیل دیا جانا مشروط ہوا۔

| | |
|---|---|
| نواب معتمد الدولہ بہادر | 20000 |
| نواب بہو بیگم زوجہ نواب معتمد الدولہ بہادر | 2000 |
| نواب عالیہ بیگم دختر نواب ممدوح | 1000 |
| امین الدولہ بہادر پسر اکبر نواب ممدوح | 2000 ''41 |

تعجب ہے کہ تواریخ نادر العصر میں لکھا ہے کہ:

''وزیر بیگم و عالیہ بیگم دختران معتمد الدولہ''42

اس اندراج کی غلطی کئی طرح سے ظاہر ہے۔ اول یہ کہ رقم کے بارے میں وضاحت نہیں ہے کہ دو بیٹیوں میں آدھی آدھی تقسیم ہوتی تھی یا ہر ایک کی الگ الگ اتنی رقم مقررہ تھی۔ حکیم نجم الغنی خاں نے بھی درگاہی لال کی طرح قطعیت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ:

"1000 ان کی بیٹی عالیہ بیگم کی تنخواہ کی گئی"43

وزیر بیگم نام کی معتمد الدولہ کی کوئی ایسی بیٹی نہیں تھی جس کی شادی محرم 1241ھ (اگست 1825) سے پہلے ہو چکی ہو اور وہ وثیقہ کی مستحق رہی ہو۔ معتمد الدولہ نے اس زمانے تک صرف ایک بڑی بیٹی عالیہ بیگم کی شادی میر افضل علی بائیسی والے کے بیٹے میر نذر علی کے ساتھ کی تھی اور یہ بیٹی اپنی والدہ نواب بیگم (خاص محل) کی زندگی میں ہی شروع 1267ھ (1840) میں رحلت کر گئی تھی۔ جس جگہ اس کی قبر تھی وہاں امام باڑہ بنوا دیا گیا تھا۔ میر رشک نے اس کی تاریخ کہی تھی:

"تاریخ امام باڑہ تعمیر دختر معتمد الدولہ بہادر مرحوم

ہست قبر سیدہ زیر ضریح حق بیا مرزد برائے اہل بیت
بشنو اے دل سال تعمیرِ بنا آہ ایں ماتم سرائے اہل بیت"

1267ھ

اس امام باڑہ میں مسجد بھی تھی اور اس کی تاریخ رشک کی کہی ہوئی یہ ہے:

زہے مسجد چہ شان اللہ اکبر ہمہ دلخواہ ارباب نماز ست
نوشتم مصرع تاریخ اے رشک عبادت گاہ ارباب نماز ست

1267ھ

قیاس چاہتا ہے کہ یہ دونوں نواب امین الدولہ کی تعمیرات میں سے ہوں گی۔

نواب معتمد الدولہ کی سب سے چھوٹی بیٹی ننھی بیگم تھیں۔ انھوں نے انیس برس کی عمر پا کر 27/ جمادی الاول 1264ھ (مئی 1848) میں وفات پائی تھی۔ میر رشک نے ان کی بھی تاریخ کہی تھی:

"وفات ننھی بیگم دختر خرد نواب معتمد الدولہ بہادر"

دخترِ مُرد وزیرِ اعظم صاحبِ عفت وایثار وسخا
نامِ ایں سیّدہ ننھی بیگم داد جاں از دق وسل واویلا
نوزدہ سالہ غمِ ہستی بُرد بست وہفتم زجمادی اولیٰ
بود آں روز سہ شنبہ افسوس نیمۂ روز بفر مود قضا
رشک تاریخ وفات بنوشت درجناں رفت بنزدِ زہرا

1264ھ (1848)

یہ نا کتخدا ہیں اور کم عمری میں مرگئیں اسی لیے وثیقہ کی تقسیم میں ان کا نام نہیں آسکا تھا۔ خود نواب حیدر علی خاں بھی ان کو نہیں جانتے تھے۔

مذکورہ قطعہ میں ننھی بیگم کی عمر اُنیس برس بتائی گئی ہے اس لیے ان کا سالِ ولادت 1245ھ (1829) ہوگا۔ یہ اپنے چھوٹے بھائی ننھے نواب سے کوئی دو برس بڑی تھیں۔ شاید یہ ان کی مختلف البطن بہن ہوں۔

محسن علی موسوی کانپور میں مقیم تھا۔ اس کے لیے معتمد الدولہ کے گھرانے کے بارے میں معلومات فراہم کرلینا بہت مشکل نہیں تھا لیکن اس نے تحقیق کی زحمت اٹھائے بغیر ایک جگہ یہ لکھ دیا ہے کہ:

"سلطان تخلص، دیوان ان کا موقف کی نظروں سے گذرا ہے اور حال معلوم نہ ہوا۔ شاید دختر نواب معتمد الدولہ کی ہوں"44

بعد کے تذکرہ نویسوں نے نہ صرف لفظ "شاید" کو حذف کردیا بلکہ اس شاعرہ کے لیے تجویز کر کے نام بھی لکھ دیا' اس طرح'

"سلطان تخلص سلطان بیگم لکھنوی، دختر نواب معتمد الدولہ بہادر لکھنوی کا تھا جو ظریف اور ذہین، صاحب دیوان گذری ہے"45

حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس تخلص اور نام کی معتمد الدولہ کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔

نواب معتمد الدولہ کی تیسری بیٹی وہ تھی جس کی شادی نواب علی حسین خاں بہادر کے ساتھ ہوئی تھی۔ علی حسین خاں کے تعارف میں لالہ سری رام نے لکھا ہے۔

''تمنا امیر والا شان نواب سید علی حسین خاں تمنا عرف نواب دولھا بہادر خلف میر حسین رضوی''نسب میں سید عالی قدر اور نواب معتمد الدولہ وزیر اودھ کے حقیقی خواہر زادہ اور داماد تھے۔ انھیں کے ہمراہ لکھنؤ سے کانپور پر تشریف لائے اور پھر یہیں بود و باش اختیار کی۔ شیخ امام بخش ناسخ سے تلمذ تھا: ........''47

صحیح یہ ہے کہ تمنا کے والد کا نام میر حسین علی رضوی تھا۔ وہ فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ معتمد الدولہ کی حقیقی بہن کے شوہر تھے۔ معتمد الدولہ جلا وطن ہو کر جب کانپور آئے تو حسین علی اپنے اہل و عیال اور متعلقین کے ساتھ یہاں آ گئے۔ ان کے بیٹے علی حسین لکھنو میں پیدا ہوئے تھے۔ کمسنی میں وہ بھی مذکورہ قافلے کے ساتھ تھے۔

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ امین الدولہ کی ایک شادی ان کی پھوپھی فاطمہ بیگم (مادر علی حسین خاں) کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ امین الدولہ اور علی حسین خاں کے مابین بہت اچھے مراسم قائم رہے۔ معتمد الدولہ کی وفات کی بعد اپنی دونوں ماؤں اور بیگموں وغیرہ کے مشورے سے امین الدولہ نے اپنی بہن کی شادی علی حسین خاں کے ساتھ کر دی۔ میر علی اوسط رشک نے اس موقع پر یہ قطعہ تاریخ کہا:

''تاریخ کد خدائی دختر کلاں نواب معتمد الدولہ بہادر مرحوم''

ہنگامِ نکاح ایں عفیفہ بودہ فرو جاہ کیقبادی
سامانِ غنا و رقص و تنویر می زد بانگِ طرب منادی
اقسامِ طعام بہر تقسیم مملوے گلاب و مشک و جادی
حاضر بودیم و صیغۂ عقد خواندیم بہ از دیاد شادی
تاریخش عیسوی برآمد درعید غدیر بودہ شادی

1834

یہ معتمد الدولہ کی وفات کے کوئی ڈھائی تین برس بعد 1250ھ (1834) میں ہوئی تھی۔ اس میں ناچ رنگ اور روشنی بہت ہوئی تھی۔ طرح طرح کے خوشبودار کھانے تقسیم کیے گئے تھے۔

اس قطعہ کے عنوان میں دولھن کو "دخترِ کلاں" کہا گیا ہے یعنی اس وقت معتمدالدولہ کی کم سے کم دو بیٹیاں ناکتخدا تھیں۔ ایک ننھی بیگم جو 1245ھ (1829) میں پیدا ہوئی تھی اور دوسری یہ دولھن جو اس سے بڑی تھی۔ اس کو چونکہ بادشاہ کی طرف سے کوئی خطاب نہیں ملا تھا، اس کی ولادت یقینی طور پر 1234ھ کے بعد کا واقعہ ہوگا، یعنی یہ اپنے تیسرے بھائی معین الدولہ سے چھوٹی اور بہ گمان غالب نواب خردمحل (بی جان) کے بطن سے تھی۔

حسین علی خاں کو سسرال سے "نواب دولھا" "خطاب ملا اور وہ "نواب سید علی حُسین خاں بہادر عرف نواب دولھا" کہلانے لگے انھوں نے کانپور کے محلہ پٹکاپور میں اپنا شاندار محل بنوا کر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ ان کے بڑے صاحبزادے سید اکبر حسین خاں سیف 1255ھ میں پیدا ہوئے تھے چنانچہ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ خود حسین علی خاں 1235ھ (1820) کے قریب کسی وقت پیدا ہوئے ہوں گے۔

1857 کے ہنگاموں میں نواب دولھا از راہِ احتیاط کانپور سے لکھنؤ چلے گئے تھے، باوجود اس کے جو خرابی مقدّر ہو چکی تھی سامنے آ کر رہی۔ سید کمال الدین حیدر نے اس کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے:

> "نواب دولھا خویش اور بھانجے نواب معتمدالدولہ کے اس جرم پر دھرے گئے کہ ان کے دروازے پر ایک بیم ماری گئی تھی مگر بروقت روبکاری سب اہلِ بازار نے بہ اتفاق گواہی دی کہ یہ اس وقت کانپور میں نہ تھے اور کسی طرح شریک فوج باغی نہیں ہوئے غرض جان بچی اور وثیقہ جاری ہوا۔"48

نواب دولھا کو حقِ شوہری کے طور پر وثیقہ ملتا تھا اور منشی درگاہی لال کے بیان کے مطابق اُنیسویں صدی کے عشرۂ ہشتم میں ان کے وثیقہ کی رقم بائیس سو تھی۔ کانپور کی املاک سے کچھ اور یافت بھی ہو جاتی ہوگی۔ بہرحال وہ کانپور میں باعزت بسر کرتے تھے۔

نواب دولھا بھی شاعر تھے۔ تمنا تخلص کرتے تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز کانپور میں ہوا تھا اور انھوں نے شیخ امام بخش ناسخ کو آخر زمانے میں دیکھا ہوگا۔ لالہ سری رام کا کہنا ہے کہ ناسخ سے تلمذ تھا۔ شاید کچھ دن کسبِ فیض کیا ہو۔ پھر منیر شکوہ آبادی کے شاگرد ہو گئے تھے۔ منیر کے کلیات

میں نواب دولھا اور ان کے بیٹوں سے متعلق حصۂ قطعات مندرج ہیں۔ ایک قطعہ کے بارے میں خود منیر نے لکھا ہے کہ:

"بمدح جناب فیض مآب نواب دولھا صاحب بہادر دام اقبالہ قطعہ ہذا در کانپور نظم کردم"

اس قطعے کے دو شعر یہ لائق توجہ ہیں۔

نواب دولھا زینت ایوانِ سروری ہے جس کے التفات سے نشو ونمائے عید
فیاضیِ حضور سے ہے عیش سال بھر کمپو میں کوئی دن نہیں رہتا سوائے عید

نواب کا الٹا ہاتھ جل گیا تو منیر نے یہ قطعہ کہا:

"تاریخ ذو بحرین برائے نواب دولھا صاحب بہادر کانپوری"

طبع نوآب کو یہ رنج ہوا جل گیا دشمنوں کا الٹا ہاتھ
میں نے تاریخ لکھی ذو بحرین ید بیضا ہوا یہ زیبا ہاتھ

1285

جب غسل صحت کیا تو انھوں نے یہ قطعہ نذر کیا:

"تاریخ غیر منقوطہ غسلِ صحت نواب دولھا بہادر کانپور:

سرکار کا یہ درد والم دور ہوا آرام وسُرور داورِ عصر کو ہو
ممدوح کا دور عام ہو عہد مدام عمرِ فلک اس داورِ عصر کو ہو
لکھ کلک منیر مصرع سالِ مُراد مسعود آرام سَرورِ عصر کو ہو

1285ھ

رواجِ زمانہ کے مطابق نواب دولھا بھی غزلیں کہتے تھے۔ یہاں ان کے چند شعر نمونہ کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔

ساتھ دیتا ہے کون پیری میں گوشت نے استخواں کو چھوڑ دیا
یارب بُرا ہو پیریِ خانہ خراب کا محتاج بال بال ہُوا ہے خضاب کا
تا حشر اب نہ ہوگی ملاقات آپ سے رخصت ہوا یہ کہہ کے زمانہ شباب کا
کیا اثر تھا جذبۂ دل میں کہ بعدِ قتل بھی تیر سینے سے اگر نکلا تو پیکاں چھوڑ کر

تمنا ہے یہی موقع جھکے وہ ذبح کرتے ہیں　　بڑھا کر ہاتھ دونوں ڈال دے قاتل کی گردن میں
حشر تک روئیں گے احباب تمنا مجھ کو　　یاد آئیگی جو آشفتہ بیانی میری

لالہ سری رام ناقل ہیں کہ:

"(نواب دولھا) کے پوتے کا بیان ہے کہ وہ صاحب دیوان تھے اور قصیدوں میں ذوق اور سودا کا انداز ہے۔"49

افسوس ہے کہ ان کے دیوان کے ہونے یا نہ ہونے اور چھپنے یا نہ چھپنے کے بارے میں کوئی قطعی بات معلوم نہیں ہوسکی، البتہ اگر اقتباس بالا پر اعتماد کیا جاسکے تو ماننا ہوگا کہ نواب دولھا تمنا غزل کے علاوہ قصیدے بھی لکھتے تھے۔

نواب سید قیصر حسین خاں کے ذخیرۂ کتب میں راقم نے نواب سید علی حسین خان بہادر تمنا کا ایک "مجموعۂ سلام" دیکھا ہے جو مطبع تصویر عالم لکھنو میں چھپا تھا۔ اس کی ضخامت 156 صفحات کی تھی۔ اس مجموعہ میں:

قطعہ تاریخ وفات تمنا 1305ھ　از عزیز
اور: دو سلام　　مصنفہ نواب اکبر حسین خاں اکبر

بھی شامل ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے مرثیوں کا بھی کوئی مجموعہ رہا ہو۔

میر علی اوسط رشک کے دیوان میں ایک قطعہ یہ بھی ہے۔

فاطمہ بیگم کہ بُد خوشدامنِ نواب من　　سوئے جنت رفت و برلب ی رسد صد حیف آہ
یافتم از غیب ایں تاریخ صوری معنوی　　وائے ذی‌حجہ نہم روز احد　صد حیف آہ
1262ھ

پہلے مصرع میں "نواب من" سے امین الدولہ مراد ہیں چنانچہ یہ امین الدولہ کی خوشدامن اور نواب دولھا کی والدہ کی وفات کا قطعہ تاریخ ہے۔

نواب دولھا خود شاعر ہی نہیں تھے، شاعر نواز بھی تھے۔ کانپور کے اس زمانے کے کئی شاعران کے دعا گو تھے۔ راقم نے نواب قیصر حسین خاں کے یہاں حامد تخلص کے ایک شاعر کا قلمی دیوان دیکھا ہے اس کے آخر میں:

قصائد در مدح نواب سید علی حسین خاں صاحب عرف نواب دولھا صاحب متخلص بہ تمنا، ونواب زادگان نواب اکبر حسین خاں صاحب، نواب مظفر حسین خاں صاحب، ونواب احمد حسین خاں بہادر سالک،

وتقریظ کتاب مستند الشعرا مرتضیٰ خاں صاحب متخلص بہ قادر تاریخ بخش نوشتہ شد 1295ھ،

در تاریخ وفات نواب مغفور سید علی حسین خاں صاحب۔ 1305ھ

در تاریخ ختنہ نواب زادہ اولاد حسین۔ 1312ھ

وغیرہ شامل ہیں اور شروع کتاب میں چند خطوط فارسی لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک خط حکیم احسن اللہ خاں دہلوی حکیم خاص شاہ دہلی کے نام بھی ہے۔ اس شاعر حامد کا نام محمد حامد علی خاں ہے اور اس نے ملا نورالدین جامی کی یوسف زلیخا مطبوعہ مطبع نولکشور کانپور کے لیے تاریخ طبع وخاتمہ بھی لکھی تھی۔

نواب دولھا تمنا کے وابستگان دولت میں معجز تخلص کے ایک شاعر کے بارے میں محسن نے تحریر کیا ہے:

''منشی مرزا محمد رضا معجز ولد مرزا اکرم علی، باشندۂ لکھنؤ، بہ سبب رفاقت نواب دولھا صاحب بہادر خویش نواب معتمد الدولہ مرحوم، مقیم کانپور، صاحب دیوان، اول شاگرد محمد علی خاں مسیحا کے بعدہٗ خواجہ وزیر وزیر کے۔''50

معجز نے ناسخ وتساخ سے متعلق معرکوں کے سلسلے میں اپنے تصنیفی کارناموں کی بدولت زمانہ مابعد میں بہت شہرت حاصل کر لی تھی۔

نواب دولھا تمنا کے تین بیٹے تھے اور تینوں شاعر تھے۔ بڑے بیٹے کے تعارف میں لالہ سری رام نے جو لکھا ہے اس کا اختصار یہ ہے:

''سیف نواب سید اکبر حسین خاں خلف نواب دولھا بہادر، 1255ھ (1839) میں پیدا ہوئے۔ 1310ھ میں وفات پائی۔ فنون سپہگری کے شائق تھے۔ علم طب سے آگاہ تھے۔ اس موضوع پر بہت سی کتابیں تالیف کیں۔ اپنے والد مرحوم نواب دولھا متخلص بہ تمنا سے فن شعر میں تلمذ تھا جو حضرت ناسخ لکھنوی کے شاگرد تھے اور آپ نواب معتمد الدولہ وزیر غازی الدین حیدر بادشاہ کے نواسے تھے اور سرکار انگریزی سے ہزار

روپے سے زیادہ ان کو وظیفہ ملتا تھا۔ وقت انتقال ورثا میں ان کے بھائی نواب مظفر حسین
خاں، بھتیجے نواب بنیاد حسین خاں اور ان کی بیوی جو نواب معتمد الدولہ کی پوتی تھیں باقی
رہے۔ کانپور میں اب تک ان کی فیاضی اور سیرچشمی کے افسانے مشہور ہیں"51

نواب دولھا کے مجموعۂ سلام سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر حسین شروع میں اکبر تخلص کرتے تھے۔ پھر اپنے شوق کی رعایت سے سیف تخلص کیا۔ معتمد الدولہ کی پوتی کے ساتھ شادی ہونے کی وجہ سے ان کے حصے کا وثیقہ بھی حق شوہری کے طور پر اکبر کو ملنے لگا تھا لیکن وہ لاولد فوت ہوئے۔

راقم نے نواب قیصر حسین خاں کے یہاں مطبع جماعت تجارت اسلامیہ میرٹھ کی چھپی ہوئی ایک کتاب "اسلام کی حالتِ آئندہ ترجمۂ فیوچر آف اسلام مصنفۂ ولفرڈ اسکاون بلنٹ" دیکھی تھی۔ مترجم کا نام سید اکبر حسین ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ مترجم نواب دولھا کے بڑے صاحبزادے ہوں گے۔

نواب دولھا کے دوسرے صاحبزادے نواب سید مظفر حسین خاں تھے جو فن شعر میں اپنے پدرِ والاقدر تمنا کے شاگرد تھے۔ سرخوش تخلص کرتے تھے۔ ان کی ایک کتاب "اورادالمومنین" راقم نے نواب حیدر علی خاں کے یہاں دیکھی تھی جو 1896 (14-1313ھ) میں اسٹار پریس کانپور میں 1176 صفحات پر چھپی تھی۔ تقریظ نواب سید بنیاد علی جاہ پسر نواب احمد حسین سالک نے لکھی تھی اور قطعات تاریخ سلیمان مرزا مفتون اور غلام احمد احمد کے کہے ہوئے ہیں۔

نواب قیصر حسین خاں کے یہاں ایک مجموعہ فارسی کے قصائد کا موجود تھا جو 331 صفحوں پر رجب 1294ھ (1877) میں چھپا تھا۔ یہ مجموعہ نواب سرخوش کا مملوکہ تھا۔

نواب مظفر حسین خاں سرخوش کی شادی نواب فاطمہ سلطان بیگم بنت نواب سید محمد علی خاں عرف نواب دولھا شمس آبادی کے ساتھ ہوئی تھی۔ سرخوش کی وفات کا قطعۂ تاریخ منیر شکوہ آبادی نے کہا تھا:

"تاریخ رحلت مظفر حسین خاں بہادر"

والا گہر جناب مظفر حسین خاں ‌ ‌ دیندار و دیں پناہ و مددگار اہلِ بیت
رضواں منیر گفت چنیں سالِ رحلتش ‌ ‌ تا کی گلے رسید بدر بارِ اہلِ بیت

1292ھ

نواب سرخوش کے تین بیٹے تھے:

نواب سلطان حسین خاں وقار شاگرد تمنا۔ان کے بیٹوں میں سے دو شاعر ہوئے یعنی نواب خاقان حسین خاں عارف پدر نواب قیصر حسین خان قیصر اور نواب سلطان حسین خاں نسیم شاگرد عارف۔نسیم کے بیٹوں میں نواب محمد حسین خان کوثر صاحب تصانیف تھے ان کی کئی کتابیں جن میں تر جمے بھی ہیں راقم نے دیکھے ہیں۔وقار نے 1950 میں وفات پائی تھی اور مقبرہ گوالٹولی میں آرام فرماتے ہیں۔ان کے تیسرے بیٹے نواب مصطفیٰ حسین خاں تھے۔

نواب دولھا کے تیسرے اور چھوٹے صاحبزادے نواب سید احمد حسین خاں سالک تھے۔ ان کے بارے میں لالا سری رام نے لکھا ہے۔

''سالک نواب سید احمد حسین خاں مرحوم خلف اصغر نواب سید علی حسین عرف نواب دولھا صاحب تمنا...... 1257ھ (1841) میں پیدا ہوئے۔ بڑے معاملہ فہم اور عالی ہمت رئیس تھے۔کتاب بوقلموں بطور کشکول، رسالہ تحقیق اللغات، خمسہ ہفت بند کاشی، زبدۃ المورخین، اسلوب الانشا، کلیات نظم فاری وغیرہ آپ کی تصنیف وتالیف سے ہیں۔آپ نواب بنیاد حسین جاہ رئیس اعظم مرحوم کے والد تھے۔

بہ عارضۂ دق 20 محرم الحرام 1299ھ کو انتقال ہوا۔آپ کی نعش کانپور سے نجف اشرف روانہ کی گئی۔وہیں مدفون ہوئے''52

اس اقتباس میں زبدۃ المورخین غلط ہے۔صحیح نام زبدۃ العروض ہے۔یہ کتاب مطبع انتظامی کانپور میں چھتیس صفحوں پر چھپی تھی۔کتاب بوقلموں علم اخلاق میں ہے اور مطبع شعلۂ طور کانپور میں 1305ھ میں چھپی تھی۔خمسہ ہفت بند کاشی بھی اسی مطبع سے 1280ھ میں 23 صفحوں پر چھپا تھا۔اس کے لیے عبداللہ عزم کانپوری نے قطعاتِ تاریخ کہے تھے۔

منیر اور حامد وغیرہ نے سالک کی مدح میں قصیدے لکھے تھے۔منیر کا ایک شعر یہ ہے ؎

نواب سالک آتے ہیں جب یاد اے منیر　　چلتے ہیں آنکھوں سے طرف کانپور پاؤں

ان تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ نواب دولھا نہ صرف خود شاعر اور شاعر نواز تھے بلکہ ان کی اولاد نے بھی کانپور کے علمی ماحول کو ترقی دینے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

# الف - شاعری،غزل

کانپور انگریزوں کی عملداری میں تھا۔ یہاں ان کے شوق اور ضرورت کی طرح طرح کی چیزیں بنتی اور بکتی تھیں۔ دوائیں اور کل پرزے بھی تیار ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ اسے ایک صنعتی مرکز اور خرید وفروخت کے بڑے بازار کی حیثیت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ ساتھ ہی نواب معتمد الدولہ آغا میر کی اولاد کی سرپرستی میں بڑی تیزی سے یہ شہر تصنیف وتالیف ہی نہیں، مختلف اور متعدد علوم وفنون کی نشر واشاعت کے لیے بھی معروف ہوگیا۔ آغا میر کی آمد کے محض چند سال کے بعد صورتِ حال یہ ہوگئی تھی کہ کانپور کے طرز پر آگرے اور خود لکھنؤ میں بھی مشاعرے آراستہ کیے جانے لگے تھے۔

غازی الدین حیدر کی مسند نشینی کے بعد ہی نواب مرزا حاجی قمر کو لکھنو سے نکلنا پڑا تھا اور اس جلا وطنی کے عالم میں وہ شہر کانپور میں گوشہ نشین رہے تھے۔ غازی الدین حیدر کے اعلانِ بادشاہت کے بعد شیخ امام بخش ناسخ ترکِ وطن کر کے کبھی الہ آباد اور کبھی کانپور میں رہے۔ آخر زمانے میں انھیں کانپور میں اطمینان اور عزت سے چند سال بسر کرنے کا موقع ملا تھا۔ غازالدین حیدر کی وفات سے چند سال پیشتر مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنؤ سے نکل کر اسی کانپور میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہیں انھوں نے وہ ،فسانۂ عجائب لکھا تھا جس نے ان کے نام کو زندۂ جاوید بنا دیا۔

شیخ امام بخش ناسخ نے اساتذۂ سلف کے طرز پر خطِ نسخ کھینچنا چاہا اور غزلیاتِ مدلل لکھنی شروع کیں۔ کچھ مدت کے بعد انھیں نے ''غزلہائے قصیدہ طور'' کی صورت اختیار کر لی تھی مثال کے طور پر ایک غزل کا مطلع اور مقطع یہاں لکھا جاتا ہے ۔

رفتار میں اورنگِ سلیماں ہے یہ گھوڑا　　پر سیرت وخلقت میں تو انساں ہے یہ گھوڑا

کافی ہے فقط ظلِّ الٰہی کا اشارہ　　ناسخ کی طرح تابع فرماں ہے یہ گھوڑا

اگر چہ یہ غزل بظاہر لکھنو میں لکھی گئی تھی، یہ طرزِ خاص شہر کانپور میں بہت تیزی سے مقبول و مروّج ہوا تھا۔ اس غزل کی ردیف ایسی ہے کہ اسے اگر شروع میں لکھ دیا جائے تو یہ غزل ایک اچھی خاصی نظم معلوم ہونے لگے گی۔ فرق صرف اسی قدر ہے کہ اس میں ہر شعر اپنے مفہوم کے اعتبار سے مکمل ہے اور کسی دوسرے شعر کا محتاج نہیں ہے۔ اسی طرح معنی کے لحاظ سے اس غزل کے شعروں میں تسلسل اور ربط کا ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ دیوانِ ناسخ کا اگر بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس طرز پر ناسخ نے ''غزلہائے نظم طور'' بہت کہی ہیں۔

شیخ ناسخ کے ممتاز ترین شاگرد خواجہ وزیر وزیر نے مذکورہ طرز سے ایک اور فائدہ اٹھایا یعنی انھوں نے نعت لکھ ڈالی اس کا مطلع یہ ہے ۔

اللہ رے حُسن رخِ نیکوے محمدؐ　　ہے چشمِ خداوند جہاں سوے محمدؐ

ناسخ کے بعد میر علی اوسط رشک اور امین الدولہ مہر وغیرہ نے اس طرزِ خاص کو خوب ترقی دی۔ اس سلسلے میں چند شاعروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

1-　عیش- ابو محمد

جاج مئو کانپور کی پرانی بستی ہے اس علاقے میں میر علی اوسط رشک کا خاصا اثر تھا اور وہاں میر رشک کے کئی شاگرد موجود تھے۔ عیش بھی انھیں میں سے تھے سعادت خاں ناصر نے ان کے بارے میں لکھا ہے

> ''سروساماں شاعری کو صاحب جیش، منشی ابو محمد تخلص عیش، قاضی زادۂ جاج مئو شاگرد رشک''[1]

محسن نے ان کے حالات میں مفید اضافے کیے ہیں اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

"شیخ ابومحمد فاروقی عیش تخلص ولد شیخ نوراللہ، عزیزوں میں قاضی امین اللہ مغفور جاج مئوی کے، باشندہ کانپور، صاحب دیوان، شاگرد میر علی اوسط رشک" 2ے

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

یا پھرتے تھے وہ ہاتھ لیے ساتھ ہاتھ میں — یاقوں کو بھی دیتے نہیں ہاتھ ہاتھ میں
ہرگز نہیں ہے پاسِ سخن اس کو آج کل — کیا فائدہ ہے دیویں جو ہم ہاتھ ہاتھ میں
ڈھالے ہیں سانچے میں صانع نے تمھارے ہاتھ پاؤں — ہیں خوش اسلوب اور نازک ادا تمھارے ہاتھ پاؤں
معین کب ہے مثلِ بوئے گل یک جامکاں اپنا — لیے پھرتے ہیں ہم دوشِ صبا پر آشیاں اپنا

2- غنی- غنی محمد

یہ عیش کے بیٹے تھے چنانچہ ناصر نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"معرکۂ شعر کا دھنی، غنی محمد تخلص غنی خلف ابومحمد، قاضی زادۂ جاج مئو، پرگنہ کانپور، شاگرد رشک" 3

ان کے احوال میں بھی محسن موسوی نے کئی ضروری اضافے کیے ہیں۔ اس کی تحریر یہ ہے:

"غنی احمد غنی ولد ابومحمد عیش باشندۂ جاج مئو مقیم کانپور، خویش مولوی عباس عاشق جاج مئوی جن کا رسالہ صولت الضیغم ہے، شاگرد میر علی اوسط رشک" 4

مولوی عباس عاشق کے رسالہ صولت الضیغم کا حال نثری تصانیف کے سلسلے میں لکھا جائے گا۔ اس سے پتہ چلے گا کہ یہ راسخ العقیدہ اور جری مسلمان گھرانا تھا۔ یہاں غنی کے کچھ شعر مثال کے طور پر لکھے جاتے ہیں ؎

حیرت دکھا رہا ہے یہ تیرا خیالِ لب — آئینے میں نظر نہیں آتا ہلالِ لب
پریوں کو بھی ملی نہیں یہ نازنیں جبیں — ابرو ترے ہلال ہیں، ماہِ مُبیں جبیں
اے یارو میرے سجدے کا کیا پوچھتے ہو حال — وہ سنگِ آستانہ جہاں ہے، وہیں جبیں
جامِ جہاں نما بنے ساغر شراب کا — اس میں پڑے جو عکس مرے آفتاب کا
پھبتی نئی کہی گلِ رخسارِ یار پر — گویا چمن میں پھول کھلا ہے گلاب کا
پھبتی کہوں گا عارض و چشمانِ یار پر — نرگس کے پاس پھول کھلا ہے گلاب کا

3- مجروح- غلام سعد

"شعر سے اس کے دل بستہ کے فتوح۔ غلام سعد تخلص مجروح، ساکن جاج مئو، پرگنہ کانپور شاگرد میر علی اوسط رشک"5

مجروح کے تعارف میں یہ الفاظ سعادت خاں ناصر نے لکھے ہیں۔ محسن کے تذکرے میں اس کا مذکور نہیں ہے اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

سیر فرما جب وہ رشکِ حور عیں ہو جائے گا　　صحنِ گلشن صاف فردوسِ بریں ہو جائے گا
بھول جائیں گے خیالِ جنت و یادِ ارم　　کوچۂ جاناں میں جانا گر کہیں ہو جائے گا
دیکھ لیں گے ہم انھیں گر عرش پر بھی ہوں گے وہ　　دیدۂ داغ محبت دور بیں ہو جائے گا
گر یہی صورت ہے اے مجروح مشقِ نظم کی　　ملک معنی یک قلم زیر نگیں ہو جائے گا

یہ تینوں شاعر ایک استاد کے شاگرد اور ایک گھرانے سے متعلق تھے۔ تینوں کی زبان، طرزِ بیان اور اندازِ فکر میں بہت یکسانی ہے۔ یہ تینوں استاد (میر رشک) سے استفادہ کے لیے کانپور آتے جاتے رہتے ہوں گے لیکن ان کا بیشتر وقت غالباً جاج مئو میں گذرتا تھا۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ کلام پر رشک اور مہر وغیرہ کے طرز کا اثر تو تھا لیکن ان کی تمام غزلوں میں وہ کیفیت معلوم نہیں ہوتی۔

4- عشقی- شیخ الٰہی بخش

یہ میر علی اوسط رشک کے ان شاگردوں میں سے تھے، جنھوں نے شیخ امام بخش ناسخ کی صحبتوں کا احوال سنا تھا اور بالواسطہ ہی سہی لیکن ان کے کلام سے فیض اٹھایا تھا۔ سعادت خاں ناصر نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"شاعر خوش گوئی، شیخ الٰہی بخش تخلص عشقی، مقیم کانپور، میر علی اوسط کے تلامیذ میں معروف و مشہور۔"6

محسن نے ان کا تعارف کسی قدر تفصیل سے قلمبند کیا ہے، اس طرح:

"محبِ بے ریا، شفیقِ دلی، صادق الولا، میاں شیخ الٰہی بخش عشقی ولد شیخ محمد بخش، بزرگ ان کے باشندۂ بجنور توابعِ لکھنؤ، ان کا مولد و مسکن کانپور، صاحب

دیوان اور تاریخ گوئی میں رستگاہ نہایت رکھتے ہیں۔ شاگرد رشید میر علی اوسط
رشک' 7

محسن نے ان سے متعلق یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے۔

''محب و مونس دلی، شفیق و زکی شیخ الٰہی بخش عشقی، زیادہ کرے اللہ انس ان کا، انیس کنج تنہائی رہے، ان کی صحبت کی برکت سے غم غلط ہوا اور غنچۂ دلِ افسردہ کو ان کے شمیم لطف نے مثلِ صبا شگفتہ کیا۔ ایک روز برسبیلِ مذکورہ ذکر آیا کہ جس زمانہ میں شیر بیشۂ سخنوری، ہژبر نیستانِ معنی استاد راسخ جناب امام بخش ناسخ مغفور وار دِ کانپور تھے، یہ غزل ارشاد فرمائی تھی۔ ع

جب کبھی پہنا جو اس نے زیور کان میں

میں نے کہا اکثر غزلیں آپ نے اسی طور کی فرمائی ہیں۔ اگر سب اعضا میں غزلیں ہو جائیں تو ایک دیوان بطور سراپا ترتیب پائے۔ کچھ جواب ارشاد نہ ہوا مگر دوسرے روز اس غزل سے محظوظ فرمایا۔

کیا نسیم صبح لائی ہے مرا دم ناک میں

اسی طور پر اکثر غزلیں اور بھی فرمائیں مگر افسوس ہے کہ زیست اُس وحید العصر کی، نے وفا نہ کی۔ اس نوازش فرمانے فرمایا کہ انسان بے بقا کو فنا ہے۔ فرصت غنیمت سمجھنا اولیٰ ہے۔ اگر تو فرہاد آسا کمر سعی پر دامنِ ہمت کو چست باندھے اور اشعار شیریں شعرائے ماضی و حال جمع کر کے تذکرہ بطور سراپا لکھے تو غالب یہ ہے کہ نئے رنگ ڈھنگ کا تذکرہ نادر الوجود نایاب ہوگا'' 8

اس تذکرہ کے لیے طرحیں دی گئیں اور ان طرحوں میں کانپور کے علاوہ لکھنؤ اور آگرہ وغیرہ علمی مراکز پر بھی مشاعرے منعقد کیے گئے محسن نے ایسے کئی شاعروں کا ذکر کیا ہے، مثلاً:

''طرح لکھنؤ، مشاعرۂ شہریار مرزا ـــ

یار بے مثل کا ہر وقت ہے جلوہ دل میں — یہ دل صاف مرا ایک ہے صد ہا دل میں

اس میں شریک ہونے والے بعض شاعر یہ تھے:

شیدا منجھلے صاحب، والا جاہ عاشق، محمد بخش شہید، محمد حسن حسن، امداد علی بحر

احسان علی فیض، حکیم قیس، مرزا عباس غنی، محمد مرزا عیش، میروزیر نور

اور:

یہ طرح اکبرآباد میں بھی ہوئی تھی۔ مولف نے یہ غزلیں اسعد الاخبار قمر الدین خاں سے لکھی ہیں ۔

مزے اٹھاتی بہت گور کے فشار میں روح — نکلتی کاش بدن سے ترے کنار میں روح

اس مشاعرے کی جن شعرا کی غزلیں ملی ہیں ان کے تخلص یہ ہیں:

تمنا، مشتاق، ماہ برادر مہر، مرزا، مشفق، عاصی، مشکل

مفتون، نحیف، اعظم، انصاف، ضیا، زاہد، نسیم وغیرہ

ان مشاعروں میں اس زمانے کے چھوٹے بڑے، معروف اور غیر معروف بیشتر شاعروں نے طبع آزمائی کی تھی اور اس طرح ایک مخصوص انداز کی غزلیں کہنے کا سلسلہ جاری ہوا۔ خود عشقی نے بھی اسی طور پر کئی غزلیں کہی تھیں۔ یہاں صرف چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

بال بھورے نہیں اے جان تمھارے سر پر — آتش حسن جبیں کے ہیں شرارے سر پر

بال رکھے نہیں وحشت میں یہ سارے سر پر — اک پری زاد کا سایہ ہے ہمارے سر پر

کھلتی نہ کمر، ہوتی نہ نزدیک اگر ناف — ہے جانِ جہاں باعثِ اظہار کمر ناف

تو جس کو کمر سمجھا ہے وہ شیشے میں ہے بال — آئینے میں چھالا ہے، نہیں اے گل تر ناف

سحر چتون ہے، نگہ قہر ہے، جادو آنکھیں — زم نکل جائے گا دکھلائے گا جب تو آنکھیں

آج سب دوست ہیں، کل ہوں گے یہ دشمن عشقی — دست و بازو و زباں، عارض و ابرو آنکھیں

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ ''غزل ہائے نظم طور'' کہنے کا سلسلہ شیخ ناسخ نے شروع کیا تھا لیکن اس طرز کو نواب امین الدولہ مہر کی موثر سرپرستی اور میر علی اوسط رشک کی استادانہ محنت نے رواج بخشا تھا۔ 1267ھ (1851) میں ان دونوں کے عراق روانہ ہو جانے کے بعد حالات یکسر بدل گئے تھے۔ نظام الدولہ سید کانپور میں خاندان کے بڑے تھے لیکن وہ خود اپنے حالات میں مبتلا تھے۔ معین الدولہ ساحر اور نواب دولھا تمنا اپنی عمر اور آمدنی کے اعتبار سے اتنے موثر

نہیں تھے۔ شاعروں میں منیرشکوہ آبادی کو استادی کا درجہ حاصل تھا۔ انھوں نے خود اپنے دیوان میں لکھا ہے کہ:

''آخر بہ حوادث گوناں گوں مبتلا گردیدہ بہ بیت السلطنت شتافتم''

اور اس موقع پر ''امیر فیاض جناب مولانا احمد حسن خان بہادر عروج'' نے ان کی سرپرستی کی۔ ایسے میں ان کے کلام میں جدت اور ندرت کی وہ صورت کہاں سے آتی جو شہر کانپور کے شعری اور علمی ماحول کو ایک خاص ڈگر پر ڈال دیتی۔ اس زمانے کی ان کی ایک غزل یہ ہے ؎

اِن روزوں لطفِ حُسن ہے، آؤ تو بات ہے — دو دن کی چاندنی ہے، پھر اندھیاری رات ہے
اُس سروقد کی یاد جگاتی ہے رات بھر — سولی پہ آئے نیند، یہ کہنے کی بات ہے
اے صبحِ ہجر میرے ستانے سے فایدہ — للہ آج وصل کی پہلی ہی رات ہے
اے ہوش الفراق، وہ جاتے ہیں شام سے — اے جان الوداع یہ رخصت کی رات ہے
محرومِ تشنگانِ شہادت میں اے منیر — تیغِ ادائے یار میں آبِ فرات ہے

اس طرح رفتہ رفتہ غزل کا قدیمی انداز پھر غالب اور رائج ہو گیا اور کانپور میں جو نیا طرز اُبھر رہا تھا وہ دب کر بالآخر ختم ہو گیا۔

# ب - مثنوی

قصہ گوئی اور افسانہ تراشی سے میر علی اوسط رشک کو کچھ دلچسپی نہیں تھی بلکہ ان کا کہنا تو یہ تھا کہ ؂

اے رشک حالِ غفلت اہلِ سخن یہ ہے　　افسانوں کی تلاش ہے فرہنگ کے عوض

اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ایک مثنوی "دربیان رجعتِ امام مہدیؑ" میں لکھی تھی اور اس کے بعد اپنے استاد شیخ ناسخ کی ایما سے کلوار کے ایک بچے کے قتل کے واقعہ کو بھی نظم کیا تھا لیکن یہ دونوں ہی عشقیہ مثنوی کی روایتوں سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ میر رشک مذہب پسند شخص تھے اور اِن دونوں مثنویوں میں ان کی طبیعت کا یہ میلان نمایاں ہے۔ آخر زمانے میں جب وہ کربلا جانے کا ارادہ رکھتے تھے، اپنے عقیدے کے مطابق انھوں نے ایک اور "مثنویِ تبرا" لکھی تھی۔ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اسے چھپنا نصیب ہوا تھا یا نہیں۔

نواب امین الدولہ مہر کو مثنوی کی صنف سے اتنی دلچسپی بھی نہیں معلوم ہوتی ہے جتنی ان کے استادوں یعنی ناسخ اور رشک کو تھی۔ ان کا جو مطبوعہ دیوان ہماری نظر سے گذرا ہے اس میں کوئی مثنوی نہیں ہے ان کے غیر مطبوعہ دیوان کے بارے میں البتہ کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی ہے۔

مہر اور رشک کے معاملات پر نظر کریں تو حقیقت غالباً یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں شہر کانپور میں صنف مثنوی کے لیے ماحول سازگار نہیں تھا۔ باوجود اس کے اپنے انفرادی شوق سے بعض شاعروں نے چھوٹی بڑی کئی مثنوی لکھی ہیں۔ لیکن بظاہر ان کا معیار کچھ بلند نہیں ہے البتہ موضوع اور مطالب کے اعتبار سے ان میں اچھا خاصا تنوع معلوم ہوتا ہے۔

### 1- صغیر- شیخ حیدر علی

یہ میر علی اوسط رشک کے باکمال اور معروف شاگردوں میں سے تھے۔ ان کا احوال محسن نے اپنے تذکرے میں اس طرح لکھا ہے:

> "شیخ حیدر علی صغیر ولد شیخ دھومن، باشندۂ لکھنؤ، صاحب مشاعرہ، صاحب دیوان، شاگرد میر علی اوسط رشک۔"1

اور لالا سری رام نے ان کے حالات پر اس طرح اضافے کیے ہیں:

> "صغیر شاہ غلام حیدر صاحب مرحوم لکھنوی ابن شیخ دھومن صدیقی، شاگرد رشک 1303ھ میں 70 برس کی عمر تھی اور دھاروپور ضلع پرتاب گڑھ میں قیام تھا۔ ان کی تصنیفات سے ایک دیوان اور مثنوی آئینۂ اختر موجود ہے۔ مذاقِ سخن میں اپنے استاد کے قدم بہ قدم ہیں۔ رعایتِ لفظی اور تشبیہات، استعارہ بالکنایہ اور محاورات کو ان کی شاعری کا خاص معیار سمجھنا چاہیے۔"2

محسن صغیر کے استاد بھائی تھے انھوں نے صغیر کا جو نام لکھا ہے اُسی کو صحیح سمجھنا چاہیے۔ بلاشبہ امکان اس بات کا بھی رہتا ہے کہ پیری میں صغیر "شاہ غلام حیدر" کر کے مشہور ہو گئے ہوں۔

صغیر کو واجد علی شاہ کی خدمت میں رسائی حاصل تھی۔ اپنی تصنیف "بنی" میں بادشاہ نے "چند شاعرِ نامی" میں "میاں صغیر" کو بھی شامل کیا ہے۔ بادشاہ سے متعلق صغیر کے بیانات کو معتبر مآخذ کا درجہ حاصل ہے۔

صغیر کی مثنوی کا نام "آئینۂ اختر" نہیں ہے صحیح نام "آئینِ اختر عرف ظفر نامہ" ہے یہ مثنوی ایک سے زائد بار چھپ چکی ہے۔ دوسرا ایڈیشن جو راقم کی نظر سے گذرا ہے۔ 1912 میں چھپا تھا اس کے سرورق کا اندراج اس طرح ہے:

''حالات زمانہ واجد علی شاہی مصنفہ فقیر صغیر استاد راجا رام پال سنگھ بہادر تعلق دار کالا کانکر، مثنوی آئین اختر عرف ظفر نامہ مطبوعہ مطبع اودھ پریس لکھنؤ''
1276

مثنوی کے شروع میں امجد علی شاہ کا بھی احوال لکھا ہے ایک شعر یہ ہے ؎

زمانے میں امجد علی شاہ کے بہت خوش رہے بندے اللہ کے

اس مثنوی کے قلمی نسخوں کا تعارف قاضی محمد سعید نے اس طرح کرایا ہے

''مثنوی از صغیر، جیم، تصنیف 1276ھ۔ واقعات لکھنؤ مولوی امیر علی، تذکرہ ولی عہد، قطعات تاریخ از قرباں علی مضطر، اسیر، امیر علی ہلال''3

اور:

چند اوراق مثنوی صغیر لکھنوی متعلق واجد علی شاہ ع پلا ساغرا ے ساقی مہرباں لارڈ ہارڈنگ کی آمد کانپور۔''4

سید کاظم حسین تنویر نے اس کی تاریخ میں یہ شعر کہے ہیں ؎

ہے بری سب عیوبِ شعری سے اس میں نقصِ کلام ہے معدوم

صاف لکھا یہ مصرع تاریخ پاک ہے یہ وقائع منظوم

1276ھ

## 2- شائق- منشی فتح علی

نام شائق کا منشی فتح علی تھا لیکن حالات ان کے بالکل معلوم نہ ہو سکے۔ بجز اس کے کہ انھوں نے ایک مثنوی گلزار نشاط کے نام سے لکھی تھی جس کے بارے میں مذکور ہے کہ:

''افضال باری سے مثنوی گلزار نشاط نے تاریخ پانزدہم شہر محرم 1264ھ (دسمبر 1847) نظارت طبع سے فراغت پائی اور محمد مصطفیٰ خاں ولد حاجی محمد روشن مرحوم کے مطبع مصطفائی محلہ محمود نگر بوزیرا کبری دوران میں پہلا ایڈیشن اس گلشن بے خزاں سے فراغ پا تھ آئی''5

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطبع اس وقت تک لکھنؤ میں تھا۔ پروفیسر گیان چند نے اس مثنوی کا سال تصنیف 1263ھ لکھا ہے جو غلط ہے۔

3- مجروح- غلام سعد

ان کا حال پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ان کا نام غلام سعد تھا اور جاج مئو (کانپور) کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ''اعجازِ عشق'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی جو پہلی بار ایک ''مجموعۂ مثنوی'' میں شامل ہو کر کانپور کے مطبع مصطفائی میں چھپی تھی۔ اس کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے:

''مجموعۂ مثنویات شعلۂ عشق و دریائے عشق و اعجازِ عشق و گل و صنوبر

و سراپا سوز در مطبع مصطفائی۔ کانپور۔ صفر 1267ھ حلیۂ طبع پوشیدہ''6

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی آئندہ سال یعنی 1268ھ (1852) میں غالباً الگ سے بھی چھپی تھی لیکن افسوس ہے کہ ہمیں وہ دستیاب نہیں ہو سکی۔

4- ہلال- امیر علی خاں

میر رشک کے معروف شاگردوں میں سے تھے۔ آخر زمانے میں انھوں نے بھی ایک مثنوی لکھی تھی۔ اس کا ذکر عبدالغفور خاں نساخ نے اس طرح کیا ہے: ''ہلال امیر علی خاں ولد تراب خاں، صاحب دیوان و مثنوی مقفّی و مردّف و سراپا ہیں''

لیکن اس مثنوی کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ صغیر نے ''تاریخ وفات امیر علی خاں ہلال'' اس طرح لکھی ہے ؎

افسوس ہلال ازیں جہاں رفت  دل در غم اوبہ اضطراب است
شیریں سخنے بہ شاعراں بود  دیوان کہ از دست خوش کتاب است
جستیم چوں صغیر تاریخ  دل گفت حیات چوں حباب است
بنویس دو حرف از سروپا  باقی زحباب غرقِ آب است
اعداد حروف چوں نوشتم  یک یک کم شد ہمیں حساب است

انگریزوں کی عملداری ہونے کی وجہ سے کانپور کے علاقے میں عیسائیت کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس صورت حال کے ردِ عمل کے طور پر اس خطے میں بعض مذہبی مثنویاں لکھی گئی تھیں مثلاً مولانا عباس علی فاروقی جاج مئوی متخلص بہ عاشق کی دو مثنویوں کے عنوان یہ ہیں:

مثنوی جہاد نامہ اور مثنوی معدنِ عصمت یعنی قصہ بی بی مریم

ان کا ذکر آگے آئے گا۔

شعرائے کانپور کی مثنویاں بیشتر دستبرد زمانہ سے نایاب ہوگئی تھیں۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اہلِ تواریخ کو ان کی طرف توجہ نہیں ہو سکی۔ کانپور کی ایسی غیر معروف مثنویوں میں سے ایک سید امداد علی انعام شاگرد فرد کی مثنوی "سرور خاطر" ہے۔ 8 ان کمیاب مثنویوں کی اگر جستجو کی جائے تو بعض لائق توجہ حقیقتوں کے سامنے آنے کا امکان ہے۔

# سلام و مرثیے

1-  گریاں وسوزاں

نواب امین الدولہ مہراوران کے دونوں استاد یعنی شیخ ناسخ اور میر رشک بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے، ان کے مطبوعہ دواوین میں ایک بھی مرثیہ موجود نہیں ہے، اس کے باوجود ان کی طبیعتیں پوری طرح مذہب پسند تھیں اور اس حقیقت کا ان کی غزلوں سے بھی بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ اسی صورت حال کا نتیجہ یہ تھا کہ راقم نے ان کے اخلاف نواب سید حیدر علی خاں اور نواب سید قیصر حسین خاں کے ذخیرہ میں اس قسم کی کتابیں بھی دیکھی تھیں:

1-  بحرالمصایب  سید امداد علی  مطبع اثنا عشری لکھنؤ  568 صفحے

2-  دہ مجلس فارسی  مصنف کا نام، زمانہ کتابت وغیرہ نامعلوم۔

پہلے یہ کتاب ''فاطمہ سلطان بیگم'' کی تھی، پھر یکم جولائی 1938 کو نواب شاہجہاں بیگم کی ملکیت میں آ گئی۔

3-  منتخب المصایب معروف بہ مجالس حسینیہ  حکیم سید حسین گریاں

مطبع تصویر عالم لکھنؤ  باراول 1224ھ/1909

میلاد علی  مولوی رکن الدین احمد عاصی  سناتن پریس سلطان پور

بار دوم 13 / رجب 1354ھ

ان میں سے گریاں بہ گمانِ غالب وہی شخص ہے جس کے بارے میں محسن نے لکھا ہے:

''سید محمد حسین گریاں خلف سید حسین علی سوزاں، پوتے میر اکبر علی برچھیت کے، باشندۂ لکھنؤ''۔1

یہ گریاں اور سوزاں دونوں سلام اور مرثیے کہتے تھے اور میر ضمیر کے تلامذہ میں سے تھے۔ گریاں نے ترجمہ کا کام بھی کیا تھا چنانچہ نواب حیدر علی خاں کے یہاں ان کی یہ ایک کتاب بھی محفوظ تھی:

سوانح عمری امیر مختار (ترجمہ) حکیم سید حسین گریاں صادق پریس لکھنؤ 1929 64 صفحے

سلام اور مرثیے کی جو کتابیں راقم کی نظر سے گذری ہیں ان میں ایک یہ ہے:

مرثیہ ہائے میر مونس (جلد چہارم) مطبع دبدبۂ احمدی لکھنؤ مارچ 1902

اس کے سرورق پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

''یہ کتاب خاص مذہب اثنا عشری کی ہے، اہل سنت ملاحظہ نہ کریں۔''

اِس ذکر سے مقصود صرف اس حقیقت کا اظہار ہے کہ کسی سُنّی طالب علم کے لیے مرثیوں کے بیش بہا علمی دفاتر تک رسائی حاصل کر لینا بھی آسان نہیں تھا چنانچہ خوش گمانی سے کام لینے کے سوا اُس کے پاس کوئی صورت نہیں ہے۔

2- تمنا- سید علی حسین خاں

نواب معتمد الدولہ آغا میر کے اخلاف میں نواب سید علی حسین خاں عرف نواب دولھا تمنا تخلص کی سلام اور مرثیہ وغیرہ سے دلچسپی ظاہر اور ثابت ہے، اُن کے سلاموں کے ایک مطبوعہ مجموعہ کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں ایک قلمی مجموعہ بھی ہے جس کی کیفیت اس طرح ہے:

''سلامہائے تمنا 2 اوراق 102 سطریں 14

سن کتابت 1296ھ (1879)

ابتدا ؎

عاشور کی سحر کو یہ شب کا کلام تھا　　آیا نہ چین دھیان جب اس روز کا ہوا

خاتمہ ؎

آرزوئے دل نا شاد تمنا نکلے　　کربلا میں مجھے پہنچائے جو دانا پانی

اسی کتب خانے میں مختلف شاعروں کے سلاموں کا ایک اور مجموعہ بھی ہے۔[3] اس میں بھی تمنا کے سلام شامل ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تمنا کے سلام مقبول بھی تھے۔

تمنا کے اخلاف بھی عموماً سلام اور مرثیے کہتے تھے چنانچہ اُن کے سلاموں کے مطبوعہ مجموعے میں ان کے بڑے صاحبزادے نواب سید اکبر حسین خاں اکبر وسیف تخلص کے بھی دو سلام شامل ہیں۔ آزاد لائبریری میں محفوظ سلام اور مرثیوں کے بعض قلمی مجموعوں میں بھی اکبر کی تخلیقات شامل ہیں۔ گوکل پرشاد رسا نے نواب دولھا تمنا کے ایک شاگرد کی بھی نشاندہی کی ہے۔ لکھا ہے:

''ضو، سید آغا علی متوطن کانپور، شاگرد نواب سید علی حسین خاں بہادر تمنا کے ہیں۔''[4]

نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بھی مرثیہ وغیرہ کہتے تھے یا نہیں۔

### 3- مقبل- اکبر علی

شاعری اور مرثیہ گوئی ان تنویر اور مقبل کے خاندان میں موروثی تھی۔ یہ خود میر علی اوسط رشک کے بھتیجے اور شاگرد تھے۔ محسن نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

''میر کاظم حسین تنویر ولد میر حسین داروغۂ سرکار بہو بیگم صاحبہ والدۂ نواب آصف الدولہ بن میر اکبر علی مقبل مرثیہ گو، باشندۂ فیض آباد، مقیم لکھنؤ، شاگرد میر علی اوسط رشک۔''[5]

خود تنویر نے دیوانِ رشک کے قطعہ تاریخ طباعت میں اُن کو اپنا ''عم'' کہا ہے ؎

دیکھ کر حُسن کلام عم و استادِ شفیق　　طالب تاریخ ہجری ہو گئی فکر حقیر

اس صورت میں ضروری ہے کہ سید سلمان پدر رشک اور مقبل پدر میر حسین بھی آپس میں بھائی بھائی رہے ہوں۔ سید سلمان کے بارے میں میر رشک نے کہا ہے۔

آں سید واسطی و حلی و فقیہ　　در علم و عمل رشید و کامل ہے ہے

لیکن ان کے بارے میں اس قسم کی کوئی بات نہیں کہی ہے جس سے سید سلمان کا شاعر ہونا

معلوم ہو۔ سید سلمان رشک کو بہت کمسن چھوڑ کر مر گئے تھے۔ خیال ہوتا ہے کہ بوقتِ مرگ خود ان کی عمر بھی بہت زیادہ نہ رہی ہوگی۔ رشک نے ان کی وفات کی تاریخ اِس طرح نظم کی ہے ؏

اربعا بست ویکم بودہ ز ماہِ شوال

1219ھ

میر اکبر علی مقبل کے حالات کسی ذریعے سے معلوم نہیں ہو سکے البتہ آزاد لائبریری علی گڑھ میں کئی ایسے قلمی مجموعے موجود ہیں جن میں مقبل کے سلام اور مرثیے بھی شامل ہیں۔ ایک مجموعے کی کیفیت اِس طرح ہے:

"سلامہائے مقبل و عاصی مقبل و عاصی اوراق۔ چھ

ہر صفحہ پر بارہ سطریں سنہ کتابت: نامعلوم

ابتدا

سلامی شہ کا جو کٹ کر گرا زمیں پر سر زمیں کا پہنچا وہیں چرخِ ہفتمیں پر سر

خاتمہ

دل میں عاصی کے یہ ہے آرزو اے ابنِ علی حق مجھے روضۂ شبیر دکھائے عباس"[6]

اس مجموعے میں کل آٹھ سلام ہیں۔ افسوس ہے کہ اِس عاصی کا بھی تعین نہیں ہو سکا، شاید مقبل کا کوئی ہم عصر ہوگا۔

## 4- تنویر- میر کاظم حسین

میر حسین کے بارے میں بھی کوئی مفید اور نتیجہ خیز بات معلوم نہیں ہو سکی ہے البتہ ڈپٹی کلب حسین خان نادر نے تنویر کے ذکر میں اتنا لکھا ہے:

"تنویر سید کاظم حسین، صاحب دیوان و مؤلف عروض منظوم و مراثی، شاگرد میر علی اوسط رشک ولد میر حسین ابن میر اکبر علی لکھنوی۔"[7]

اور گوکل پرشاد رسا نے بھی تنویر کی مرثیہ گوئی کا ذکر کیا ہے:

"تنویر سید کاظم حسین ولد میر حسین ابن میر اکبر علی مقبل، مؤلف رسالہ عروض وغیرہ شاگرد میر علی اوسط رشک، عاشقانہ کلام کے سوا مرثیہ بھی فرماتے ہیں۔ فیض آباد کے

باشندے ہیں۔ میر حسین مرحوم آصف الدولہ بہادر کی سرکار میں داروغہ تھے۔"[8]

افسوس ہے کہ فی الوقت ہمیں تنویر کے سلام اور مرثیے دستیاب نہیں ہو سکے۔

## 5- صغیر- شیخ حیدر علی

میر رشک کے شاگردوں میں صغیر اس اعتبار سے بہت نمایاں تھے کہ انھوں نے مختلف شعری اصناف میں قابل قدر یادگاریں چھوڑی ہیں چنانچہ ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ لالہ سری رام نے ان کے ذکر میں یہ اضافہ کیا ہے کہ:

"علاوہ غزل کے مرثیے بھی کہے ہیں۔"[9]

لیکن ان کی مرثیہ گوئی کا تذکرہ کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ لالہ صاحب نے صغیر کے بعض مرثیوں کے اقتباس بھی اپنے تذکرے میں محفوظ کر دیے ہیں۔ وہیں سے کچھ اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

الف۔ صفت اسپ

دُلدل ہے سر سے پاؤں تک اسپ پری شیم — رفتار میں ہے کبک تو آہو میانِ رَم
نقش ہلالِ نعل سے ظاہر ہے یک قلم — ماہی ہے پشت روئے زمیں ہے قدم قدم
فیروزہ عکس رنگ سے ہر شے ہے زمین پر
جمتا ہے اِس کے سایہ سے سبزہ زمین پر

اس باد پا کے وصف ہیں بے حد و بے حساب — طاؤس ہے جمال میں، اُڑنے میں ہے عقاب
نظروں میں مثلِ نور ہے، آنکھوں میں مثلِ خواب — گاہے ہلالِ نعل ہوا، اور گہہ رکاب
شاہانہ دبدبہ ہے نمودار آپ سے
ڈنکے کی چوٹ گرد ہے گھوڑوں کی ٹاپ سے

ب۔ صفت تیغ

بجلی تھی ذوالفقار صفِ کارزار میں — کُشتوں کے ڈھیر کرتی تھی ایک ایک وار میں
گاہے جو سو میں تھی تو کبھی تھی ہزار میں — ہلچل سی پڑ گئی سپہ نابکار میں
ترکش تھے تنگ، تنگ دہن تھا میان کا
چھپنے کو ڈھونڈتے تھے وہ گوشہ کمان کا

جب خود پر پڑی تو گلے تک اُتر گئی    گردن سے تا بہ سینہ گئی ، تا کمر گئی
دو کر چلی کمر کو تو وہ زین پر گئی    وہ زین سے زمین پہ بالشت بھر گئی
نکلی زمین سے تو یہ غُل بر محل ہوا
گاوِ زمیں کی شاخ سے پیدا یہ پھل ہوا

یہ اشعار شاعر کی تیزیٔ فکر، قدرتِ کلام وغیرہ کے علاوہ زبان کے روزمرّہ اور محاروں پر اس کی ماہرانہ بلکہ حاکمانہ دسترس کے مظہر ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ صغیر کے مرثیے اس کے زمانے کے بہترین مرثیوں میں سے تھے۔

ان چند کے علاوہ میر رشک کے تلامذہ میں سے اور بھی بعض شاعر مرثیہ گو ہوئے مثلاً گلشن الدولہ مرزا علی بہار تخلص سے عبدالغفور خاں نساخ کی ملاقات ہوئی تھی اور نساخ نے ان کو "مرثیہ گو" بتایا ہے۔

کانپور کے اُس ماحول میں بتدریج مرثیہ خوانی نے بھی فن کا درجہ حاصل کرلیا تھا اور اس کے انداز بھی مختلف اور متنوع ہو گئے تھے۔ بعض لوگوں نے اس فن میں اختصاص حاصل کرلیا تھا چنانچہ وہ اپنے مخصوص فن کے تعلق سے ہی جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ میر علی اوسط رشک کے مطبوعہ دیوان میں ایسے دو شخصوں کی وفات کے قطعۂ تاریخ ملتے ہیں جو اس طرح ہیں:

6- ببر- علی مرثیہ خواں

از ستمِ گردشِ گردونِ پیر    مُرد عجب مَرد جواں حیف وائے
مُردنِ ایں ماتمِ جانسوز بود    شد ہمہ را وردِ زباں حیف وائے
بود خوش آواز دریں کانپور    جملہ بگویند چساں حیف وائے
مصرعِ تاریخ مسیحی رسید
ببر علی مرثیہ خواں حیف وائے

1841(1257ھ)

7- میر- علی رزم خواں

مُرد بیجوئے وقت میر علی رزم سخوانِ حُسین حیف اے وائے
بود علّام علمِ موسیقی گوئم از شور و شین حیف اے وائے

زہرہ تاریخِ رحلتش فرمود
ثانی تانسین حیف اے وائے

1258ھ(1842)

اِن قطعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نواب امین الدولہ کی سرپرستی میں کانپور میں مرثیہ خوانی اور رزم خوانی نے ترقی کر کے علاحدہ فن کا درجہ پالیا تھا۔ دوسرے شہر میں ان کی ترویج نسبتاً بعد میں ہو سکی تھی۔

# د - قصیدہ

باوجود اس کے کہ نواب معتمد الدولہ آغا میر کو اپنی مدح میں قصیدے سُننے کا کچھ زیادہ شوق نہیں تھا، ان کے وقت کے بعض معروف شاعروں نے صلہ اور انعام کی خاطر قصیدے لکھے تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے حالات میں بھی ایک قصیدے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

> ''دراصل یہ قصیدہ معتمد الدولہ کی مدح میں تھا۔ غالب نے یہ بات کہ قصیدہ نہ کہہ سکا، مصلحتاً لکھی تھی۔ فی الحال اس قصیدے کے ایک سو چار اشعار ہیں۔ ابتدا میں ایک سو دس تھے۔ معتمد الدولہ سے ملاقات نہ ہوئی اور یہ قصیدہ پیش نہ ہوا تو وہ اسے نواب مرشد آباد کے نام سے شہرت دینا چاہتے تھے لیکن یہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آ سکا۔ غالب ایک غیر مطبوعہ خط میں محمد علی خاں (باندہ) کو لکھتے ہیں کہ میں نے معتمد الدولہ کی مدح میں جو قصیدہ کہا تھا وہ جب تک کہ ترمیم نہ ہو کسی کو دکھایا نہ جائے۔
>
> قصیدہ کہ در مدح آغا میر گفتہ ام خدای داند کہ برائے خاندان من طرفہ داغ بدنامیست ولطف اینکہ یک صد و دہ شعر را از سطحہ حک ساختن نمی توانم...... نواب مرشد آباد نیز سیّد زادہ است۔ ایں قصیدہ را بنام وے شہرت دہم، گو بہ ملازمتش نارسیدہ ...... لیکن مداح بودن من ہمایوں جاہ (نواب مرشد آباد) را بر من ناگوار نیست۔

توقع تازہ مانے کہ اشعار موضح اسم ممدوح.... قصیدہ را بہ کس نہ نمایند وعیب فرداں را چوں بزرگاں پوشند۔''[1]

معتمد الدولہ کی مدح کو غالب نے اپنے خاندان کے لیے ''داغ بدنامی'' کہا ہے۔ مناسب یہ تھا کہ اِس پردہ اپنی بیوی کے خاندان کا ذکر کرتے۔ صحیح یہ ہے کہ غالب کے لیے بدنامی کی بات محض کہنے کے لیے تھی، عملاً انھوں نے ساری عمر میں ایسی باتوں کی کبھی پرواہ نہیں کی تھی۔

معتمد الدولہ کی وفات کے بعد میر علی اوسط رشک کے ایک شاگرد خوش وقت علی خاں خورشید کے توسط سے مرزا اسد اللہ خاں غالب نے معتمد الدولہ کے بڑے صاحبزادے ''امین الدولہ آغا علی خاں نواب عالی جناب معلا القاب'' کی خدمت میں رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، چنانچہ نواب موصوف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''......دریں روز ہا خان صاحب مہربان خوش وقت علی خاں را بہ خرامش اتفاق افتاد۔ چوں دراں محفل از بار یافتگان و مرا از دوستان مہر بانند، نامہ بہ ایشاں سپردم تا چوں برسند برسانند، من نیز...... بہ سراپردہ قرب جایافتہ باشم و پردۂ بیگانگی از میاں برخاستہ باشد...... منتخب دیوان ریختہ کہ ورقے چند بیش نیست از جانب خاکسار ہدیۂ آں بارگاہ است...... دو دیوان فارسی نیز بہ نظر گاہ التفات خواہد گذشت۔ حالیا غزلے ہم از اں اوراق نگاشتہ می شود تا از سوز درون نامہ نگار خبر تواند داد۔ غزل

حق کہ حق است سیح ست فلانے بشنو — بشنوے گر تو خداوند جہانے بشنو

یا رب بساط آں خجستہ بزم ہموارہ گذرگاہ بہاراں بادو پیوستہ نظرگاہ امیدواراں والسلام والاکرام۔''[2]

خوش وقت علی خاں کے احوال میں سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

''ملقب بہ تازہ گویان، موزون الطبع، خوش وقت علی خاں تخلص خورشید، مرزا محمد رضا برق کا شاگرد جدید۔[3] پہلے یہ شاگرد میر علی اوسط رشک کا تھا اور امیر علی خاں ہلال شاگرد مرزا محمد رضا برق کا۔ اب ہلال کو اگر شاگردی پر رشک کی دعوائے کمال ہے۔ یہ خورشید نعم البدل ہلال ہے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ امین الدولہ اپنے پدر والا قدر کی روش پر قائم رہے اور مرزا کو ان کی توقع کے مطابق جواب نہیں ملا۔

نواب مہر اور میر رشک وغیرہ کے دواوین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کانپور میں مختلف تقریبوں سے متعلق قطعات تاریخ کہے جاتے تھے۔ قصیدے پیش کرنے کا رواج نہیں رہ گیا تھا۔ میر رشک نے نواب مہر کی تعریف کرتے ہوئے ایک قطعہ میں کہا تھا ؎

نوکر بھی ہوں اس کا کہ جو تقریب کوئی ہو　　تکلیف نہ دے قطعہ کی اللہ رے اخلاق

اسی میں یہ مذکور بھی ہے کہ ہاتف بھی تقریب کی مناسبت سے مدح، یا اگر شاعر قصیدہ پڑھ رہا ہو تو برعکس مطلع پیش کرنے کے بجائے قطعۂ تاریخ نذر کردینے کی ہدایت کرتا ہے ؎

فرسودۂ ہاتف نے ہدایت جو مجھے کی　　تاریخ کا قطعہ بھی بڑھایا پے الصاق

اور اُس زمانے میں فنِ شاعری کا مقتضا بھی بس اسی قدر تھا ؎

ہوئی رشک کو فکر تاریخ لاحق　　کہ یہ مقتضائے فنِ شاعری ہے

دلّی میں کاملیت کے لیے ضروری تھا کہ شاعر قصیدہ کہنے کی قدرت بھی رکھتا ہو لیکن کانپور میں اس صنف کی اہمیت اس طور پر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ میر علی اوسط رشک نے خود اپنے دیوان کے بارے میں کہا تھا ؎

دیوان و مخمس و رباعی، قطعہ　　با صحت لفظ و با صفا شد مطبوع

اس سے دو اہم نکتے سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ اس شہر (کانپور) میں مخمس، رباعی اور قطعہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ ان کو عملاً دیوان کے لازمی جُز کا درجہ دیا جانے لگا تھا۔ دوم یہ کہ معمولاً دیوان سے مُراد دیوان غزلیات ہی ہوتا تھا۔ اگرچہ دوسری اصناف مثلاً مخمسات وغیرہ کے دواوین بھی اس زمانے میں مرتب کیے جانے لگے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ امین الدولہ مہر اور میر رشک کے عراق کے لیے روانہ ہو جانے کے بعد شاعروں نے حصولِ مقصد کے لیے قصیدے کہنے شروع کردیے تھے۔ ممدوح بھی بیشتر کم عمر اور نسبتاً کم حیثیت لوگ تھے۔ اس مداحی سے ان کے دل بھی خوش ہو جاتے تھے۔ اس صورتِ حال کا فائدہ یہ ہوا کہ کانپور میں قصیدہ گوئی کا پھر سے رواج ہو گیا لیکن معیار بتدریج پست سے پست تر

ہوگیا۔ حامد اور منیر وغیرہ کے قصیدوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ نواب قیصر حسین خان بہادر کے یہاں راقم نے ایک مطبوعہ دیوان قصائد دیکھا ہے جو رجب 1294ھ میں 331 صفحوں پر چھپا تھا۔ وہ نواب سید مظفر حسین خاں (سرخوش تخلص ابن نواب دولھا تمنا) کانپوری کا مملوکہ تھا۔

# ۵ - تاریخ گوئی

کانپور کے علاقے میں تاریخ گوئی کے فن کو جس طور پر اور جس حد تک فروغ حاصل ہوا تھا، اس کی مثال کسی دوسرے علمی اور تہذیبی مرکز پر نہیں ملتی ہے۔ ہوا یہ تھا کہ یہاں پر تاریخ گوئی نے پوری طرح قصیدے کی جگہ لے لی تھی۔ بادشاہ کے جشن جلوس کے موقع پر بھی کانپور کا شاعر قصیدے کے بجائے صرف ایک قطعۂ تاریخ کہہ لینا کافی سمجھتا تھا، اور یہ بات کہ اسی قطعہ کو موزوں کرنے پر وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کے استعمال اور اظہار کی تمام تر کوشش کرتا تھا اور اپنے ممدوح سے اپنی اسی محنت اور کاوش کی داد چاہتا تھا۔ یہاں مثلاً میر علی اوسط رشک کا ایک قطعہ درج کیا جاتا ہے۔

قطعہ تاریخ بارے جلوس محمد علی شاہ بادشاہ

| | |
|---|---|
| خسرو عالم و آفاق پناہ | ناسک دین نبیؐ ظل اللہ |
| 1253 | 1253 |
| شیر ساں بہر عدو میر نگہ | اے توئی مہر ولیعہدت ماہ |
| 1253 | 1253 |
| مخزن لطف کرم ، معدن جود | ولی راحم و شاہ دلخواہ |
| 1253 | 1253 |

| | |
|---|---|
| ذر شہوار محیط ملت | مہر تاج تو و مہ نام کلاہ |
| 1253 | 1253 |
| این بجا وارثِ تاج و دیہیم | سمع از حکم شریعت آگاہ |
| 1253 | 1253 |
| باد با صحت و اقبال خدا | شہ اسکندر ثانی جمجاہ |
| 1253 | 1253 |
| رشک ہر مصرعے آمد بحساب | با ادب مخبر اجلاسِ شاہ |
| 1253 | 1253 |

سات شعر کا یہ قطعہ ہر طرح مرصّع اور مزین ہے۔ ہر لفظ شائستہ اور رشستہ اور ہر ترکیب پُر شان و شکوہ۔ افعال کا استعمال نہ ہونے کے برابر کیا گیا ہے۔ ہر مصرعے سے جلوس کا ہجری سال برآمد ہوتا ہے اور یہ صورت استقلال اور استحکام کی مظہر ہے۔ ہر مصرع با معنی اور برمحل اور ہر شعر اپنی جگہ پر مکمل اور مستقل ہے۔ مضامین سب موقع اور محل سے پوری مناسبت رکھتے ہیں، وہ زمانہ تھا جب اس قسم کی کاوشوں کی قدر ہوتی تھی۔ پھر زمانے کی ہوا بدل گئی چنانچہ ڈپٹی کلب حسین خان نادر نے لکھا ہے کہ:

> ''ایک منشی نثار نے کسی تاریخ میں دیکھا تھا کہ ایک بادشاہ نے جب ابتداءً تختِ شاہی پر جلوس کیا تو ایک منشی نثار نے دو فقرے صنعتِ سجع میں لکھ کر پیش کیے کہ اس میں سے سن جلوس بھی نکلتا تھا۔ اس بادشاہ نے صلہ بے انتہا دیا۔ فی زمانناً ایک منشی نے ایک تخت نشین حال کے جلوس کے دن ہزار فقرے اسی صنعت میں لکھ کر گزرانے۔ حضرت نے بہ گوشۂ چشم بھی اعتنا نہ کیا۔''1

1- رشک- میر علی اوسط

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ نواب امین الدولہ مہر کو تاریخ گوئی کا بہت شوق تھا، انھوں نے اپنی متعدد غزلوں کے لیے تاریخی مقطعے کہے تھے، ان کے اثر سے کانپور کے تقریباً سبھی شاعر فنِ تاریخ گوئی سے تھوڑی بہت دلچسپی لینے لگے تھے۔ میر علی اوسط رشک نواب امین الدولہ کے استاد ہونے

کی وجہ سے ''استادشہر'' کا درجہ رکھتے تھے، انھوں نے اس فن کو بڑی محنت اور کوشش سے ترقی دی اور اس کے اصول وضوابط بھی مرتب کیے مثال کے طور پر:

الف۔ امین الدولہ کے ایک بیٹے کی پیدائش سے متعلق قطعہ میں رشک نے کہا ہے ۔

سُن کے یہ ستہ ضروری مجھ سے ہاتف نے کہا　　چاہیے مُلکِ نصاریٰ میں بھی پیدائش کا پاس

اور ہاتف کی اس ہدایت کے مطابق انھوں نے جو تاریخ کہی اس سے سالِ عیسوی معلوم ہوتا ہے، اس طرح ہے ۔

مصرعِ تاریخِ سامانِ طرب ہے عیسوی　　ناچ، رنگ، انعام، کھانا، دھوم کے خلعت، لباس

1841

اس سے ظاہر ہے کہ شاعر جس علاقے میں مقیم ہو یا جس خطے کے واقعہ کی تاریخ کہنا چاہتا ہے، مناسب یہ ہے کہ وہاں پر مروّج سَن میں ہی تاریخ کہے۔

ب۔ تاریخ گو کے لیے مناسب ہے کہ سَنوں کے زیادہ سے زیادہ نظاموں سے واقفیت حاصل کر سکے۔ کم سے کم اُن سنوں سے اس کے لیے واقف ہونا ضروری ہے جن کا اس کے زمانے اور علاقے میں رواج ہو۔ میر علی اوسط رشک نے اپنے دیوان کی طباعت کی تاریخ پہلے ہجری سن میں، پھر عیسوی سَن میں کہی۔ اس کے بعد تیسری تاریخ سَن فصلی میں کہی۔ اس طرح ۔

چو گفتم سال ہجری و مسیحی　　کہ ہر تاریخ را ہست اعتبارے

نمودم فکرتِ تاریخ دیگر　　کہ ایں ہم ماند از من یادگارے

نوشتم مصرعِ تاریخِ فصلی　　کلام رشک شد مطبوع بارے

1255

اس میں شک نہیں کہ میر علی اوسط رشک نہایت کامیاب تاریخ گو تھے۔ سعادت خان ناصر نے ان کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

''میر علی اوسط صاحب تخلص رشک، گویا تاریخ کا جامہ ان پر قطع ہوا ہے۔''2

میر صاحب نے بڑی کثرت سے تاریخیں کہی تھیں لیکن ان کی شاید ہی کوئی تاریخ ہوگی جس میں تعمیہ یا تخرجہ سے کام لیا گیا ہو۔ بیشتر تاریخیں بیساختہ اور برمحل ہیں، مثلاً نصیرالدین حیدر بادشاہ دوم

کی وفات کی تاریخ اس طرح کہی ع

الٰہی بخشائے بر حال آں

1253ھ

خیال کرنے کی بات ہے کہ یہی وہ بادشاہ تھا جس نے میر رشک کے آقا نواب امین الدولہ مہر کے والد نواب معتمد الدولہ آغا میر کو قید کرنے کے بعد لکھنؤ سے جلا وطن کر دیا تھا۔

رشک نے ''صوری و معنوی'' تاریخیں بھی بہت کہی ہیں اور بہت برجستہ کہی ہیں مثلاً منا جان کی وفات کی تاریخ اس طرح کہی ہے ؎

ہوئی تاریخِ رحلت معنوی و صوری          محرم بارہویں اتوار کا دن وائے

1262ھ

شیخ امام بخش ناسخ میر رشک کے استاد تھے، ان کی وفات کی کئی تاریخیں کہی تھیں۔ یہاں ان میں سے دو نمونہ کے طور پر نقل کی جاتی ہیں:

تاریخ از دائرۂ ہزج

رگ و پے داغ و خستہ تا ابد کردی          پیاپے ظلم بے پایاں و حد کردی
نوشتم سالِ مرگِ ناسخ ایں مصرع          چہ بے بے، عشرۂ سیوم بد کردی

تاریخ از دائرہ متقارب

اُٹھا مرگِ ناسخ کا غل چار سو سے          گیا لطف تحقیق کا گفتگو سے
کہا رشک نے مصرعِ سالِ رحلت          دلا شعر گوئی اُٹھی لکھنؤ سے

سعادت خاں ناصر نے اس قطعہ کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''دوسری تاریخ کہ دو بحر میں پڑھی جاتی ہے۔ متدارک: فاعلن ہشت بار۔ متقارب: فعولن ہشت بار......''3

آخر میں رشک کی کہی ہوں ایک اور قابل توجہ تاریخ یہاں لکھی جاتی ہے:

''در تعمیر مسجد و چاہ و مدرسہ کہ بانیش مولوی سلامت اللہ صاحب اند۔''

رشک در یک مصرع تاریخ آورد این سہ نام ___چاہِ شیریں، مسجد معقول و زیبا مدرسہ___

1267ھ

اِن چند مثالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ میر رشک نے طرح طرح کی تاریخیں عموماً بے ساختہ اور نہایت برمحل کہی ہیں۔ مولانا حسین آزاد نے بھی ان کے بارے میں بہت صحیح لکھا ہے کہ:

''شاعری کی سرکار سے (رشک کو) تاریخیں کہنے کا ٹھیکہ ملا ہے۔''4

پوری کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ خود تاریخیں کہتے رہنا بھی بلاشبہ بڑی بات تھی، لیکن اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ تھی کہ استاد کی تحریک، ترغیب اور کوشش کے نتیجے میں میر علی اوسط رشک کے تقریباً سبھی شاگرد اس فن میں مشاق ہو گئے تھے۔ یہی نہیں، شاگردانِ رشک کے زیر اثر شہر کانپور میں تاریخ گوئی کا ایسا ماحول بن گیا تھا کہ یہاں کا ہر شاعر موقع اور محل کی مناسبت سے کم و بیش اچھی بڑی تاریخ کہہ لیتا تھا۔ اس میدان کے چند نام بر آوردہ شاعروں کا یہاں مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

2- بہار- گلشن الدولہ

لکھنؤ کے رہنے والے تھے، مرزا حاجی بیگ کے بیٹے، میر رشک کے شاگرد اور واجد علی شاہ بادشاہ کے مصاحب تھے۔ بادشاہ نے خود ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''گلشن الدولہ مرزا علی خاں بہادر بہار، یہ شاعر ہیں۔ ان لوگوں کے ذمہ خدمت سرکاری بھی تفویض ہے اور مصاحب بھی ہیں۔''5

بادشاہ کے محلّات میں صدر محل، صدر تخلص کے یہ استاد بھی تھے اور اپنے وقت کے باکمالوں میں شمار ہوتے تھے۔ بادشاہ کی تصنیف ''بنی'' کی انھوں نے بھی تاریخ کہی تھی۔

بہار اپنے استاد کے عزیز شاگردوں میں سے تھے، اُن کے دیوان کی طباعت کی تاریخ انھوں نے اس طرح کہی تھی

چوں متن و حاشیہ بد و دیواں احاطہ کرد ___ باصد صفا ، کلامِ فصیح و بلیغ رشک
یک مصرع اے بہار و دو تاریخ عیسویست ___ ___خوش خوش دلا___ ___کلام فصیح و بلیغ رشک___

1847 1847

اس دیوان کے آخر میں بہار کا کہا ہوا ایک اور قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

مرے استاد کی زہے تحقیق صحتِ لفظ کا ہے شغل مدام
نظرِ ثانی آپ کی اِس پر دوستوں نے بھی کی عنایت تام
ہوگئے جب کئی ورق مشکوک سر نو منطبع ہوئے وہ تمام
اس کی تاریخ اے بہار ہوئی غلطی سے جدا کیا ہے کلام

1264ھ

مصرعِ تاریخ کے نیچے دیوان میں 1263 کے عدد چھپے ہیں لیکن اس سے 1264 کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ یہ قطعہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس کے سوا کسی دوسرے ماخذ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ طباعت کے بعد میر رشک نے اپنے دیوان پر نظر ثانی کی تھی اور مشکوک ہوجانے کی وجہ سے کئی ورق از سر نو چھپوا کر اس میں شامل کیے تھے۔

بہار نے میر رشک کے تیسرے (غیر مطبوعہ) دیوان کی جو تاریخ کہی تھی، وہ بہت دلچسپ اور لائق توجہ ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے:

''تاریخ طبعزاد مرزا علی صاحب بہار در صنعت اسمائے شعرائے زمانا'' ۔

یہاں اس کے شروع کے دو شعر اور مقطع لکھا جاتا ہے ؎

دیوان رشک کا یہ جو استاد میرے ہیں بعدِ کلامِ ناسخ معجز نما ہے واہ
اللہ رے برقِ مصرعِ شفاف کی چمک حامیِ نورِ مہرِ سپہرِ علا ہے واہ

اور ؎

تاریخ اے بہار سراجِ منیر ہے یہ نو بہار گلشنِ فکرِ رسا ہے واہ

1267ھ

## 3- عشقی- شیخ الٰہی بخش

شیخ الٰہی بخش عشقی کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یہ میر رشک کے شاگرد اور کانپور کے باشندے تھے۔ محسن نے ان کے بارے میں کہا ہے:

''تاریخ گوئی میں دستگاہ نہایت رکھتے ہیں۔''

انھوں نے اپنے استاد کے دیوان کی بھی تاریخ کہی تھی۔

محسن نے اپنا تذکرہ عشقی کی تحریک سے ہی مکمل کیا تھا، اس کے آغاز کا قطعۂ تاریخ بھی انھوں نے کہا تھا جو اس طرح ہے

قطعہ تاریخ دیباچہ

لکھا محسن نے عشقی ایسا یہ دیباچۂ رنگیں　　فزوں تر بوستاں سے ہے گلستاں سے زیادا ہے
نہ کیوں ہو روحِ سعدی مست اس دیباچہ کو سن کر　　کہ ہر فقرے سے بوئے بادۂ شیراز پیدا ہے
تخلص شاعروں کے مندرج ہیں ایسے فقروں میں　　کہ خوشبو پھول میں جیسے نہان و آشکارا ہے
سُنی تاریخ طورِ فکر پر یہ موسیٰ دل نے　　سراپا فقرہ ایک اک نور کے سانچے میں ڈھالا ہے

1267ھ

4- مُنیر- سید اسمٰعیل حسین

مُنیر اس زمانے کے ممتاز شاعروں میں سے تھے۔ گزشتہ اوراق میں ان کا ذکر آ چکا ہے۔ محسن نے ان کے حالات میں جو لکھا ہے، یہ ہے:

''سید اسماعیل حسین منیر ولد منشی احمد حسین شکر، بزرگ ان کے باشندۂ شکوہ آباد، مولد ان کا لکھنؤ، مسکن اکبر آباد، کانپور میں ملازم نواب نظام الدولہ کے تھے، بعد اس کے رئیس فرخ آباد اور رئیس باندہ کے ملازم رہے..... قواعد نظم و نثر سے طبیعت بخوبی آگاہ ہے، شاگرد رشید میر علی اوسط رشک۔''[6]

منیر کے کلیات میں بہ کثرت قطعاتِ تاریخ شامل ہیں۔ بعض اپنے اپنے موقع پر گذشتہ اوراق میں نقل کیے جا چکے ہیں۔ اپنے استاد کے دواوین کے لیے بھی انھوں نے کئی تاریخیں لکھی تھیں۔ ایک یہ ہے ؎

مدح اس نظمِ منور کی کرے کیا کوئی　　جس کے صفحے مَلک و حور کی ہیں پیشانی
اس کی ترتیب کی تاریخ کہی میں نے منیر　　طورِ انوار ہے دیوان سیوم لاثانی

1267ھ

5- ہلال- امیر علی خاں

میر علی اوسط رشک کے شاگردوں میں یہ تاریخ گوئی کے لیے ممتاز اور معروف تھے۔ محسن نے اپنے تذکرہ میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

''امیر علی خاں ہلال ولد تراب خاں، باشندۂ لکھنؤ، شاگرد رشید میر علی اوسط رشک، ان کا کلام لطیف مشہور عام ہے۔ ایک دیوان کہ جس کا ہر مقطع تاریخ ہے اور ایک سراپا کہ جس کی تاریخ آغاز یہ شعر ہے ؎

یہ تاریخ آغاز اشعار کی ہے سراپا یہ تصویر دلدار کی ہے

1269ھ

اور ایک مثنوی مقفّٰی و مرڈف ان کی طبع زاد ہے۔''7

اپنے استاد کے دیوان کی تاریخ ہلال نے اس طرح کہی ہے۔

مصرع واحد میں میں نے تہری تاریخیں کہیں کیا بجا تاریخ ہے، ہراک غزل، مرغوب ہے

1263 1263 1263

6- شوق- حکیم سید علی ضامن

اپنے والد ماجد میر رشک کے یہ شاگرد رشید تھے اور تاریخ گوئی میں بے مثال۔ چنانچہ محسن نے لکھا ہے:

''حکیم اور فاضل سید علی ضامن شوق خلفِ اکبر اور شاگرد میر علی اوسط رشک، باشندۂ لکھنؤ، صاحب دیوان، ان کی ہر غزل کا مقطع تاریخی ہوتا ہے۔''8

سعادت خاں ناصر نے بھی ان کے بارے میں کہا ہے کہ:

''ہر غزل کے آخر میں تاریخ کہنا ایجاد کیا، آپ کو اس میں استاد کیا۔''9

# معمّا

اگرچہ تاریخ اور معما کے درمیان بہت زیادہ بُعد نہیں ہے اور دونوں کی حدیں ایک مقام پر مل جاتی ہیں۔ تعجب ہے کہ اہل کانپور نے فن معما سے دلچسپی نہیں لی اور اِس باب میں ان کی کسی کاوش کا حال معلوم نہیں ہوتا ہے۔

# ز - عروض

شعرگوئی کے لیے علم عروض کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اِس علم سے بخوبی واقفیت کے بغیر شاعر اکثر ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ میر علی اوسط رشک کہتے تھے ؎

بحر بے پایاں سے بحر شعر بھی کمتر نہیں　　　چوکنا ہے شاعروں کا ڈوبنا تیراک کا

میر رشک اپنے زمانے میں مسلّم الثبوت ماہرین عروض میں شمار ہوتے تھے۔ سعادت خان ناصر نے اس سلسلے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ واقعہ اس طرح ہے:

> ''ایک شخص نے اپنی غزل روبرو میر وزیر صبا (تلمیذ آتش) کے پڑھی۔ اس میں ایک شعر تھا کہ تقطیع اس کی معلوم نہ ہوتی تھی۔ میر صاحب نے کہا کہ یہ شعر ظاہراً ناموزوں معلوم ہوتا ہے، اس میں اس نے کہا کہ شعر موزوں ہے۔ چنانچہ میر علی اوسط صاحب کو یہ شعر سنایا تھا میں نے۔ اگر ناموزوں ہوتا تو وہ اطلاع کر دیتے۔ اس میں کہنے لگے کہ اگر میر علی اوسط صاحب سن چکے ہیں تو موزوں ہے۔ واللہ اعلم۔''[8]

یہی نہیں تھا کہ میر رشک بذاتِ خود اس فن میں کامل تھے بلکہ اُن کے فیضِ تعلیم سے کانپور کے علاقے میں اس کا رواج عام ہو گیا تھا۔ مختلف لوگوں نے اپنے اپنے طور پر اس علم کی کتابیں

تالیف کی تھیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ جتنی کثیر تعداد میں اس علم سے متعلق کتابیں کانپور میں لکھی گئی تھیں اتنی بہ گمانِ غالب کسی دوسرے مرکز پر نہیں لکھی گئی تھیں۔ یہاں مجملاً ان میں سے صرف بعض کا ذکر کیا جاتا ہے:

1- منشی- بشارت علی

یہ شیخ حیدر علی صغیر ولد شیخ دھومن صدیقی کے بھائی تھے، صاحب علم شخص تھے لیکن غالباً خود شعر نہیں کہتے تھے۔ ان کے حالات میں اسی قدر معلوم ہو سکا ہے کہ ان کی بیوی ''آمنہ بیگم'' نے 1281ھ (65-1864) میں رحلت کی تھی۔ صغیر نے تاریخ کہی تھی:

''تاریخ وفات بیگم منشی بشارت علی خاں صاحب''

آمنہ بیگم ازیں عالمِ فانی چو گذشت — غمِ مرگش سبب داغِ دلِ مادر شد
عرش مجید ز فریاد و فغانِ خواہر — فرشِ خاکی زِ نمِ اشکِ عزیزاں تر شد
خاک بر فرق فشانند زمانی احباب — چاکِ دل، چاک گریباں بہ غمش شوہر شد
بہر تاریخ ندا آمدہ از غیب صغیر — قدمِ مومنۂ پاک بجنت در شد

1281ھ

شوہر، ماں اور بہن کا اس وقت موجود ہونا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آمنہ بیگم نے لمبی عمر نہیں پائی تھی۔

منشی بشارت علی خاں کے بڑے بھائی حیدر علی صغیر کے بارے میں لالہ سری رام کا کہنا ہے کہ 1303ھ میں ان کی عمر 70 برس کی تھی۔ 2 اگر اس بیان پر اعتماد کر لیا جائے تو قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ بشارت علی کا سال ولادت 1231ھ.......... کے آس پاس ہوگا۔ ان کی طبیعت نثر کی طرف مائل تھی چنانچہ جوانی میں ہی اس حیثیت سے وہ معروف ہو گئے تھے، اُن کی صرف ایک تالیف کا پتہ چلتا ہے جس کی تاریخ صغیر نے اس طرح کہی تھی:

''تاریخ تالیف جدولِ عروض منشی بشارت علی خاں صاحب''

کشید جدولِ صنعت برادرِ خُردم — خلاصہا بہ نوشت دراں مفصلہا
دریں زمانہ آخر چنانست نثر نویس — شکست شد قلم دستِ فکر اوّلہا

عروض و قافیہ را آنچناں خلاصہ کرد — کہ اختصار شدہ دفترِ مطولہا
صغیر بینہ و زبر گفت از منقوط — عروض و قافیہ اندر حساب جدولہا

مصرع ثانی میں حروفِ منقوط یہ ہیں: ضاد، قاف، فے، یے، نون، بے، جیم

ان میں حروف زبر یہ ہوئے: ض+ق+ف+ی+ن+ب+ج

اور حروف بینات یہ ہوئے: اد+اف+ی+ی+ون+ی+ی م

اول الذکر کے اعداد 1045 اور ثانی الذکر کے 222 ہوئے۔ ان کو جمع کریں تو سالِ تصنیف کے عدد 1267 برآمد ہوں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بشارت علی کو میر علی اوسط رشک کی خدمت میں رسوخ حاصل تھا (شاید یہ بھی ان کے شاگرد رہے ہوں) چنانچہ انھوں نے استاد سے نہ صرف تاریخ کی فرمائش کی، بلکہ کتاب کے لیے تاریخی نام کے لیے بھی کہا۔ میر رشک نے ان کی فرمائش اِس طرح پوری کی:

''تاریخ رسالۂ عروض تصنیف بشارت علی مع نام تاریخی''

کیا ذہنِ بشارت علی ہے — کیا فکر مناسب و رسا ہے
گو نام میں ہوگیا تصرّف — ہو جائے اشارہ تو بجا ہے
ہر چند نہیں وہ آپ شاعر — علموں سے طبیعتِ رسا ہے
لکھا جو عروض کا رسالہ — طورِ تالیف یہ نیا ہے
اللہ رے طبع کی روانی — دریا کوزے میں بھر دیا ہے
تھا مجھ سے سوالِ نام و تاریخ — تصنیفوں کا یہ مقتضا ہے
ہے نام ''قواعد عروضی'' — تاریخ سُنائیے کہ کیا ہے
1267ھ

اے رشک ہے مصرع مناسب — جدول میں عروض آگیا ہے
1264ھ

مخطوطے میں مصرع آخر کے نیچے 1266 لکھا ہے لیکن اگر ''آگیا'' میں الف ممدودہ کے عدد دو لیے جائیں تو 1267 سالِ تصنیف نکل سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا سالِ آغاز

1266ھ ہے اور اس کی تکمیل 1267ھ میں ہوئی، چنانچہ اسم تاریخی سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ رشک اور صغیر کی تاریخوں پر خیال کریں تو کتاب کا نام اس طرح معلوم ہوتا ہے:

''قواعدِ عروضی معروف بہ جدولِ عروض''

2- تمکین- میر ہدایت علی

میر ہدایت علی ان کا نام تھا اور اپنے مزاج کی مناسبت سے تمکین تخلص کرتے تھے۔ لالہ سری رام نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''میر ہدایت علی تمکین متوطن قصبہ کندرکی ضلع مرادآباد، تمام عمر درس و تدریس میں بسر کی۔ فارسی شعرا کثر اور ریختہ بہت کم کہتے تھے''۔ 3

پرانے شاعر اور بڑے صاحب علم شخص تھے، ان کی تصنیف ''ہدایۃ الشعرا'' کی تاریخ میر علی اوسط رشک نے کہی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رشک ان کے علم و فضل کی وجہ سے تمکین کی بہت عزت کرتے تھے۔ رشک کا قطعہ تاریخ یہ ہے ۔

زہے جناب ہدایت علی، زہے علمش — شناورے ست پے بحرِ بے کنار نکات
نوشت مصطلحاتے کہ پیش رتبہٴ او — نقود جملہ نسخ شد بضاعتِ مزجات
خزاں گرفت بہارِ عجم ز نزہتِ او — ز نظم او شدہ منسوخ نسخہ ہائے لُغات
ہمہ متانت و تمکین، تخلصش تمکین — کلام پاک دمِ عیسوی و آبِ حیات
نہاد نامِ شریفش ہدایۃ الشعرا — ہدایتش بہ کمال است و صحتش بہ ثبات
بخواست از من ناقہم سالِ اتمامش — بدیں صفات کہ یکجا شوند نام و صفات
زغیب یافتم اے رشک مصرعِ تاریخ — ہدایۂ شعرا جاے حلِ مصطلحات

1257ھ

میر رشک نے ''ہدایت الشعرا'' کی تعریف تو کی ہے لیکن اس کتاب کے مطالب وغیرہ سے متعلق کوئی قابلِ ذکر اطلاع نظم نہیں کی ہے۔

3- تنویر- سید کاظم حسین

سید کاظم حسین نام تنویر تخلص تھا۔ گذشتہ اوراق میں ان کا احوال لکھا جاچکا ہے۔ یہ اپنے

زمانے میں علم عروض کے باکمالوں میں شمار ہوتے تھے۔ لالہ سری رام نے اِس فن کے استاد کی حیثیت سے ضمناً ان کا اس طرح ذکر کیا ہے:

''مولوی محمد راشد علی مرحوم ضیا بدایونی اپنے گرد ونواح کے نامی شعرا میں تھے، آپ نے علم عروض کی تحصیل میر کاظم حسین تنویر شاگرد جناب رشک سے کی تھی.....صنائع بدائع میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے اور علم عروض کے ماہر تھے۔''4

علم عروض سے تنویر کی دلچسپی کا اندازہ اس طرح بھی کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے بہ گمانِ غالب اپنے شاگردوں کی تعلیم کے خیال سے اس علم سے متعلق ایک منظوم کتاب تالیف کی تھی۔ ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''تنویر سید کاظم حسین، صاحب دیوان ومؤلف عروض منظوم ومراثی، شاگرد میر علی اوسط رشک ولد میر حسین ابن میر اکبر علی لکھنوی''5

تنویر کی اس ''عروضِ منظوم'' کے بارے میں کوشش کے باوجود کوئی قابل ذکر بات معلوم نہیں ہوسکی ہے۔

## 4- سیفی- سید وارث علی

یہ میر علی اوسط رشک کے استاد بھائی تھے، اپنے زمانے کے معروف تاریخ گویوں میں شمار ہوتے تھے، زبان وبیان اور فن شعر کے مسلّم الثبوت ناقدوں میں سے تھے چنانچہ عبدالغفور خاں نساخ کی کتاب ''انتخابِ نقص'' کی تاریخ انھوں نے اس طرح کہی تھی:

''ریختۂ قلم فصاحت رقم سید وارث علی صاحب متخلص بہ سیفی باشندۂ فرخ آباد شاگرد شیخ امام بخش ناسخ''

بندہ کی ہے عرض اے جناب نساخ — میں نے یہ رسالہ غور کرکے دیکھا
کچھ اس میں نہیں ذرا تعسّف کو دخل — اور کوئی نہیں ہے اعتراض کی جا
چشم انصاف سے جو دیکھے گا اسے — وہ بھی کہے گا یہی کہ جو میں نے کہا
لازم نہیں اس میں کچھ شکایت، نہ ملال — یعنی کہ بشر سے ہو ہی جاتی ہے خطا
سیفی نے کہا یہ اس کا سالِ تاریخ — واللہ تمام راست ہے جو لکھا

1294ھ

اِس قطعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فنِ شعر گوئی میں سیفی کا ان کے زمانے میں اُن باکمالوں میں شمار ہوتا تھا جن کے قول و بیان کو سند کا درجہ حاصل تھا چنانچہ ان کا یہ قطعہ اسی حیثیت سے نساخ کی کتاب میں شامل کیا گیا تھا۔

سیفی کے مفصل حالات تو معلوم نہیں، جو کچھ معلوم ہے یہ ہے کہ کسی وجہ سے ترکِ وطن کر کے انھوں نے کانپور میں شاید جاجمؤ کی طرف کسی جگہ سکونت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ محسن نے لکھا ہے:

''سیفی تخلص میر وارث علی خوشنویس ولد بشارت علی باشندہ نواب گنج توابع فرخ آباد، مقیم کانپور، شاگرد ناسخ۔'' 6

سیفی شاید کسی مطبع میں کام کرتے ہوں گے۔ ان کی ایک نثری کتاب کا احوال آگے آئے گا۔

## 5- شوق- سید علی ضامن

میر علی اوسط رشک کے بڑے صاحبزادے حکیم سید علی ضامن شوق کئی اعتبار سے باکمال شخص تھے۔ تاریخ گوئی کے سلسلے میں مجملاً ان کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ ان کے حالات میں سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

''کلام میں متانت تمام، شعر میں لطافت اور نظام، میر علی ضامن، صاحبزادۂ جناب میر علی اوسط صاحب رشک سلمہ اولی میں حسب الارشاد اپنے والد کے تحصیل علوم درسی تمام و کمال کیا، پھر علم طب کا اشتغال۔ شیخ ناسخ نے تخلص نامی رکھا تھا، جب اس نے علم عروض اپنے والد گرامی سے حصول کیا تو شوق تخلص قبول کیا......'' 7

علم عروض سے ان کی واقفیت کے سلسلے میں ناصر نے ایک ''حکایت'' اس طور پر سنائی ہے:

''ایک دن میں (سعادت خاں ناصر) حسب دستور ان (علی ضامن شوق) کے مکان پر بیٹھا تھا اور وہ معیار الاشعار شیخ غلام حیدر کو پڑھاتے تھے اور مضامین خوش بیانی سے سمجھاتے تھے کہ میاں بحر صاحب تشریف فرما ہوئے اور انھوں نے ایک شعر فارسی کا پڑھا اور تقطیع کرنے کو کہا۔ ایک ادنیٰ تامل میں انھوں نے سمجھا دیا کہ یہ دو مصرعے الگ الگ ہیں۔ میاں بحر چپ ہو رہے۔''

آغا حجو شرف نے شوق کی بعض خوبیوں کا بیان اس طرح کیا ہے

یہ سیّد علی ضامن اک با کمال     خدا دان وزایر ، فرشتہ خصال
پسر ہیں علی اوسط استاد کے     جو موجد تھے مضمون ایجاد کے
یہ ہیں شاعر و صاحبِ علم بھی     طبیعت میں ہے خُلق بھی حلم بھی
عجب شعر کہنے کا اسلوب ہے     کہ طبعِ رواں میں مزا خوب ہے
مہذّب ، مدبّر ، سخن سنج ہیں     خدا دوست ، بے نفس و بے رنج ہیں

قاضی عبدالودود صاحب نے ان کے بارے میں راقم کو مطلع کیا تھا کہ انھوں نے:

''ایک رسالہ عروض پر تصنیف کیا جو چھپ چکا ہے''

اس رسالہ کا نام ''ریاض العروض'' ہے۔ اس کے سبب تالیف میں علی ضامن شوق نے لکھا ہے کہ:

''مجھے غدر 1857 میں اپنے وطن سے نکلنا پڑا، کئی سال مختلف قصبوں اور دیہی علاقوں میں طبابت کرنے کے بعد 1278ھ (1861) میں آغا علی خاں مہر کے بیٹے نواب بہادر علی خاں شمس کی خدمت میں کانپور پہنچا، کچھ دنوں کے بعد نواب موصوف نے مجھ سے فنِ عروض پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی جسے میں چند ماہ تک ٹالتا رہا، آخر جب ان کا اصرار بہت بڑھا تو صرف ایک ہفتہ کی قلیل مدّت میں زیرِ نظر کتاب لکھ کر نواب کی خدمت میں پیش کر دی۔''

ریاض العروض ایک مختصر سا صرف چودہ صفحوں پر محیط رسالہ ہے۔ علی ضامن شوق کے ایک دوست محمد میر کی فرمائش اور مشورے سے یہ کتاب شنبہ 8 رجب 1279ھ (30 دسمبر 1862) کو مطبع علوی علی بخش خاں واقع کٹرہ محمد علی خاں لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہو گئی تھی۔ مختصر ہونے کے باوجود شوق کا یہ رسالہ طالب علموں کے لیے بہت مفید ہے۔

6- سید- محمد علی حکیم

حکیم سید محمد علی نامی کسی شخص نے بھی جس کے حالات معلوم نہیں ہو سکے، عروض کا ایک رسالہ لکھا تھا، اس کا قلمی نسخہ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے، اس کی کیفیت اس طرح ہے:

''زبدۃ العروض حکیم سید محمد علی کاتب نامعلوم اوراق 24

ابتدا: الحمد للہ الذی خلق الانسان بالطبع الموزون والشعرہ ان یسلک فی سلک النظم

خاتمہ: کیونکہ گرد داز بہار خوش ہوا فزوں شود بہ ہر دل اندرون صفا

تقطیع کیونکہ گر مفاعلن ز دز بہا مفاعلن

رخش ہوا مفاعلن'' 8

نہیں معلوم کہ اس کتاب کو چھپنا نصیب ہوا یا نہیں۔

## 7- سالک- سید احمد حسین خاں

نواب سید احمد حسین خاں مرحوم سالک تخلص خلفِ اصغر نواب سید علی حسین عرف نواب دولھا صاحب تمنا......کانپور میں امیرانہ ٹھاٹ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ خلیق، با مروت اور ذی استعداد علم دوست تھے، کئی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ ان میں سے عروض سے متعلق 36 صفحوں کا ایک رسالہ ''زبدۃ العروض'' بھی ہے جو مطبع انتظامی کانپور میں چھپا تھا۔ زبان اس کی فارسی ہے۔ یہ رسالہ راقم نے نواب قیصر حسین خاں کے یہاں دیکھا تھا۔ لالہ سری رام کے تذکرے میں غلطی سے اس کا نام ''زبدۃ المؤرخین'' چھپ گیا ہے۔ 9

ان جدید تصانیف سے قطع نظر اس زمانے میں کانپور میں عروض کی بعض قدیم کتابیں بھی درسیات میں شامل تھیں۔ مثلاً نظیر الدین حسن شائق کی کتاب '' <u>مصدر فیوض</u> '' جس کا
1230
نام تاریخی تھا اور جو 1851 (1268ھ) میں مطبع مصطفائی کانپور سے چھپ کر شائع ہوئی تھی، اس کتاب کا مطبع نولکشور کا 1281ھ (1864-65) کا مطبوعہ ایک نسخہ راقم نے نواب حیدر علی خاں صاحب کے یہاں دیکھا تھا۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں اس کتاب کے کم سے کم تین قلمی نسخے محفوظ ہیں۔

## 8- نامعلوم

کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد میں علم عروض کا ایک منظوم رسالہ محفوظ ہے جس کا نام ''دُرِ منظوم'' ہے۔ آغاز اس رسالہ کا ان شعروں سے ہوتا ہے ؎

تیرے فیضِ حمد سے اے خالقِ جن و بشر  شمع کی مانند نور افشاں ہوئی میری زباں
واہ کیا جنسِ گراں ہے نقد تیری حمد کا  حشر تک ہووے نہ سنجیدہ بہ میزانِ بیاں
بہت ابروئے بتاں مغرور ہے تیری صنع سے  مصرعِ برجستہ ہے گلزار میں سروِ جہاں

جناب نصیر الدین ہاشمی نے اس رسالے کے قلمی نسخے کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

"درِ منظوم  صفحے 27  سطر فی صفحہ 19

تاریخ تصنیف  1255ھ (1839)

مصنف کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئی...... یہ رسالہ جو منظوم ہے علم عروض پر مشتمل ہے۔ اس میں شاعری کے متعلق قواعد اور ضوابط نظم میں لکھے گئے ہیں۔

اختتام: ؎

بہ زودی ہوا یہ رسالہ تمام  کہ جس کی بہر سو دھوم ہے
کیا سالِ تاریخ کا جب سوال  خرد نے کہا درِ منظوم ہے
1255ھ

شاعر کے "بہر سو دھوم" کے ذکر کے باوجود تعجب ہے کہ شاعر اور اس کا رسالہ دونوں اس طرح گوشۂ گمنامی میں پڑ گئے تھے کہ آج ان کے بارے میں بنیادی معلومات بھی حاصل نہیں ہیں۔ اس رسالے کے بارے میں جناب نصیر الدین ہاشمی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"پہلے صفحے پر ایک مہر سید محمد عباس موسوی 1262ھ کی ثبت ہے اور اس کے نیچے کتب خانہ سید محمد عباس شوستری لکھا ہوا ہے۔"

مفتی سید محمد عباس شوستری اپنے زمانے کے معروف مذہبی عالموں میں سے تھے، شعر بھی کہتے تھے، آخر عمر میں کانپور میں جا کر نواب معین الدولہ باقر علی خاں ابن معتمد الدولہ کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو گئے تھے، اسی زمانے میں 1282ھ (1865) میں انھوں نے ایک مثنوی لوحِ محفوظ کے عنوان سے لکھی تھی، ان کی ایک اور مثنوی گوہر شہوار (قلمی) کا مذکور ملتا ہے۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ مفتی صاحب کا کتب خانہ بھی کانپور میں ہی رہا ہوگا اور رسالہ "درِ منظوم" غالباً لکھنؤ کے کسی شاعر کا تصنیف کردہ ہوگا۔

# ح - قواعد ولغت

وہ زمانہ تھا جب کانپور میں "تحقیق لفظ" کو شاعری کے لیے لازم و ملزوم خیال کرتے تھے، بقول میر علی اوسط رشک ؎

تحقیق لفظ کرتا ہے تنبیہ رات دن سقم و غلط کے حرف مرے حرف گیر ہیں

اور شاعری کا فائدہ ہی یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سے زبان و بیان کے قاعدوں اور ضابطوں کا علم حاصل ہو چنانچہ شاہ غلام اعظم افضل نے منیر کے بارے میں کہا ہے ؎

ہے زبانِ رشک گویا آپ کی بالکل زباں انکشاف قاعدہ ہوتا ہے ہر ہر بات سے

اِس قسم کی زبان اور شاعری کے لیے قواعد اور لُغت کے مطالعہ کی اہمیت ظاہر ہے چنانچہ اس شہر میں ان موضوعات سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئی تھیں۔ یہاں بعض کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

## 1- اصول عجیبہ

مصنف کا نام محمد جمال الدین خاں صاحب ہے۔[1] انھوں نے اپنی ایک بیٹی کے دو بیٹوں یعنی حافظ محمد اسحاق اور شیخ محمد خیر الدین انصاری کی تعلیم کے لیے یہ کتاب لکھی تھی اور اس کا تاریخی نام "خزانۃ القواعد" رکھا تھا جس سے سال تصنیف 1270ھ (1854) معلوم ہوتا ہے۔

یہ کتاب اردو زبان میں ''صَرفِ افعالِ فارسی'' کے بیان میں ہے، اس میں ایک مقدمہ، تین فصلیں اور ایک خاتمہ ہے۔ اس طرح

| | |
|---|---|
| مقدمہ: | کلمے کے معنی اور اس کے اقسام کے بیان میں۔ |
| فصل پہلی: | ماضی کے بیان میں اور جو ماضی سے متعلق ہے۔ |
| فصل دوسری: | مضارع وغیرہ کے بیان میں۔ |
| فصل تیسری: | مستقبل کے بنانے کی ترکیب۔ |
| خاتمہ: | مصدر کی قسمیں۔ |

آغاز اس کتاب کا اس عبارت سے ہوتا ہے:

''بعد حمد الٰہی ونعت حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کے پوشیدہ نہ رہے کہ یہ رسالہ ترکیب گردانِ فارسی کا زبان ریختہ اردو میں......''

یہ رسالہ طالب علموں کے فائدہ کے لیے چند بار چھپا ہوگا۔ ایک ایڈیشن وہ ہے جو مطبع نظامی کانپور میں بہ انضمام محمد حبیب اللہ 1381ھ میں چوالیس صفحوں پر چھپا تھا۔

2- رسالہ افضل

شاہ غلام اعظم افضل الٰہ آبادی سے بھی قواعد کا ایک رسالہ منسوب ہے لیکن وہ ضائع ہو گیا ہے۔ چونکہ اس کا تعلق میر علی اوسط رشک سے تھا، اس مقام پر اس کا ذکر مناسب معلوم ہوا۔ دیوانِ آسی کے مقدمے میں ہے کہ:

''شاہ غلام اعظم صاحب افضل الٰہ آبادی نے ایک رسالہ ناسخ اور رشک کے قواعد کے مطابق تصنیف کیا تھا۔ حضرت (آسی) کے پاس دیکھنے کے لیے بھیجا تھا۔ حضرت نے قواعد میں کچھ اور سختیاں بڑھا دی تھیں۔ حضرت (آسی) نے یہ رسالہ اپنے دلی دوست میر مبارک حسین عرف میر محمد جان المتخلص بہ صدق کے پاس جو حضرت کے استاد بھائی تھے بھیج دیا۔ میر صاحب موصوف کے پاس وہ رسالہ رہ گیا، ان کے بڑے صاحبزادے میر سید ضامن علی سے میں نے دریافت کیا تھا، ان سے معلوم ہوا کہ اس کا پتہ نہیں ملتا۔ معلوم نہیں کیونکر ضائع ہوا۔''[2]

### 3- تعلیم الصبیان

زبان فارسی میں اس نام کی قواعد کی دو کتابیں مشہور تھیں:

پہلی خواجہ عبداللہ تمکین معروف بہ سید عبدالفتاح حکیم دہلوی کی، اور دوسری محمد باقر بن محمد تقی مجلسی کی۔

مطبع مصطفائی کانپور کے بانی محمد عبدالرحمٰن شاکر ابن حاجی محمد روشن ابن محمد نواز خان نے اسی نام سے قواعد کی ایک کتاب اردو میں تیار کی تھی، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے جس کا جناب نصیرالدین ہاشمی نے اس طرح تعارف کرایا ہے:

"تعلیم الصبیان، بارہ صفحے، خط نستعلیق، صفحے بارہ، مصنف عبدالرحمٰن خان شاکر، کتابت 1270ھ (1854)۔ یہ رسالہ مبتدیوں کے لیے با قاعدہ الف، با، تا ہے۔ ضمناً اسمائے حُسنیٰ اور چند ادعیہ وغیرہ جواز روئے حدیث شریف مجرب ہیں، اس میں شامل کیے گئے ہیں۔"[3]

آغاز: بعد حمد خدائے علیم اور نعت رسول کریم کے بندہ کثیر المعصیت، قلیل المقدرت عبدالرحمٰن ولد حاجی محمد روشن خاں مبرور؟ مغفور..........

اختتام: اللہ اکبر کہہ کے دونوں طرف سلام دے۔

ترقیمہ: تمت تمام شد، بہ توفیق ایزد سبحان تعلیم الصبیان من تصنیف...... بتاریخ بست و ہفتم محرم 1270ھ، بہ دستخط عاصی پُر معاصی خواجہ میاں در قصبہ جھنڈ داڑہ اختتام یافت۔"

حاجی محمد روشن خاں کے دو بیٹے اپنے مطبعوں کی وجہ سے مشہور ہوئے، بڑے کا نام محمد مصطفیٰ خاں تھا جو مطبع مصطفائی کے مالک تھے۔ چھوٹا بیٹا عبدالرحمٰن شاکر شروع میں اپنے بڑے بھائی کے مطبع میں ہی کام کرتا تھا، پھر انھوں نے اپنا ذاتی مطبع محلہ پٹکاپور، کانپور میں قائم کرلیا تھا۔ دونوں بھائیوں کو تصنیف و تالیف کا شوق تھا چنانچہ ان کی بعض کتابیں اب بھی مل جاتی ہیں۔

محمد عبدالرحمٰن شاکر کی ایک کتاب کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے، ان سے منسوب فارسی قواعد کی ایک اور مشہور کتاب "چہار گلزار" ہے جو مسٹر کوراوزلی (Crossly) کی فرمائش سے شاکر ہی کے مطبع میں 1275ھ (1858-59) میں چھپی تھی اور اس پر[4] "نام نگارندہ محمد عبدالرحمٰن خان بن محمد روشن یاد شدہ است۔"

4- صفوۃ المصادر

یہ کتاب ''برائے استعمال مکاتب و مدارس سررشتۂ تعلیم مُلکِ اودھ'' شائع کی گئی تھی اور یہ عام طور سے ''آمدنامہ'' کے نام سے مشہور ہے[5]۔ اس کے مؤلف محمد مصطفیٰ خان خلف حاجی محمد روشن خاں نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

''سُبحَانَکَ لاَ عِلمَ لَنَا اِلاَّ مَا عَلَّمتَنَا اِنَّکَ اَنتَ العَلِیمُ الحَکِیمُ بعد حمد ایزد غفار و صلوٰۃ و سلام بر سیّد ابرار و آلِ اطہار و اصحاب اخیار میگوید امید وار مغفرت ایزد منان محمد مصطفیٰ خاں...... چند مصادر مشہورہ مع معانی متعارفہ و صرف صغیر ضروری ہر یک بہ ترتیب حروف تہجی در جداول...... جمع نمودہ، صفوۃ المصادر نام نہادم و صرف کبیر یک مصدر لازم و دیگرے متعدی ہم بطریق نمونہ بیان کردہ۔''

یہ کتاب پہلی بار 1850 (1266ھ) میں چھپی تھی، پھر کانپور کے علاوہ ملک کے مختلف شہروں میں بار بار چھپتی رہی ہے۔

5- نفس اللغہ

''نفس اللغہ'' کانپور کی بول چال اور وہاں کی لفظیات اور مصطلحات پر مشتمل مستند ترین لغت ہے، اس کی زبان فارسی ہے اور نام تاریخی ہے جس سے اس کا سالِ تصنیف 1256ھ (1840) معلوم ہوتا ہے۔ اس لغت کے مؤلف میر علی اوسط رشک تھے۔ جناب نشتر نے نیرّ پریس لکھنؤ سے اس کا صرف ایک حصہ جو باب الف سے باب تائے فوقانی تک ہے چھپوادیا تھا، اگرچہ انھوں نے دیباچے میں یہ وضاحت کردی تھی کہ:

''نفس اللغہ جس کا حصہ اول شائع کیا جاتا ہے، معلومات کا خزانہ ہے۔''[6]

یہ غلط فہمی عام ہوگئی کہ میر رشک اس کو مکمل نہیں کر سکے تھے، وجہ اس کی دو معلوم ہوتی ہیں:

اول یہ کہ اس کے باقی حصے کو اب تک چھپنا نصیب نہیں ہوا ہے۔

دوم یہ کہ خود نشتر نے حرف تائے فوقانی کے بعد کی جو مثالیں اپنے دیباچے میں دی ہیں، وہ عموماً اردو میں ہیں اور وہ سب میر رشک کے بجائے خود نشتر کی تحریر معلوم ہوتی ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ میر رشک نے اس لغت کو مکمل کرلیا تھا، چنانچہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی کے

کتب خانہ میں اس کا جو ناقص الآخر قلمی نسخۂ مخطوطہ ہے اس میں حرف ''ی'' تک کے الفاظ موجود ہیں۔ جناب افسر صدیقی امروہوی نے اس کے تعارف میں لکھا ہے:

''نفس اللغۃ نولکشور پریس لکھنؤ سے مکمل چھپا تھا اور یہ مخطوطہ مطبوعہ نسخے کی نقل ہے۔ کسی صاحب نے اصل کتاب سے قبل اس کا تعارف ان الفاظ میں تحریر کیا ہے۔ لغتِ اردو مسمی بہ نفس اللغۃ تصنیف و تالیف مستند الشعرا جناب میر علی اوسط صاحب متخلص بہ رشک کہ در عہد حضرت محمد علی شاہ بادشاہ اودھ نوشتہ شد۔ اس مخطوطے کے چند آخری صفحات ضائع ہو گئے تھے جنھیں معمولی خط کے ساتھ نقل کر کے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ان اشخاص کے لیے خاص طور پر مفید ہے جو اردو کے ذریعہ فارسی حاصل کرنا چاہتے ہوں۔

آغاز باب الالف فصل الف آ آ۔ کلمہ ایست کہ صیغۂ امر بود برائے طلبیدن

کسے، ف = بیا، ع = تَعَ

آبخورہ فارسی است، ع = زکوۃ بالفتح

آبرو فارسی است، ع = عزت

اختتام یہ ف، ایں، ع نداو بمعنی چہ قدر روا ایں قدر آمدہ۔

یہاں فارسی اینجا یہ لوگ ف، ایں کساں''۔[7]

زیرِ نظر مخطوطہ کے آخری صفحوں کے لکھنے والے نے ترقیمہ کو نقل نہیں کیا ہے، اس نے خود اپنی طرف سے بھی اس قبیل سے کچھ نہیں لکھا ہے۔

اس مقام پر یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میر رشک نے اپنے دو دیوان، نظم مبارک اور نظم گرامی 1261ھ میں چھپوا لیے تھے، پھر انھوں نے زبان و بیان سے متعلق اپنے تجربات کی روشنی میں ان پر نظر ثانی کی تو کئی ورق مشتبہ معلوم ہوئے، چنانچہ بعض کو دوبارہ چھپوایا اور باقی کی تصحیح کے لیے دو صفحوں پر مشتمل ''صحیح نامہ'' چھپوا کر شامل کیا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ نفس اللغۃ کی تالیف کے زمانے میں ان پر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ حروفِ منقوطہ پر مقررہ تعداد میں نقطے اور ک، گ پر ایک اور دو مرکز بنانے کا التزام ضروری ہے چنانچہ دیوان کے ''صحیح نامہ'' میں انھوں

نے اس قسم کی تصحیحات بھی کی تھیں:

| غلط | صحیح | غلط | صحیح | غلط | صحیح |
|---|---|---|---|---|---|
| کل | گل | چلے | جلے | بھری | پھری |
| کناہ | گناہ | پھڑک | بھڑک | گو | کو |

اسی دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ عربی، فارسی کے لفظوں کو اردو میں اسی تلفظ کے مطابق لکھا جائے جیسا کہ موقع و محل کا تقاضا ہے چنانچہ صحیح نامہ میں ایک جگہ انھوں نے ''زمانہ'' کو غلط قرار دے کر ''زمانا'' لکھا ہے، اسی طرح ایک شعر میں ''بتکدا'' لکھا تھا۔ نظر ثانی میں اسے بدستور رہنے دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ تالیفِ لُغت کے دوران ہی انھوں نے املا اور تلفظ کے مسائل سے متعلق غور و فکر کا سلسلہ شروع کر دیا تھا چنانچہ ان کا ایک مصرع اس طرح لکھا تھا ؎

پیٹنا، رونا، تڑپھنا ادنکا دیکھا چاہئے

صحیح نامہ میں ''تڑپھنا'' کو غلط قرار دے کر اسے ''تڑپنا'' بنا دیا۔ لُغت میں بھی انھوں نے اس نوع کے سبھی کلمات مثلاً تڑپ، تڑپانا، تڑپنا، کو بغیر ہائے مخلوط کے ہی لکھا ہے۔ اسی طرح لفظ ''پوہنچا'' کے بارے میں لکھا ہے:

> ''املائے ایں لُغت ہمیں است چہ اگر ہائے ہوز بعد بائے فارسی نویسند بائے فارسی مخلوط الہا شود بخنا مُل۔''

بعد کے زمانے میں جب ہائے مخلوط (ھ) کی صورت متعین ہو گئی تو یہ دقت باقی نہیں رہی اور اس لفظ کو ''پہنچا'' لکھا جانے لگا۔

نفس اللغہ میں میر رشک نے ان لفظوں کو جگہ دی ہے جو اُن کے زمانے میں کانپور والوں کی بول چال میں رائج تھے۔ ان میں عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی وغیرہ اصل کے الفاظ بھی شامل تھے، اس لُغت میں بہت لفظوں کا تلفظ وغیرہ بھی اہل لکھنؤ کے روزمرہ سے مختلف ہے مثلاً:

''بیاز، بموحدہ مکسور باشباع تحتانی بالف وزائے معجمہ کشیدہ، بروزن رز، انچہ زر نقد دام

وادہ زیادہ از اں گیرندو بروزن نیاز غلط است۔ف سود، ح ربابالکسر"۔

معلوم ہوتا ہے کہ رشک کے زمانے میں کلمہ "ہی" کو لفظ ماقبل کے ساتھ ملا کر بولتے تھے چنانچہ نفس اللغہ میں اس قسم کے کئی لفظ موجود ہیں مثلاً:

آپھی (آپ + ہی) ساتھی (ساتھ + ہی) وغیرہ

بعد کے زمانے میں یہ صورت متروک ہوئی، چنانچہ ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے لکھا ہے:

"یہ دو حرف بڑے چھپے ہوئے دشمن ہیں، ایک تو عین اور دوسرے ہائے ہوز، کہ یہ اکثر وقت موزونی دھوکا دے کر وزن سے خارج ہو کر شاعر کو ذلیل کرتے ہیں..... پس ہنگام موزونیت ان دونوں سے احتیاط کرنا چاہیے۔"8

نفس اللغہ اردو کی پہلی باقاعدہ اور مبسوط لغت ہے اور اس کی تالیف پر میر رشک نے بہت محنت کی ہے۔ بعد کے سبھی قابل ذکر لغت نویسوں مثلاً امیر مینائی اور جلال لکھنوی وغیرہ نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

# ط - تذکرے

یہ ذکر آ چکا ہے کہ نواب امین الدولہ سید آغا علی خاں بہادر مہر تخلص اور والا جاہ میر علی اوسط رشک کے زیر اثر کانپور میں غزل ہائے نظم طور کے لکھے جانے کا چلن ہو گیا تھا۔ اِس صورت حال نے اِس ملک نصارا میں تذکرہ نویسی کو بھی نئی نئی راہیں دکھائی تھیں۔ نواب سید حیدر علی خان بہادر کی کتابوں میں راقم نے فارسی کا ایک قلمی تذکرہ دیکھا تھا جس کا نام ''قطعہ گلشن'' تھا۔ یہ محسن کے تذکرہ سراپا سخن کے طور پر مرتب کیا گیا تھا اور اس میں رباعیات اساتذہ، مسدس، مثنوی اساتذہ وغیرہ درج تھیں۔

اسی طرح فارسی گویوں کے مشہور تذکرہ ''ریاض الشعرا'' کا ایک انتخاب اوسط ماہ جمادی الاول 1255ھ (1839) میں ''انتخاب دواوین اساتذۂ ولایت زا'' کے نام سے تیار کیا گیا تھا اور اس کا قلمی نسخہ بھی نواب صاحب مذکور کے یہاں موجود تھا۔ اردو میں بھی اسی طور پر بعض تذکرے مرتب کیے گئے تھے۔ یہاں مختصراً ان کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

## 1- سراپا سخن

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس تذکرے کے مؤلف نے انسانی سراپا (اعضائے جسمانی وغیرہ) سے متعلق مختلف اور متعدد شاعروں کے اشعار اس میں جمع کیے ہیں۔ مؤلف نے اس میں

خود اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے:

"مؤلف تذکرہ سید محسن علی سہسوی محسن تخلص ولد منشی سید شاہ حسین حقیقت لکھنوی بن سید عرب شاہ سہسوی، اولاد میں سید امیر کلال علیہ الرحمہ کی، وطن بزرگوں کا خوست توابع غور، مولد و مسکن مؤلف لکھنؤ، کمترین تلامذۂ خواجہ وزیر وزیر اور میر علی اوسط رشک۔" 1

ان سطور کی تحریر کے زمانے سے برسوں پہلے سے مؤلف کا مسکن کانپور تھا، نہ کہ لکھنؤ۔ چنانچہ سعادت خاں ناصر نے اس حقیقت کا اظہار مکرر کیا ہے۔ لکھا ہے:

"کلام دو دردستوں کا معرفت میر محمد علی اور میر محسن علی صاحب کے کانپور سے ڈاک کی طرح آیا گیا۔ دو برس کے عرصے میں خاتمہ بالخیر ہوا۔" 2

اور:

"(محسن) شاگرد خواجہ وزیر کے تھے، بہ سبب سکونت کانپور کے میر علی اوسط رشک سے تلمذ حاصل ہوا۔" 3

چنانچہ یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ تذکرہ سراپا سخن لکھنؤ میں لکھا گیا۔ اس تذکرے کی تحریک بھی کانپور کے مخصوص ماحول میں ہوئی تھی اور تکمیل بھی وہیں ہوئی تھی چنانچہ مؤلف نے خود بھی "سبب تالیف" میں بیان کیا ہے:

"چندے باقتضائے آب و خورش بہ تقریب تجارت کپ کانپور میں مقیم رہا، جب وہ سلسلہ برہم ہوا ہر آشنا کو نا آشنا پایا۔۔۔۔۔شیخ الٰہی بخش عشقی۔۔۔۔۔ان کی صحبت کی برکت سے غم غلط کیا۔"

اس اقتباس سے تجارت کی نوعیت کا پتہ نہیں چلتا ہے، البتہ مشرف احمد نے لکھا ہے کہ:

"یہاں (کانپور میں) انھوں نے ایک مطبع اور ایک اشاعت گھر قائم کیا تھا۔۔۔۔نقصان اٹھانے کے بعد انھوں نے اس کو بند کر دیا۔۔۔۔محسن لکھنوی نے اپنے قائم کردہ اس مطبع سے کون سی کتب شائع کی تھیں، ان کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں ہے۔" 4

مشرف احمد کے بقول محسن کانپور میں جاج مئو کے علاقے میں رہتے تھے، وہیں ان کی شیخ الٰہی بخش عشقی سے دوستی ہوئی، وہ میر رشک کے شاگرد تھے۔ غالباً انھیں کے واسطے سے محسن نے بھی

میر رشک کی خدمت میں پہنچ کر زانوے تلمذ تہ کیا۔ عشقی چونکہ شروع سے کانپور میں تھے، انھوں نے شیخ ناسخ کی صحبتیں اٹھائی تھیں، وہ محسن کو شیخ ناسخ کی محفلوں کے واقعات سُناتے تھے چنانچہ:

"ایک روز برسبیلِ مذکور ذکر آیا کہ جس زمانہ میں جناب امام بخش ناسخ مغفور واردِ کانپور تھے، یہ غزل ارشاد فرمائی تھی ع

جب کبھی پہنا بجواد اس نے زیور کان میں

میں (عشقی) نے عرض کیا..... اگر سب اعضا میں غزلیں ہو جائیں تو ایک دیوان بطور سراپا ترتیب پائے ... افسوس ہے کہ زیست اس وحید العصر کی نے وفا نہ کی، اس نوازش فرما (عشقی) نے (محسن سے) فرمایا کہ ..... اگر تو فرہاد آسا کمرِ سعی پر دامنِ ہمت کو چست باندھے اور اشعار شیریں شعرائے ماضی وحال جمع کر کے تذکرہ بطور سراپا لکھے تو غالب یہ ہے کہ نئے رنگ ڈھنگ کا تذکرہ نادر الوجود نایاب ہوگا اور امید یہ ہے کہ ہر اہل بینش سخنور سیکدۂ کلام کا لا کلام باعث سرور بلکہ موجب بقائے نام اور فرحت احباب ہوگا..... ان کے پاس۔ خاطر سے اس محنت عظیم کو گوارا کیا، فہرست اعضا کی تیاری پر مائل و راغب ہوا..... پندرہ تذکرے اور صد ہا دواوین اور بیاضیں بڑی جستجو سے بہم پہنچائیں..... ہر ناظم دور و دیار کی خدمت میں آپ اور احباب دلسوز سے خطوط لکھوائے، حتیٰ کہ چار (مرتبہ) اخبار میں یہ خبر چھپوائی..... مشاعروں میں اسی طرح کی طرحیں کیں، غرض کہ اس تلاش سے سات سو سے زیادہ شعرا کا کلام فراہم کیا..... بعض نے خرد ماغی سے عذر لنگ کیا..... بڑی جاں کاہی اور عرق ریزی سے 10 برس میں یہ تذکرہ مسمّٰی بہ سراپا سخن آغاز 1269ھ میں انجام پا کر..... مقبول نظر ہوا۔"4

اس بیان سے ظاہر ہے کہ ابتداءً شیخ ناسخ سے "ایک دیوان بطور سراپا ترتیب دینے" کی فرمائش کی گئی تھی۔ چند سال بعد اس شہر میں اسی طرز میں بیشتر شاعر غزلیں کہنے لگے تو ان سب کا ایک تذکرہ لکھوانے کا خیال ہوا۔ 1258ھ (1842) میں عشقی نے محسن سے اس کی فرمائش کی اور محسن اس کام کے لیے مستعد ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محسن اس سال سے کچھ ہی پہلے کانپور پہنچے تھے۔

محسن نے 8 سال میں اپنے تذکرے کا نقشِ اوّل تیار کر کے اس کے لیے دیباچہ بھی لکھ لیا۔ تذکرے کے محرک یعنی الٰہی بخش عشقی نے اس دیباچے کی تاریخ کہی، اس طرح ع

سراپا فقرہ ایک نور کے سانچے میں ڈھالا ہے

1267ھ

محسن کے مذکورہ بیان کی تصدیق سعادت خاں ناصر کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے:

''سید خجستہ خصال، شیریں مقال، غیر ممکن اس سے ممکن، میر محسن علی محسن تخلص، صاحب بینش ولیاقت، خلف الصدق منشی شاہ حسین تخلص حقیقت۔ سید صاحب موصوف نے ایک تذکرۂ اشعار تعریف سراپا لکھنا شروع کیا ہے۔ الٰہی انجام اس کا بخیر ہو، پہلے وہ شاگرد خواجہ وزیر کا تھا، اب رشک کا۔'' 5

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریر کے وقت تک محسن کو میر رشک کی شاگردی میں بہت زیادہ مدت نہیں گزری تھی، شاید چار چھ برس ہوئے تھے، اسی عرصہ میں وہ رشک کے عزیز ترین شاگردوں میں شمار ہونے لگے تھے، اسی زمانے میں میر رشک کا دیوان تصحیح کے بعد چھپا، اس کے لیے محسن نے بھی تاریخ کہی تھی، وہ قطعہ تاریخ یہاں نقل کیا جاتا ہے تاکہ شاگرد کے استاد کے بارے میں خیالات کا اندازہ کیا جا سکے۔

از سید محسن علی محسن

چو شد مطبوع نظم پاک استاد — کہ بے نقص و خلل بے شک و ریب است
کشودہ قفلِ مضمونِ دہن خوب — زباں گویا کلید علم غیب است
جوانا نہ کلام و عاشقانہ — خلاف پاسِ وضع و سنِ شیب است
بَری از شکوۂ جورِ زمانہ — بصبر و شکر ایوب و شعیب است
نوشتہ مصرع تاریخ محسن — کلام رشک پاک از جملہ عیب است

1263ھ

اس قطعہ کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے تک محسن نہ صرف اردو کے علاوہ فارسی میں بھی پورے اعتماد سے شعر کہنے لگے تھے، بلکہ وہ فنِ شعر کے محاسن اور معائب سے بھی بخوبی آگاہ ہو گئے تھے۔

کہا جا چکا کہ محسن نے اپنے تذکرے کا نقشِ اول 1277ھ میں تیار کرلیا تھا، اس کے بعد وہ اس میں ترمیم واضافے کرتے رہے چنانچہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے کہ:

''سراپا سخن کا ایک ناقص قلمی نسخہ ڈاکٹر محمد عبدالرحمن بارکر (مانٹریال) کے پاس ہے، اس میں 308 صفحے ہیں اور آخری کئی صفحات غائب ہیں۔ ترقیمہ بھی نہیں ہے..... اس نسخے سے انکشاف ہوتا ہے کہ محسن نے اپنے تذکرے کا نام پہلے ''سحر البیان'' رکھا تھا، بعد کو ''سراپا سخن'' کر دیا۔ دیباچے میں تکملے کا سال آغاز 1268ھ بتایا گیا ہے جب کہ مطبوعہ نسخوں میں آغاز 1269ھ ہے۔''[6]

قیاس کہتا ہے کہ تذکرے کو مکمل کرنے کے بعد محسن نے 1267ھ میں اس کا دیباچہ لکھ لیا تھا، پھر ''مرزا محمد خورشید قدر بہادر و مرزا محمد عزیز القدر بہادر'' کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے اس کو خود لکھا (یا لکھوایا) اور اس عمل میں نیا سال شروع ہوگیا، بعد میں کچھ اور مواد مل گیا ہوگا تو اس کا اضافہ کر دیا اور اس طرح تذکرے کی موجودہ صورت 1269ھ میں بن سکی۔ تذکرے کو شاہزادگانِ تیموری کی خدمت میں پیش کرنا بھی اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ محسن کو لکھنوی امرا کے یہاں تک رسائی حاصل نہیں تھی۔

کہا جا چکا ہے کہ کانپور میں تاریخ گوئی کا رواج اس حد تک تھا کہ مشکل ہی سے کوئی ایسا شاعر ہوگا جس نے اس میدان میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ سراپا سخن کی تکمیل کے لیے بھی ڈیڑھ درجن سے زائد شاعروں نے تاریخیں کہی تھیں، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

منصف چنارگڑھ مرزا حاتم علی بیگ مہر شاگرد ناسخ، لالا رام سہائے رونق
شاعرِ بے مثال امیر علی خاں ہلال شاگرد رشک ، مرزا علی بہار
خواجہ بادشاہ سفیر، سید آغا جان ضبط، نورالعین سید محمد حسین محمد طول عمرهٗ

آخر الذکر مؤلف تذکرہ کے بڑے صاحبزادے تھے، ان کے بارے میں اشرف احمد نے لکھا ہے:

''محسن کے چار لڑکے اور ایک لڑکی تھی، سب سے بڑے سید محمد حسین، ان سے چھوٹے سید احمد حسین، سید علی حسین اور سید جعفر حسین، لڑکی کنیز فاطمہ۔''[7]

محسن کے تین لڑکے تھے، سب سے بڑے جو عمر میں سید جعفر حسین سے سترہ اٹھارہ
برس بڑے تھے، پرتاب گڑھ میں اسکول ماسٹر تھے، دوسرے سید محمد حسین جنھوں نے
لندن جا کر زراعت اور انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی..... جعفر حسین نے 1856 کے
لگ بھگ لکھنؤ میں آنکھ کھولی۔"8

صحیح یہ ہے کہ سید محمد حسین شاعر تھے، نام کی مناسبت سے محمد تخلص کرتے تھے، سراپا سخن کی تاریخ کہی تھی، اس وقت ان کی عمر سترہ اٹھارہ برس رہی ہو تو ان کا سالِ ولادت 1251ھ کے آس پاس ہوگا، اپنے والد سے یہ اگر کوئی بیس برس چھوٹے ہوں تو محسن کا سالِ ولادت 1231ھ (1816) کے قریب خیال کیا جانا چاہیے۔ شاہ حسین حقیقت کی کتاب خزینۃ الامثال کے نولکشوری ایڈیشن کے" خاتمۃ الطبع" میں مذکورہ باپ بیٹے کا ذکر اس طرح آیا ہے:

"مصنف (شاہ حسین حقیقت) کے نبیرہ جناب مشفقی منشی محمد حسین صاحب ڈپٹی انسپکٹر تعلیم اودھ ہیں اور فی الحال پرتاب گڑھ کے ضلع میں بہ عہدۂ مذکورۃ الصدر منصب دار ہیں۔ این خانہ تمام آفتاب است کی مثل ہے۔ میر محسن علی صاحب جن کا تذکرہ مسمیٰ بہ سراپا سخن سابق ازیں اس مطبع میں چھپا ہے صاحب کے والد ہیں۔ مؤلف کتاب کے خلف الرشید ہیں۔ ... ماہ اگست 1872 مطابق ماہ جمادی الثانی 1289ھ مطبع منشی نولکشور مقام لکھنؤ میں طبع ہوئی۔ فقط۔"9

محسن نے اس سال یعنی 1289ھ (1820) کے بعد کسی وقت وفات پائی ہوگی۔

محسن کا تذکرہ سراپا سخن پہلی بار 1277ھ (1861) میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ ایک درجن سے زیادہ شاعروں نے اس کی تاریخ کہی تھی۔ محمد حسن خان طبیب کے شعر سے 1276ھ اور 1860 کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ یہ آغاز طباعت کا سال ہوگا۔ طبیب کے علاوہ جن لوگوں نے تاریخ کہی تھی ان میں سے بعض یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| تدبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں بہادر اسیر، | مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب دہلوی |
| میر علی ضامن شوق خلف الرشید میر رشک | شیخ فدا علی عیش عرف اچھے صاحب |

مرزا غالب کا قطعہ یہ ہے:

اس کتابِ طرب نصاب نے جب　　آب و تاب انطباع کی پائی
فکر تاریخِ سال میں مجھ کو　　ایک صورت نئی نظر آئی
ہند سے پہلے سات سات کے دو　　دیے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا　　با ہزاراں ہزار زیبائی
سال ہجری تو ہو گیا معلوم　　بے شمول عبارت آرائی
مگر اب ذوق بذلہ سنجی کو　　ہے جداگانہ کار فرمائی
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ　　بہ امید سعادت افزائی
غرض اس سے ہیں چار دہ معصوم　　جس سے چشم جہاں کو بینائی
اور بارہ امام ہیں بارہ　　جس سے ایماں کو ہے توانائی
ان کو غالب یہ سال اچھا ہے　　جو ائمہ کے ہیں تولّائی

جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے تذکرہ سراپا سخن میں انسانی جسم کے اعضا سے متعلق زیادہ سے زیادہ شاعروں کے کلام کو جمع کر دینے کی کوشش کی گئی ہے اور کچھ شک نہیں کہ اس کوشش میں محسن پوری طرح کامیاب ہیں۔ انھوں نے جو عنوان قائم کیے ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:

سر ، دماغ ، بال ، چوٹی ، زلف ، کاکل ، جبیں
ابرو ، آنکھیں ، پلکیں ، ناک ، عارض ، لب ، دنداں
زباں ، دہن ، ذقن ، کان ، گردن ، دوش ، بازو وغیرہ

شاعروں کے حالات کی تلاش و تحقیق یا کلام کی خامیوں اور خوبیوں سے بحث کرنا وغیرہ مولف کو مطلوب نہیں تھا، پھر بھی محسن نے دو ایک کو چھوڑ کر تقریباً سبھی شاعروں سے متعلق اتنی معلومات فراہم کر دی ہیں کہ ان سے اس شاعر کی شناخت ہو سکے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ محسن نے معاصرین کی بھی مذمت سے اپنے قلم کو بچالیا ہے۔

اپنی ندرت اور خوبیوں کی وجہ سے محسن کا یہ تذکرہ صاحبانِ علم میں بہت مقبول ہوا۔ صورتِ حال یہ ہوئی کہ ذی قعدہ 1315ھ (اپریل 1898) میں یہ مطبع نولکشور سے تیسری بار چھپ کر شائع ہوا تھا۔

## 2- ترجمہ مخزنِ نکات

رامپور کی رضا لائبریری میں قائم کے مشہور تذکرے ''مخزنِ نکات'' کے اردو ترجمے کا ایک نا تمام قلمی نسخہ محفوظ ہے جس کے بارے میں امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے اِس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''کتاب میں مترجم کا نام نہیں ہے لیکن خاتمے میں مقام لکھنؤ لکھا ہے...... تذکرۂ احبا کے مؤلف کو اپنا والد بتایا ہے...... اپنے عمو کا ذکر شعر فہم اور شعرا سے واقف شخص کی طرح کیا ہے۔ شیخ ناسخ کو امام الکملا، فخر الاساتذہ لکھا ہے اور انھیں قواعدِ زبان اردو کا موجد قرار دیا ہے۔ مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں شاہ حسین حقیقت کو جو محسن کے والد ہیں ایک تذکرے کا مولف بتایا ہے۔ اپنے عمو صاحب سید حسن شاہ ضبط مؤلف مراۃ حیدری وغیرہ کا ذکر خود محسن نے سراپا سخن میں کیا ہے۔ نیز اپنے آپ کو میر علی اوسط رشک کا شاگرد بتایا ہے جو ناسخ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔'' 10

عرشی صاحب نے مترجم کے اصل الفاظ نقل نہیں کیے ہیں اس لیے فی الوقت ان کے بیان پر اعتماد کے سوا چارہ نہیں۔ تذکرہ احبا کے بارے میں سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

''صاحب ارادت منشی میر حسین شاہ تخلص حقیقت شاگرد جرأت ولد میر عرب شاہ، صاحب فضل و کمال، مؤلف اور مصنف ہفت نسخہ کا تذکرہ احبا تالیف کیا ہوا اِس کا میاں مصحفی اس تذکرے سے کشیدہ خاطر، اہانت اس کی میاں صاحب کے تذکرے سے ظاہر۔ امام بخش خاں جن کی فرمائش سے وہ تذکرہ تالیف ہوا تھا ان کو کاشمیری اور جرات کو کور موصلی قرار دیا ہے......'' 11

تذکرۂ احبا کا کوئی نسخہ تا حال دستیاب نہیں ہو سکا ہے لیکن ناصر کے اِس مفصل بیان کی موجودگی میں اِس تذکرے کے وجود پر شبہ کی بھی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔ اِس بیان میں ناصر نے حقیقت کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے چنانچہ شاہ حسین حقیقت کے اخلاف کے لیے ناصر سے ناراض ہو جانے کی ہرگز کوئی وجہ نہیں ہے۔

محسن اور ان کے والد حقیقت کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہیں۔ اِس امکان سے صَرفِ

نظر نہیں کیا جاسکتا کہ محسن کا کوئی بھائی بھی رہا ہو۔ اگر ایسا ہو تو مخزنِ نکات کا مترجم محسن کے بجائے اس کے بھائی کو سمجھنا زیادہ مناسب ہے، اس کے لیے کئی قرائن موجود ہیں۔

محسن نے ناسخ کو ایک سے زائد مقاموں پر "شیر بیشہ سخنوری" لکھا ہے جب کہ مترجم نے ان کو "امام الکملا" کہا ہے۔ فرق ظاہر ہے۔

سید حسن شاہ ضبط کے نانا میر محمد نواز نے کانپور (قصبہ جاجمو) میں مستقلاً سکونت اختیار کر لی تھی۔ ضبط بھی وہیں رہے تھے اور پھر محسن بھی لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے وہیں جا رہے تھے۔ یہ بات کہ محسن نے پھر کانپور کو چھوڑ کر لکھنؤ میں رہائش کر لی تھی اور وہیں یہ ترجمے کا کام کیا تھا۔ ثبوت طلب ہے۔ مخزنِ نکات کا مترجم (محسن کا بھائی) لکھنؤ میں مقیم تھا۔

اِس ترجمے کے بعض اقتباسوں سے جو عرشی صاحب نے نقل کیے ہیں پتہ چلتا ہے کہ مترجم سعادت خاں ناصر سے اس کے تذکرہ "خوش معرکۂ زیبا" کی وجہ سے بہ شدت ناراض تھا۔ یہ بات کہ اس تذکرے سے بعض لوگ خوش اور کچھ ناخوش تھے، خود ناصر کو بھی معلوم تھی چنانچہ اس نے خود بھی لکھا تھا کہ:

> "الحمد للہ والمنۃ کہ انجام اِس (تذکرہ) کا حسب دلخواہ اور ہر طرف سے شورِ واہ واہ ہوا۔ خاطر احباب اِس گلدستے سے باغ اور سینۂ حسادآتشِ رشک سے داغ۔"[12]

اپنے دوستوں میں ناصر نے رشک، شائق، اسیر، نسیم وغیرہ کو شمار کیا ہے، کسی کا اس کے برخلاف کچھ کہنا فضول ہے۔

ناصر نے اپنے تذکرے میں محسن اور اس کے استاد رشک کا ذکر اچھی طرح سے کیا ہے، اُس نے محسن کے تذکرے کے "انجام بخیر" ہونے کی دعا بھی کی ہے۔ ناصر کے تذکرے کی تکمیل کے چند سال بعد جب محسن نے اپنا تذکرہ "سراپا سخن" لکھا تو ناصر کے استاد مذنب کو "مرثیہ گویوں میں نامی" لکھا[13] اور خود ناصر کے بارے میں یہ عبارت قلم بند کی:

> "سعادت خاں ناصر خلف رسالت خاں، باشندہ نگینہ، مقیم لکھنؤ۔ ان کے پانچ دیوان اور ایک تذکرہ جس کے اتمام کی تاریخ میر علی اوسط نے فرمائی۔
>
> تذکرۂ شرکا
>
> 1826

واقعی وہ تذکرہ اسی اسم کے قابل ہے۔ شاگرد مرزا محمد حسن عرف چھونے مرزا مذنب

مرثیہ گو اور مذنب شاگرد مرزا رفیع السودا"۔ 14

بظاہر اس میں کوئی بات منفی نہیں معلوم ہوتی۔ ناصر نے اپنے تذکرے میں ہر استاد کے شاگردوں کے ذکر کو استاد کے ذکر کے ساتھ "شریک" کیا ہے۔ اس کی اسی خصوصیت پر خیال کر کے میر رشک نے یہ تاریخی نام تجویز کیا ہوگا لیکن دوسرا بہتر نام سامنے آ گیا، اس لیے ناصر نے اسے پسند کر لیا۔ محسن نے اپنے استاد کی کہی ہوئی اس تاریخ کو ضائع نہیں کیا اور اسے اپنے تذکرے میں لکھ کر محفوظ کر دیا، اس سے محسن یا رشک کا ناصر سے کبیدہ خاطر ہونا ظاہر نہیں ہوتا ہے۔

مخزن نکات کا مترجم ناصر سے بہ شدت ناراض ہے، اُس نے اپنی حد سے تجاوز کر کے ناصر کی خوردہ گیری اور عیب جوئی کی ہے گویا یہی اس کا مقصودِ اصلی تھا۔ ایک جگہ اس نے لکھا ہے:

"ایسی بات کے لکھنے سے مشقت تالیف غارت اور برباد ہوتی ہے چنانچہ ظاہر ہے کہ تذکرہ خان صاحب کا کسی اہل انصاف کے منظور نظر نہیں ہوا ہے۔"

ان حقائق کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا کہ محسن اور مذکورہ مترجم مخزنِ نکات ایک ہی شخص تھا بہت مشکل ہے، اس سلسلے میں متن کے بغور مطالعے کی ضرورت ہے۔

مخزنِ نکات کے اِس ترجمے کے بارے میں عرشی صاحب کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ:

"تذکرۂ میر حسن اور تذکرہ احباب سے متعدد نئے شعرا کا حال بھی بڑھایا ہے۔"

لیکن اُنھوں نے ایک شاعر کا بھی نام یا تخلص پیش نہیں کیا ہے چنانچہ یہ دعویٰ بھی بے دلیل ہے۔ امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے ترجمے کے تعارف کے طور پر جو عبارتیں نقل کی ہیں، اس طرح ہیں:

"الحمد للہ رب العلمین ---- ترجمہ طبقۂ اولیٰ تذکرہ محمد قائم قائم مغفور چاند پوری مسمّی بہ مخزنِ نکات کہ نام تذکرے کا تاریخی ہے۔ قدر دانانِ سخن اور نقادان اس فن پر مخفی نہ رہے کہ صاحب تذکرہ بنائے ریختہ گوئی کو لکھتے ہیں کہ مقبول درگاہ....."

"ترجمہ طبقۂ دوم تذکرہ محمد قائم قائم - اس طبقے میں اشعار اور احوال ان شعرا کا ہے جو بعد ولی کے آخر زمانہ اورنگ زیب عالمگیر بہادر سے تا ابتدائے عہد دولت محمد شاہ

بادشاہ کے دارالخلافت شاہجہاں آباد اور سائر بلاد ہندوستان میں ہوئے اور راقم نے ہر
تذکرے سے مقابلہ کر کے زیادہ اور بھی لکھ دیے ہیں۔''

''طبقۂ سوم (بعد حمد و نعت) مخفی نہ رہے کہ زمانہ مرزا رفیع سودا مغفور اور میر تقی میر اور
خواجہ میر درد میں طرزِ کلام میں تغیر آیا اور بہت الفاظ متروک ہو گئے اور ریختہ میں
اور رنگ کی پختگی آئی، اس واسطے اس زمانے کے شعرا کو اس طبقۂ سوم میں ترجمہ تذکرہ
احبا سے راقم لکھتا ہے کہ اہل تمیز فرق کلام کو دریافت کریں اور حال اور اشعار ہر شاعر کا
زیادہ کر دیا ہے کہ ناظرین کا موجب مسرت ہو۔''

اِس تیسرے طبقہ میں بقول عرشی صاحب ''صرف شاہ عالم ثانی آفتاب تخلص کا ذکر موجود ہے۔ اگلا حصہ ضائع ہو گیا۔''

اِس مقام پر یہ ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محسن علی محسن نے اپنے تذکرے میں قائم کے نام اور سکونت کا اندراج اِس طرح کیا ہے:

''شیخ قیام الدین مغفور عرف محمد قائم قائم باشندۂ چاند پور توابع سنبھل، مقیم دہلی۔''15

اس فرق سے بھی مترجم کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

طبقۂ دوم کے ترجمے کے آخر میں مترجم نے یہ اطلاع قلمبند کی ہے کہ:

''الحمد للہ والمنہ کہ تاریخ دوسری ربیع الاول سنہ 1271ھ (55-1854) کے یہ
طبقہ دوم بخط خام مولف تمام ہوا، شہر لکھنؤ میں۔''

لیکن عرشی صاحب ''بخط خام مولف'' سے متفق نہیں ہیں، ان کا کہنا ہے کہ:

''اس میں املے کی جو فاش غلطیاں پائی جاتی ہیں ان کے مرتکب سے مخزن نکات کے
ترجمے کی امید نہیں کی جا سکتی مثلاً مسرّت کو سرط لکھا ہے، بنا بر ایں میرا خیال ہے کہ یہ
کسی کم سواد کاتب کے قلم کی نقل ہے البتہ اس میں متعدد مقامات پر کسی دوسرے پختہ قلم
سے اشعار اور عبارتیں بڑھائی گئی ہیں۔ اغلب ہے کہ یہ خود مترجم کا خط ہو۔''

اس ترجمے کے بارے میں ضروری حقیقتیں معلوم نہیں ہیں لیکن محسن مولف سراپا سخن سے منسوب ہونے کی وجہ سے (اگرچہ یہ دعویٰ بے دلیل ہے) اس کا یہاں پر ذکر کیا جانا مناسب معلوم ہوا۔

### 3- گلستانِ مسرت

عبدالرحمٰن شاکر ولد حاجی محمد روشن ابن محمد نواز خان کا جو مطبع مصطفائی کے بانی تھے گذشتہ اوراق میں ذکر کیا جاچکا ہے۔ کئی برس کی ''دماغ سوزی کے بعد'' انھوں نے متعدد تذکروں اور دواوین کی مدد سے 1261ھ (1845) میں جب کہ لکھنؤ میں امجد علی شاہ فرماں روا تھے۔ ایک ضخیم بیاض مرتب کی اور اُس زمانے کے چلن کے مطابق اس کا تاریخی نام ''گلستانِ مسرت'' رکھا۔

(1261)

چند سال کے بعد شاکر نے اپنی اس بیاض کو اپنے مطبع مصطفائی میں چھپوا دیا۔

راقم نے نواب سید قیصر حسین خاں کے یہاں اس کتاب کے دو مطبوعہ نسخے دیکھے تھے۔ سرورق پر اس کا نام:

''گلستانِ مسرت المعروف بہ حدائق المعانی''

چھپا ہے اور کتاب 1267ھ (1851) میں 562 صفحوں پر چھپی ہے۔ اس کے دوسرے نام سے ظاہر ہے کہ اس کتاب میں کئی حدیقے ہیں چنانچہ محمد عتیق صدیقی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

> ''گلستانِ مسرت المعروف بہ حدایق المعانی پانچ حدیقوں پر مشتمل ہے:
>
> 1- حمد و نعت　　2- صفت عشق و حالات عشاق
>
> 3- اشعار مفید و کتابت　　4- اشعار صنایع و سوال و جواب
>
> 5- نصائح
>
> ہر حدیقے میں ذیلی عنوانات بھی قائم کیے گئے ہیں اور ان کی فہرست 10 صفحوں پر مشتمل ہے۔''[16]

اس کتاب میں فارسی کے ہندستانی اور ایرانی شاعروں کے کلام کا بہ اعتبارِ موضوع انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ موضوع والی بات وہ ہے جو اِسے محسن کے تذکرہ سراپا سخن کی قبیل میں لے آتی ہے۔ یہی اس کتاب کے یہاں پر ذکر کیے جانے کا جواز ہے۔

# نثر

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ شہر کانپور کی جدید آبادی جس میں گوال ٹولی اور پٹکاپور وغیرہ محلے بھی شامل ہیں، ریلوے اسٹیشن کے عقب میں ہے اور کانپور اسٹیشن کا صدر دروازہ جاج مئو کی طرف ہے جسے بوجوہ اب بھی قصبے ہی کی حیثیت دی جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس زمانے میں یہ اسٹیشن بنایا گیا، اس سے قریب ترین ہی نہیں، قدیم آبادی بھی جاج مئو ہی میں تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جاج مئو کے قدیم گھرانے علم دوست اور مہمان نواز بھی تھے چنانچہ لکھنؤ وغیرہ مراکز سے بھی اکثر شعرا وغیرہ آ کر یہیں مقیم ہوئے تھے چنانچہ محسن مؤلف تذکرہ سراپا سخن بھی انھیں میں سے تھے۔

جاج مئو میں فاروقیوں کے بھی کچھ معزز اور صاحب علم گھرانے موجود تھے جنھوں نے شعر و سخن کے ساتھ ساتھ اردو نثر کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ افسوس کی بات ہے دستبرد زمانہ سے اِن کے بیشتر علمی کارنامے نایاب ہو گئے ہیں۔ جن چند کا احوال معلوم ہو سکا ہے، ان کا اور کانپور کے خطے کی مختلف نثری تصانیف کا مختصراً ذکر کیا جائے گا۔

## الف - خطوط

تیرھویں صدی ہجری کے عشرۂ چہارم (19 ویں صدی عیسوی کے ربع اول) میں اردو خطوط نویسی

کا آغاز ہو چکا تھا چنانچہ اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے:

1- شوق- شیخ الٰہی بخش

"شوق شیخ الٰہی بخش، اکبر آباد کا رہنے والا، مرزا جواں بخت کے منشیوں میں تھا، زبان اردو میں اچھے مکاتیب لکھے ہیں۔"[1]

اس شخص کے بارے میں شیفتہ نے اطلاع دی ہے کہ:

"شوق تخلص شیخ الٰہی بخش اکبر آبادی، کاتب بتقدیر منصب نامہ نگاری مرزا مظفر بخت بہادر خلف مرزا جواں بخت بدعنت و ے نوشتہ...... وفاتش در 1241ھ (1825) اتفاق کردہ۔"[2]

جہاں تک معلوم ہو سکا ہے، الٰہی بخش شوق کا اپنے وطن ہی میں قیام رہا تھا، اس بنا پر خیال کیا جا سکتا ہے کہ اردو میں خطوط نویسی کا آغاز اکبر آباد (آگرے) میں ہی ہوا تھا۔

آگرے اور کانپور کے درمیان براہِ راست رابطہ کا سلسلہ جاری تھا چنانچہ جب کانپور کو اربابِ قلم نے اپنا مسکن بنایا تو ضرورت نے خطوط نویسی کی راہ بھی دکھائی۔ گلستانِ مسرت کا ذکر کیا جا چکا ہے جس میں ایک حدیقہ "اشعار مفید خط و کتابت" پر بھی مشتمل ہے۔

سعادت خاں ناصر نے بھی شیخ ناسخ کے زمانے کی اردو میں خط و کتابت کے چند واقعات اپنے تذکرے میں لکھے ہیں۔ ایک یہ ہے:

"لالا سیوارام شائق نے ایک خط کانپور سے اپنے شاگرد سٹی بانکے بہاری شجاعت کو لکھا اور اس خط میں چند اشعار درج کیے چنانچہ واسطے ملاحظۂ ناظرین کے وہ اشعار لکھے جاتے ہیں۔ (صرف مطلع یہ ہے)

ڈرنا چاہیے کہ دَر توبہ باز ہے      بخشش کا کرنے والا تو وہ بے نیاز ہے"[3]

......الغرض جب خط لالا سیوارام شائق کا کانپور سے بانکے بہاری شجاعت کو لکھنؤ میں آیا تب شجاعت نے اس خط کا جواب بوجہ احسن شائق کو لکھا اور اس جواب میں ایک غزل تحریر کر کے روانہ کانپور کی چنانچہ وہ غزل واسطے ناظرین تذکرۂ ہذا کے تحریر ہوتی ہے۔ فہو ہذا (صرف مطلع)

دم میں تیرے کب بھلا آتے ہیں ہم      عاشقوں کو اپنے ترساتے ہیں ہم

شاید ناصر کو شائق اور شجاعت کے خط دستیاب نہیں ہو سکے تھے اور وہ ان کو اپنے تذکرے میں درج نہیں کر سکا تھا، اس لیے ان کے معیار و مزاج کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔

کچھ مدت کے بعد جب اردو میں خطوں کے لکھنے کا رواج زیادہ ہوا تو ان کے لیے اصول اور ضابطوں کے مرتب کرنے کا خیال ہوا تا کہ مبتدیوں کو انھیں کی روشنی میں تربیت دی جا سکے۔

## 2- عطا- مسیح الزماں فاروقی

مولوی مسیح الزماں کے والد مولوی نور محمد فاروقی اپنے قدیمی وطن ملتان کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ میں آ گئے تھے۔ یہیں نواب سعادت علی خاں کے عہد میں 1221ھ (1806) میں مسیح الزماں پیدا ہوئے۔ مولوی نور محمد کا مشغلہ درس و تدریس تھا، مسیح الزماں نے بھی انھیں سے علوم متداولہ کی تحصیل کی، جب اس لائق ہوئے تو کتابوں کی تجارت شروع کر دی، پھر 1845 (1261ھ) میں انھوں نے اپنے نام کی مناسبت سے مطبع مسیحائی شروع کیا۔

شاید اس کام کے لیے کانپور کا ماحول زیادہ سازگار تھا، اس لیے انھوں نے اسی نام سے اس شہر میں اپنا مطبع قائم کر کے یہیں سکونت اختیار کر لی۔ 1857 کے ہنگاموں کے بعد حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں مطبع سرکاری کے مہتمم مقرر ہوئے۔ آخر عمر میں حج بیت اللہ شریف کے لیے گئے اور 9/ذی قعدہ 1295ھ (1878) میں مکہ معظمہ میں وفات پائی۔

مولوی مسیح الزماں فاروقی شعر بھی کہتے تھے اور عطا تخلص کرتے تھے، بچوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے چنانچہ ان کی تعلیم و تربیت کے خیال سے انھوں نے ایک کتاب ''کتب نامہ المعروف بہ معلّم الحساب'' نہایت صاف، سادہ اور سریع الفہم زبان میں لکھی تھی۔ یہ کتاب چار مختلف ابواب پر مشتمل ہے۔

| | |
|---|---|
| پہلا باب | نصیحتوں کے بیان میں |
| دوسرا باب | نصیحت آمیز حکایتوں کے بیان میں |
| تیسرا باب | خطوط اور رقعات کے نمونے |
| چوتھا باب | حساب کے قواعد اور سرکاری کاغذات کے نمونے |

اُس زمانے کے رواج کے مطابق اس کتاب کی عبارت بھی نظم آمیز ہے چنانچہ یہ درج ذیل

شعروں سے شروع ہوتی ہے ؎

خدا ایک ہے کوئی اس سا نہیں　　وہ کرتا ہے سب کچھ، وہ ہے سب کہیں
وہ سب کا ہی معبود ہے لا کلام　　کرو یاد تم اُس کو ہر صبح و شام
خدا کے ہیں پیارے محمدؐ نبی　　ہوئے ان کی خاطر سے پیدا سبھی
خدا کی ہو رحمت نبیؐ پر عطا　　اور آل اور اصحاب پر سدا

اِن شعروں کے بعد نثری عبارت کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"پوشیدہ نہ رہے کہ اس کتاب میں لڑکوں کے واسطے نصیحتوں کی تھوڑی سی باتیں اور حکایتیں اور حساب کے ضروری قانون وغیرہ مشتمل اوپر چار بابوں کے لکھے گئے اور نام اس کا مکتب نامہ رکھا ہے..... لڑکوں کو لازم ہے کہ اس کتاب کو دل لگا کر پڑھیں اور اس کے مطلب کو خوب سمجھ کر یاد رکھیں تاکہ علم سے بہرہ ور ہوں اور سعادت دارین سے باخبر۔"

یہ کتاب مطبعِ نظامی لکھنؤ میں 1265ھ (1849) میں چھپی تھی لیکن اس کے مندرجات کئی برس پہلے کے ہیں، ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"کتاب کی بعض داخلی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکتب نامہ 1259ھ (1843) میں مرتب ہوا۔"

اِس کتاب کے دوسرے باب میں نصیحت آمیز حکایتیں قلمبند کی گئی ہیں، انھیں اُس زمانے کی کانپور کی افسانوی نثر کا نمونہ خیال کیا جانا چاہیے۔ یہاں ایک حکایت نقل کی جاتی ہے:

"حضرت فقیہ علی مخدوم صاحب ماہمی قدس سرہ بڑے صاحب کمال اور ولی بڑے عالم و فاضل بزرگ تھے، بچپن سے بہت نیک بخت اور غیرت مند تھے اور ان کی ماں صاحب نہایت پرہیزگار تھیں اور ہمیشہ عبادت و بندگی میں مشغول رہتی تھیں اور خدا کی دوست اور مقبول تھیں۔ مخدوم صاحب بچپن سے اپنی ماں کی خدمت اور تعظیم اور ادب حد سے زیادہ کرتے تھے۔ ایک رات ان کی ماں نے پانی پینے کو مانگا، مخدوم صاحب بہت خوشی سے جلدی پیالہ اپنے ہاتھ سے دھو کے، اس میں صاف پاکیزہ ٹھنڈا

پانی بھر کے، والدہ صاحبہ کے پاس لے آئے۔ دیکھا کہ اُن کی آنکھ لگ گئی ہے۔ مخدوم صاحب پانی ہاتھ میں لیے چپکے کھڑے رہے کہ شاید آنکھ کھل جائے اور پانی مانگیں لیکن ادب سے ذرا آواز نہ دی کہ ان کی نیند میں خلل نہ آوے۔ خاموش انتظار میں رات بھر کھڑے رہے، یہاں تک کہ صبح ہونے کا وقت نزدیک آیا، تب اماں صاحبہ جاگیں۔ دیکھا کہ فرزند سعادت مند پیالہ پانی کا بھرا ہوا ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں۔ پوچھا کہ اے پیارے بیٹے تم کیسے کھڑے ہو۔ حضرت بہت ادب و عاجزی سے بولے کہ آپ نے پانی جس وقت طلب کیا تھا اُسی وقت میں لے آیا، اتنے میں آپ کی آنکھ لگ گئی، میرا جی نہ چاہا کہ آپ کو جگاؤں یا چلا جاؤں، والدہ صاحبہ نے جب یہ حقیقت سُنی اور اس طرح ان کے ادب کا حال دیکھا تو نہایت خوش ہوئیں اور جانا کہ یہ فرزند نہایت نیک بخت ہے بلکہ خدا کے لطف سے لائق ولایت کے ہے۔ ان کے دل پر رحمت کا جوش ہوا اور دونوں ہاتھ اٹھا کے خدا کی درگاہ میں دعا کی کہ اے پروردگار بندہ نواز اس میرے بیٹے کو دونوں جہان میں سرفراز کر اور اپنی محبت میں کامل اور ولایت کی دولت بخش۔ چنانچہ ان کی دعا مقبول ہوئی اور مخدوم صاحب کو ادب کی برکت اور والدہ صاحب کی دعا سے دین و دنیا کی سعادت حاصل ہوئی۔ خدا کے ولی اور صاحب کرامت ہوئے۔"

کتاب کا تیسرا باب خطوط اور رقعات سے متعلق ہے، ان کی زبان بھی صاف اور سلیس ہے۔ یہاں نمونہ کے طور پر ایک خط نقل کیا جاتا ہے جو بیٹے کے نام ہے، خط کے سارے مضامین بیٹے کے لیے نہایت نفع بخش ہیں:

"فرزند سعادت مند، نور چشم نیک اطوار (فلانے) دراز ہو عمر تمھاری بعد دعائے فراواں کے معلوم ہووے کہ حق تعالیٰ کے لطف و عنایت سے ہم یہاں اچھی طرح خیریت اور صحت سے خوش ہیں اور تمھاری اور گھر کے سب آدمیوں کی خیر و عافیت ہمیشہ پروردگار سے چاہتے رہتے ہیں۔

تمھارا خط نیک وقت میں پہنچا اور گھر کے سب آدمیوں کی صحت اور تمھارے پڑھنے اور

حساب سیکھنے کی حقیقت دریافت کرنے سے جان کو فرحت اور تازگی اور دل کو تسکین اور خوشی بہت حاصل ہوئی۔

فرزند! علم و ہنر سے کوئی چیز بہتر نہیں ہے۔ علم سب چیزوں پر فوقیت رکھتا ہے اور مسافری اور مفلسی میں نہایت مدد کرتا ہے اور حساب بھی علم و ہنر سے ہے۔ خصوص روزگار کے واسطے وسیلہ ہے، پس جتنی محنت اس کی تحصیل میں ہو سکے واجب اور لازم ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم حساب کے قانون پورے کر کے تھوڑا ہندوستانی صرف ونحو کا قاعدہ پڑھو کہ اس سے عربی اور فارسی یا اور کسی زبان کے قاعدے سیکھنے اور سمجھنے آسان ہو جاتے ہیں۔ بعد اس کے اور کتاب شروع کرنا اور ہمیشہ لکھنے پڑھنے اور گھر کی خبرداری میں مشغول رہنا۔ صحبت سے خراب لڑکوں کی دور رہنا۔ خدا تعالیٰ تم کو توفیق نیک نصیب کرے اور ذہن اور فہم کامل بخشے۔ آمین۔

پہلی جمادی الثانی 1257ھ مقدسہ''

مکتوب الیہ سن و سال، مال اور کمال کے اعتبار سے بڑا، چھوٹا یا برابر کا ہو سکتا ہے اور اسی لحاظ سے القاب و آداب لائے جاتے تھے۔ فرق یہ ضرور تھا کہ چھوٹے کے لیے ''مقدمۂ القاب'' نہیں لاتے تھے۔ یہ خط اپنے ارکان اور مطالب کے اعتبار سے ایک اچھے نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقام پر یہ ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر مہذب انسانی جماعت کی زندگی کے کچھ ضابطے ہوتے ہیں، خط کے القاب و آداب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ ''ترکِ آداب'' شائستگی کے تقاضے کے خلاف ہے اور اسے کسی بھی حالت میں پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

# ب - مذہبی نثر

انگریزوں کی عملداری ہونے کی وجہ سے ہندستانی معاشرے میں شعوری اور غیر شعوری طور پر فرنگیوں کی مختلف النوع مصنوعات کا استعمال اور اس کے نتیجہ کے طور پر ان کی لفظیات، بول چال، اندازِ فکر و بیان اور پھر خورش، پوشش، رہائش کے علاوہ مذہب اور عبادت کے اثرات بھی بتدریج بڑھتے جارہے تھے۔ علمائے وقت جو زمانے کے نبّاض بھی ہوتے ہیں، حالات کی رفتار کو پہچان کر اپنے قلم کی طاقت سے اس کے مقابلے کے لیے آمادہ ہوئے چنانچہ مذہب نصارا کے رَد میں چھوٹی بڑی کتابیں بھی لکھنی شروع کیں۔

جاج مئو کا علاقہ شہر کانپور سے متصل تھا، وہاں کے فاروقی علما کی طرف سے اس باب میں زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ ہوا، اُنھوں نے نظم اور نثر میں طرح طرح کی کتابیں لکھیں اور صاف لفظوں میں یہ اعلان کیا کہ:

''اس زمانے کے عالموں پر (یہ کام) فرض واجب ہے۔''

## 1- عاشق- عباس علی فاروقی

ان کے مفصل حالات معلوم نہیں ہیں، سید محسن علی محسن نے اپنے تذکرے میں ان کے بارے میں بس اتنا لکھا ہے کہ:

''مولوی عباس عاشق جاجمئوی، جن کا رسالہ ''صولۃ الضیغم'' ہے۔''5

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر بھی تھے اور عاشق تخلص کرتے تھے، ان کی صرف دو مثنویوں کا حال معلوم ہو سکا ہے اور وہ مختصراً اِس طرح ہے:

الف- انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے میں ایک مثنوی کا قلمی نسخہ محفوظ ہے جس کے بارے میں لکھا ہے:

| | |
|---|---|
| نام مثنوی | معدنِ عصمت یعنی قصہ بی بی مریم |
| مصنف | عباس |
| سالِ تصنیف | 1251ھ (1835) |
| سالِ کتابت | 1277ھ (61-1860) |

اِس مثنوی میں اسلامی عقیدے کے مطابق حضرت مریم کے واقعات نظم کیے گئے ہیں اور اِس طرح بالواسطہ طور پر عیسائیوں کے عقائد کی تردید کی گئی ہے۔

2- جہاد نامہ

یہ 55 شعروں کی مختصری مثنوی ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے ۔

بعد تحمید خدا ، نعتِ رسولِ اکرمؐ    یہ رسالہ ہے جہادی کہ یہ لکھتا ہے قلم

اور یہ مثنوی اِس شعر پر ختم ہوتی ہے۔

ہند کو اس طرح سے کردے اے شاہ    کہ نہ آوے کوئی آواز جز اللہ اللہ

مصنف کی ایک نثری تصنیف ''صبح کا ستارہ'' کا جو قلمی نسخہ اسٹیٹ سینٹرل لائبریری حیدرآباد (دکن) میں محفوظ ہے، اس کے شروع میں یہ مثنوی لکھی ہوئی ہے۔ کانپور میں انگریزوں کے تسلط کے خلاف جو شدید جذبات دلوں میں موجزن تھے ان کا اس مختصری مثنوی سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے سلسلے میں اِس قسم کی تصنیفات کی اہمیت ظاہر ہے۔

مولوی عباس علی فاروقی نے خود اپنے والد کا نام اِس طرح لکھا ہے:

''ناصر علی المورخ بن فضل اللہ الجاجمئوی''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان کئی پشت سے جاجمئو میں رہتا آیا تھا اور مولوی عباس علی

کے والد اپنے زمانے کے ایک ممتاز عالم تھے، انھوں نے یہ ذکر بھی کیا ہے کہ ان کا ایک بھائی جس کا نام قاسم علی تھا اور ان کی والدہ نے 1249ھ (1833) میں وفات پائی تھی۔

خود مولوی عباس علی نے احادیث کا بہت اچھا مطالعہ کیا، خصوصاً عیسائی مذہب کے تعلق سے ان کا شمار ممتاز عالموں میں ہوتا تھا چنانچہ وہ مناظروں اور مباحثوں میں بھی نمایاں رہتے تھے، ان کی کتاب ''صولۃ الضیغم'' میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔

الف۔ صولۃ الضیغم

محسن نے ''صولۃ الضیغم'' کو رسالہ کہا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ عیسائیت کے رد میں ایک ضخیم کتاب ہے۔ مصنف نے یہ خیال کر کے کہ اتنی ضخیم کتاب کا چھپوانا اور اس کا پڑھ لینا بھی عام آدمی کے لیے آسان نہیں ہوگا، اس کا خلاصہ تیار کیا چنانچہ سببِ تالیف میں لکھا ہے:

> ''اب جاننا چاہیے کہ راقم اس رسالہ کا عباس علی بن ناصر علی بن فضل اللہ فاروقی جاجموئی کہتا ہے کہ آگے میں نے کتاب ''صولۃ الضیغم علی اعداء ابن مریم'' نصارا کے رد میں تصنیف کی تھی لیکن اس کا حجم بہت تھا اس واسطے میں نے یہ مختصر ترتیب دیا، جس کو اس میں کسی طرح کا شبہ پڑے وہ اس کی طرف رجوع کرے۔''

کتاب کے خاتمہ میں مصنف نے اصل کتاب اور اُس کے خلاصہ کے بارے میں بعض اطلاعات فراہم کی ہیں:

> ''اس کتاب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم وحضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کے واسطے ایک چھوٹا سا دھماکہ ہے، اس قدر بیان کیا گیا ہے اور جسے زیادہ تشریح و تفصیل کی طلب ہو وہ ''صولۃ الضیغم'' کی طرف رجوع کرے، اس وقت ان کی گمراہی سے بخوبی آگاہی حاصل ہوگی اور اگلے وقت میں اس سبب سے کہ نصارا کا عمل نہ تھا اور زور وشور اس دین منسوخ کا پنہاں تھا، اگلے عالموں نے ان کے رد کی طرف کم توجہ فرمایا لیکن اس زمانے کے عالموں پر فرض وواجب ہے کہ ان کے دین کے ابطال پر کوشش کریں اور رفتہ رفتہ یہی لوگ خلق کثیر کو گمراہ کر ڈالیں گے اور یہ گمان نہ چاہیے کہ رد لکھنے سے کفار قائل نہیں ہوتے، پھر کیا فائدہ،

کیوں کہ جب میں صولۃ الضیغم لکھ چکا اور دس پانچ جگہ یہ امر مشہور ہو گیا کہ لوگوں نے ڈیٹ اور ولیم پادریوں اور مجھ سے بحث کرادی، آخر میں خدا کی مدد سے ان پر غالب ہوا تب ان کے رفیقوں میں سے جو نئے نئے کرسٹان ہوئے ہیں، دو شخص میرے پاس آکر مسلمان ہو گئے۔''

انگریزوں کی عملداری بلکہ ان کی فوجی چھاؤنی (کیمپ) سے متصل رہ کر ان کے مذہب کی تردید میں چھوٹی بڑی کتابوں کا لکھ ڈالنا معمولی بات نہیں تھی۔ قیاس کہتا ہے اس قسم کی کارکردگی انگریز حکام کو ضرور کھٹکتی رہی ہوگی، یہ بھی ایک وجہ ہوگی کہ فاروقی علما کا مسکن جاج مئو پسماندگی کی حالت میں تادیر رہا ہے۔

خلاصہ صولۃ الضیغم میں اسلامی نقطۂ نظر سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات کے علاوہ توریت اور انجیل کی بشارات کو نقل کر کے عقائد نصارا کا رد کیا گیا ہے۔ مولانا امداد صابری نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے:

> ''ردِّ نصارا میں اردو زبان میں پہلی کتاب جو طبع ہوئی وہ'' خلاصہ صولۃ الضیغم علی اعداء ابن مریم'' تھی جس کے مصنف مولوی عباس علی صاحب بن ناصر علی بن فضل اللہ فاروقی جاجمئوی تھے۔ یہ کتاب مطبع سنگین میں 1258ھ کے اندر چھپی جو بڑے سائز 30×20 پر 106 صفحات پر مشتمل تھی۔ یہ کتاب اصل میں 1248ھ (1832-33) میں لکھی گئی تھی لیکن ضخیم ہونے کی وجہ سے اس کا خلاصہ 1258ھ (1842) میں چھپا۔'' مصنف نے اصل کتاب کی تالیف کی تاریخ اس طرح کہی تھی ؎

چوں بفضلِ خدائے عزّ وجل　　یافت ترتیب ایں رسالۂ خوب
گفت ہاتف کتاب مرغوبست　　سالِ تاریخ ہم بود مرغوب
1248

کتاب کی عبارت میں قدامت کا رنگ جھلک جاتا ہے، بعض ایسے الفاظ بھی اس میں آئے ہیں جو پورب والوں کی زبان سے اب بھی سُنے جا سکتے ہیں، باوجود اس کے زبان بطور

مجموئی صاف، سلیس اور رواں ہے اور بیان کا انداز بھی پسندیدہ، مدلل اور سریع الفہم ہے۔ مطالب مصنف کے علم وفضل اور وسعتِ مطالعہ پر دلالت کرتے ہیں۔غرض یہ کتاب ہر طرح قابلِ قدر وتحسین ہے۔

ب۔صبح کا ستارہ

یہ مولوی عباس علی فاروقی المتخلص بہ عاشق جاج مئوی کی دوسری نثری کتاب ہے۔اس کے سبب تالیف میں مذکور ہیں:

''حمد اس خدا کو جو عالم کا پروردگار ہے اور درود وسلام اس نبیؐ پر جو سب نبیوں کا سردار ہے۔ بعد ازاں عباس بن ناصر علی المورخ بن فضل اللہ الجاجموی غفراللہ لھم کہتا ہے کہ سنہ بارہ سوانچاس ہجری (34-1833) میں جب میرے بھائی قاسم علی نے کہ نہایت سخی وشجاع ومجاہد تھا اور میری والدہ نے انتقال کیا، میں نے کتاب دقائق الاخبار کو امام حجۃ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی کی موت کے احوال میں تصنیف کی تھی، مغلق عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا تا فائدہ اس کا عام ہو جائے اور ثواب اس کا میں نے اُن دونوں کی روح کو بخشا اور جو شخص اس کتاب سے فائدہ پاوے اور نفع اٹھاوے، اس سے امید ہے کہ اس مغموم کو اور ان دونوں مرحوم کو اپنی دعا سے محروم نہ کرے اور اصل کتاب میں میں نے کچھ کمی بیشی نہیں کی مگر بعض جگہوں میں بہ ضروریات یا بہ قصد اختصار، اور نام اس کا ترجمہ ''صبح کا ستارہ'' ہے، اس واسطے کہ یہ زمانہ بھی آخری ہے اور اس میں اخیر وقت کا حال بھی مسطور ہے اور خلق کو اس سے ہدایت بھی حاصل ہوگی۔''[7]

دراصل عیسائیوں کے خیال کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کر دیا گیا تھا جبکہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کو نہ قتل کیا گیا اور نہ صلیب دی گئی بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھالیا۔اس معاملہ میں موت کی نوعیت اور کیفیت بھی زیر بحث آئی تھی۔ مترجم مولوی عباس علی نے اپنے رسالہ کو چند ابواب میں تقسیم کیا، اس طرح:

1- نور محمدؐ
2- آدم کی پیدائش
3- فرشتوں کی پیدائش
4- موت کی پیدائش
5- موت کس طرح روح کونہیں ہے
6- پیغمبروں کی روح
7- مومنوں کی روح
8- فریب شیطان کا بیان
9- مرنے کے بعد کی آواز
10- زمین اور قبر کی آواز
11- میّت کی تختی وغیرہم۔

اس کتاب میں بھی ایسے الفاظ استعمال میں آئے ہیں جو دہلی میں مروّج نہیں ہیں، البتہ پورب والوں کی زبانوں سے اب بھی سُنے جاسکتے ہیں۔ مثلاً:

جوکھنا، تولنا اور بدلنا شرط لگانا وغیرہ۔

یہ کتاب ''صبح کا ستارہ'' مطبع مصطفائی کانپور میں پہلی مرتبہ 1851 میں 205 صفحوں پر چھپ کر شائع ہوئی تھی، بعد میں دوسرے مطبعوں سے بھی یہ کتاب چھپ کر عام ہوتی رہی۔

مولوی سید عباس علی کے بھائی قاسم علی کے بارے میں فی الوقت کوئی بات معلوم نہیں ہوسکی۔ نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے بھی نظم ونثر میں کوئی یادگار چھوڑی یا نہیں۔ ان کے والد کا بھی کوئی علمی کارنامہ تاحال ہمارے علم میں نہیں آسکا ہے۔

# ج - میلادنامہ

## 1- شاکر- عبدالرحمٰن

عبدالرحمٰن شاکر ولد حاجی محمد روشن خاں ابن محمد نواز خان کا ذکر ایک سے زائد مقاموں پر کیا جاچکا ہے۔ انھوں نے ایک ''میلادنامہ'' بھی لکھا تھا جس کا قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔ اسی قبیل کی بعض کتابیں ان کی تالیف کردہ اور بھی ہوسکتی ہیں۔

## 2- عیش- ابومحمد فاروقی

یہ میر علی اوسط رشک کے نام برآوردہ شاگردوں میں سے تھے چنانچہ محسن علی موسوی نے ان کے بارے میں مفید اطلاعات قلمبند کی ہیں:

> ''شیخ ابومحمد فاروقی عیش تخلص ولد شیخ نورالہدیٰ، عزیزوں میں قاضی امین اللہ مغفور جاجموی کے، باشندہ کانپور، صاحب دیوان، شاگرد میر علی اوسط رشک۔''10

تلاش کے باوجود نورالہدیٰ اور امین اللہ کے حالات معلوم نہیں ہوسکے۔ سعادت خان ناصر نے عیش کو ''قاضی زادہ جاج مئو'' لکھا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ گھرانا قاضیوں کا تھا اور جاج مئو کے صاحب علم، مذہب دوست اور معزز افراد پر مشتمل تھا۔

3- غنی- غنی احمد

تذکروں میں عیش کے ایک بیٹے کا بھی ذکر ملتا ہے جو شاعر تھا چنانچہ محسن کے تذکرے میں ہے:

"غنی احمد غنی ولد ابو محمد عیش باشندہ جاجمؤ متعلقہ کانپور، خویش مولوی عباس عاشق جاجموی جن کا رسالہ صولۃ الضیغم ہے، شاگرد میر علی اوسط رشک۔"[11]

مولوی عباس علی عاشق کی تصانیف کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ عیش اور غنی کے عقائد بھی وہی تھے، اردو نثر میں فی الوقت عیش کی صرف ایک کتاب کا حال معلوم ہو سکا ہے جس کا نام انھوں نے "بیانِ آخرت وسیلۂ مغفرت" رکھا تھا، اس کے آغاز کی عبارت اس طرح ہے:

"سب تعریف اس خالق وحدہ لاشریک کو سزاوار ہے جس نے کل مخلوقات کو آن کی آن میں بے استعانتِ غیر کے پردۂ ہستی سے عالم ظہور میں لا کر جسم انسان خاکی بنیان کو خلعتِ حیات سے ممتاز کر کے اشرفِ مخلوقات کیا اور اپنی قدرتِ کاملہ سے آسمان کو بے ستون قائم کر کے ستاروں سے آرائش دی..... بعد حمد و نعت کے بندہ گنہگار امیدوار مغفرتِ غفار الصمد شیخ ابو محمد عیش بن نور الہدیٰ جاجموی فاروقی، بخشے اللہ تعالیٰ جرم ان دونوں کے اور رحمت کرے اللہ ان دونوں پر بہ طفیل اپنے رسول کریم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے خدمت میں اربابِ اہل اسلام و احباب ذوی الاحترام کے عرض کرتا ہے کہ بعض محبِ صادق و دوستانِ واثق نے تکلیف اس امر کی دی کہ رسالۂ قیامت کو جو تصنیفات عالم ربانی و مرتاض حقانی مروّج احکامِ دین، بانی مراسم شرع متین یعنی مولانا و مرشدنا محمد رفیع الدین محدث دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز سے ہے، اس کو سلیس اردو میں کر، تا عام لوگوں کو اس سے فائدہ حاصل ہو اور فہم میں ہر صغیر و کبیر کے بہ آسانی آ جائے۔ ہر چند فقیر لیاقت اس امر کی نہ رکھتا تھا لیکن بموجب مقولہ سعدی علیہ الرحمہ کے کہ آزردنِ دلِ دوستاں جہل است اور بحکم المامور معذور کے موافق فرمانے دوستانِ شفیق و محبانِ حقیقی کے سن بارہ سو چونسٹھ ہجری (1848) میں اس کے لکھنے پر مصروف ہوا اور نام اس کا "بیانِ آخرت وسیلۂ مغفرت" رکھا۔"

کتاب کا اختتام اس عبارت پر ہوا ہے:

'' اللہ تعالیٰ سب مسلمان بندوں کو اور ہمارے دوستوں اور آشناؤں اور اقرباؤں اور عزیزوں کو خاتمہ بخیر کرے اور ہولِ قیامت سے نجات بخشے اور عذابِ محشر سے محفوظ رکھ کر جنت نصیب کرے اور رضامندی اپنی مجھ کو اور سب بھائی مسلمانوں کو بطفیل اپنے رسول مقبول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نصیب کرے۔ آمین۔''

کتاب کے آخر میں مترجم نے قطعہ تاریخ بھی لکھا ہے۔ اس کے کچھ شعر یہ ہیں:

جب کیا یہ ترجمہ میں نے تمام — ہوگیا مشہور عالم شش جہت

یا الٰہی خاتمہ بالخیر کر — تیری رحمت میں خدایا ہے وسعت

اس رسالے کا رکھا ہے عیش نے — نام تاریخی بیانِ آخرت

1264ھ

تکمیل کے بعد یہ کتاب مطبع محمدی لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہوگئی۔ خاتمۃ الطبع کی عبارت یہ ہے:

'' کان رکھ کر سُنو یہ رسالۂ قیامت ہے، مفصل بیانِ آخرت ہے، فارسی سے ہندی زبان ہوا، ہر ایک کو سمجھنا آسان ہوا۔ نفعِ عام کے لیے مطبع محمدی میں چھپا اور صفر کی سولہویں بارہ سو پینسٹھ 1265ھ میں انجام کو پہنچا۔ ایک بار اس کی سیر کر جاؤ، نصیحت قبول کرو، فائدہ اٹھاؤ۔''12

ابو محمد عیش نے عبارت میں اکثر عربی فارسی کے لفظوں اور مقفّٰی ترکیبوں کا صَرف کیا ہے، ان کی تحریر میں بیساختگی کی وہ صورت نہیں ہے جو عباس علی فاروقی کے یہاں پائی جاتی ہے۔

## 4- سیفی- وارث علی

یہ شیخ امام بخش ناسخ کے باکمال شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے حالات گزشتہ اوراق میں لکھے جاچکے ہیں۔ نظم کے علاوہ یہ نثر کے لکھنے پر بھی قدرت رکھتے تھے، ان کی فی الوقت دو کتابوں کا پتہ چل سکا ہے:

الف۔ ''تقریر الشہادتین۔ یہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کی مشہور کتاب 'سر الشہادتین' کا ترجمہ ہے۔ مترجم سیفی نے اس کے سبب تالیف میں لکھا ہے:

''مخدوم ومکرم محمد شیر علی خاں صاحب کہ اللہ نے ان کو توفیقِ خیر وسعادت بکمال تہذیب و اخلاق عنایت کی ہے اور اس فقیر کے حال پر کمال التفات فرماتے ہیں، مجھ سے مصر ہوئے کہ اگر تو اس رسالہ (سر الشہادتین) کو زبانِ اردو میں لکھے تو بہت مناسب ہے، اس واسطے کہ ارذل الخلقت وفاقد البصیرت وارث علی سیفی نے تقدیم ارشاد خاں صاحب ممدوح کا مقدم سمجھ کر باوصف فقدانِ لیاقت اور ضیق اوقات کے تحریر اس کی اوائل 1260ھ (1844) میں کہ عشرات اس سنہ کے سنہ شہادت جناب سید الشہدا...... سے مطابقت بھی رکھتے ہیں۔ شروع کر کے بتوفیق ایزدی ختم کیا اور کچھ اشعار حسب موقع اپنے اپنے مقامات پر زیادہ کیے اور نام اس کا بہ اقتداءِ تسمیہ متن اور شرح کے ''تقریر الشہادتین'' رکھا۔ چونکہ حقیقت میں اس ہیچمدان کو مطلق لیاقت تالیف وتصنیف کی نہیں ہے اور اس کوچہ سے محض نابلد ہے، اس واسطے ناظرین خطا پوش سے امید یہ ہے کہ اس فقیر کی بے بضاعتی پر نظر نہ کریں اور اصل مطلب سے غرض رکھیں۔''13

واقعہ یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کی کتاب ''سر الشہادتین'' کی شرح فارسی میں ان کے شاگرد مولوی سلامت اللہ کشفی بدایونی نے ''تحریر الشہادتین'' کے نام سے لکھی تھی۔ کشفی اور سیفی کے مابین اچھے روابط تھے چنانچہ سیفی نے محمد شیر علی خاں کی تحریک سے کشفی کی شرح کا اردو میں ترجمہ کر دیا تھا۔ اصل کتاب ''سر الشہادتین'' کا ایک ترجمہ مولوی خرم علی بلہوری نے کیا تھا، وہ ترجمہ 1873 (1290ھ) میں لکھنؤ میں چھپا تھا۔ بتایا گیا ہے کہ مولوی خرم علی کے ترجمے کے:

''حاشیہ پر محمد سلامت اللہ (کشفی) کی فارسی کتاب تحریر الشہادتین کا اردو ترجمہ تقریر الشہادتین (مترجمہ وارث علی) منقول ہے۔''

''تقریر الشہادتین ترجمہ تحریر الشہادتین فارسی'' کا ایک قلمی نسخہ جو 1264ھ (1848) کا لکھا ہوا ہے، انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہی کتاب تقریر الشہادتین ترجمہ سر الشہادتین کے نام سے نولکشور پریس لکھنؤ میں 1871 میں چھپ کر

شائع ہو چکی تھی، بعد میں دوسرے مطبعوں سے بھی یہ کتاب چھپتی رہی تھی۔''14

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ محمد شیر علی خاں کون تھے جو اس ترجمے کے محرک ہوئے۔ سیفی کے اس ترجمے کی عبارت اکثر مقاموں پر مقفی ہے۔ بطور مجموعی اس میں عربی فارسی کے الفاظ و تراکیب کی آمیزش زیادہ ہے۔

ب۔ واقعاتِ درّانی

اس کتاب کی دو اشاعتوں کا ذکر ملتا ہے۔ اس طرح:

اشاعتِ اول: ''عبدالکریم منشی واقعاتِ درّانی

مترجم: میر وارث علی سیفی صفحات 60

سالِ اشاعت: 1290ھ مطبع: نظامی پریس، کانپور

احمد شاہ درانی سے زمان شاہ کے عہد تک کے حالات۔''

اشاعتِ ثانی: عبدالکریم واقعاتِ درّانی

مترجم: وارث علی سیفی صفحات 228

سالِ اشاعت: 1963 ناشر: پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور

نادر شاہ درّانی کے ہندوستان پر حملے کے واقعات۔

فی الوقت یہ کتاب دستیاب نہیں ہو سکی اس لیے اس کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔

کانپور کے علاقے میں اُس زمانے میں بطور مجموعی مذہبی ماحول تھا، چنانچہ اس بارے میں شبہ کی ہرگز کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہاں اردو نثر میں اور بھی بہت مذہبی کتابیں لکھی گئی تھیں جن تک راقم کی رسائی نہیں ہو سکی۔

راقم نے نواب حیدر علی خان بہادر کی کتابوں میں یہ دو کتابیں بھی دیکھی تھیں:

1- نہالِ آخرت محمد تحسین علی خاں

مطبوعہ مطبع اثنا عشری لکھنؤ شعبان 1287ھ (1870)

اور

2- منافع الابرار مرزا محمد جعفر خاں

سال تصنیف: 1272ھ          سال طباعت: 1288ھ (1871)

مطبع: اثنا عشری لکھنؤ          226 صفحے

حسب حکم شاہزادہ مرزا محمد حیدر ابن مرزا محمد کام بخش۔

اس سے اس قسم کی کتابوں کے ان کے شوق مطالعہ کا کسی حد تک اندازہ ہوتا ہے۔

## ک - مطبعے

انگریزوں کی عملداری ہونے کی وجہ سے شہر کانپور میں قوم نصاریٰ کے طور طریق، ان کے استعمال کی اشیا، ادویہ اور اغذیہ کے علاوہ مختلف النوع مصنوعات کا بھی تیزی سے چلن ہوتا جارہا تھا۔ اس صورتِ حال کا فائدہ یہ ہوا کہ یہ شہر بتدریج ایک اچھے صنعتی مرکز کے طور پر ترقی کرنے لگا تھا۔ صنعتی اور پھر تجارتی وغیرہ ضرورتوں سے اس شہر میں مطبعے بھی قائم کیے جانے لگے تھے۔

### 1- کانپور ایڈورٹائزر

اُنیسویں صدی عیسوی کے تیسرے عشرے کے آغاز میں "مسٹر سیم ویل گرین وے" نامی ایک انگریز نے بہ عہد غازی الدین حیدر بادشاہ اول اپنے قومی مفادات کے پیش نظر ایک پریس "کانپور ایڈورٹائزر" کے نام سے جاری کیا، پھر اسی نام کا ایک انگریزی اخبار بھی اسی پریس سے چھپ کر شائع ہونے لگا۔ پریس اور اس اخبار کے مقاصد ان کے نام سے ظاہر ہیں۔ ان دونوں کو شمالی مغربی ہندوستان میں اوّلیت حاصل رہی ہے۔ چند سال کے بعد اسی شہر میں ایک اور انگریزی اخبار نکلنا شروع ہوا لیکن اس کی عمر زیادہ نہیں ہوئی، صرف چند شمارے اس کے نکل سکے۔

### 2- مطبعِ مسیحائی

نصیر الدین حیدر بادشاہ دوم کے زمانے میں "مسٹر آرچر" نامی ایک انگریز نے کانپور میں

لیتھو کا ایک سنگی پریس 1830 (46-1245ھ) میں قائم کیا جو مطبع مسیحائی کہا گیا۔[1]

بادشاہ نے اس کا حال دریافت کر کے آرچر کو طلب کیا اور لکھنؤ میں سنگی مطبع لگوایا، اس کا نام مطبع سلطانی رکھا گیا، اس کا سالِ اجرا 1247ھ (1831) معلوم ہوتا ہے۔

### 3- مطبعِ مصطفائی

مولوی محمد مصطفیٰ خاں پسر حاجی محمد روشن خاں ابن محمد نواز خان نے محمد علی شاہ بادشاہ سوم کے جلوس کے کوئی ایک برس بعد اپنے نام سے لکھنؤ میں ایک مطبع قائم کیا۔ یہ مطبع مصطفائی بڑی خوبی سے کام کرتا رہا، کچھ ہی مدت کے بعد حالات سے مجبور ہو کر 1266ھ (1849) میں مصطفیٰ خاں کو اپنے مطبع کو لکھنؤ سے کانپور منتقل کرنا پڑا، لکھنؤ میں مصطفیٰ خاں کے صاحبزادے عبدالواحد خاں ان کے مطبع کے مہتمم تھے۔

کانپور میں مطبع کے مالک تو مصطفیٰ خاں ہی رہے لیکن مہتمم کی حیثیت سے ان کے چھوٹے بھائی محمد عبدالرحمٰن خاں نے ذمہ داری سنبھال لی، کانپور میں منتقل ہونے کے بعد اس مطبع سے جو سب سے پہلی کتاب چھپی تھی وہ ''دستور الفصیحت'' معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں لکھا ہے:

> ''دستور الفصیحت (1259ھ) اردو مثنوی میں مصنفہ منشی احمد علی رسا مطبوعہ مطبعِ مصطفائی محمد مصطفیٰ خاں محلہ پٹکاپور، کانپور۔
>
> اہتمام طباعت 20 ربیع الاول 1266ھ۔ صفحات 84۔ حوض وحاشیہ پر۔''[2]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مطبع نے شروع سال 1266ھ (نومبر، دسمبر 1849) میں کانپور کے محلہ پٹکاپور میں کام شروع کر دیا تھا۔

قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ دونوں بھائی یعنی مصطفیٰ خاں اور عبدالرحمٰن خاں صاحب علم اور علم دوست تھے، دونوں کی بعض کتابوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ عبدالرحمٰن خاں شاعر بھی تھے اور شاکر تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک بہت مختصر نثری رسالہ ''شرحِ عقدِ انامل'' ہے، اس کا ذکر آگے آئے گا۔

### 4- مطبعِ محمدی

یہ ''مطبع حاجی حرمین شریفین مولوی محمد حسین'' کے نام سے مشہور تھا، یہ بھی لکھنؤ میں محمد علی شاہ کے جلوس کے بعد سے کام کر رہا تھا لیکن اسے بھی حالات سے مجبور ہو کر لکھنؤ سے کانپور لانا پڑا تھا،

اس مطبع کے مہتمم منشی نواز علی سجاد تھے جو مالکِ مطبع کے بھائی تھے۔ جیسا کہ تخلص سے ظاہر ہے، یہ بھی شاعر تھے اور تاریخ گوئی میں ماہر تھے مثال کے طور پر الٰہی بخش عثمانی کے جدِ امجد شیخ احمد رئیس کٹرا کی وفات کا قطعہ تاریخ اس طرح کہا ہے ؎

چو ناگہ رئیس کٹرا شیخ احمد ز دنیا سُوِ بیتِ اقصیٰ شدہ
بمرد از وفاتش طریقِ سعادت سبیلِ کرم پیش احبا شدہ
ز اخلاصِ عامش بدل خاص و عام بتوصیفِ والاش گویا شدہ
چو بود او گلستان و گنجِ شرف بخلدِ نعیم رونق افزا شدہ
چنیں گفت سجاد تاریخ فوتش مقامش ز فردوس اعلیٰ شدہ

وقتِ زوال روز دوشنبہ 24 شوال 1258ھ

مثنوی مہر و ماہ کے مطبوعہ نسخہ پر مطبع سے متعلق درج ذیل عبارت توجہ طلب ہے:

''مثنوی مہر و ماہ مؤلفہ نواب علی بہادر ثانی۔ مطبوعہ در مطبع خاص حاجی حرمین شریفین مولوی محمد حسین، شہر کانپور، چھتر محال، مکان سیتارام صفا''

اس کے لیے سجاد نے قطعہ تاریخ کہا تھا جو اس طرح درج ہے:

قطعہ تاریخ از شیخ محمد نواز علی سجاد متوطن کٹرا ضلع الٰہ آباد برادر حاجی محمد حسین مطبع محمدی ؎

چھپ گئی جب مثنوی نواب عالی جاہ کی شعر پر جس کے گماں ہے مطلع خورشید کا
خامۂ سجاد نے تاریخ اس کی یوں لکھی کیا ہی مہر و ماہ کا راحت فزا قصہ چھپا
1267ھ (1850-51)

اس سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ مطبع 1850 (67-1266ھ) کے اوائل میں ہی شہر کانپور میں کام کرنے لگا تھا۔

یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ ''ہندوستانی پریس'' کے موضوع سے متعلق تحقیق کرنے والے نے اپنے تمام بلند بانگ دعوؤں کے باوجود ایک بھی مطبع کے مالک اور کارپردازوں کے حالات کی جستجو کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی ہے۔ مندرجہ بالا قطعات سے سجاد کے جو کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں، ان کی روشنی میں حاجی حرمین کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ان

کا تعلق قصبہ کڑا (ضلع الہ آباد) کے ایک علمی گھرانے سے تھا۔ وہ بذاتِ خود علم دوست، ہوشمند اور معاملہ فہم شخص تھے، انھوں نے اپنے بھائی سجاد کو جو اپنے وقت کے اچھے تاریخ گویوں میں سے تھے اپنے مطبع کا مہتمم مقرر کیا تھا، کتابت کے کام پر شیخ عبدالرحمٰن، احسن تخلص کو مامور کیا تھا تاکہ متن کی صحیح کتابت ہو سکے۔ مطبع کے کانپور میں قیام کے بعد جو اوّلین کتابیں چھپی تھیں ان میں مثنوی مہر و ماہ بھی تھی جس کو بغیر کسی مبالغہ کے کتابت اور عمدہ طباعت کے دیدہ زیب نمونہ کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی کارکردگی کی وجہ سے حاجی حرمین کے مطبع کو بہت تیزی سے شہرت حاصل ہو گئی۔

## 5- مطبع مسیحائی

مولوی مسیح الزماں فاروقی جاج مئوی ابن مولوی نور محمد کا ذکر کیا جا چکا ہے، انھوں نے اپنے نام کی مناسبت سے لکھنؤ میں ایک مطبع قائم کیا تھا، جب حالات ناموافق ہوئے تو مطبع محمدی وغیرہ کی طرح مولوی مسیح الزماں کو بھی اپنے مطبعِ مسیحائی کو کانپور لانا پڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی مسیح الزماں دور اندیش اور زمانہ شناس شخص تھے چنانچہ طباعت کے کام میں انھوں نے بہت تیزی سے ترقی کی تھی، اپنے مطبع کے لیے انھوں نے ایک ہندو کاتب ''رنگی لال'' کا تقرر کیا تھا اور کچھ شک نہیں کہ اس نے کتابت کی خوبی کے لحاظ سے مطبعِ مصطفائی وغیرہ کی مطبوعہ کتابوں کی برابری کر کے دکھا دیا تھا۔ بعض کتابوں کے اندراجات اس صورت حال کو دکھاتے ہیں مثلاً:

''طب نبوی مطبوعہ مطبع مسیحائی مطابق نسخۂ مصطفائی

بہ اہتمام مولوی مسیح الزماں ص 52''3

اس مطبع کی کتابت اور طباعت کا معیار خاصا بلند تھا چنانچہ اکثر نفیس طبع لوگ اپنی کتاب یہیں چھپوانا پسند کرتے تھے۔ ایک دو کتابیں یہ ہیں:

''سرورِ سلطانی، ترجمہ شمشیر خانی مصنفۂ توکل بیگ (عہد شاہجہانی 1063ھ) ترجمہ مرزا رجب علی بیگ سرور، ترجمہ حسب ارشاد سلطان عالم واجد علی شاہ فرماں روائے اودھ۔ سن اتمام ترجمہ 1264ھ، مطبوعہ مطبع مسیحائی، مسیح الزماں 1268ھ، ص 204۔''

اس سے ظاہر ہے کہ اس مطبع نے بھی کانپور میں 1851 میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

''گل بکاؤلی اردو ترجمہ از فارسی قصہ مصنفہ شیخ عزت اللہ بنگالی (1124ھ) ترجمہ نہال چند لاہوری موسومہ مذہب عشق، کتابت و مطبوعہ در شہر کانپور بہ محلہ کل خانہ بازار، در مطبع مسیحائی بہ اہتمام مسیح الزماں ولد مولوی نور محمد۔''[5]

اس اقتباس سے مطبع کے محل وقوع کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔

6- مطبع نظامی

مطبع مصطفائی کے مالک محمد مصطفیٰ خاں کے چھوٹے بھائی محمد عبدالرحمٰن شاکر کا ذکر گذشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے، انھوں نے مطبع عبدالرحمٰن کے نام سے اپنا ایک الگ مطبع لکھنؤ میں قائم کیا تھا، وہاں جب حالات دگرگوں ہوئے تو شاکر اپنے مطبع کو بند کر کے کانپور میں آکر رہ پڑے۔ بڑے بھائی نے چھوٹے کی مدد اس طرح کی کہ ان کو اپنے مطبع میں مہتمم کا عہدہ عطا کر دیا، کچھ مدت کے بعد جب حالات موافق ہوئے تو مولوی محمد عبدالرحمٰن خان شاکر نے اس شہر میں بھی اپنا مطبع الگ لگا لیا اور اس کا نام 'مطبع نظامی' رکھا۔ یہ نام کیوں رکھا گیا اس کی صحیح وجہ معلوم نہیں ہو سکی ہے۔

مطبع نظامی کا قیام بہ گمان غالب 1269ھ (53-1852) میں عمل میں آیا تھا۔ وہ زمانہ تھا جب مفتی عنایت احمد اپنی کتاب ''الکلام المبین فی آیۃ رحمۃ للعلمین'' لکھ رہے تھے، کتاب مکمل ہونے کے بعد شاکر کو مل گئی اور انھوں نے 1270ھ (54-1853) میں اسے چھاپ دیا، اس کے بعد وہ مفتی صاحب کی کتابیں یکے بعد دیگرے چھاپتے رہے، چنانچہ بعض کے نام یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| محاسن العمل الافضل مع التتمات[4] | اتمام طباعت 27 شعبان 1372ھ |
| ضمان الفردوس | 1273ھ |
| فضائل درود و سلام | 1273ھ |

معلوم ہوتا ہے کہ شاکر نے شہر کے مطبع والوں سے مثبت روابط قائم کر رکھے تھے چنانچہ ان میں سے بھی بعض کتابیں انھوں نے اپنے مطبع میں چھاپی تھیں مثلاً لکھا ہے:

''مولوی مسیح الزماں ولد مولوی نور محمد (جاجموی) نے 1848 میں تعلیم مکاتب کے لیے معلّم الحساب ملقب بہ مکتب نامہ لکھا جس میں لڑکوں کے لیے نصائح، حکایات، انشا، رقعات، قواعد، حساب اور بارہ سو برس کی ایک جنتری تحریر کی۔ مکتب نامہ دوسری

بار 1275ھ (1859) میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔ اشاعت اول

1265ھ (1847) میں ہوئی تھی۔"[6]

شاکر جیسا کہ کہا جاچکا فرصت کے اوقات میں کچھ کچھ تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے رہتے تھے، انھوں نے "پنج رسائل" کے نام سے ایک کتاب چھاپی تھی، اس میں خود ان کا ایک مختصر رسالہ بھی شامل تھا چنانچہ مذکور ہے:

"پنج رسالہ مشتمل بر احکام الایمان، تنبیہ بے نمازاں، موضح البدعات والکبائر، معاصی کبیرہ منظوم، شرح عقد انامل، مطبوعہ مطبع نظامی کانپور 1273ہجری (57-1856)

......شرح رسالہ عقد انامل ایک نثری رسالہ ہے جسے عبدالرحمٰن شاکر نے تصنیف کیا ہے۔ یہ رسالہ صفحہ 23 سے شروع ہوتا ہے، صفحہ 24 تک ناتمام ہے۔"[7]

مطبعے الگ الگ ہونے کے باوجود بڑی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ دونوں بھائی محمد مصطفیٰ اور محمد عبدالرحمٰن کے مابین اچھے تعلقات رہے تھے، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ 1857 کے ہنگاموں میں بھی ان کے مطبعے بند نہیں ہوئے البتہ دونوں ایک مشترک مطبع کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

معیاری مطبع کی حیثیت سے شاکر کے مطبع نظامی کو بہت شہرت حاصل تھی چنانچہ مرزا اسداللہ خاں غالب کا دیوان بھی یہیں چھپنے کے لیے آیا تھا، اس کے آخر میں لکھا ہے:

"خاتمۃ الطبع

بخدمت ارباب سخن عرض کرتا ہے امیدوار رحمت و غفران محمد عبدالرحمان بن حاجی محمد روشن خاں طیب اللہ ثراہ اس سے پہلے دیوان بلاغت نشان جناب نواب اسداللہ خاں غالب کا دہلی میں چھپا لیکن بہ سبب سہو و نسیان کے بعض مقام میں تغیر و تبدل ہوا، اس لیے جناب مجمع لطائف بیکراں محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کی ایک نسخہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے بہ افضال ایزدی مطابق اس نسخہ کے شہر ذی الحجہ 1278ھ مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا۔ امید کہ جب ناظرین اس کے مطالعہ سے حلاوت سخن کی پائیں مہتمم کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔ فقط۔"

مطبع کی ساکھ کا اندازہ اس طرح بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس کی کتابوں کے آخر میں ایک اندراج اس قسم کا بھی ہوتا تھا:

''وجہ مہر کی خاتمے پر

واسطے سند اس بات کی کہ یہ کتاب چھپی ہوئی مطبع نظامی کی ہے، دستخط اور مہر کی گئی۔

العبد　　مہر　　حاجی محمد روشن خاں حنفی 1273

دستخط　　محمد عبدالرحمٰن بن''

کچھ شک نہیں کہ مطبع نظامی اپنے زمانے کا سب سے زیادہ مقبول اور معیاری مطبع تھا۔

اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ اختر تخلص کے دور میں کانپور کے معروف مطبعوں کا مختصراً حال لکھا گیا۔ کچھ اور مطبعے بھی اس زمانے میں اس شہر میں تھے لیکن ان کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی تھی، اس لیے ان کا احوال یہاں نہیں لکھا جارہا ہے۔

# حواشی

کانپور کی آبادی

| | | | |
|---|---|---|---|
| -1 | تاریخ ضلع کانپور | جلد 1 | ص15 |
| -2 | ایضاً | | ص42 |
| -3 | ایضاً | | ص73 |
| -4 | ایضاً | | ص26 |
| -5 | ایضاً | | ص67 |
| -6 | ایضاً | | ص69 |
| -7 | ایضاً | | ص56 |
| -8 | ایضاً | | ص19 |
| -9 | ایضاً | | ص56 |
| -10 | ایضاً | | ص96 |
| -11 | فسانۂ عجائب | | ص |
| -12 | سرمایۂ زبان اردو | | ص188 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 13- | فسانۂ عجائب | | ص |
| 14- | خوش معرکۂ زیبا | جلد1 | ص223تا224 |
| 15- | ایضاً | جلد1 | ص232 |
| 16- | سراپا سخن | | ص270 |
| 17- | فسانۂ عجائب | | ص |
| 18- | نفس اللغۃ | | ص98 |
| 19- | مخطوطات موزۂ ملی | | ص70 |

## ماحول

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | آب حیات | | ص338 |
| 2- | تاریخ اودھ | جلد3 | ص167 |
| 3- | تاریخ اودھ | جلد3 | ص167 |
| 4- | خوش معرکۂ زیبا | جلد2 | ص24تا25 |
| 5- | انتخاب یادگار | | ص198 |
| 6- | ایضاً | | ص122 |
| 7- | گلشن ہمیشہ بہار | | ص308 |
| 8- | نفس اللغۃ | | ص55 |
| 9- | تذکرہ ابن طوفان | | ص9 |
| 10- | قیصر التواریخ جلد 2 | | ص91 |
| 11- | تواریخ ضلع کانپور | جلد2 | ص112 |
| 12- | سراپا سخن | | ص84 |
| 13- | ایضاً | | ص220 |
| 14- | بحر الفصاحت | | ص973 |
| 15- | ایضاً | | ص965 |

16- حضرت رشید ص22تا24

17- گلشن ہمیشہ بہار ص308

18- بہار بے خزاں ص83

19- تاریخ اودھ جلد4 ص167

20- ایضاً جلد4 ص380

21- ایضاً جلد4 ص381

22- منتخب العالم ص3

23- سراپا سخن ص283

24- ایضاً ص245

25- ذات شریف ص 6تا7

26- امیر نامہ ص313

27- قیصر التواریخ جلد2 ص190

28- سخن شعرا ص232

29- قیصر التواریخ جلد2 ص394

30- ایضاً جلد2 ص252

31- تواریخ ضلع کانپور جلد2 ص112

32- قیصر التواریخ جلد2 ص252تا253

33- کلیات منیر ص4

34- تذکرۃ الذاکرین ص32

35- فہرست کتاب ہائے فارسی چھاپ سنگی ص47

36- خوش معرکہ زیبا جلد2 ص52

37- خمخانۂ جاوید جلد5 ص41

38- قیصر التواریخ جلد2 ص209

| | | | |
|---|---|---|---|
| 39- | ایضاً | جلد 2 | ص253 |
| 40- | تواریخ ضلع کانپور | جلد 2 | ص112 |
| 41- | ایضاً | جلد 2 | ص111 |
| 42- | تواریخ نادر العصر | | ص90 |
| 43- | تاریخ اودھ | جلد 4 | ص201 |
| 44- | سراپا سخن | | ص250 |
| 45- | شمیم سخن | | ص31 |
| 46- | چمن انداز (مراۃ خیال) اور بہارستان ناز | | ص37 |
| 47- | خمخانۂ جاوید | جلد 2 | ص130 |
| 48- | قیصر التواریخ | جلد 2 | ص252 |
| 49- | خمخانۂ جاوید | جلد 2 | ص130 |
| 50- | سراپا سخن | | ص284 |
| 51- | خمخانۂ جاوید | جلد 2 | ص319 |
| 52- | ایضاً | جلد 4 | ص37 |

## شاعری

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | خوش معرکہ زیبا | | ص344 |
| 2- | سراپا سخن | | ص360 |
| 3- | خوش معرکہ زیبا | جلد 2 | ص232 |
| 4- | سراپا سخن | | ص137 |
| 5- | خوش معرکہ | جلد 2 | ص333 |
| 6- | ایضاً | جلد 2 | ص348 |
| 7- | سراپا سخن | | ص324، 328 |
| 8- | ایضاً | | سبب تالیف |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 9- | ایضاً | | ص95 |
| 10- | خمخانہ جاوید | جلد5 | ص291 |
| 11- | فہرست نمائش پٹنہ | | ص140 |
| 12- | ایضاً | | ص21 |
| 13- | صوبہ شمال ومغربی کے اخبارات ومطبوعات | | ص202 |
| 14- | ایضاً | | ص206 |
| 15- | سخن شعرا | | ص561 |
| 16- | ارمغان گوکل | | ص12 |
| 17- | سراپا سخن | | ص91 |
| 18- | اردو مخطوطات علی گڑھ | | ص390 |
| 19- | ایضاً | | ص420 |
| 20- | ارمغان گوکل | | ص56 |
| 21- | سراپا سخن | | ص60 |
| 22- | اردو مخطوطات علی گڑھ | | ص402 |
| 23- | تذکرہ نادر | | ص49 |
| 24- | ارمغان گوکل | | ص21 |
| 25- | خمخانہ جاوید جلد5 | | ص292 |
| 26- | کچھ غالب کے بارے میں | جلد1 | ص100 |
| 27- | پنج آہنگ | | ص |
| 28- | خوش معرکہ زیبا | جلد2 | ص451تا452 |

## تاریخ گوئی

| | | |
|---|---|---|
| 1- | تلخیص معلی | ص164 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| -2 | خوش معرکہ زیبا | جلد2 | ص586 |
| -3 | ایضاً | جلد2 | ص206 |
| -4 | آب حیات | | ص358 |
| -5 | نی | | ص341 |
| -6 | سراپا سخن | | ص328 |
| -7 | ایضاً | | ص330 |
| -8 | ایضاً | | ص84 |
| -9 | خوش معرکہ زیبا | جلد2 | ص317 |

## عروض

| | | | |
|---|---|---|---|
| -1 | خوش معرکۂ زیبا | جلد2 | ص79 |
| -2 | مخزانۂ جاوید | جلد5 | ص291 |
| -3 | ایضاً | جلد2 | ص125 |
| -4 | ایضاً | جلد5 | ص383 |
| -5 | تذکرہ نادر | | ص49 |
| -6 | سراپا سخن | | ص36 |
| -7 | خوش معرکۂ زیبا | جلد2 | ص317 |
| -8 | اردو مخطوطات علی گڑھ | | ص129 |
| -9 | مخزانۂ جاوید | جلد4 | ص37 |
| -10 | آصفیہ کے اردو مخطوطات | جلد1 | ص372تا373 |

## قواعد ولغت

| | | | |
|---|---|---|---|
| -1 | کتاب ہائے چاپ سنگی | جلد1 | ص332 |
| -2 | دیوان آسی | | ص23 |
| -3 | آصفیہ کے اردو مخطوطات | جلد1 | ص359 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 4- | مخطوطات موزۂ ملی کراچی | | ص357 |
| 5- | کتاب ہائے چاپ سنگی | جلد1 | ص345 |
| 6- | نفس اللغۃ | | ص20 |
| 7- | مخطوطات انجمن کراچی | جلد6 | ص156 |
| 8- | تلخیص معلی | | ص223 |

## تذکرے

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | سراپا سخن | | ص386 |
| 2- | خوش معرکۂ زیبا | جلد2 | ص585 |
| 3- | ایضاً | جلد2 | ص352 |
| 4- | شاہ حسین حقیقت | | ص283 |
| 5- | خوش معرکۂ زیبا | جلد2 | 351تا352 |
| 6- | اردو شعرا کے تذکرے | | ص378تا379 |
| 7- | شاہ حسین حقیقت | | ص284 |
| 8- | ایضاً | | ص339تا340 |
| 9- | خزینۃ الامثال | | ص256 |
| 10- | فہرست مخطوطات اردو رامپور | | ص395تا401 |
| 11- | خوش معرکۂ زیبا | جلد2 | ص271تا272 |
| 12- | ایضاً | جلد2 | ص584 |
| 13- | سراپا سخن | | ص177 |
| 14- | ایضاً | | ص272 |
| 15- | ایضاً | | ص104 |
| 16- | صوبہ شمالی ومغربی کے مطبوعات | | ص205 |

## الف - خطوط

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | تذکرہ سرور | | ص |
| 2- | گلشن بے خار | | ص111 |
| 3- | خوش معرکہ زیبا | جلد 1 | ص58 تا 60 |
| 4- | اردو نثر میں علما کا حصہ | | ص564 تا 570 |

## ب - مذہبی نثر

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | سراپا سخن | | ص144 |
| 2- | اردو نثر میں علما کا حصہ | | ص534 تا 539 |
| 3- | ایضاً | | ص540 تا 542 |
| 4- | آصفیہ کے اردو مخطوطات | جلد 2 | ص53 تا 54 |
| 5- | سراپا سخن | | 360 |
| 6- | خوش معرکہ زیبا | جلد 2 | ص344 |
| 7- | سراپا سخن | | ص144 |
| 8- | جائزہ مخطوطات | جلد 1 | ص98 تا 100 |
| 9- | علما کا حصہ | | ص571 تا 576 |
| 10- | قاموس الکتب | جلد 2 | ص52 |
| 11- | ایضاً | جلد 2 | ص507 |
| 12- | ایضاً | جلد 2 | ص |

## مطبعے

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | تاریخ ادب (سکسینہ) | | ص36 |
| 2- | یادنامہ داودی | | ص227 |
| 3- | ایضاً | | ص185 |
| 4- | ایضاً | | ص177 |

5- ایضاً ص177

6- ایضاً ص201

7- ایضاً ص185 تا 186

8- دیوانِ غالب ص104

# 4-الہ آباد

i حواشی

| | | | |
|---|---|---|---|
| | | الہ آباد | 401 |
| | | الف - شاعری | 403 |
| 1- | افضل- | شاہ غلام اعظم | 403 |
| 2- | اعظم- | مرزا اعظم علی بیگ | 406 |
| 3- | متین- | رائے کانجی سہائے | 406 |
| 4- | توانا- | سید اکرام علی | 407 |
| 5- | داغ- | سید لطف حسین | 408 |
| 6- | سجاد- | میر علی سجاد | 409 |
| 7- | بشیر- | شیخ بشیر اللہ | 409 |
| 8- | ندیم- | محمد عسکری | 410 |
| 9- | نخی- | نور سید پرورش علی نقوی | 411 |
| 10- | سجاد- | سجاد | 411 |
| 11- | جولاں- | سید قدرت علی | 412 |
| | | ب - نثر | 413 |
| 1- | قاسم علی | | 413 |
| 2- | بدرالحسن | | 414 |
| | | ج - مطبعے | 417 |
| | حواشی | | 418 |

# الہ آباد

نوابین اودھ کی عملداری میں الہ آباد کو ایک صوبہ کی حیثیت حاصل تھی۔ نواب سعادت علی خاں نے مسندِ وزارت کے حصول کے صلے میں جو علاقہ انگریزوں کے حوالے کیا تھا اس میں صوبہ الہ آباد بھی شامل تھا۔ شہر الہ آباد میں شعر و سخن کے رواج کا ذکر کرتے ہوئے کلب حسین خاں نادر نے لکھا ہے:

> ''مخفی نہ رہے کہ اگر چہ شہر میں شعر و شاعری کا تذکرہ پرانے زمانے سے ہے لیکن حضرت شاہ محمد علیم مغفور کی وفات کے بعد اس فن کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا تھا.... اور جب سے کہ ان اوراق کے جامع نے مشاعرہ کی طرح ڈالی ہے اس شہر کے رہنے والے شعرا کے علاوہ بیالیس حضرات یہاں پہنچے ہیں اور اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں۔'' 1

شاعروں کی اس تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا اور یہ شاعر عموماً غزل گو تھے۔

صوبہ الہ آباد کا ایک مشہور قصبہ ''کڑا'' ہے۔ محمد واصل عثمانی نے اپنے تذکرہ ''سخنورانِ قصبہ کڑا'' میں لکھا ہے کہ:

> ''یہ قصبہ تحصیل سراتھو سے جانب جنوب تقریباً چار میل کے فاصلے پر گنگا کے کنارے پر واقع ہے۔ گنگا کی دوسری جانب قصبہ مانکپور واقع ہے۔ قربت کی وجہ سے یہ دونوں قصبے

ایک ساتھ پکارے جانے لگے اور کڑا مانکپور کے نام سے مشہور ہوئے۔ تحصیل سراتھو کا یہ سب سے بڑا قصبہ رؤسا، شرفا اور علما و شعرا کا ہر زمانے میں مسکن رہ چکا ہے۔" 2

زمانہ قدیم سے جنوبی ہند کی طرف جانے کا یہی عام راستہ تھا چنانچہ اب بھی مدھیہ پردیش کے لوگ یو پی کے باشندوں کو "الہ آبادی" کہتے ہیں۔ خیال کیا جانا چاہیے کہ شمال سے زبان ہندوی (قدیم اردو) بھی اسی راستے سے دکن تک پہنچی ہوگی۔

انگریزوں کی عملداری قائم ہو جانے کے بعد صوبہ الہ آباد میں شعر و سخن اور تصنیف و تالیف کے الگ الگ چند مراکز وجود میں آ چکے تھے۔ یہاں محض نمونہ کے طور پر ہر مرکز کے دو تین شاعروں کا نام اور کلام درج کیا جاتا ہے۔

# الف - شاعری

لکھنؤ بادشاہ نشیں شہر تھا اور الہ آباد شاہی عملداری کے باہر تھا۔ اس صورتِ حال کا نقصان یہ ہوا کہ باوجود یہ کہ لکھنؤ سے نکالے ہوؤں کو یہ شہر پناہ دیتا تھا، یہاں کے شاعروں کے نام اور کلام کو کماحقہ، اہمیت نہیں دی گئی۔

## 1 - افضل - شاہ غلام اعظم

سعادت خاں ناصر نے ان کے تعارف میں اپنے تذکرے میں تحریر کیا ہے:

''درویش کامل بلکہ اکمل، شاہ غلام اعظم، تخلص افضل پسر شاہ خلیل ابوالمعالی نبیرہ شاہ اجمل صاحب دائرہ الہ آباد۔ پہلے شاگرد شیخ ناسخ کے تھے۔ اب میر علی اوسط رشک ان کے استاد۔''[3]

الہ آباد میں مذہبی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز یہی دائرہ شاہ اجمل تھا۔ شیخ ناسخ اس شہر میں آتے تو اسی دائرے میں رہتے تھے چنانچہ ان کا یہ شعر مشہور ہے:

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم      آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

الہ آباد کے شاعروں میں اکثریت شیخ ناسخ کے تلامذہ کی تھی۔ افضل کے ناسخ کا شاگرد ہونے کا حال مولانا محمد عبدالعلیم آسی کے حوالے سے جو خود افضل کے شاگرد تھے، اس طرح قلمبند کیا گیا ہے:

'' شاہ صاحب کی شاگردی کا واقعہ ناسخ کے ساتھ حضرت ( آسی ) یہ بیان فرماتے تھے کہ جب حضرت ناسخ الہ آباد تشریف لائے تو حضرت افضل کی ذہانت پر عاشق ہو گئے ۔ شاہ صاحب موصوف پیشتر ایک میاں جی کے شاگرد تھے جو ہجو گوئی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے ۔ میاں جی صاحب کے خوف سے ناسخ کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ شاہ موصوف کو اپنا شاگرد بنائیں چنانچہ ایک روز حضرت ناسخ 5 روپے کی مٹھائی اور دوسو روپیہ نقد لے کر میاں جی صاحب کے پاس حاضر ہوئے ۔ عرض کی کہ میں شاگرد ہونے آیا ہوں ۔ میاں جی بہت مفلس تھے ۔ 200 روپئے کی کثیر رقم پا کر بہت خوش ہوئے ۔ جب وہ نذرانہ قبول کر چکے تو ناسخ نے دست بستہ عرض کی کہ افضل کو مجھے دے دیجیے ۔ میاں جی نے فرمایا کہ بڑا دھوکا دیا ۔ وہی تو مجھے ایک لڑکا ملا ہے ۔ قہر درویش بر جانِ درویش ۔ افضل کو ناسخ کے حوالہ کیا ۔'' 4

محسن نے افضل کے بارے میں مفید معلومات قلمبند کی ہیں، اس طرح:

'' جناب شاہ غلام اعظم افضل خلف حضرت شاہ ابو المعالی عالی بن حضرت شاہ اجمل اجمل صاحب دائرہ، باشندہ الہ آباد ۔ تین دیوان ان کے ہیں ۔ ایک مثنوی ان کی مشہور عالم ہے ۔ شاگرد شیخ امام بخش ناسخ '' 5

عبداللہ خاں، ضیغم نے اپنے تذکرے میں افضل کو 'صاحب دیوانات' لکھا ہے ۔ 6 اس سے بھی محسن کے مذکورہ بیان کی تائید ہوتی ہے ۔

منیر شکوہ آبادی کے کلیات میں ایک قطعۂ تاریخ ''ختم دیوانِ شاہ غلام اعظم صاحب افضل الہ آبادی'' موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دیوان 1256ھ (1840) میں مکمل ہو گیا تھا ۔ قیاس کہتا ہے کہ یہی افضل کا پہلا دیوان ہے اور اس میں شامل کلام بھی میر علی اوسط رشک کا اصلاح کیا ہوا تھا ۔ بعد کے دواوین کا بھی یہی معاملہ تھا ۔

زبان کے بارے میں شاہ عبدالعلیم آسی کا یہ بیان توجہ طلب ہے:

'' حضرت آسی فرماتے تھے کہ ہم لوگوں ( ہم لوگوں سے مراد حضرت کا شف

اور دیگر استاد بھائی اور شاگرد تھے) کی زبان دوسروں سے الگ ہے۔
ہم لوگ دو حرفوں کے مخارج میں ثقالت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔''7

افضل کے شاگردوں تک شیخ ناسخ کی جو ہدایات پہنچی تھیں ان کا اندازہ آسی کے ان شعروں سے کیا جانا چاہیے:

اگر بیانِ حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ — تو شعر لغو ہے آسی، کلام ناکارا
آسی مست کا کلام سنو — وعظ کیا، پند کیا، نصیحت کیا
جناب ناسخ کی یہ ہدایت ہے، یاد رکھنا تم اس کو آسی — غزل میں اپنے، ہوں شعر جن میں کمی نہ ہو انتخاب ہو کر

ابتدائی زمانے کی افضل کی ایک غزل کے کچھ شعر یہ ہیں:

اے جانِ جاں وصال سے یاشاد کیجیے — یا بندگی سے بندے کو آزاد کیجیے
عاشق ہیں ہم اٹھائیں گے سب اپنی جان پر — جو ظلم دل میں آئے سو ایجاد کیجیے
مدت سے بار یابِ تکلم نہیں ہوئے — بوسہ زبان کا ہمیں امداد کیجیے
جچتا نہیں ہے کوئی بھی افضل نگاہ میں — ناسخ کو چھوڑ کر کسے استاد کیجیے

اور پختگی کے وقت کی ان کی ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں:

جینے نہیں دیتی ہے ذرا چاہ کسی کی — آئے مجھے، آئی ہو جو اللہ کسی کی
جی جائے، جگر ٹکڑے ہو، پھٹ جائے کلیجا — کیا تجھ کو خبر اے بتِ گمراہ کسی کی
جب سے کہ ترے نورِ رخِ صاف کو دیکھا — خواہش نہیں اے رشکِ دہِ ماہ کسی کی
افضل تو غلامی میں ہے یا سیدِ کونینؐ — پروا اسے ہرگز نہیں یا شاہ کسی کی

شیخ امام بخش ناسخ خود الہ آباد میں مقیم رہے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے بیشتر شاعران کے شاگرد ہو گئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں کے فیض سے اس شہر میں اردو نظم و نثر کے سلسلے جاری رہے۔ خود افضل کے شاگردوں میں بھی بعض نامور ہوئے چنانچہ تذکرہ سراپا سخن میں بھی بعض کا حال لکھا ہے مثلاً:

''سید مبارک علی مبارک باشندہ الہ آباد شاگرد شاہ غلام اعظم افضل۔''8

2- اعظم- مرزا اعظم علی بیگ

الٰہ آباد میں ایک دو شاعر خواجہ آتش کے شاگرد بھی تھے۔ ان میں سے اعظم کو شہرت ملی تھی۔ انھوں نے خود اپنا نام اس طرح نظم کیا ہے۔

ع ہے گدائے درگہِ شاہِ نجف اعظم علی

اور محسن نے اِن کے تعارف میں لکھا ہے:

''محرر صدر دیوانی آگرہ، مرزا اعظم علی بیگ اعظم، باشندۂ الٰہ آباد، صاحب دیوان، شاگرد خواجہ حیدر علی آتش''۔9

اعظم دین دار شخص تھے۔ قادر الکلام اور مشاق شاعر تھے۔ انھوں نے سولہ شعر کی ایک غزل غیر منقوطہ بھی کہی تھی۔ اس میں اپنا تخلص اعلا نظم کیا ہے۔ اس کے کچھ شعر یہ ہیں:

''غزل در صنعت غیر منقوطہ''

اس کو گر ہو سرِ عطا ہمدم کوہ کا کوہ ہو طلا ہمدم
مالکِ مُلک اور کو کردو ہم کو در کا کرو گدا ہمدم
وصلِ دلدار ہو، الم ہو دور ہو اگر طالع رسا ہمدم
آسرا دل کو ہر طرح ہوگا وردِ اسمِ رسولؐ کا ہمدم
دلِ اعلا کو ہر طرح ہوگا آلِ احمدؐ کا آسرا ہمدم

الٰہ آباد میں اعظم کے کئی شاگرد تھے۔ بعض کے نام یہ ہیں:

(1) محمد جان خاں حیرت (3) شاہ محمد علیم الدین علیم
(2) شاہ امین الدین قیصر (4) سردار حسین سعید

ان کے واسطے سے شہر الٰہ آباد میں خواجہ آتش کے طرز کو بھی رواج حاصل ہوا تھا۔

3- متین- رائے کانجی سہائے

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ الٰہ آباد میں ہندوؤں میں بھی بعض لوگ فارسی اور اردو کے شاعر کی حیثیت سے اپنے زمانے میں معروف ہوئے۔ متین کے بارے میں مرزا قادر بخش صابر نے جو لکھا ہے مختصراً یہ ہے:

''متین تخلص، زبدۂ معتبرانِ روزگار رائے کانجی سہائے متوطنِ قدیم الہ آباد اس صاحب اقتدار کے والد ماجد جھگڑو لال نے ابتدائے عملداری انگریزی میں مدت ہائے مدید عہدۂ تحصیلداری پرگنہ اہرکھ ضلع بنارس پر مامور ہو کر جاہ و اعتبار کے ساتھ بسر کی اور عم بزرگوار تحصیلدار پرگنہ ہند کی ضلع فتحپور پر.... یہ والا جاہ بالفعل مسند صدر الامینی رہتک پر متمکن ہے۔ قلم تحریر اوصاف میں عاجز اور نفس تقریر محامد میں قاصر ہے.... گاہ گاہ اوقاتِ فرصت میں شعر فارسی کا فکر دامنگیر ہوتا ہے۔ ہر چند اس فن میں کسی سے مشورے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن استعدادِ خداداد سے قدمِ فکر جادۂ استقامت سے منحرف نہیں ہے۔''10

متین کی فارسی غزل کے دو شعر یہ ہیں:

رنگیں بود زبس کہ کلام متین ما — گوئی کہ کشتہ اندگل اندر زمینِ ما
مادریں بزم از مذاقِ بادہ آگہ نیستیم — ریختہ ساقی جائے مے خونِ دل اندر جامِ ما

انگریزی عملداری کے قائم ہونے کے بعد صوبہ الہ آباد میں مختلف مقاموں پر ان کے عہدے دار اور کارپرداز رہنے لگے تھے اور ان مقامات پر شعر و سخن کی محفلیں بھی آراستہ ہونے لگی تھیں۔ چنانچہ فتحپور میں بھی کئی شاعروں کے موجود اور مقیم ہونے کا مذکور ملتا ہے۔ بعض یہ ہیں:

4- توانا- سید اکرام علی

فتح پور کے پرانے شاعروں میں توانا زیادہ معروف ہوئے۔ محسن نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

''سید اکرام علی توانا خلف سید سبحان علی باشندۂ فتحپور ہنسوا، صاحب دیوان۔ پہلے شاگرد منشی تونگر سنگھ عاشق کے تھے کہ وہ شاگرد مرزا قتیل کے تھے۔ تب یہ ناتواں تخلص کرتے تھے۔ جب شیخ امام بخش ناسخ الہ آباد میں تشریف فرما ہوئے اور میر صاحب ان کے شاگرد ہوئے تو توانا تخلص کیا۔''11

توانا کے پہلے استاد تونگر سنگھ عاشق فارسی کے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے نام کے برعکس اور اپنے تخلص کی مناسبت سے شاگرد کا تخلص ناتواں رکھا۔ شیخ ناسخ نے اسے ناپسند کیا اور اپنے مزاج

کے مطابق انھیں توانا بنادیا۔توانا کے اثر سے فتح پور کے علاقے میں شیخ ناسخ کے طرزِ شعر گوئی کو رواج حاصل ہوا۔

توانا کی ایک غزل کے کچھ شعر یہ ہیں:

روندیو آکر ہماری خاکِ مدفن زیرِ پا　　ہاتھ اٹھا کر ہم دعا دیں گے کہ دشمن زیرِ پا
چل سکی کانٹوں سے کچھ مطلق نہ قیسِ زار کی　　لاکھ صحرا نے بچھایا اپنا دامن زیرِ پا
ناز کی دیکھو کہ رکھتا ہے قدم جب خاک پر　　تارِ بخیہ کو سمجھتا ہے وہ سوزن زیرِ پا
جس کی تنگی سے توانا دَم خفا ہوتا رہا　　لاغری سے گر پڑا وہ طوقِ گردن زیرِ پا

5- داغ- سید لطف حسین

یہ بھی شیخ ناسخ کے شاگرد تھے۔کلبِ حسین خاں نادر نے ان کے بارے میں تحریر کیا ہے:

''داغ سید لطف حسین ابن سید حیدر علی رئیس فتح پور ہنسوا شاگرد ناسخ۔''12

نساخ نے ان کا ذکر کیا ہے لیکن حالات میں کچھ بھی اضافہ نہیں کیا ہے۔ان کی ایک غزل کے چار شعر یہ ہیں:

چڑھی آنکھیں ہیں کیوں، اُترا ہوا چہرا تمھارا ہے　　ہُوا معلوم شاید آتشِ مے کا حرارا ہے
دوپٹے کا نہ آنچل ڈالیے ہر وقت محرم پر　　صفائی کے سبب رنگِ بدن سب آشکارا ہے
صنم نامِ خدا سارا بدن ہے نور کا پُتلا　　خدا نے اپنے ہاتھوں سے ترا نقشہ اُتارا ہے
بروزِ حشر بخشانا مجھے داغِ غلامی سے　　حُسین ابنِ علی تیری عنایت کا سہارا ہے

شیخ ناسخ کے علاوہ فتحپور میں لکھنؤ اور کانپور کے بھی بعض شاعروں کے شاگرد مقیم تھے مثلاً میر محمد حسین حیرت ابن سید اُمید علی جو ہند کی (ضلع فتح پور) میں رہتے تھے اور شیخ احمد علی کامل لکھنوی کے، جو کانپور میں اسکول ماسٹر تھے شاگرد تھے۔ان کے باوجود فتح پور میں شیخ ناسخ کا طرز ہی غالب تھا۔

صوبہ الہ آباد میں اس زمانے میں شاعروں کی سب سے زیادہ تعداد موضع کڑے میں معلوم ہوتی ہے اور ان میں بھی اکثریت ان کی تھی جن کا براہِ راست یا بالواسطہ طور پر شیخ امام بخش ناسخ سے تعلق رہا تھا۔یہاں ان میں سے صرف بعض کا حال مختصراً نقل کیا جاتا ہے۔

6- سجاد- میر علی سجاد

بہ گمانِ غالب میر سجاد کا ذکر سب سے پہلے سعادت خان ناصر کے تذکرے میں آیا ہے، اس طرح :

''خوش معاش، نیک معاد، سید علی سجاد، تخلص سجاد، محافظ دفتر کلکٹری ضلع الہ آباد، شاگرد میر علی اوسط رشک''13

ناصر کے بعد محسن نے ان کے حالات میں ضروری اضافے اس طور پر کیے ہیں:

'' محافظ دفتر کلکٹری ضلع الہ آباد، میر علی سجاد سجاد خلف میر حیدر علی، باشندہ موضع کھڑا (=کڑا) پرگنہ بینہ توابع ضلع مذکور، صاحب دیوان ، شاگرد میر علی اوسط رشک''14

ان کے والد کا نام نساخ اور سری رام کے تذکروں میں بھی یہی لکھا ہے لیکن نادر کے ''دیوانِ غریب'' میں ''میر صفدر علی'' چھپا ہے۔ 15 اسے چھاپے کی غلطی سمجھنا چاہیے۔

محمد واصل عثمانی نے مولوی وحید الدین محمد وحید فاروقی کا ایک شعر اس طرح نقل کیا ہے۔

اب نہ وہ سجاد و افضل ہیں نہ عیاش و بشیر

شاعری کا چار دن کہنے کو چرچا ہو گیا 16

ان میں سے عیاش کا پتہ نہیں چل سکا، البتہ سجاد کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

اس سے ہوئی جب سے چار آنکھیں کس درجہ ہیں اشکبار آنکھیں
دو دن میں یہ گھٹ گئی محبت کرتے ہیں مجھ سے چار آنکھیں
صدقے ترے قد پہ لاکھوں خوش قد آنکھوں پہ فدا ہزار آنکھیں
روئیں یہ لہو مژہ کی خاطر سجاد کی ہیں فگار آنکھیں

7- بشیر- شیخ بشیر اللہ

عبد الغفور خاں نساخ کے مطبوعہ تذکرے میں بشیر کے بارے میں صرف یہ کلمات ملتے ہیں:

''بشیر تخلص، بشیر اللہ، باشندۂ کڑہ مانکپور''17

البتہ محمد واصل عثمانی نے ان کے حالات اس طرح تحریر کیے ہیں:

''شیخ بشیر علی علوی، شیخ امیر علی علوی کے فرزند..... آپ کو خواجہ حیدر علی آتش کا فرزند بتایا جاتا ہے..... بقول بزرگان کڑا نوکروں سے شاعری کی ہے یعنی جو کچھ لکھا کسی نوکری میں ڈال دیا۔ آپ کا مزار قصبہ میں بالا سے سڑک پختہ ایک بلند ٹیلے پر املی کے درخت کے نزدیک ہے۔ تخن شعرا اور آپ کی لوح مزار سے جو چند اشعار دستیاب ہوئے ہیں، یہ ہیں.....''18

کہہ رہی ہے موت ہر دم ہر گھڑی بالائے سر  غافلو آتا ہے وقتِ ناگہاں بالائے سر
ہم پاؤں اٹھاتے ہوئے صحرا میں چلیں گے  کانٹوں نے اگر بوجھ اٹھایا کفِ پا کا
اے سالکِ مسلکِ محمدؐ  افسوس یہ حسرت و رجا ہے
تربت پہ بشیر کی جو گذرے  تکبیر کی اس سے التجا ہے

کڑے کے شاعروں میں سے بعض نے غزل کے علاوہ دوسری مختلف اصناف کی طرف بھی توجہ کی تھی اور ان کے لیے بھی نام پیدا کیا تھا۔

8- ندیم- محمد عسکری

اپنے زمانے کے معروف شاعروں میں سے تھے۔ مرزا قادر بخش صابر نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''ندیم تخلص، زبدۂ سادات عظام محمد عسکری، متوطن کڑا کہ موضع ہے مضافات الہ آباد سے، شاہ غلام اعظم افضل تخلص سے کہ ارشد تلامذۂ ناسخ سے ہے، تلمذ رکھتا ہے۔ مدت تک خط و خال خوباں اور زلف و چہرۂ محبوباں کے وصف میں خامہ فرسائی کی لیکن آخر کار رہنمائی توفیق سے مضامین حمد و ثنا کو ورد زبان اور وظیفۂ قلب و جناں کیا۔''19

محمد واصل عثمانی نے ان کے حالات میں لائق توجہ اضافے کیے ہیں:

''ایک ذاتی کتب خانے کے مالک تھے جس میں عربی و فارسی کتب کا بڑا نایاب ذخیرہ تھا۔ بعد غدر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنائے گئے اور تین گاؤں عطا ہوئے۔ سلسلۂ نسب سید جلال الدین بخاری سے ملتا ہے۔ پنشن لینے کے بعد بھوپال میں نواب شاہجہاں بیگم کے عہد میں کئی برس تک نائب مدار المہام رہے''20

صابر نے ان کے یہ دو شعر لکھے ہیں:

زمینِ قبر سے مجھ کو بڑی ندامت ہے    کہ مشتِ خاک نہیں ہے فشار کے قابل
آبرو غیر کی کیا اشکِ ریا سے ہو فزوں    زرِ جعلی کو یہ سنتے ہیں کہ ہیں کام کے کم

9- سخی- سید پرورش علی

سید پرورش علی نقوی نام، اردو میں سخی اور بھاشا میں انور تخلص کرتے تھے۔ محمد واصل عثمانی نے ان کے حال میں لکھا ہے:

"بھاشا میں تخلص انور تھا۔ آپ نے اچھے اچھے دوہے، ہولی، ٹھمریاں، گیت اور برہا کہے ہیں۔ انور برہا لکھنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور بڑے درد انگیز لہجے میں برہا پڑھتے بھی تھے.... مٹیا برج میں انتقال ہوا۔ وہیں دفن ہوئے۔"21

ان کی بھاکھا کی شاعری کا ذکر لالا سری رام نے بھی کیا ہے لیکن کلام کا نمونہ انھوں نے بھی نقل نہیں کیا ہے۔

الہ آباد کے بعض شاعروں نے مثنوی کی قبیل کی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ یہاں نمونہ کے طور پر صرف ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

10- سجاد- سجاد

کڑے میں اس زمانے میں سجاد تخلص کے ایک سے زیادہ شاعر ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے ایک منظوم خط "نامۂ سجاد" کے نام سے لکھا تھا۔ اس کا قلمی نسخہ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ پانچ اوراق پر محیط ہے اور ہر صفحہ پر اُنیس سطریں ہیں۔ اس کی ابتدا اس شعر سے ہوئی ہے:

کس منہ سے ثنا کروں میں تیری    یا رب قاصر زباں ہے میری 22

حمد و ثنا کے بعد شاعر نے عرضِ مطلب کیا ہے اور پھر اس نامے کو ذیل کے شعر پر ختم کیا ہے:

سب دوستوں کی طرف سے تسلیم    پہنچے بصد احترام و تعظیم

الہ آباد کے شاعروں میں افضل وغیرہ نے مثنوی بھی لکھی تھی لیکن اس علاقے کے شاعروں کو اس صنفِ شاعری میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں ہو سکی۔

واقعہ یہ ہے کہ اردو شاعری کی مروجہ اصناف میں سے سبھی کی طرف الہ آباد کے خوش طبعوں نے کم و بیش توجہ کی تھی لیکن وہاں سر پرستی کرنے والا کوئی معلوم نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں نہ تو شاعری کا معیار کچھ بلند ہو سکا اور نہ شعرا کے کلام کی حفاظت ہی کما حقہ کی گئی۔ وہاں کے شاعروں میں سے کم ایسے خوش بخت ہوئے جن کا نام اور کلام محفوظ رہ گیا۔

11- جولاں- سید قدرت علی

یہ الہ آباد کے ریختی گویوں میں سے تھے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے اپنے تذکرے میں ان کے بارے میں بس اتنا لکھا ہے:

''جولاں تخلص، سید قدرت علی، باشندۂ الہ آباد۔ ریختی کہتے ہیں:

آتو کی چھوکری کو نواں اب کی سال ہے قاجی رت جگے کا مجھے پھر خیال ہے'' 23

افسوس ہے کہ ان کے مزید حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

# ب - نثر

بہادر شاہ ثانی بادشاہ دہلی کے زمانے میں الہ آباد کے علاقے میں مذہبی اور علمی ہر قسم کی نثر لکھی جارہی تھی۔ یہاں بعض کتابوں کا مختصر ا احوال لکھا جاتا ہے۔

1- قاسم علی

یہ الہ آباد کے رہنے والے اپنے وقت کے معروف اطبا میں سے تھے۔ ان کا پورا نام "حکیم سید قاسم علی رضوی" بتایا گیا ہے اور لکھا ہے کہ:

"اساوہ پرگنہ کراری ضلع الہ آباد کے تعلقدار تھے۔ جنگِ آزادی 1857 کے زمانہ میں ملزم قرار دیکر چودہ سال کی قید کی سزا دی گئی۔ الہ آباد جیل میں محبوس کیے گئے۔"1

انھوں نے طب یونانی سے متعلق ایک مختصر کتاب "فوائد الاحباب" کے نام سے 1271ھ (1855) میں لکھی تھی۔ اس کا 1278ھ کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ اس کا آغاز ذیل کی عبارت سے ہوتا ہے:

"الوف حمد خدائے را کہ خداوند احمد زا کہ وہ غفار عزوجل ہے۔ صوت سپاہ مختص اللہ الصمد را کہ وہ قادر لم یزل ہے۔ سزائے حکم الست کہ مشتے خاک اربع عناصر متضاد الطبائع کو مجتمع بہ یک قلب کر کے صورت اجسام کی بنایا....."2

مصنف نے اس رسالے کو چند باب اور فصلوں پر منقسم کر کے احباب کے فائدہ کے لیے اس میں کئی امراض کی کیفیت اور ان کے علاج قلمبند کیے ہیں۔ شروع میں ایک طویل دیباچہ لکھا ہے جیسا کہ اقتباس بالا سے بھی ظاہر ہے۔ رسالے کے آخر میں ذیل کا قطعہ تاریخ لکھا ہوا ہے۔

قطعہ تاریخی

نسخہ جات عمدہ علی قاسم چو گفت　　غنچۂ دل ہا ز تاثیرش شگفت
بادہ روشن در جہاں نیز مثال　　صاف کردہ چوں تجسس بہرِ سال
از فلک آمد ندایش یک بیک　　ہزارو دو صد و ہفتاد و بہ یک

1271ھ

آخری مصرع جس میں تاریخ بیان کی گئی ہے کھینچ تان کر ہی موزوں ہو پاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ قاسم علی شاعر بھی تھا لیکن بہ گمان غالب اس کی شاعری مذہبی موضوعات سے متعلق تھی۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں اس کی مناجات کا ایک تین ورقی قلمی نسخہ محفوظ ہے جس کی کتابت خورشید عالم نامی کسی شخص نے 1278ھ (62-1861) میں کی تھی۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:

رحمٰن ہے رحیم ہے بے شک تو اے خدا　　پس ربّ عالمین نہیں ہے ترے سوا

اور آخری شعر یہ ہے:

ہندوستان میں خاک کو میری نہ نشر کر　　ہمراہ کربلا کے شہیدوں کے حشر کر

اس مناجات کی زبان بھی اتنی ہی خام ہے جتنی مذکورہ طبی رسالے کی ہے۔ اس مناجات کے مصنف کا نام البتہ ''میر قاسم علی'' لکھا ہے۔

2- بدر الحسن

قاضی شیخ بدر الحسن ان کا نام تھا انھوں نے میلاد کی ایک کتاب ''ذکرِ میلاد شریف'' کے نام سے لکھی تھی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جو چوہتر اوراق پر محیط ہے خود مصنف کے ہاتھ کا 1264ھ (1848) کا لکھا ہوا علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کے پہلے صفحہ پر حسن الدین نامی کسی شخص کی 1912 کی یہ یادداشت موجود ہے۔

"یہ کتاب اس بزرگ کے ہاتھ کی قلمی نشانی ہے جو ایام غدر سے پہلے ضلع فتحپور میں
مشہور قاضی ومفتی تھے۔ شاہی دربار سے معقول آمدنی اور جائداد ملی ہوئی تھی۔"3

اس نسخہ کے ساتھ شاہ ولی اللہ دہلوی کا ایک فارسی رسالہ "سرور المحزون" بھی نقل ہوا ہے جس کے کاتب شیخ بدر الحسن قاضی ہیں۔ اس سے شیخ صاحب کے علمی شوق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

"ذکر میلاد شریف" کی ابتدا ذیل کی عبارت سے کی گئی ہے:

"بعد حمد خدائے جل وعلا اور نعت محمد مصطفیٰ سرور انبیا علیہ وعلی آلہ واصحابہ الصلوٰۃ والثنا کے عرض ہے کہ بہ فحوائے کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے بہترین اذکار بعد ذکر حق تعالیٰ بیان فضائل رسالت اور معجزات حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم ہے...."

"... یا اللہ تحقیق تو بہت معاف کرنے والا ہے۔ دوست رکھتا ہے تو عفو کو، بس عفو کر مجھ سے گناہ میرے۔ نقل کی یہ ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، حاکم نے۔"

عبارت کا یہ انداز قدیمانہ ہے اور کچھ شک نہیں کہ لکھنؤ اور کانپور وغیرہ مراکز پر اس زمانے میں نسبتاً زیادہ صاف اور سلیس نثر لکھی جارہی تھی۔

## ج - مطبعے

اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی کے آخر زمانے میں الہ آباد میں ایک پریس قائم کیا گیا لیکن پہلے ہی سال میں وہ جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔

کچھ مدت کے بعد امریکی مشنریوں نے اس شہر میں نہ صرف ایک مطبع قائم کیا بلکہ اس کے ساتھ شمالی ہند کی مختلف زبانوں کے رسم خط کے ٹائپ تیار کرنے کے لیے ایک کارخانہ بھی شروع کیا۔ 1857 کے ہنگاموں میں اسے بھی پھونک دیا گیا۔

1856 میں سرکار انگریزی نے اپنی ضرورتوں سے الہ آباد میں گورنمنٹ پریس قائم کی تھی۔ اس طرح اس شہر میں مطبعوں کی موجودگی تو ظاہر ہے لیکن ان میں عوام کے فائدے کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت کا کام نہ ہونے کی برابر ہوتا تھا۔

# حواشی

الف - شاعری

| | | | |
|---|---|---|---|
| -1 | شوکت نادری | | ص50 |
| -2 | سخنوران قصبہ کڑا | | ص18 |
| -3 | خوش معرکۂ زیبا | جلد2 | ص370 |
| -4 | عین المعارف | | ص12 |
| -5 | سراپا سخن | | ص246، 100 |
| -6 | یادگارِ ضیغم | | ص25 |
| -7 | عین المعارف | | ص33 |
| -8 | سراپا سخن | | ص186 |
| -9 | ایضاً | | ص391 |
| -10 | گلستان سخن | جلد2 | ص337 |
| -11 | سراپا سخن | | ص357 |
| -12 | تذکرہ نادر | | ص56 |
| -13 | خوش معرکۂ زیبا | جلد2 | ص395 |

14- سراپا سخن ص83

15- تذکرہ نادر ص79

16- سخنوران قصبہ کڑا ص168

17- سخن شعرا ص76

18- سخنوران قصبہ کڑا ص78 تا 80

19- گلستان سخن جلد 2 ص430

20- سخنوران قصبہ کڑا ص364 تا 365

21- ایضاً ص194 تا 195

22- علی گڑھ کے اردو مخطوطات ص239

23- سخن شعرا ص117

ب - نثر

1- آصفیہ کے اردو مخطوطات جلد 1 ص259

2- علی گڑھ کے اردو مخطوطات ص380

3- ایضاً ص55

# لکھنؤ

حواشی

لکھنؤ 427

الف - شاعری 431

1- بادشاہ اختر- مرزا واجد علی شاہ 432

2- برجیس قدر- نور رمضان علی 434

ب - شاگردان آتش 439

1- خلیل- میر دوست علی 441

2- صبا- میر وزیر علی 442

3- شوق- تصدق حسین عرف نواب مرزا 445

4- نسیم- دیاشنکر 450

ج - شاگردان ناسخ 453

1- رشک- میر علی اوسط 454

2- وزیر- خواجہ محمد وزیر 457

3- برق- مرزا محمد رضا 458

4- بحر- شیخ امداد علی 461

5- آباد- مہدی حسن خاں 463

6- اسیر- مظفر علی خاں 466

| | | | |
|---|---|---|---|
| | | د - تاریخ گوئی | 471 |
| -1 | اظہر- | مولوی کرامت علی | 472 |
| | | ہ - مرثیہ | 475 |
| -1 | انیس- | میر ببر علی | 477 |
| -2 | دبیر- | مرزا سلامت علی | 480 |
| | | و - ہزلیات | 483 |
| -1 | ذاکر- | میر جان | 483 |
| -2 | اسرار- | مرزا ابندو | 484 |
| -3 | چرکین- | شیخ باقر علی | 484 |
| | | ز - ریختی | 487 |
| -1 | جان- | صاحب میر یار علی | 487 |
| -2 | نسبت- | احمد علی | 490 |
| -3 | مخلوق- | سید احسان حسن | 490 |
| | | ح - رَہس | 493 |
| -1 | امانت- | سید آغا حسن | 493 |
| -2 | اختر- | واجد علی شاہ | 497 |
| | | الف - نثر | 499 |
| | | ب - تذکرے | 501 |
| -1 | ناصر- | سعادت خاں | 501 |
| -2 | محسن- | سید محسن علی | 505 |
| -3 | اشپرنگر- | اے اشپرنگر | 509 |
| | | ج - مقدمے | 513 |
| -1 | تاسف- | سید حسین علی | 513 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 2- | بیخود- | سید ہادی علی | 516 |
| | | د - تنقیدِ شعر | 517 |
| 1- | ناسخ و قتیل | | 517 |
| 2- | ناصر و ناسف | | 519 |
| | | ہ - بیان و عروض | 521 |
| 1- | اختر- | واجد علی شاہ | 521 |
| 2- | منشی- | بشارت علی | 523 |
| 3- | تمکین- | میر ہدایت علی | 524 |
| 4- | طالب- | امام الدین | 525 |
| | | و - لُغت | 529 |
| 1- | رشک- | میر علی اوسط | 529 |
| | | ز - مکتوب نگاری | 533 |
| 1- | شہید- | غلام امام | 534 |
| 2- | نامہ نویس- | بادشاہی نامہ نویس | 536 |
| 3- | شفق- | مرزا علی جان | 538 |
| 4- | فارغ- | میر علی حسین | 540 |
| 5- | ہنر- | مرزا مظفر علی | 541 |
| | | ح - سفر نامے | 545 |
| 1- | یوسف خاں | | 545 |
| 2- | شاہ اودھ کا سفر نامہ | | 549 |
| 3- | سفیر اودھ کا سفر نامہ | | 550 |
| 4- | حزن اختری | | 553 |
| 5- | قلق | | 555 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| | ط - علمی تصانیف | | 559 |
| -1 | اختر واجد علی شاہ | | 559 |
| -2 | محمد حسن | | 563 |
| | ی - مذہب سے متعلق | | 565 |
| -1 | اختر واجد علی شاہ | | 565 |
| -2 | مرزا جان | | 566 |
| | ک - داستان | | 569 |
| -1 | گویا- | فقیر محمد خاں | 569 |
| -2 | ناصر- | سعادت خاں | 574 |
| -3 | رسا- | لالا انبا پرساد | 575 |
| -4 | حیدر علی- | حیدر علی | 577 |
| -5 | سرور- | مرزا رجب علی بیگ | 578 |
| -6 | ولایت علی- | ولایت علی | 579 |
| -7 | اصغر- | سید اصغر علی خاں | 580 |
| | حواشی | | 584 |

# لکھنؤ

لکھنؤ میں شاہی کے قیام کی غرض و غایت اور اس کی نوعیت و حیثیت کا بیان کرتے ہوئے مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے:

''شہنشاہ دہلی کے قبضے میں صرف دہلی کے گرد و پیش کی زمین باقی رہ گئی تھی۔ اس بے بضاعتی پر بھی شہنشاہ و جہاں پناہ وہی تھے۔۔۔ اس غرور کو توڑنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے غازی الدین حیدر کو، جنھوں نے باپ کے اندوختہ میں سے بہت سا روپیہ انگریزوں کو قرض دے دیا تھا' شاہی کا خطاب دیا اور دربار اودھ نے اس عزت و سرفرازی کو نہایت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔''1

غازی الدین حیدر کے بعد ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے۔ بقول شرر ان کا حال یہ تھا کہ:

''عورتوں کی سی باتیں کرتے اور عورتوں ہی کا سا لباس پہنتے۔ زنانہ مزاجی کے ساتھ مذہبی عقیدت نے یہ شان پیدا کر دی کہ۔۔۔ خود حاملہ عورت بن کر زچہ خانہ میں بیٹھتے۔۔۔''2

ان کے بعد بادشاہ بیگم زوجۂ غازی الدین حیدر نے منا جان کو جنھیں وہ اپنا پوتا کہتی تھیں تخت

پر بیٹھا دیا لیکن انگریزوں نے دادی پوتے دونوں کو گرفتار کر کے سعادت علی خاں کے بیٹے نصیرالدولہ محمد علی خاں کو بادشاہ بنا دیا۔ تاریخ ہوئی

سروش از سرِ دولت آواز داد      محمد علی گشتہ شاہِ اودھ

4 +      1249 = 1253ھ

انھوں نے معاملات سلطنت کو درست کرنے اور لکھنؤ کو ''زندہ بابل'' بنا دینے کی کوشش کی لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ 5 ربیع الثانی 1258ھ (1842) کو وفات پائی۔ اسی روز ان کے ولی عہد محمد امجد علی شاہ ثریا جاہ کے لقب سے تخت نشین ہوئے۔ ان کے بارے میں شرر نے لکھا ہے:

''انھیں اپنے خیال کی پابندی شرع سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ نظم و نسق مملکت کی طرف توجہ کریں جس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ محمد علی شاہ نے اپنی تجربہ کاری اور بیدار مغزی سے جو کچھ انتظامات کیے تھے سب درہم برہم ہو گئے۔''3

26 صفر 1263ھ (1848) کو انھوں نے رحلت کی تو ان کے بڑے فرزند واجد علی شاہ بادشاہ ہوئے۔ ان کو عمارتوں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی بہت شوق تھا۔ خود شاعر بھی تھے اور شاعر نواز بھی۔ اپنی مشہور تصنیف ''بنی'' میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''بقیش الدولہ بیش۔ سات شخص ایک مرتبہ میرے شاگرد ہوئے۔ ساتوں کا سبع سیارہ لقب ہوا۔ ان میں ایک یہ بھی ہے۔ صاحب استعداد بہت اچھا، عروضی لاجواب، میرا ملازم بھی ہے۔ مطلع:

پہلے صفتِ پاک میں کھول اپنے دہن کو
کر صاحبِ تیمین سے طلب تاج سخن کو

اودھ کے آخری تاجدار مرزا برجیس قدر بہادر کے حالات میں ڈاکٹر کوکب قدر نے یہ دلائل تحریر کیا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ برجیس قدر کی شاہی جو 5 جولائی 1857 سے 16 مارچ 1858 تک خاص لکھنؤ میں جملہ لوازم شہر یاری کے ساتھ اور پسپا ہونے کے بیس مہینے بعد تک اضلاع اودھ میں بہ صورت کشمکش باقی رہی.........''5

اور:

''بہادر شاہ نے نہ صرف اپنے قلم سے برجیس قدر کو شاہ اودھ لکھا بلکہ سفیر کو سفیرالدولہ خطاب عطا کیا اور فرمایا میں نے تاج بخشی کی۔ اس توثیق کے بعد برجیس قدر کی تاج پوشی میں اگر کوئی کسر باقی تھی تو خاندانِ اجتہاد کے رکن اعظم سلطان العلما کے تاج پہنانے سے وہ بھی دور ہوگئی۔''[6]

# الف - شاعری

سلاطین لکھنؤ میں سے بیشتر نے اپنے مزاج اور حالات کے مطابق اردو میں شاعری کی تھی لیکن ان کی شاعری کچھ زیادہ وقیع نہیں تھی۔ بادشاہ اول غازی الدین حیدر کے بارے میں ڈاکٹر کوکب قدر نے لکھا ہے:

''شعروں کا ایک مجموعہ جو ان سے یادگار ہے بیشتر ایسے اشعار پر مشتمل ہے جو مدح اہل بیت میں ثواب کی غرض سے کہے گئے تھے۔''7

اس میں شک نہیں کہ ان شعروں کا معیار کچھ بلند نہیں تھا لیکن ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہت کے قیام کے ساتھ ہی اودھ میں شعر و ادب پر بھی مذہب کا اثر غالب ہونے لگا تھا۔ بادشاہ دوم نصیر الدین حیدر کے معاملات کسی قدر مختلف تھے۔ ان کے زمانے میں مذہبی عقائد کے ساتھ ساتھ ''گل رعنا'' کے حُسن اور اس کے معمولات کا ذکر کیا جانے لگا تھا۔ سعادت خاں ناصر کے تذکرے میں ہے:

''شہر یار ذوی الاقتدار، ذرہ ذرہ اس کی ہمت سے آفتاب، عاشق آل حضرت رسالت مآب، شاہ عجاہ، نصیر الدین حیدر تخلیق بادشاہ یہ دو شعر اس غفراں مآب سے انتخاب۔

بلبلِ شیدا نے پوچھا گل سے یہ فصلِ بہار　　اے گلِ رعنا ترے دامن سے کیوں لپٹا ہے خار
تیغِ ابرو دیکھ یہ آئی ندا اے بادشاہ　　لافتیٰ الاعلی لاسیف الا ذوالفقار" 2

تیسرے بادشاہ محمد علی شاہ دہلی کے بادشاہ بہادر شاہ ثانی کے اس اعتبار سے بھی ہمعصر تھے کہ دونوں کا سال جلوس ایک ہے۔ محمد علی شاہ اور ان کے جانشین امجد علی شاہ دونوں کے مزاج اور معاملات پر مذہب کا اثر غالب رہا ہے۔ دونوں شاعر تو نہیں تھے لیکن ان کے دور میں شعر وسخن کے سلسلے جاری رہے اور غزل کے ساتھ ساتھ مرثیے کی صنف کو بھی خوب فروغ حاصل ہوا۔

1- بادشاہ اختر۔　　مرزا محمد واجد علی شاہ

واجد علی شاہ لکھنؤ کے پانچویں تاجدار تھے۔ محسن نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

سلطان ابن سلطان خاقان ابن خاقان، شاہِ سخنوران ابو المنصور ناصر الدین حضرت سلطان عالم مرزا محمد واجد علی شاہ بادشاہ اختر تخلص خلد اللہ ملکہ فرمانروائے بیت السلطنت اختر نگر المشتہر بہ لکھنؤ ابن جنت آرامگاہ حضرت محمد امجد علی شاہ، سوائے اور تالیف وتصنیف کثیرہ کے تین دیوان، تین مثنویاں کہ خلاصۂ فکر عالی ہیں طبع ہو کے واسطے فیضِ عام کے تقسیم فرمائی ہیں کہ ان کی مدح کی گنجائش اس مختصر میں نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت کی حدیں سکڑ کر عملاً اختر نگر تک محدود ہو گئی تھیں۔ بادشاہ کی تصانیف فروخت ہونے کے بجائے "تقسیم" ہوتی تھیں۔ خود بادشاہ کو فنِ عروض و بیان وغیرہ سے خصوصی دلچسپی تھی چنانچہ انھوں نے زمانۂ ولی عہدی میں بھی ان سے متعلق کتاب لکھی تھی۔ بادشاہ نے فنِ شعر میں مرزا برق سے تلمذ حاصل کرنے کا ایک سے زیادہ موقعوں پر اعتراف کیا ہے، مثلاً

جو تھے فتح دولہ پری زاد تھے　　مرے قدرداں، میرے استاد تھے
فنِ شعران سے ہوا ہے نصیب　　وہ تھے جان ودل سے ہمارے حبیب

اس سلسلے میں ڈاکٹر کوکب قدر کا کہنا ہے کہ:

"واجد علی شاہ نے اپنی نصف سے زیادہ زندگی مع اپنی تمام رنگینیوں اور مصیبتوں کے اسی استاد کے سایہ میں بسر کی اور فنِ شعر تو کیا فنِ حرب تک برق سے حاصل کیا ہو تو تعجب نہیں"۔

واجد علی شاہ کی ایک دو غزلوں کے مطلعے نمونہ کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بڑے سلیقہ سے غزل ہائے قصیدہ طور بھی کہہ لیتے تھے:

تلخی ہجر دیتے ہیں شیریں دہن کے پاؤں — سر کی جگہ تراشیے پھر کوہکن کے پاؤں
نرگس کو کیا زرد، غزالوں سے لڑی آنکھ — آنکھوں نے نہیں دیکھی ان آنکھوں سے بڑی آنکھ
مری جان ہیں یار حضرت محل — حسینہ طرحدار حضرت محل
جب کبھی برسات کی فصل آ گئی — یاں گھٹا الفت کی دل پہ چھا گئی

واجد علی شاہ نے مثنوی کی صنف کی طرف بھی خصوصیت سے توجہ کی تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر کوکب قدر کا یہ بیان لائق توجہ ہے:

"واجد علی شاہ کی شاعرانہ قدرت کا اندازہ ان کی داستانی مثنویوں سے ممکن نہیں کیونکہ ان مثنویوں میں واقعہ نگاری مصنوعی ہے اور وہ ان کا ابتدائی کلام ہے۔ حزن اختری اور بیت حیدری ناقص ہیں۔۔۔ چھوٹی چھوٹی مثنویاں کسی فرض کی ادائیگی میں لکھی گئی ہیں اور ان میں واجد علی شاہ کا کمال پوری طرح نہیں اُبھر سکا ہے۔ عشق نامہ اور ثبات القلوب مکمل ہوتے ہوئے بھی ناقص اور طبعزاد ہوتے ہوئے بھی ترجمہ ہیں کیونکہ شاعر اس سلسلے کو آگے بڑھاتا رہا اور ان کا بنیادی ماخذ فارسی میں ہے۔۔۔ عشق نامہ خوبی کلام کے لیے اردو ادب میں عدیم المثال ہے۔ ثبات القلوب ضخامت اور قادرالکلامی کے لیے۔۔۔"[5]

واجد علی شاہ نے پورب دیس کی مقامی بولی میں گیت وغیرہ بھی بہت کامیابی سے لکھے تھے۔ نمونہ اس کا یہ ہے:

راگ: بہار[6] — تال: آڑا چوتالہ

تو کہہ رے بھونرا پیا کی بات — پیا کی بات، مورے جیا کے سات
چندرا سا مکھڑا کنول ایسی گات — تڑپ تڑپ بیتی سگری رات

اور اُنھوں نے اپنے ایک گیت میں فارسی کی آمیزش سے عجیب لطف پیدا کیا ہے

ایک رنے جانی، مورا تو راجیز ا[7] — ساقیا برخیز و جاے دہ مرا
خاک بر سر کن، غم ایام را

ایک اور مثال گیت کی یہ ہے۔

کوثر کا جام بھر دے　　　اے نجف کے بَسیا
علی ولی سنگ رنگ مچا ہے　　　اکھتر ہوری کے کھلئیا

2- برجیس قدر- نواب رمضان علی

مرزا برجیس قدر بہادر لکھنؤ کے آخری تاجدار ہوئے۔ ان کا تاریخی نام "نواب رمضان علی" [9]
1260ھ

تھا۔ واجد علی شاہ کی کلکتہ کو روانگی کے بعد 12- ذیقعدہ 1273ھ (5 جولائی 1857) کو تخت نشین ہوئے اور:

"14/اگست 1893 کو وہ اپنے دو بچوں اور چند نیپالی وفاداروں کے ساتھ زہر سے ہلاک کیے گئے۔ مٹیا برج کلکتہ کے امام باڑہ سبطین آباد مبارک میں دفن ہیں۔" [9]

برجیس قدر نے بڑے سخت حالات میں زندگی بسر کی تھی۔ کسی استاد سے فن شعر کا اکتساب تو بڑی بات تھی، انھوں نے لکھنؤ کی شعری اور علمی صحبتوں سے بھی کما حقہ استفادہ نہیں کیا تھا۔ ان کی شاعری گویا فطرت کے تقاضوں کے مطابق تھی۔ عالی ظرفی نے مزاج میں انکساری بھر دی تھی چنانچہ اس قسم کے مضامین نظم کرتے تھے:

افضل و اعلیٰ ہیں سب بندے خدا کے دہر میں　　　تجھ سے دنیا میں نہیں برجیس بدتر دوسرا
برجیس کو تمھیں نے عنایت کیا ہے صبر　　　بارِ الم اٹھانے کو اس کا جگر نہ تھا
کرم سے اس کے نا امید میں نہیں برجیس　　　کبھی تو میری بھی پروردگار سُن لے گا

برجیس قدر کے مختصر سے دیوان میں بیشتر غزلیں ان کے متعلقین اور اُن کے شخصی حالات اور واقعات سے متعلق ہیں اور اسی اعتبار سے ان کی اہمیت ہے۔ چند شعر یہ ہیں:

مری راحتِ جاں نہ ہو مجھ سے خفا　　　چلو جانے دو بس جو ہوا سو ہوا
ملو مجھ سے اب آؤ بہر خدا　　　چلو جانے دو بس جو ہوا سو ہوا
محرم و ہمدم و ہمراز ہے مہتاب آرا　　　میری مہرو، مری دمساز ہے مہتاب آرا
ہم کو پاس اپنے کہیں جلد بُلا رے خورشید　　　تابِ فرقت نہیں اب دل کو ہمارے خورشید

مرا دل اور میری جان مختار النسا بیگم — عجب ذی قدر اور ذیشان مختار النسا بیگم
جشن یہ تا صدوی سال مبارک ہووے — تخت و تاج و زر و اقبال مبارک ہووے

اس میں شک نہیں کہ برجیس قدر نے نیپال کے زمانۂ قیام میں غزلیں کہی تھیں اور اس حقیقت پر ان کے یہ اشعار قطعیت کے ساتھ شاہد ہیں۔

بے ترے آنکھوں میں اندھیر ہے سارا نیپال — بہتیرا ذکر کیا کرتے ہیں ہر جا حشمت
روضۂ شاہِ شہدا پر شبید چل، تجھے نیپال میں کیا چاہیے

اس مطلع سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شبید تخلص بھی کرتے تھے۔

برجیس قدر کے ساتھ جو رفقا نیپال میں مقیم تھے ان میں سے بعض شاعر بھی تھے اور کچھ شک نہیں کہ ان کے اثر سے کاٹھمانڈو میں بعض خوش مزاجوں نے بھی شعر گوئی سے دلچسپی لی ہوگی لیکن موجودہ حالات میں وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ اتنی بات البتہ یقینی ہے کہ لین دین اور روزمرّہ کے معاملات میں نیپال میں زبان اردو کا بھی استعمال ہونے لگا تھا چنانچہ آج بھی اہل نیپال اس زبان میں خوب بات چیت کرتے ہیں۔

برجیس قدر نے غزل کے علاوہ بعض دوسری شعری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ ان کے ایک ترجیع بند کا پہلا بند یہ ہے

ہو شاد اَب تو یہ دل ناشاد یا علی — اور جلد قیدِ غم سے ہوں آزاد یا علی
اولاد کی ہوں شادیوں سے شاد یا علی — کس سے کروں مُجز آپ کے فریاد یا علی
للہ اب تو کیجیے امداد یا علی
برجیس کی ہے آپ سے فریاد یا علی

ڈاکٹر کوکب قدر نے برجیس قدر کے ایک منظوم خط کا بھی تعارف کرایا ہے جو انھوں نے نیپال سے مٹیا برج میں مقیم اپنی شریک حیات مہتاب آرا بیگم کے نام لکھا تھا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

کچھ نہیں حال آپ کا کھلتا — برف آسا ہوں روز میں گھلتا
دل نے تازہ گل اب کھلائے ہیں — اشک بھی اور رنگ لائے ہیں

ہے تڑپ مثل ماہی بے آب    رات کی نیند ہوگئی ہے خراب
کچھ کسی سے نہیں مجھے ہے کام    تیری بس یاد ہی ہے صبح و شام

اپنے اس منظوم نامہ کو برجیس قدر نے دعاؤں پر ختم کیا ہے۔ ڈاکٹر کوکب قدر نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

"اس میں چند دعائیہ اشعار بھی ہیں جن میں خط لکھنے والے کا پُرخلوص لہجہ الفاظ کا انتخاب اور زبان کی روانی قابلِ دید ہے۔"

برجیس قدر نے اپنے پدر والا قدر کی اتباع میں بعض گیت بھی لکھے ہیں۔ زبان ان کی بھی وہی ہے۔ ایک یہ ہے:

تم بن موہے ایک چھن پرت نا چین    تلپت ہوں دن رین
تمھارے بغیر مجھ کو ایک لمحہ پڑتا نہیں    تڑپتی ہوں رات
تم بن موہے ایک چھن پرت نا چین

جب پیاری سُدھ آت ٹھاڑے    ٹپ ٹپ ٹپکت نین
ہوش آتا ہے کھڑے ہوکر    آنکھ
تم بن موہے ایک چھن پرت نا چین

جے لگ تُمرے درشن نا پائی ہوں    کیس پڑھیے مَن چین
جب تک تمھارا دیدار نہ پاؤں گا    کس طرح پڑیگا دل کو
تم بن موہے ایک چھن پرت نا چین

اپَن سنگ سب لے گئی گوری    پریتم کو سُکھ چین
اپنے ساتھ حسینہ    عاشق کا آرام
تم بن موہے ایک چھن پرت نا چین

برجیس پیا سوں کاہے رسایو    کیو سنگ کیونا سیں
محبوب سے کیوں غصہ ہوئے    کس کے ساتھ معطر کرتے ہو
تم بن موہے ایک چھن پرت نا چین

اُن پُر آشوب حالات میں فارسی اور اردو کے علاوہ پورب کے علاقے کی زبان اور شعری روایات پر بھی بر جیس قدر کا اس حد تک قدرت حاصل کر لینا حیرت انگیز حقیقت ہے۔ ممکن ہے اس کے پسِ پشت بعض سیاسی مصلحتیں بھی رہی ہوں۔ بہر نوع انھوں نے نیپال اور بنگال میں واجد علی شاہ کی علمی روایات کو بحدِ امکان زندہ اور باقی رکھنے کی کوشش کی تھی۔

اس ذکر سے یہ حقیقت بخوبی ظاہر ہے کہ غزل، مثنوی، مخمس، مسدّس وغیرہ کے ساتھ ساتھ ہولی، گیت، دوہرے اور ٹھمری وغیرہ کو بھی اس زمانے میں بادشاہ پسند شعری اصناف کا درجہ حاصل تھا۔ اکثر داستانوں کو دوہروں، سورٹھوں وغیرہ سے مزین کرنے کا بھی اس زمانے میں ملک گیر سطح پر رواج رہا تھا چنانچہ ان مُلکی اصناف کو اردو کے لیے ''غیر'' خیال کرنا بڑی زیادتی کی بات ہے۔

# ب - شاگردانِ آتش

لکھنؤ کی شاہی کے ابتدائی زمانے میں شیخ عبداللہ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کا نام اور کلام خوب چمکا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اس بارے میں لکھا ہے:

''انھوں (ناسخ) نے اور ان کے ہمعصر خواجہ حیدر علی آتش نے خوبیِ اقبال سے ایسا زمانہ پایا جس نے ان کے نقش و نگار کو تصاویرِ مانی و بہزاد کا جلوہ دیا۔ ہزاروں صاحب فہم دونوں کے طرفدار ہو گئے اور طرفین کو چمکا چمکا کر تماشے دیکھنے لگے لیکن حق پوچھو تو ان فتنہ انگیزوں کا دونوں کو احسان مند ہونا چاہیے کیونکہ روشنیِ طبع کو اشتعال لگ دیتے تھے۔''[12]

ان دونوں استادوں کے کارناموں کے سلسلے میں آزاد کا یہ بیان توجہ طلب ہے کہ:

''شیخ صاحب اور خواجہ حیدر علی آتش کے کمال نے لکھنؤ کو وقتی کی قید پابندی سے آزاد کر کے استقلال کی سند دی اور وہی مستند ہوئی۔ اب جو چاہیں سو کہیں ہم نہیں روک سکتے۔''[13]

محمد علی شاہ کے ابتدائی زمانے میں ناسخ نے رحلت کی۔ خواجہ آتش نے البتہ امجد علی شاہ کا زمانہ بھی دیکھا تھا لیکن آزاد کا کہنا ہے کہ:

''جب شیخ ناسخ کا انتقال ہوا تو خواجہ صاحب نے ان کی تاریخ کہی اور اس دن سے شعر کہنا چھوڑ دیا کہ کہنے کا لطف سننے اور سنانے کے ساتھ ہے۔ جس شخص سے سنانے کا لطف تھا جب وہ نہ رہا تو اب شعر کہنا نہیں، بکواس ہے۔''14

واجد علی شاہ نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں آتش کو دیکھا تھا اور ان کے کلام سے نہایت متاثر ہوئے تھے۔ کہتے تھے:

کلام شاعران ماسبق منسوخ کر ڈالا جنھیں کچھ عقل ہے آتش کا دیواں مول لیتے ہیں۔

اسی بات کو آزاد نے اس طرح قلمبند کیا ہے:

''جو کلام ان کا ہے حقیقت میں محاورۂ اردو کا دستور العمل ہے۔ ان کے کلام نے پسند خاص اور قبول عام کی سند حاصل کی۔۔۔۔ دلیل اس کی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ بار بار چھپتا ہے اور بک جاتا ہے۔''15

خواجہ آتش بلا شبہ اپنے وقت کے مقبول ترین استادوں میں سے تھے۔ آزاد نے ان کے حال میں لکھا ہے کہ:

''جتنے شاگرد انھوں نے پائے کسی استاد کو نصیب نہیں ہوئے۔ ان میں سے سید محمد خاں رند، میر وزیر علی صبا، میر دوست علی خلیل، ہدایت علی جلیل، صاحب مرزا شاد، مرزا عنایت علی بسمل، نادر مرزا فیض آبادی نامور شاگرد تھے کہ رتبۂ استادی رکھتے تھے۔''16

تلامذہ کی کثرت سے متعلق آزاد کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ 1964 میں راقم نے ناسخ کے شاگردوں کی ایک فہرست سہ ماہی نخلستان اودے پور میں شائع کی تھی۔ اس میں چھیانوے شاعروں کے نام شامل تھے۔ بعد میں اس میں متعدد ناموں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ سہ ماہی اردو کراچی میں ان کے ایک سو تین سے بھی زیادہ تلامذہ کا حال شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد علی زیدی نے مرزا داغ کے 140 شاگرد شمار کیے ہیں۔ ان کے بعد شاہ عبد السلام نے ''دبستان آتش'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی اگر چہ اس میں ان کا دعویٰ ہے کہ:

''راقم نے کافی تحقیق کے بعد تقریباً ستر ایسے شعرا کی فہرست تیار کی ہے جنھوں نے باقاعدہ آتش سے اصلاح لی۔''17

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس فہرست میں بعض ایسے شاعروں کے نام بھی شامل کر لیے گئے ہیں جن کا آتش سے تلمذ ثابت نہیں ہوتا مثلاً عدم واجد علی خاں کو سعادت خان ناصر نے صبا کا شاگرد لکھا ہے۔ شاہ صاحب نے اس ہموطن اور ہمعصر تذکرہ نویس کی شہادت کو مسترد کر دیا ہے اور دہلوی تذکرہ نویس کریم الدین کے سُنے سنائے بیان کو قبول کر لیا ہے جب کہ سامنے کی بات یہ بھی تھی کہ آتش کی وفات کے وقت اس عدم کی عمر صرف پندرہ سولہ برس کی تھی۔ نہیں معلوم کہ اس وقت تک اس نے شعر کہنا شروع بھی کیا تھا یا نہیں۔ بہرنوع آتش کے شاگردوں کی تعداد غیر معمولی نہیں تھی۔ اب یہاں ان کے دو ایک معروف شاگردوں کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

## 1- خلیل- میر دوست علی

خواجہ آتش کے شاگرد خاص اور خلوت و جلوت کے حاضر باش، بقول آزاد انھیں نے استاد کی تجہیز و تکفین کی اور رسوم ماتم بھی بہت اچھی طرح ادا کیں۔ محسن نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

> ''میر دوست علی خلیل ولد سید جمال علی باشندۂ قصبہ بڑ دلی حلقہ بارہا، مقیم لکھنؤ، رفیق نادر مرزا نیشاپوری کے، صاحب دیوان، شاگرد رشید خواجہ حیدر علی آتش۔''18

شروع میں تخلص سوزش تھا پھر اپنے نام کی مناسبت سے خلیل تخلص کیا اور اپنے حلقے میں خوب مقبول ہوئے۔ واجد علی شاہ کے عہد میں نظامت اور چکلہ داری کے منصب پر فائز تھے۔ بہادر شاہ ثانی بادشاہ دہلی کی تبدیلیِ مذہب سے متعلق ہنگامے میں لکھنؤ میں 1271ھ (55-1854) میں:

> ''مثنوی شیعیانِ علی دررد مثنوی جعلی دہلی''19

چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ اس مثنوی کے نظم کرنے والے دوست علی خلیل تھے اور رہنمائی مفتی میر محمد عباس شوستری نے کی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خلیل مثنوی نظم کرنے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ ان کا دیوان مطبع نامی لکھنؤ میں چھپا تھا۔

واجد علی شاہ کی سرپرستی میں جب مٹیا برج میں شعر و سخن کی محفلوں کو شہرت ملی تو دوست علی خلیل وہاں بھی گئے۔ ناسخ نے لکھا ہے:

''خلیل بیشتر لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ بارہ سو اناسی ہجری (1862) میں کلکتہ میں آئے
تھے۔ صاحب دیوان ہیں۔ اشعار ان کے بہت خوب اور مرغوب ہوتے ہیں۔ راقم
کے دوستوں میں ہیں۔''20

خلیل اپنے استاد کی طرح بنیادی طور پر غزل گو تھے۔ تشبیہ، استعارہ اور صنف مراعاۃ النظیر اور تجنیس کے دلدادہ تھے۔ اکثر کنگھی، چوٹی، موباف کے مضامین باندھتے تھے، کبھی کبھی اخلاقی اور اصلاحی مضامین بھی نظم کرتے تھے چنانچہ ان کے کچھ شعر یہ ہیں:۔

جس نے پوچھا یہی جواب ملا آدمی باوفا نہیں ملتا
مرتبہ خاک نشینوں کا جو سمجھے کوئی رکھتے پھر نقشِ قدم پر بھی نہ زنہار قدم
لاکھ نازک ہو رشتۂ الفت ٹوٹتا ہے یہ تار مشکل سے
ترقیوں میں تنزل کا بھی خیال ہے شرط گڑھے کنویں کو نظر میں سوار رکھتا ہے

میر دوست علی خلیل کے شاگرد بھی کئی تھے۔ ان میں نواب معتمد الدولہ آغا میر کے چھوٹے صاحب زادے نواب محمد علی خاں عرف ننھے نواب متخلص بہ شمس اپنے زمانے میں معروف تھے۔

2- صبا- میر وزیر علی

صبا بھی خواجہ آتش کے معروف شاگردوں میں سے تھے۔ سعادت خاں ناصر نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''صاحب فکر رسا، خوش مذاق و نازک ادا، میر وزیر متخلص بہ صبا، سادہ گوے معنی بند اور
اردوے خاص عام پسند۔۔۔۔''21

ناصر نے ایک حکایت بھی نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عروض میں صبا کو معمولی سا دخل تھا۔ محسن نے البتہ ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''میر وزیر صبا ولد میر بندہ علی پسر خواندہ اور خواہر زادۂ میر اشرف علی، باشندۂ لکھنؤ،
صاحب دیوان، ارشد تلامذۂ خواجہ آتش۔''22

جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے محسن کے تذکرہ ''سراپا سخن'' میں انسانی جسم کے ہر عضو سے متعلق غزلیں جمع کی گئی ہیں لیکن روح چونکہ اعضا میں سے نہیں ہے، اس سے متعلق کوئی غزل

شامل نہیں کی گئی تھی۔ اس کو دیکھ کر:

"جناب میر وزیر صبا نے فرمایا کہ بغیر روح قالب بیکار ہوتا ہے۔ یہ لطیفہ مولف کو نہایت پسند ہوا۔ فصل روح زیادہ کی۔"23

لالا سری رام کے تذکرے میں صبا کے حالات میں مذکور ہے کہ:

"حضرت سلطانِ عالم واجد علی شاہ کی سرکار سے دوسو روپیہ مقرر تھا اور تیس روپیہ نواب محسن الدولہ بہادر نبیرۂ غازی الدین حیدر کے ہاں سے ملتے تھے---"24

واجد علی شاہ نے محسن الدولہ اور نواب احمد علی خاں سے ایک شیر کو زندہ گرفتار کرنے کی فرمائش کی۔ اس شکار میں صبا بھی شریک تھے۔ جب یہ فرمائش پوری ہوگئی تو اس واقعہ کو صبا نے نظم کر کے اپنی اس مثنوی کا نام صید یہ رکھا۔ میر علی اوسط رشک نے اس مثنوی کی تاریخ کہی، اس طرح:

"قطعہ تاریخ من تصنیف جناب میر علی اوسط صاحب رشک ح

خبذا فکر مستقیم صبا — واہ کیا خوب کارنامہ یہ ہے
رشک نے نظم کی کہی تاریخ — مثنوی یا شکار نامہ یہ ہے

1264ھ

مثنوی صید یہ رواج زمانہ کے مطابق حمد، نعت اور مدح سلطان عالم سے شروع ہوتی ہے۔ مثنوی کے مطالب سب حقائق پر مبنی ہیں اور اس اعتبار سے اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ شاعر نے اس میں اپنے شہر لکھنؤ کی تعریف اس طرح کی ہے۔

کسی شہر کو اس سے کیا ہمسری — کہ ہے یہ پرستان سے بھی پری
ہمیشہ ہیں چہلیں خوشی سے سدا — کوئی نامِ غم سے نہیں آشنا

شکارگاہ میں ایک دریا بھی بہہ رہا تھا۔ اس کا ذکر صبا نے اس طرح کیا ہے۔

وہ دریا کا عالم وہ بادِ مُراد — جنابِ خضر پھرتے تھے شاد شاد
وہ دریا کہ قربان ہو کہکشاں — ہلالی وہ چھوٹی ہوئی کشتیاں

"خلیل بیشتر لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ بارہ سو اناسی ہجری (1862) میں کلکتہ میں آئے
تھے۔ صاحب دیوان ہیں۔ اشعار ان کے بہت خوب اور مرغوب ہوتے ہیں۔ راقم
کے دوستوں میں ہیں۔"20

خلیل اپنے استاد کی طرح بنیادی طور پر غزل گو تھے۔ تشبیہ، استعارہ اور صنف مراعاۃ النظیر اور تجنیس کے دلدادہ تھے۔ اکثر کنگھی، چوٹی، موباف کے مضامین باندھتے تھے، کبھی کبھی اخلاقی اور اصلاحی مضامین بھی نظم کرتے تھے چنانچہ ان کے کچھ شعر یہ ہیں:۔

جس نے پوچھا یہی جواب ملا ۔۔۔ آدمی باوفا نہیں ملتا
مرتبہ خاک نشینوں کا جو سمجھے کوئی ۔۔۔ رکھے پھر نقشِ قدم پر بھی نہ زنہار قدم
لاکھ نازک ہو رشتۂ الفت ۔۔۔ ٹوٹتا ہے یہ تار مشکل سے
ترقیوں میں تنزل کا بھی خیال ہے شرط ۔۔۔ گڑھے کنویں کو نظر میں سوار رکھتا ہے

میر دوست علی خلیل کے شاگرد بھی کئی تھے۔ ان میں نواب معتمد الدولہ آغا میر کے چھوٹے صاحب زادے نواب محمد علی خاں عرف ننھے نواب متخلص بہ شمس اپنے زمانے میں معروف تھے۔

2- صبا- میر وزیر علی

صبا بھی خواجہ آتش کے معروف شاگردوں میں سے تھے۔ سعادت خاں ناصر نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"صاحب فکر رسا، خوش مذاق و نازک ادا، میر وزیر متخلص بہ صبا، سادہ گوے معنی بند اور
اردوے خاص عام پسند۔۔۔۔"21

ناصر نے ایک حکایت بھی نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عروض میں صبا کو معمولی سا دخل تھا۔ محسن نے البتہ ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"میر وزیر صبا ولد میر بندہ علی پسر خواندہ اور خواہر زادۂ میر اشرف علی، باشندۂ لکھنؤ،
صاحب دیوان، ارشد تلامذۂ خواجہ آتش۔"22

جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے محسن کے تذکرہ "سراپا سخن" میں انسانی جسم کے ہر عضو سے متعلق غزلیں جمع کی گئی ہیں لیکن روح چونکہ اعضا میں سے نہیں ہے، اس سے متعلق کوئی غزل

شامل نہیں کی گئی تھی۔ اس کو دیکھ کر:

"جناب میر وزیر صبا نے فرمایا کہ بغیر روح قالب بیکار ہوتا ہے۔ یہ لطیفہ مولف کو نہایت پسند ہوا۔ فصل روح زیادہ کی۔"[23]

لالا سری رام کے تذکرے میں صبا کے حالات میں مذکور ہے کہ:

"حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کی سرکار سے دوسو روپیہ مقرر تھا اور تیس روپیہ نواب محسن الدولہ بہادر نبیرۂ غازی الدین حیدر کے ہاں سے ملتے تھے۔۔۔۔"[24]

واجد علی شاہ نے محسن الدولہ اور نواب احمد علی خاں سے ایک شیر کو زندہ گرفتار کرنے کی فرمائش کی۔ اس شکار میں صبا بھی شریک تھے۔ جب یہ فرمائش پوری ہوگئی تو اس واقعہ کو صبا نے نظم کر کے اپنی اس مثنوی کا نام صید یہ رکھا۔ میر علی اوسط رشک نے اس مثنوی کی تاریخ کہی، اس طرح:

"قطعہ تاریخ من تصنیف جناب میر علی اوسط صاحب رشک ح

خوشا فکر مستقیم صبا واہ کیا خوب کارنامہ یہ ہے
رشک نے نظم کی کہی تاریخ مثنوی یا شکار نامہ یہ ہے

1264ھ

مثنوی صید یہ رواج زمانہ کے مطابق حمد، نعت اور مدح سلطان عالم سے شروع ہوتی ہے۔ مثنوی کے مطالب سب حقائق پر مبنی ہیں اور اس اعتبار سے اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ شاعر نے اس میں اپنے شہر لکھنؤ کی تعریف اس طرح کی ہے۔

کسی شہر کو اس سے کیا ہمسری کہ ہے یہ پرستان سے بھی پری
ہمیشہ ہیں چہلیں خوشی سے سدا کوئی نام غم سے نہیں آشنا

شکارگاہ میں ایک دریا بھی بہہ رہا تھا۔ اس کا ذکر صبا نے اس طرح کیا ہے۔

وہ دریا کا عالم وہ باد مراد جناب خضر پھرتے تھے شاد شاد
وہ دریا کہ قربان ہو کہکشاں ہلالی وہ چھوٹی ہوئی کشتیاں

صبا کی یہ مثنوی اہل لکھنؤ کی بعض اور مثنویوں کے ساتھ ایک مجموعے کی صورت میں چھپ گئی ہے۔ اس میں 700 سے زیادہ اشعار ہیں اور زبان و بیان کی خوبیوں کے اعتبار سے یہ اردو کی قابل ذکر مثنویوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔

صبا نے 1271ھ (1854) میں گھوڑے سے گر کر وفات پائی تھی۔ بحر، مہر کیف اور کاشف وغیرہ مختلف شعرا نے تاریخیں کہی تھیں۔ یہاں میر ولد حسین فوق خلف میر مولود علی کا قطعہ نقل کیا جاتا ہے۔

جب گرے گھوڑے سے وزیر علی — کان سے، منہ سے خون بہنے لگا
حکما سے کہا یہ جاکر حال — بولے وہ، فصد لو تو ہوگی شفا
فصد کھلوائی جس گھڑی ان کی — کیا کہوں کیا ہوگیا نقشا
نبضیں ہاتھوں کی ہوگئیں ساقط — عالم نزع ہوگیا پیدا
غیر حالت جب اس طرح کی ہوئی — پنجشنبہ کی شب کا تھا پچھلا
بست و ہفتم مہِ صیام کی تھی — ہائے اس دن یہ سانحہ گزرا
روح نے کی مفارقت اُس دم — خوب محشر بپا سبھوں نے کیا
پھر کہی یہ وفات کی تاریخ — گئے باغ جہاں سے آہ صبا

1271ھ

میر وزیر علی صبا کی وفات کے بعد ان کا دیوان مرتب کر کے شائع کیا گیا۔ اس کا تاریخی نام ''غنچۂ آرزو'' رکھا گیا جس سے 1272 کے عدد برآمد ہوتے ہیں۔ اس کے لیے کیف، فوق، بحر، تسلیم وغیرہ شعرا نے تاریخیں کہی تھیں۔

صبا کے دیوان میں چند قطعات تاریخ بھی شامل ہیں مثلاً:

قطعہ تاریخ کتاب مثنوی مہر تالیف مرزا حاتم علی مہر — 1858
ایضاً — مسجد — ---- — 1265ھ
ایضاً — انتقال والدہ شیخ مہدی حسن نظم — 1267ھ

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ صبا ہر موضوع سے متعلق مروجہ سنین یعنی ہجری و عیسوی وغیرہ میں تاریخیں کہہ لینے پر قدرت رکھتے تھے۔

صبا کے دیوان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں تلاشِ مضامین کا شوق تھا۔ عموماً زبان وبیان کی خوبیوں پر نظر رکھتے تھے۔ چھوٹی بحروں میں بڑی روانی سے غزلیں کہتے تھے۔ صنعتوں میں رعایت لفظی اور تضاد وغیرہ سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ان کے کلام میں آمد اور سلاست کا جو عنصر پایا جاتا ہے اس کی وجہ سے بعض ناقدین نے ان کے یہاں دہلویت کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے چند شعر نمونہ کے طور پر درج ذیل ہیں۔

جائے عبرت ہے جہانِ بے ثبات　　دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا
آبرو کی جو صفاتِ فقرا سے پیدا　　صورت وصل ہوئی ذاتِ خدا سے پیدا
نفس امارہ سے کیوں زیر ہوا جاتا ہے　　زور کر روح میں تقلیلِ غذا سے پیدا
دھوم ہے پیرہنِ یار کی بازاروں میں　　چٹھیاں پڑتی ہیں یوسف کے خریداروں میں
جو عدوئے باغ ہو، برباد ہو　　کوئی ہو، گلچیں ہو یا صیاد ہو
آمد آمد موسم گل کی ہوئی　　پھر طبیعت کہ گدائی دیکھیے

3- شوق- تصدق حسین عرف نواب مرزا

یہ بھی آتش کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ آغا حجو شرف نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

سرافراز نوآب مرزا حکیم　　معالج یہ ہیں بادشاہی قدیم
حقیقت میں عیسیِ ثانی یہ ہیں　　بڑے نامور خاندانی یہ ہیں
علاجوں کا عالم میں افسانہ ہے　　مطب ان کا جو ہے شفا خانہ ہے
سمجھتے ہیں عیسیٰ، جو بیمار ہیں　　اسی طرح کے تجربہ کار ہیں
یہ عہد خلافت میں کامی رہے　　ہمیشہ عماید میں نامی رہے
یہ شاگرد آتش کے ہیں نامور　　ظریف و جہاں آشنا خوش سیر
قضا کی جو عبرت سے رہتے تھے ست　　مریض ایسے ایسے کیے تندرست 25

اس سے پتہ چلتا ہے کہ شوق شاعری سے زیادہ طب و معالجہ کے لیے معروف تھے۔ سعادت خان ناصر نے بھی اپنے تذکرے میں لکھا ہے:

''ارسطوے زماں، فلاطونِ دوراں، تصدق حسین خاں عرف حکیم نواب مرزا

خلف حکیم آقا علی خاں برادر حکیم الملوک حکیم مرزا علی خاں مرحوم، گوفن شاعری میں بہرہ نہیں مگر پانچویں سواروں میں نام ملایا ہے۔ پیش طبیب منجم و پیش منجم طبیب کا آپ ہی میں مزہ پایا ہے۔ بے استاد، تلمذ شعرا سے انکار ہے۔ خود استادی معلم الملکوت کا اقرار ہے چنانچہ چند غزلیں اور چار مثنوی مسمی زہر عشق ولذت عشق وفریب عشق و بہار عشق، صاحب مسدس ومخمسہ تخلص ندارد، مقیم لکھنؤ۔''26

یہ حقیقت ہے کہ غزل، خمسہ وغیرہ کے لیے شوق کوئی امتیاز حاصل نہیں کر سکے تھے چنانچہ محسن نے ان کے ذکر میں بس اتنا لکھا ہے:

''حکیم تصدق حسین خاں عرف نواب مرزا شوق خلف حکیم آغا علی خاں متوطن لکھنؤ شاگرد خواجہ حیدر علی آتش۔''27

شوق کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا یا نہیں۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار نمونہ کے طور پر لکھے جاتے ہیں:

دیکھ لیتا ہوں جو میں اس گل کے پیارے ہاتھ پاؤں  بیخودی سے پھول جاتے ہیں ہمارے ہاتھ پاؤں
خوش چشم ہے تو، تجھ سے زمانے کی لڑی آنکھ  کس کس کی تری آنکھ کے اوپر نہ پڑی آنکھ
ایک ایک سے دلچسپ ہے جو عضو بدن ہے  رہ رہ گئی پہروں وہیں جس جا پہ پڑی آنکھ
ہم جان گئے آنکھ ملاؤ نہ ملاؤ  بگڑے ہوئے تیور ہیں تمھارے کئی دن سے

شوق نے غزل کے علاوہ واسوخت بھی لکھا تھا۔ یہاں اُس کے صرف دو بند نقل کیے جاتے ہیں۔ ان سے بھی شاعر کی قدرت کا پتہ چلتا ہے:

وہ بھی کیا دن تھے کہ تم شوخ جفا کار نہ تھے  تیغ ابرو کی طرح خلق کے خونخوار نہ تھے
سر مو مثل سر زلف دل آزار نہ تھے  شوخ تھے، گرم تھے، اس طرح کے طرار نہ تھے
صورت برق جو رخسار چمک جاتے تھے
اپنے سایے سے بھی تم آپ جھجک جاتے تھے

ان کو منظور اگر غیروں سے ہے انس ووفا — ان سے ملنا نہیں منظور ہمیں بھی حاشا
گو کہ مشہور زمانے میں وہ ہو مہرلقا — اپنے مطلب کے نہیں، روز جلے کس کی بلا
کس کو مطلب ہے کہ اب ان سے ملاقات کرے
ایسے خود غرضوں سے پاپوش مری بات کرے

سعادت خاں ناصر کے تذکرے کا اقتباس اوپر نقل کیا جاچکا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرزا شوق کی چار مثنویاں مانتا تھا لیکن ہمارے زمانے کے اہل تحقیق نے ان کی صرف تین مثنوی تسلیم کی ہیں۔ ان کی کیفیت اس طرح ہے:

الف۔ فریب عشق — سال تکمیل 1262ھ/28-1846ء
مطبوعہ 1272ھ (56-1855) مطبع آغا جان لکھنؤ
نسخۂ مملوکۂ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ضخامت: تیس صفحے
تعداد اشعار۔ سوا چار سو سے زائد

اس مثنوی میں شاعر نے سیدھے سادے انداز سے باغ کے پیڑ پودوں اور پھولوں وغیرہ کا نہایت کامیابی سے بیان کیا ہے چنانچہ ان شعروں سے ظاہر ہے:

باغ چھوٹا سا، پیارے پیارے چمن — گل تو گل، پتے پتے پر جوبن
چار جانب سے آتی ہے خوشبو — کہیں جوہی کھلی، کہیں شبو
ہر چمن پہ نئی طرح کی بہار — پھولا اک سمت کو ہے ہار سنگھار

اس مثنوی کے مکالموں میں بھی زبان کی لطافت، شستگی اور صفائی لائق ستائش ہے چنانچہ ان شعروں میں بھی ہے:

رہے یہ بھی خیال میں تیرے — میں نہ آؤنگی جال میں تیرے
آگ میں کوئی آپ جلتا ہے — جیتی مکھی کوئی نگلتا ہے
آپ سے کوئی جی گنواتا ہے — جان کر کوئی زہر کھاتا ہے
ایک ہی خانماں خراب ہے تو — چیونٹیوں کا بھرا کباب ہے تو

زبان، بیان اور مطالب کی خوبیوں کے باوجود شوق کی یہ مثنوی معاصرین میں مقبول

نہیں ہوسکی۔ وجہ اس کی غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے حسین آباد اور حضرت عباس کی درگاہ جیسے مقاموں کے ذکر میں بھی اس قسم کے شعر شامل کردائے تھے:

صحبت عیش گرم رہتی تھی　　کچھ نہ آپس میں شرم رہتی تھی

ب۔ بہار عشق — شوق کی اس مثنوی کے نسخۂ مملوکۂ سید مسعود حسن رضوی ادیب کا یہ ترقیمہ لائق توجہ ہے:

"الحمدللہ یہ نسخہ۔۔۔ منظومہ حکیم۔۔۔ نواب مرزا صاحب۔۔۔ حسب استدعائے۔۔۔ نواب ابو تراب خاں صاحب بہادر دام اقبالہ۔۔۔ بہار عشق نام رکھا۔۔۔ بیچ شہر شوال 1266ھ (53-1852) کے تالیف طبع میں آیا۔"29

اس مثنوی میں شعروں کی تعداد ساڑھے آٹھ سو سے کچھ کم بتائی گئی ہے۔ سال تصنیف اس کا 1262ھ اور 1266ھ کے درمیان ہے۔ اس میں واجد علی شاہ کی مدح بھی شامل کی گئی ہے:

سرور خسروان عالم ہے　　حق تو یہ ہے کہ جان عالم ہے

مثنوی کے قصہ میں کئی مقام ایسے ہیں جو شوق کے زمانے کی معروف معاشرت سے میل نہیں کھاتے ہیں۔ غالباً یہ بھی ایک سبب ہے کہ اس زمانے میں اس کو پسند عام کی سند حاصل نہیں ہوسکی۔ بایں ہمہ شاعر نے اس مثنوی میں بھی مختلف مواقع کے بہت کامیاب مرقعے پیش کردیے ہیں چنانچہ کچھ شعر یہ ہیں:

دور ہو بس کہ ہے قصور معاف　　پاس کرتی ہوں جان کر اشراف

اب خبردار یاں نہ آیئے گا　　پھر نہ بات منہ پہ لایئے گا

میری جوتی سے زہر کھایا ہے　　مجھ کو کس بات پر ڈرایا ہے

جان جائے گی ان کی جائے گی　　میری پاپوش بھی نہ آئے گی

اور —

منہ دوپٹے سے ڈھانپتی اُتری　　خوف کے مارے کانپتی اتری

نیچی نظروں سے دیکھ بھال لیا　　سر پہ آنچل اُلٹ کے ڈال لیا

سب حیا سے بدن چُرائے ہوئے　　پائینچے ناز سے اٹھائے ہوئے

پانی پانی جو دل تھا سینے میں    جسم ڈوبا تھا سب پسینے میں
کچھ رُکھائی تھی، کچھ لگاوٹ تھی    کچھ حقیقت تھی، کچھ بناوٹ تھی

ج۔زہر عشق ـــــ اس مثنوی میں ساڑھے پانچ سو سے زائد اشعار ہیں۔اس کے بارے میں گیان چند صاحب نے لکھا ہے:

''اس کا سب سے قدیم مطبوعہ نسخہ 1279ھ/1862 کا ملتا ہے۔سب سے پہلے سر راس مسعود نے انتخاب زریں میں لکھا ہے کہ زہر عشق کی تاریخ 'ظُم دلربا' یعنی 1277ھ ہے۔''30

پروفیسر ابواللیث صدیقی نے اس مثنوی کی خوبیوں کا بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

''اس میں مافوق الفطرت عناصر کا ذکر بالکل نہیں ہے۔۔۔افراد قصہ بادشاہوں اور سلاطین کے بجائے عوام کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔۔۔قصہ نہایت مختصر ہے۔اگر آخر شب کی تمام گفتگو کو کچھ مختصر کر دیا جائے تو مثنوی کا حجم گلزارِ نسیم سے بھی کم رہ جاتا ہے۔

شاعرانہ نقطۂ نظر سے یہ گلزارِ نسیم پر بہت بھاری ہے بلکہ بعض اعتبار سے سحر البیان پر بھی فوقیت رکھتی ہے۔ پھر اس اختصار میں وہ بدمزگی نہیں پیدا ہوتی جو گلزارِ نسیم میں نظر آتی ہے۔''31

چنانچہ پروفیسر آل احمد سرور نے بھی کہا ہے کہ:

''لکھنؤ کی بہترین مثنوی گلزارِ نسیم بتائی جاتی ہے مگر میرے خیال میں شوق کی زہر عشق کو یہ درجہ دینا چاہیے۔لکھنؤ کی ساری مثنویوں میں سب سے زیادہ روشن اور تھرتھراتی ہوئی تصویریں شوق کی مثنویوں میں ملتی ہیں:32

نمونہ کے طور پر اس مثنوی کے کچھ شعر نقل کیے جاتے ہیں:

اس سِن وصال پر کمال خلیق    چال ڈھال انتہا کی نستعلیق
چشم بددور وہ حَسین آنکھیں    رشک چشم غزالِ چین آنکھیں
تھا جو ماں باپ کو نظر کا ڈر    آنکھ بھر کر نہ دیکھتے تھے ادھر

تھی زمانے میں بے عدیل و نظیر　　خوش گلو، خوش جمال، خوش تقریر
تھا نہ اس شہر میں جواب اس کا　　حسن لاکھوں میں انتخاب اس کا

زبان کے محاوروں، روایتوں اور روزمروں پر شاعر کی نظر اور گرفت غیر معمولی ہے۔ کوئی مصرعہ صنعتوں سے خالی نہیں ہے۔

مثنوی کے آخر میں شاعر نے اکثر مضامین سبق آموز نظم کیے ہیں، مثال کے طور پر چند شعر یہ ہیں:

جائے عبرت سرائے فانی ہے　　موردِ مرگ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے　　آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم　　ہوئے جاجا کے زیر خاک مقیم
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے　　اک فقط نام، نام باقی ہے
موت سے کس کو رستگاری ہے　　آج وہ، کل ہماری باری ہے

مثنوی زہر عشق کی مقبولیت کا اندازہ اس طرح بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس کے بعض شعر ضرب المثل کا درجہ بھی حاصل کر چکے ہیں۔

نواب مرزا شوق نے 12-ربیع الثانی 1288ھ/3، جون 1871 کو لکھنؤ میں وفات پائی تھی اور اپنے اسی شہر میں وہ مدفون بھی ہوئے تھے۔

4- نسیم- دیاشنکر

دیاشنکر نام، نسیم تخلص، کشمیری برہمن گنگا پرشاد کول کے بیٹے، لکھنؤ میں 1228ھ کے قریب پیدا ہوئے۔ سعادت خاں ناصر نے ان کو "خواجہ آتش کا شاگرد قدیم" بتایا ہے۔33 خواجہ آتش اپنے وقت کے مسلم الثبوت غزل گو تھے۔ نسیم نے بھی اس فن میں نام پیدا کر لیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ان کا ایک مختصر دیوان تھا جو اب نایاب ہے۔ ان کی غزل کے چند شعر یہ ہیں:

خم نہ بن کر خود غرض بن جایئے　　مثل ساغر اور کے کام آیئے
سرد آہیں بھرتے ہیں جب ہم نسیم　　کہتے ہیں وہ ٹھنڈے ٹھنڈے جایئے
طوفانِ نوح اس میں ہو یا شورِ حشر ہو　　ہونا جو ہے وہ ہوگا جو گذرا گذر گیا
مجھ سے تو جیسا ہے پیارے تجھ سے ویسا میں بھی ہوں　　دوستی میں دوستی اور دشمنی میں دشمنی

اکثر شعر کسی محاورے یا روزمرّہ کو نظم کرنے کے لیے موزوں کیے گئے ہیں لیکن ان میں کوئی خاص لطف اور کیفیت نہیں ہے۔

اپنے ابتدائی زمانے میں نسیم نے نہال چند لاہوری کے قصہ گلِ بکاؤلی کو نظم کیا تھا۔ اس مثنوی کا نام انھوں نے ''گلزارِ نسیم'' رکھا تھا اور اس کا سالِ تکمیل اس مصرع سے نکالا تھا:

توقیع قبول روزِ لیش باد

1245ھ/1838

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا اس مثنوی کے بارے میں کہنا ہے کہ:

''راقم السطور کے ذہن میں تو یہ بات آتی ہے کہ گلزارِ نسیم ایک مسلسل غزل ہے اور اس کی یہی حیثیت سب سے نمایاں بھی ہے اور سب سے مقبول بھی۔''34

اور عبدالحلیم شرر کا دعویٰ یہ ہے کہ:

''باوجود اردو کی بہترین مثنوی ہونے کے جس قدر عیب اس مثنوی میں موجود ہیں وہ اردو کی کسی دوسری مثنوی میں نہیں ہیں۔''

اور مولوی محمد مبین چریا کوٹی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''ان کی مثنوی گلزارِ نسیم نے ان کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ مثنوی کا رنگ ان کی غزل سے بہت بہتر ہے۔ غزل میں سلاست اور روانی ہے۔ زبان کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ مضمون آفرینی میں کوئی خاص رنگ نہیں۔ اکثر اشعار بے مزہ ہیں لیکن ناگوار نہیں۔''35

اہلِ تحقیق نے گلزارِ نسیم کے مآخذ کی جستجو میں بہت محنت کی ہے۔ اس سلسلے میں یہ دیکھنا بھی ضروری تھا کہ نوعمر، نومشق نسیم کی ان مبینہ مآخذ تک رسائی ہونی ممکن بھی تھی یا نہیں۔ نسیم نے اپنی مثنوی کا آغاز حمد سے کیا ہے۔ شروع کے دو شعر یہ ہیں:

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر حمدِ حق و مدحتِ پیمبرؐ

قصہ کی ابتدا اس عنوان سے کی گئی ہے:

''خواستگاری جنابِ باری سے مثنوی گلزارِ نسیم کی ترتیب کے واسطے''

اور اِس جُزو کا پہلا شعر یہ ہے:

یارب مرے خامے کو زباں دے　　　منقار ہزار داستاں دے

وہ زمانہ تھا جب نثر اور نظم دونوں میں مطالب کی توضیح وتصریح کے لیے بیچ بیچ میں دلچسپ لطیفے اور حکایتیں بھی شامل کردی جاتی تھیں۔نسیم نے بھی اپنی مثنوی میں ایسا کیا ہے۔ایک حکایت کا عنوان ہے:

"حکایت نصیحت گری مرغ اسیر اور نافہمی صیاد کی"

اختصار کے باوجود اس مثنوی میں نسیم نے مرقع نگاری اور جذبات نگاری وغیرہ کے بعض بہت اچھے نمونے پیش کردیے ہیں۔زبان اور بیان کی خوبیوں اور لطافتوں کے اعتبار سے بھی یہ مثنوی آپ اپنا جواب ہے۔

# ج - شاگردانِ ناسخ

خواجہ حیدر علی آتش کے معروف شاگردوں میں سے بیشتر نے غزل کے ساتھ ساتھ مثنویاں بھی لکھی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اساتذۂ دہلی کے بعد شاعری کی اس صنف کو چمکا دینے کا سہرا انھیں حضرات کے سر رہا ہے۔ بعض شاعروں نے خمسے اور تاریخیں وغیرہ بھی لکھی تھیں لیکن اس باب میں امتیاز دوسروں کو حاصل ہوا۔

شیخ امام بخش ناسخ کی شاعری کی بنیاد بقولِ محمد حسین آزاد ''فقط نازک مزاجی پر تھی''۔ انھوں نے غزل کے ساتھ ساتھ تاریخ گوئی کے لیے بھی نام پیدا کیا تھا۔ کلب حسین خاں نادر نے ان کی خوبیوں کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> ''بانیِ طرزِ جدید، واضعِ قواعدِ مفید، مدوّنِ دواوینِ فصاحت، مقنّنِ قوانینِ بلاغت شیخ امام بخش ناسخ نے سب لغویات اور حشویات کو دور کر کے ایسی صحتِ محاورات اور صفائیِ بندش اور شستگیِ زبان اور روز مرّہ کی پیدا کی کہ سخنورانِ پایۂ بلند اور دقیقہ رسانِ ہنر مند نے بہ دل پسند کیا اور ہر ایک کو اس کی پیروی و تقلید ملحوظ رہی۔''36

ناسخ کے بعد ان کے شاگردوں نے بھی اپنی اپنی استعداد کے مطابق زبان و بیان کی اصلاح و درستی کی کوششیں کیں، یہاں ان میں سے صرف بعض کا احوال مختصراً تحریر کیا جاتا ہے۔

1- رشک- میر علی اوسط

میر علی اوسط نام اور رشک تخلص تھا۔ اپنے وقت کے بہترین استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ پہلے حصے میں ان کا احوال لکھا جا چکا ہے۔ نادر نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''سید علی اوسط صاحب سلمہ اللہ تعالی بڑے صاحب تدقیق و اہل استعداد با تحقیق ہیں کہ مثل و نظیر اپنا نہیں رکھتے ہیں۔ بہت سے لوگ اور کل پیرو ان کے انھیں قیود کے ساتھ شعر موزوں کرتے ہیں۔''37

نادر نے ان کے اختراع کردہ بعض ضابطوں کو قلمبند کر دیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''از آنجملہ ہے سقوط الف آخر الفاظ عربی و فارسی و ہندی کا کہ محض ناجائز ہے۔ میر صاحب کا دیوان سیوم اس سے خالی ہے۔ پہلے اور دوسرے دیوان میں جا بجا یہ بات پائی جاتی ہے، جیسے اس شعر میں ایسا ہے۔ رشک

رکھا پناہ میں سحر وصل یار نے کھا ہی لیا تھا دیو شب انتظار نے

زبان ذرفشان جناب منشی احمد حسن خاں صاحب سے کہ تلامذۂ ارشد میر صاحب سے ہیں یہ قول بھی سنا گیا کہ سقوط الف کا دو حرفی الفاظ میں مضایقہ نہیں ہے۔''38

میر رشک کے جس تیسرے دیوان کا یہاں ذکر آیا ہے وہ 1267ھ (1851) میں مرتب ہوا تھا۔ خود انھوں نے اس کی تاریخ اس طرح کہی تھی

اے رشک ندا آ دم سروش دم ترتیب دیوان سوم نیز مرتب شدہ واللہ

1267ھ

راقم نے اس دیوان کو مدوّن کر کے پی ایچ ڈی کے لیے اپنے مقالے کے ساتھ بطور ضمیمہ منسلک کر دیا تھا۔ اس دیوان میں غزلوں، رباعیوں اور ترجیع بند وغیرہ کے علاوہ بہ کثرت تاریخیں بھی شامل ہیں۔ مثنوی کوئی نہیں ہے۔ غزل کے لیے عموماً ایسی ردیفیں اختیار کی گئی ہیں جن کو ان کا عنوان بنایا جا سکتا ہے مثال کے طور پر پہلی غزل کا مطلع یہ ہے:

عرش ہے پائے نام حیدر کا فوق عالم ہے نام حیدر کا

ان غزلوں کو اہل نقد و نظر نے ''غزلہائے قصیدہ طور'' کہا ہے۔ اس دیوان میں بعض غزلوں پر عنوان بھی قائم کیے گئے ہیں مثلاً

''غزل در بیان ولادت باسعادت جناب صاحب العصر والزماں علَیہ الصّلوٰۃ وَالسّلام''

اور: ''غزل در نعت خاص جناب امیر علیہ السلام''

اس دیوان کی ترتیب اور اس کی غزلوں کی خوبیوں وغیرہ کا ذکر بعض معاصر شاعروں اور میر رشک کے شاگردوں نے اس طرح کیا ہے۔

الف۔ از حکیم میر محمد جعفر حامی تخلص

از کمال جبر دیوان سوم ترتیب داد دیداولی بعد ازیں از لکھنؤ ترک وطن

یعنی یہ دیوان حالات کے جبر میں مرتب ہوا تھا۔ اس سے فرصت پانے کے بعد رشک نے ترک وطن کو مناسب تر خیال کیا

ب۔ از سید محمد تقی عُرف جنگلی صاحب جبر تخلص

صحت الفاظ وحُسنِ بندش ومضمون نو جمع اس دیوان میں پائی گئیں یکجا صفات

ج۔ از منیر شکوہ آبادی

دونوں جہان تیسرے دیوان کے ہیں محو مداح خلق غائب وحاضر ہے آپ کی

یوں عرض کی منیر نے تاریخ عیسوی یہ بے مثال نظم جواہر ہے آپ کی

اس تیسرے دیوان کی ترتیب کے بعد اپنے آقا نواب امین الدولہ مہر کے ساتھ میر رشک کربلا کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کا پہلا قیام میراں کی سرائے میں ہوا۔ تاریخ کہی

تاریخِ معاینہ کہی رشک نے یہ <u>للہ الشکر دیکھی میراں کی سرائے</u>

1267ھ

اس کے بعد میر علی اوسط رشک کوئی 20 برس تک زندہ رہے۔ اس مدت میں انھوں نے بہت کچھ کہا ہوگا لیکن وہ کلام غالباً مرتب نہیں کیا گیا۔ کچھ متفرق شعر بعض مآخذ میں ضرور مل جاتے ہیں لیکن محض ان سے کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

میر رشک نے 1248ھ (1867) میں وفات پائی۔ متعدد شاعروں نے تاریخیں کہیں۔ دو یہ ہیں:

الف۔از نیاز احمد خاں ہوش بریلوی

شیخ سے حاصل ہے تلمذ جنھیں　　رشک کے ہمسر وہ بھلا کب ہوئے
فوت ہوئے رشک کہا ہوش نے　　حیف لو رشک شعرا اب موئے

1284ھ

ب۔از منیر شکوہ آبادی

آں سید فاضل و محقق ہمہ داں　　درزہد وورع وحید مردان خدا
گفتم بہ سنین عیسوی تاریخ وفات　　شاہنشہ ملکِ نظم بودہ حقا

1867

ان تاریخوں سے جو امور سامنے آتے ہیں مختصراً یہ ہیں:

میر رشک مذہب کے عالم اور احکام مذہب کے پابند تھے۔ اس صورت حال کے اثرات ان کے معمولات ہی نہیں، شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

انھیں زبان و بیان کے معاملات و مسائل سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اپنی شاعری کے بارے میں انھوں نے خود بھی کہا ہے کہ:

تحقیق لفظ کرتا ہے تنبیہہ رات دن　　سقم و غلط کے حرف مرے حرف گیر ہیں

اور:

اے رشک ایک آدھ غزل ہو تو میں کہوں　　مضمونِ تازہ ہے کئی دیوان بھر گئے

اور مولانا محمد حسین آزاد نے بھی اعتراف کیا ہے کہ:

''اصل واضع ان قوانین کے میر علی اوسط رشک تھے۔'' اور:

''دلّی کے بھی مستند لوگوں نے ان میں سے بعض بعض باتوں کی رعایت اختیار کی۔''39

میر رشک کے بارے میں آزاد کا یہ اعتراف بھی قابل توجہ ہے کہ:

''شاعری کی سرکار سے تاریخیں کہنے کا ٹھیکہ انھیں ملا تھا۔''

واقعہ یہ ہے کہ تاریخ گوئی کے فن کو بطور خاص ترقی دینے والے میر رشک اور ان کے بعض تلامذہ تھے۔

2- وزیر-   خواجہ محمد وزیر

وزیر تخلص، خواجہ محمد وزیر نام، خواجہ محمد فقیر کے بیٹے تھے۔ سلسلۂ نسب ان کا خواجہ بہاء الدین نقشبندی سے ملتا ہے۔ وزیر کے نانا مرزا سیف اللہ بیگ خاں امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کے حقیقی بھائی تھے۔ آزاد نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''خواجہ وزیر کہ آتش کے شاگرد تھے پھر ناسخ کے شاگرد ہوئے اور اسی پر فخر کرتے کرتے مر گئے۔ جیسے نازک خیال تھے ویسی ہی زبان پر قدرت رکھتے تھے۔ شیخ صاحب بھی ان کی بڑی خاطر کرتے اور اول درجہ کی شفقت مبذول فرماتے تھے۔''40

وزیر کے کلام سے ان کے عقیدے کا حال معلوم ہوتا ہے چنانچہ ان کا ایک قطعہ یہ ہے

نہ کر عوض مرے جُرم و گناہِ بیحد کا   الٰہی تجھ کو غفورُ الرحیم کہتے ہیں
کہیں کہیں نہ عدو دیکھ کر مجھے محتاج   یہ اس کے بندے ہیں جس کو کریم کہتے ہیں

استاد کے ساتھ ان کے جو معاملات تھے، ان کے متعلق آزاد نے کئی واقعات نقل کیے ہیں۔ ایک یہ ہے:

''ایک دن وزیر اپنے شاہِ سخن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مزاج پرسی فرما کر عنایت و محبت کی باتیں کرنے لگے اور کہا کہ آج کل کچھ فکر کیا؟ عرض کی کہ درود وظیفہ سے فرصت نہیں ہوئی۔ آپ نے پھر ارشاد فرمایا۔ انھوں نے مطلع پڑھا

وہ زلف لیتی ہے تاب و دل و توان اپنا   اندھیری رات میں لٹتا ہے کارواں اپنا

بہت خوش ہوئے۔ اس وقت ایک عمدہ تسبیح عقیق البحر کی ہاتھ میں تھی، وہ عنایت فرمائی۔ خواجہ وزیر پر بڑی عنایت تھی اور قدر و منزلت فرماتے تھے۔ سب شاگردوں میں ان کا نمبر اول تھا۔ پھر برق، رشک وغیرہ وغیرہ۔''41

وزیر نے اپنے ابتدائی کلام کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا جو برباد ہو گیا۔ پھر 1263ھ (1847) میں ان کے شاگردوں محسن، بیجُو وغیرہ نے ان کا دیوان مرتب کر کے اس کے کئی تاریخی نام مقرر کیے۔ ان میں ایک نام ''دفترِ فصاحت'' بھی تھا۔ وہ مجموعہ بھی ضائع ہو گیا۔

آخر عمر میں شعر و شاعری سے وزیر کی طبیعت ہٹ گئی تھی البتہ شاگردوں کے اصرار سے کہتے تھے کہ "جیسا جی چاہتا ہے" دیوان تیار ہو جائے مگر اجل نے فرصت نہ دی۔ ان کی وفات کے بعد بیخود وغیرہ نے جو کلام مل سکا اسے مرتب کر کے "دفتر فصاحت" ہی کے نام سے شائع کر دیا۔ بیخود نے تاریخ کہی

سال ترتیب یہ رو رو کے لکھا پھر میں نے     آج دیوان مرتب ہوا بعد استاد

1271ھ

وزیر نے 22 ویں تاریخ شب آدینہ ذیقعدہ کی 1270ھ (1854) میں وفات پائی۔
میاں بحر نے تاریخ کہی:

واے خواجہ وزیر عالی قدر

1270ھ

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

سر مرا کاٹ کے پچھتایئے گا     کس کی پھر جھوٹی قسم کھایئے گا
تھام لوں دل کو ذرا ہاتھوں سے     ابھی پہلو سے نہ اٹھ جایئے گا
گذرا فلک کے پار، گیا لامکاں تلک     او تیر آہ بے ادبی اب کہاں تلک
مر مر گئی بلبل جو کیا یاد چمن کو     غربت میں خدایاد دلائے نہ وطن کو
پتھر گداز ہونے سے بنتا ہے آئینہ     روشن ضمیر ہے تو، اگر دل گداز ہے

خواجہ وزیر سے نوحہ، سلام اور مرثیہ وغیرہ منسوب نہیں ہیں البتہ ان کے دیوان میں نعت شامل ہے۔ یہاں صرف دو شعر نقل کیے جاتے ہیں:

اللہ رے حُسنِ رخِ نیکوے محمدؐ     ہے چشمِ خداوند جہاں سوئے محمدؐ
بخشش میں وہ مصروف، یہ سرگرم شفاعت     اللہ سے ہے ملتی ہوئی خوئے محمدؐ

3- برق-     مرزا محمد رضا

واجد علی شاہ بادشاہ نے ایک موقع پر برق کا حال اس طرح تحریر کیا ہے:

"فتح الدولہ، بخشی الملک مرزا محمد رضا برق، استاد مرحوم راقم ابن مرزا کاظم علی صلح،

جنھوں نے تادم مرگ گھر سے قدم باہر نہیں نکالا۔ بخشی مذکور میرے والد کے عہد سلطنت میں تمام فوج کے بخشی رہے اور میرے عہد میں استاد عاشق رہے اور بعد انتزاع سلطنت ہمراہ آئے اور زندان قلعہ ولیم فورڈ کلکتہ میں بھی میرے ساتھ قید ہوئے اور اسی زندان میں جاں بحق ہوئے اور وقت دمِ واپسیں یہ بیت اور مطلع پڑھ کر روانۂ فردوس ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون مطلع

برق جو کرنا تھا آخر وہی کرکر اٹھے

جان دی آپ کے دروازے پہ مرکر اٹھے" 42

مرزا برق کا جو دیوان مطبوعہ راقم نے گورکھپور میں دیکھا تھا اس کے پہلے سادہ صفحہ پر یہ عبارت ہاتھ سے لکھی ہوئی تھی:

"فقیر حقیر ہیچ مدان واضعف العباد محمد رضا ابن مرزا کاظم علی خاں مرحوم ومغفور متخلص بہ برق اہل کمالات سخن آفریں سے عرض کرتا ہے کہ سن طفلی سے مجھ کو فن شعر وشاعری کا شوق تھا اور یہ انکسار یہ بات نہیں ہے حقیقۃً مجھ کو اس میں کچھ دخل بہم نہ پہنچا فقط بطور شوق کے جبکہ جی گھبرایا کچھ کچھ موزوں کرلیا۔ حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ نے از راہ پرورش وخانہ زاد پروری اس مجموعۂ پریشان کو چھپوادیا۔"

یہی عبارت اس مطبوعہ دیوانِ برق پر بھی لکھی تھی جو مرتب جواہر سخن کے پیش نظر رہا تھا۔ لکھنؤ میں مرزا برق کے مشاعروں کی دھوم تھی۔ 43مرزا رجب علی بیگ سرور نے بھی ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"ایک بندے کے شفیق جگت آشنا مرزا محمد رضا مجمع خوبی از پاتا فرق تخلص برق فی الحقیقت کلام بلاغت نظام ان کا صاعقۂ خرمن ہستی حاسد ہے۔ بھائی بند شاعروں کا بازار ان کے روبرو کاسد ہے۔ جوان خوشرو، بہادر، آشنائے بامزہ نکتہ، شب ماہ صحبت مشاعرہ بہ دولتخانۂ مرزا معین ہے۔ رئیس امیر صغیر وکبیر تشریف لاتے ہیں۔ اس مکان وسیع میں آدمیوں کی کثرت سے جگہ کی قلت ہوتی ہے۔ ہوا کشاکش سے بار پاتی ہے جب پنکھے کی سعی اٹھاتی ہے۔ سخن سنج بے رنج خوشگو نازک فہم باریک بیں نیک خو جمع

ہوتے ہیں۔ لوگ ان سے حظ اٹھاتے ہیں۔ تلامذۂ مرزائے ممدوح خدمت کو حاضر کورے کورے مدار بے دمبدم گلوریاں ورق لگی کھا بسا چونا سنگ مرمر کا متواتر تحمل از غزلخوانی افیوں کا چرچا جاری ہے۔ کوئی پیتا ہے کوئی کھاتا ہے۔ اگر چاہ کسی کو چائے کی ہوئی دودھ پیتے بچے تک کو شیر چائے موجود کردی۔ ہمیشہ صبح اس شام کے جلسے کی ہوجاتی ہے، طبیعت نہیں گھبراتی ہے، گھر جانے والوں کو صدائے مرغ سحر ندائے اللہ اکبر سناتی ہے۔ ہر چند سب لوگ یہاں کے قہر ہیں مگر یہ بزرگوار زینت شہر ہیں۔" 44

نجات حسین خاں عظیم آبادی ربیع الاول 1259ھ (1843) میں لکھنؤ میں برق سے ملاقات کے لیے گئے تھے۔ انھوں نے جو دیکھا اس طرح لکھا تھا:

"جوانے گندم رنگ، پست قامت بادست و پائے منحنی، سن شریف قریب پنجاہ سال، برمسند سفیدی بلا تکیہ نشستہ دگر دو پیش ایشاں شرفا و نجبا از سیاہ پیشہ قریب چہل و پنجاہ کس امیدوار چاکری۔۔۔ چوں دو سہ کساں از قریب مسند شاں برخاستند، راقم را قریب تر طلبیدہ۔۔۔ چوں درآں وقت ذکر انتظام لشکر بود سخنے از شعر و غزل بہ میاں نہ آمدہ۔۔۔ معلوم شد کہ بالفعل پانصد سوار از طرف حضرت سلطاں بہ ایشاں تعلق یافتہ است۔۔۔ مشق غزلگوئی بسیار رسانیدہ و مرثیہ نیز خوب می گویند۔۔" 45

مرزا برق کی مرثیہ گوئی کا ذکر کہیں دیکھنے میں نہیں آیا البتہ نادر نے مرزا دبیر کے ذکر میں لکھا ہے:

"دبیر مرزا سلامت علی مرثیہ گوے نامی، یہ وہ غزل ہے جو مرزا صاحب نے مشاعرۂ فتح الدولہ میں بہ عہد غازی الدین حیدر شاہ اودھ کے پڑھی تھی۔

اگر وہ غیرت شمشاد جائے سیر گلشن کو گلوے سرو میں پہنا دے قمری طوق گردن کو" 46

اس سے برق کی غزل سے دلچسپی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے مشاعرے میں معروف مرثیہ گو بھی آتا تھا تو غزل سناتا تھا۔ برق کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

دولت نہیں کام آتی جو تقدیر بری ہو قارون کو بھی اپنا خزانہ نہیں ملتا
درد جاتا رہا مرے سر کا کیا اثر ہے تمھاری ٹھوکر کا

اے صنم وصل کی تدبیروں سے کیا ہوتا ہے　　وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے
اٹھ گیا پردۂ دوئی تو کھلا　　خود پرستی خدا پرستی ہے
نام عالم میں رہے، بات خدایا رہ جائے　　پردۂ خاک میں چھپ جاؤں تو پروارہ جائے

4- بحر- شیخ امداد علی

خواجہ عبدالرؤوف عشرت نے میاں بحر کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان کا اختصار اس طرح ہے:

''بحر شیخ امداد علی نام ولد شیخ امام بخش لکھنؤ میں توپ دروازہ کے رہنے والے، شیخ ناسخ مرحوم کے شاگرد رشید، سیاہ فام، دبلے پتلے، میانہ قد تھے۔ تحقیق لغت اور صحت الفاظ ہندی میں مشہور، استاد لوگ ان کی زبان کی سند مانتے تھے۔ ہمیشہ محاورات کی تلاش رہتی تھی۔۔۔ چھوٹی شہزادی اشرف النسا بیگم افسر بہو صاحبہ دختر امجد علی شاہ کی سرکار سے کچھ قلیل وظیفہ پاتے تھے۔۔۔ ان کی ڈیوڑھی کے پھاٹک کی بغل میں ایک کمرہ میں افیون گھلا کرتی تھی۔ ایک کہنہ چٹائی بچھی رہتی تھی۔ دن بھر وہیں رہتے۔ شام کو گھر آ جاتے تھے۔۔۔ ڈاڑھی کا ہمیشہ صفایا رکھتے تھے۔ عیش باغ کے میلوں میں اکثر جاتے تھے۔۔۔ بہت تنگدست رہتے تھے۔ شاگردوں سے لینے میں انکار تھا مگر لوگ خدمت سے دریغ نہ کرتے تھے۔ آواز میں سخت رعشہ تھا۔ غزل خود نہیں پڑھتے تھے۔ کئی شاگرد ساتھ آتے تھے۔۔۔ نواب سید محمد خاں رند نے ان کی تمام غزلیں جمع کیں اور ردیفیں تمام کرا کے دیوان مکمل کیا جس کو بحر نے مطبع مصطفائی میں چھپوایا۔ 75 برس کی عمر میں لکھنؤ میں انتقال کیا اور کربلائے تال کٹورہ میں دفن ہوئے۔''47

سعادت خاں ناصر کے تذکرے سے ان کے بارے میں بعض دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ لکھا ہے:

''میاں بحر اور میاں کے لفظ کی شرح جرأت کے احوال میں ہم لکھ چکے ہیں، شاگرد شیخ امام بخش ناسخ نام ان کا شیخ امداد علی، بلند آوازگی میں نقارۂ فیلی، بیت کی کرسی سے ایوان

گردوں پست اور سلسلہ نظم کا زنجیر فیل مست۔ عروض دانی میں لاجواب، معنی یابی
میں نایاب، یہ تذکرہ زبان پر کہ شیخ صاحب کہتے تھے میرے شاگرد مجھ سے بہتر، خود
پسندی ان پر تمام اور ناپسند کلام خاص و عام۔"48
عجیب بات ہے کہ ناصر نے ایسے واقعے بھی نقل کیے ہیں جن سے کہ بحر کی عروض وغیرہ
سے واقفیت مشتبہ ہو جاتی ہے۔49

بہر نوع اس بارے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ بحر نہایت قادرالکلام اور پُرگو شاعر تھے۔ حکیم نجم الغنی خاں نے ان کے ذکر میں تحریر کیا ہے کہ:

"شیخ امداد علی بحر۔۔۔ یہ ہفت غزلہ لکھا ہے۔

سنگ درباں کے لیے کوچۂ جاناں چھوڑا — بحر تم رک گئے خاشاک سے، دریا ہو کر"50

بحر جیسے دو تین شاعر ہی تھے جن کی پُرگوئی کی بدولت یہ بات مشہور ہو گئی کہ لکھنؤ والے عموماً سہ غزلے اور چہار غزلے وغیرہ کہتے تھے۔ بحر کے کلام میں اخلاقی اور ناصحانہ مضامین بھی صَرف ہوئے ہیں۔ یہاں نمونہ کے طور پر ان کے چند شعر لکھے جاتے ہیں۔

اس چمن میں رنج کس کس سے نہیں پہنچا مجھے — شکوہ گلچیں کا کروں میں یا گلہ صیاد کا
کون دُنیا میں بٹاتا ہے کسی کا درد دکھ — کون سر پر بوجھ لیتا ہے کسی مزدور کا
روئے کوئی غریب تو ہنسنا نہ چاہیے — واقف نہیں کسی کی فغاں کے اثر سے آپ
زور وزر رکھتے ہیں جو لوگ یہ حال ان کا ہے — اگر اک بار تواضع ہے تو سو بار گھمنڈ
جب مجھے تم نے پکارا یہ دعا دی میں نے — رہے مکّے میں، مدینے میں تمھاری آواز
عشق میں تھی وفا شعاری شرط — مر مٹے ہم مگر نہ ہاری شرط

بحر کے کلام میں ٹھیٹھ ہندستانی لفظیات اور روایات کا صَرف بھی لائق توجہ حد تک ملتا ہے۔ مثلاً ایک دو شعر یہ ہیں۔

قدم میرے لے کر یہ کہتا ہے مجنوں — میں چیلا ہوں تیرا، تو میرا گرو ہے
ہُوا دھوپ میں بھی نہ کم حُسنِ یار — کھِلتا ہے وہ جو کہ سنولا گئے
جھولے پڑ جائیں اُڑیں تخت پری زادوں کے — رُت پھر آئے کہیں اے بار خدا ساون کی

میاں بحر نے رباعیاں بھی لکھی تھیں اور واسوخت بھی۔ ان کے ایک واسوخت کے دو بند نمونہ کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں۔

یا خدا عشق صنم کا کوئی بیمار نہ ہو
دم نکل جائے بلا سے، پر یہ آزار نہ ہو
شعلۂ حسن کبھی گرمیِ بازار نہ ہو
کھوٹے داموں کوئی یوسف کا خریدار نہ ہو
نہ رہے حسن پرستی کا نشہ آنکھوں میں
ماہرو داغ نظر آئیں سدا آنکھوں میں

آئی آفت جو کسی شے پہ طبیعت آئی
ہفت اقلیم میں مشہور ہوئے سودائی
آبرو کھوئی کسی جا کہیں ذلت پائی
پیار کرنا بھی زمانہ میں ہے کیا رسوائی
تابہ مقدور محبت نہ کرے، بہتر ہے
زہر کھا جائے کہیں ڈوب مرے بہتر ہے

5- آباد- مہدی حسن خاں

یہ بھی شیخ ناسخ کے نام برآوردہ شاگردوں میں سے تھے۔ سعادت خاں ناصر نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''صنعت تضمین میں استاد مہدی حسن خاں متخلص بہ آباد۔ قند بے شبہ ناسخ کو گچ میل مٹھائی بتاتا ہے اور واہ واہ کے مزے آپ اٹھاتا ہے۔ جن روزوں میں یہ تذکرہ تالیف ہوتا تھا اسماعیل گنج میں ایک دوکان حلوائی کے اوپر مجھ سے اور ان سے ملاقات ہوئی۔ پوچھنے لگے مجھے کیا لکھا ہے۔ میں نے کہا شاعر خوش فکر شاگرد شیخ ناسخ: بدمزا ہو کر کہا، اپنا ہی شاگرد لکھا ہوتا: مجھے اس کے کہنے سے تعجب ہوا۔ آخر استفسار کیا کہ سبب انکار کا ناسخ کی شاگردی سے بیان فرمایئے۔ بے تامل کہا کہ اب تو ان سے ہم اچھے ہیں اور اگر کچھ دخل و تصرف اپنے کلام میں ہے تو مرزا محسن صاحب کا ہے۔ افسوس کہ شیخ کا ہر شاگرد آپ کو اُس سے بہتر جانتا ہے۔ یہ فقط ناحق شناسی ہے۔ ع

شیخ ہوتا ہے کہاں پر شیخ چلی تو نہیں''51

کچھ مدت کے بعد محسن نے ان کے حالات اس طرح لکھے:

''شاعر نامی گرامی مہدی حسن خاں آباد ولد غلام جعفر خاں، عزیزوں میں تجمل حسین

خاں کے، باشندہ لکھنؤ۔ ہر بحر میں غزل کی ان کا ایک دیوان ہے، شاگرد رشید شیخ امام بخش ناسخ۔''52

آباد کے چند شعر یہ ہیں۔

دم فکر سخن گر وصفِ دنداں جلوہ افگن ہو عجب کیا ہے زمینِ شعر سب ہیرے کی معدن ہو

کہاں تھامئے اس کو بھلا سیلِ حوادث سے کبھی برباد اے آباد اپنا خانۂ تن ہو

سر میں بھری ہوئی ہے ازل سے ہوائے زلف صیاد دل کی قید کو ہے دام دوش پر

آباد کی غزلوں میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی ہے۔ اس زمانے میں شاعروں کا جو طرز عام تھا اسی کے مطابق مضامین نظم کرتے تھے۔

آباد کی شہرت کی بنیاد واسوخت پر ہے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''سال تولد ان کا 1228ھ (1813) ہے۔ ان کے تین واسوخت اور ہر بحر میں غزل کا ایک ایک دیوان ہے۔ بعض دیوان اور واسوخت نظر راقم سے گذرے ہیں۔''53

آباد کے واسوخت اس اعتبار سے لائق توجہ ہیں کہ ان میں عاشق ''ہرجائی'' نہیں ہے۔ محبوب کی بے اعتنائی بلکہ روگردانی کے باوجود عاشق کے یہاں استقلال کی صورت نمایاں ہے۔ اپنے ایک واسوخت کو انھوں نے اس طرح ختم کیا ہے۔ 54

کچھ نہیں اب بھی گیا، آن کے مل جائیں آپ بعد آباد کے ایسا نہ ہو پچھتائیں آپ

غیروں سے ملنے کی اے جان قسم کھائیں آپ اس کو آنکھوں سے بجالائیں جو فرمائیں آپ

آرزو ہے کہ تمھارا رخ زیبا دیکھیں

آنکھیں پھوٹیں جو کسی حور کا چہرا دیکھیں

اپنے ایک دوسرے واسوخت میں بھی آباد نے ''کسی اور'' کو تا زیست نہ دیکھنے کی بات کہی ہے۔ 55 یہ واسوخت 1268ھ (1852) سے پہلے کا ہے اور اس میں ڈھائی سو سے بھی زیادہ بند ہیں۔ پہلا بند یہ ہے۔

عشق وہ آئینہ ہے جس کی صفا طینت ہے — عشق ہر دیدۂ خود بیں کے لیے حسرت ہے
عشق سے خانہ خرابوں کے لیے زینت ہے — عشق کا روپ نرالا ہے نئی صورت ہے
عشق کا میل ہر اک دل کے لیے صیقل ہے
آخرِ کار صفائی ہے، غبار اول ہے

اکثر واسوخت لکھنے والوں نے عشق کی تعریف و توصیف سے اپنے واسوخت کی ابتدا کی ہے لیکن آباد نے اس سلسلے میں جو لکھا ہے اس کی بات ہی اور ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس واسوخت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''یہ واسوخت معاملہ بندی اور لطف زبان کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے۔''

اس کا آخری بند یہ ہے:

مثل آباد رہا پاس سخن کا تا زیست — آنکھ اٹھا کر نہ کسی اور کو دیکھا تا زیست
فرق ا: ت میں نہ لایا دلِ شیدا تا زیست — دولتِ حُسن کو دل کھول کے لوٹا تا زیست
حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

یہ واسوخت کتابی صورت میں پہلی بار 1268ھ میں چھپ گیا تھا اور اس کی وجہ سے آباد کو خوب شہرت ملی تھی۔

لکھنؤ کے شعرا میں سید آغا حسن امانت، سید محمد خاں رند، نواب مرزا شوق، نواب محمد حسن خاں شیدا وغیرہ نے بھی واسوخت لکھے تھے لیکن بحر اور آباد کے علاوہ امان علی سحر اور آفتاب الدولہ قلق وغیرہ شیخ ناسخ کے سلسلے کے شاعروں کو اس کے لیے جو شہرت حاصل ہوئی وہ دوسروں کو میسر نہیں آسکی۔

## دیگراں

شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے علاوہ دوسرے اساتذہ کے تلامذہ نے بھی اس زمانے میں لکھنؤ میں نام حاصل کیا تھا۔ انھوں نے بھی غزل کے علاوہ دوسری تقریباً سبھی مروّجہ شعری اصناف میں نہ صرف طبع آزمائی کی تھی بلکہ قابلِ قدر اور لائقِ تحسین کارنامے یادگار چھوڑے ہیں۔

### 6- اسیر- مظفر علی خاں

یہ واجد علی شاہ بادشاہ لکھنؤ کے مقرب تھے چنانچہ خود بادشاہ نے ان کے بارے میں تحریر کیا ہے:

''تدبیر الدولہ منشی مظفر علی خان بہادر جنگ اسیر- یہ شخص دس پندرہ برس کے سن میں راقم کا ہم پیالہ اور ہم نوالہ رہا اور صحبت مشاعرہ کوئی ایسی نہ ہوتی تھی جس میں اس کی اور میری ہمراہی نہ ہو بلکہ یہ خطاب فقیر ہی کا عنایت کیا ہوا ہے۔ دم محبت بھرتا تھا اور خود کو میرے عاشقوں میں گنتا تھا۔ اباً عن جدٍ اس کے نمک خوار میرے باپ دادا کے رہے۔ میری ولی عہدی میں عاشق اور میرے زمان سلطنت میں مصاحب اور داروغہ کل زنداں خانہ سرکار اودھ کا اور خلاصہ نویس تمام کچہریات سلطانی کا رہا اور یہاں تک میرے مزاج میں دخیل تھا کہ شبانہ روز حاضر خدمت رہتا تھا، پچیسٹھ برس کے سن میں عقد کیا۔ زوجہ سے نہایت مانوس رہا کرتا تھا۔ جب اوضاع فلکی مبدل ہوئے یعنی امر انتزاع سلطنت اودھ واقع ہوا میں مایوس جانب کلکتہ چلا۔ یہ از بسکہ زوجہ کا جتنا بہت تھا حق نمک مالک یک قلم فراموش کرکے گھر میں جا چھپا۔ کلکتے میں داخل نہ ہوا۔ بیس برس سے مجھ سے اس سے فراق ہے۔ طرفہ تر یہ کہ اب والی رامپور کو اپنا پادشاہ بنا کر یہ سید بنی فاطمہ ملکی ان کا نمک کھاتا ہے۔ فاعتبروا یا اُولی الابصار۔ یہ مطلع اس شخص نمک فراموش کا ہے۔ غزل

دل تنگ کرنے میں خیرہ ہوگیا جو صغیرہ تھا کبیرہ ہوگیا
کھا گیا بے فائدہ مجھ کو فلک اونٹ کے منہ میں زیرہ ہوگیا'' [56]

اسیر کے سب سے نامور شاگرد امیر مینائی ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے استاد کا احوال تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا اختصار یہ ہے:

''استادی جناب منشی مظفر علی صاحب، ابن سید مدد علی ابن سید محمد علی ابن سید مولوی محمد معین الدین ابن محمد صالح کروری، حضرت عباس علم بردار کی اولاد میں ہیں۔ مولد ان کا قصبہ امیٹھی ہے۔ صغر سن سے لکھنؤ آئے۔ اپنے ننھیال یعنی شیخ زادگان شہر لکھنؤ میں

کتخدا ہوئے۔ 8 برس عہد نصیر الدین حیدر میں محکمہ صدر امانت کے امین رہے۔ ساڑھے چار برس عہد امجد علی شاہ میں محکمہ عالی وزارت کے میر منشی رہے۔ چار برس عہد واجد علی شاہ میں سلطانی خاص کچہری ان کے پائنام رہی۔ نواب محمد سعید خاں کے قیام لکھنؤ کے زمانے میں صاحبزادگان کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔ نواب یوسف علی خاں کے زمانے میں گھر بیٹھے وظیفہ خوار رہے۔ فن شعر میں شیخ مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ ایک دیوان فارسی گلشن تعشق اور چھ دیوان اردو گلستان سخن، ریاض مصنف، دیوان منقبت، گلدستۂ امامت، دیوان اسیر، ایک دیوان قصائد اردو اور ایک دیوان جو فی الحال کہا ہے اور چند مثنویاں جن میں سے ایک معارج الفضائل معجزات ائمہ کے بیان میں ہے۔ ان کے علاوہ زر کامل عیار شرح معیار الاشعار اور رسالہ عروض وقوافی فارسی اور اردو دونوں میں اور رسالہ بیان اضافات اور رسالہ تشریح الحروف فارسی میں اور فوائد مظفریہ علم نحو میں عربی میں لکھا ہے۔ مدت تک مرثیہ اور سلام کہے جو غدر میں تلف ہوئے۔ عمر اب 75 برس ہے۔"57

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اسیر جامع الکمالات شخص تھے اور انھوں نے اردو کی تقریباً مروجہ شعری اصناف میں طبع آزمائی کی تھی۔ افسوس ہے کہ ان کے مرثیے وغیرہ اب دستیاب نہیں البتہ ان کی مثنویاں یہ ہیں:

الف۔ اسیر کی پہلی معلوم مثنوی وہ ہے جس میں بقول "امیر مینائی" نواب امین الدولہ وزیر لکھنؤ کے زخمی ہونے کا حال نظم ہوا ہے۔ اس مثنوی کا نام کچھ معلوم نہیں ہوتا ہے، البتہ اس کی تاریخ خود اسیر نے اس طرح کہی ہے۔

اسیر سالِ وقوع فسادکرد رقم رسیدہ بود بلائے ولے مآل بخیر

1263ھ

یہ واقعہ اپریل 1847 (ربیع الثانی) کا ہے اس لیے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مثنوی اس ماہ کے بعد کسی وقت لکھی گئی ہوگی۔

ب۔ دُرّۃ التاج، بقول امیر مینائی یہ ایک عاشقانہ مثنوی ہے اور "حسب فرمائش پادشاہ

موزوں کی ہے۔'' خود شاعر نے اس کا نام اس طرح نظم کیا ہے۔

یہ وصف جو ہے سخن کو معراج زیبندہ ہے نام درّۃ التاج 58

اور اس کی تاریخ اس نے اس طرح نظم کی ہے ؎

تاریخ بھی ہے اسی میں پیدا ہے خامشی اے اسیر زیبا

1268ھ

شروع کے چھ صفحوں میں ''در سبب تالیف کتاب گوید'' کے عنوان سے شاعر نے اپنی عاشق مزاجی کا بیان کیا ہے۔ اسی میں ہے۔

القصہ کیا یہ عہد واثق منظوم ہو داستانِ صادق

مطبوع جہاں جو داستان ہو خلوت میں انیسِ عاشقاں ہو

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی مثنوی کی طرح اس میں بھی حقیقی واقعات نظم کیے گئے ہیں البتہ بقول ڈاکٹر کوکب قدر ''یہ ایک مسلسل مربوط قصہ نہیں ہے بلکہ مختلف واقعات ہیں جن کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی گئی ہے۔'' ان قصوں میں عشق، عاشق، معشوق وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے اسی لیے شاعر نے اسے ''عشق نامہ'' بھی کہا ہے ؎

لکھتا ہوں یہاں سے عشق نامہ پھرتی ہے عنانِ اسپ خامہ

اس مثنوی سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کے لیے خود اسیر کے واقعات اور واجد علی شاہ بادشاہ کے معاملات سے کما حقہٗ واقفیت ضروری ہے۔

ج۔ معارج الفضایل۔ امیر مینائی نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''باقی مثنویاں دینیات میں ہیں جن میں سے ایک کا نام معارج الفضائل ہے اور اس میں معجزات ائمہ معصومین علیہم السلام کے موزوں کیے ہیں''۔

اس مثنوی کا نام تاریخی ہے جس سے اس کا سال تصنیف 1266ھ (1850) معلوم ہوتا ہے یہ 1313ھ (1895) میں چھپی تھی اور اس میں کوئی ایک ہزار شعر ہیں۔

د۔ ریاض المسلمین۔ اس مثنوی کا جو نسخہ رامپور کے کتب خانے میں ہے 322 ورق پر محیط ہے۔ نام اس کا بھی تاریخی ہے اس کا سال تصنیف 1272ھ (1850) ہے۔ اس میں کوئی نو ہزار

شعر ہیں اور یہ کتاب ''حق الیقین'' کا ترجمہ ہے۔ فارسی میں اس نام کی دو کتابیں معروف ہیں یعنی:

''حق الیقین فی معرفتِ ربّ العالمین از محمود شبستری (687ھ/1288 تا 720ھ/1320) در ہشت باب''59 اور

''حق الیقین از محمد باقر مجلسی در شعبان 1106ھ/1698 در اصول مذہب شیعی نگاشتہ است''60

غالب گمان ہے کہ اسیر نے ثانی الذکر کا ترجمہ کیا ہے۔

ہ۔ خلاصۃ التقویٰ۔ ڈاکٹر گیان چند نے اس مثنوی کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ:

''1273ھ میں تصنیف کی۔ 1286ھ میں شائع ہوئی۔ تینتیس سو سے زائد اشعار ہیں۔ 'خلاصۃ التقویٰ' میں 'ت' کے بجائے 'ۃ' شمار کرنے سے صحیح عدد نکلتے ہیں۔''61

تاریخ نکالنے کی یہ صورت غیر معمولی بھی ہے اور غور طلب بھی۔

ممکن ہے کہ اسیر نے ان کے علاوہ بھی کوئی مثنوی لکھی ہو جس کا حال معلوم نہ ہو سکا ہو۔ بصورت موجودہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اسیر کو محض خیالی قصے کہانیوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ انھوں نے واقعات، حقائق اور مسلمات کو اپنی مثنویوں میں نظم کیا ہے اور اس مقصد میں وہ کامیاب معلوم ہوتے ہیں۔

لکھنؤ میں شاہی کے قیام کے زمانے میں ہی مخمس اور مسدس وغیرہ کے لکھے جانے کا رواج ہو گیا تھا۔ شیخ ناسخ کے شاگردوں نے خمسوں وغیرہ سے بطور خاص دلچسپی لی تھی چنانچہ بعد کے زمانے میں خمسوں کے دیوان بھی مرتب کیے جانے لگے تھے۔ ان میں سے ایک عظیم اللہ رعنی کا تھا جس کا خلاصہ راقم نے ''انتخاب رعنی'' کے نام سے چھپوا دیا ہے۔ دوسرا دیوان کلب حسین خاں نادر کا تھا جس کی تلخیص پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے تذکرۂ نادر کے نام سے شائع کر دی ہے۔

مظفر علی خاں اسیر اپنے زمانے کی مروجہ کسی بھی صنفِ شاعری میں بند نہیں تھے انھوں نے بھی فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ''مخمسہائے مرغوب'' لکھے تھے۔ یہاں محض نمونہ کے طور پر ان کا ایک بند نقل کیا جاتا ہے۔

غل شہر میں ہے اہل سفر جا کے پھر آئے　　روضے پہ گئے احمدِ والا کے، پھر آئے
حج کر کے زیارت کا شرف پا کے پھر آئے　　مکّے کی، مدینے کی ہوا کھا کے پھر آئے
کیا کوکبِ تقدیر کو چمکا کے پھر آئے

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانے کے شاعروں خصوصاً ناسخ کے شاگردوں میں سے کوئی ایسا ہوگا جس کا دیوان مخمسات وغیرہ سے خالی ہو۔ اور تو اور بعض مرثیہ گو بھی خمسے وغیرہ کہنے کے لیے معروف تھے مثلاً سید حسین مرزا عشق کے بارے میں بھی سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے کہ وہ خمسہ اور مسدس خوب کہتے تھے۔ 62

# د - تاریخ گوئی

شیخ امام بخش ناسخ کے ذکر میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ "بات بات پر تاریخ کہتے تھے۔"[63] ناسخ کے شاگردوں نے بھی اس فن کو خوب ترقی دی۔ میر علی اوسط رشک نے بہ کثرت تاریخیں کہی تھیں اور ان کے کئی شاگردوں نے اس فن میں نام پیدا کیا۔ بعض نام برآوردہ شاعر یہ تھے:

"شائق میر محمد شاگرد شیخ ناسخ، ریختہ پر تاریخ گوئی اس کی فائق"[64]

"عشق شیخ الٰہی بخش۔ تاریخ گوئی میں دستگاہ نہایت رکھتے ہیں۔"

شوق میر علی ضامن۔ ہر غزل کے آخر میں تاریخ کہنا ایجاد کیا، آپ کو اس میں استاد کیا"[66]

ہلال امیر علی خاں۔ ایک دیوان کہ جس کا ہر مقطع تاریخ ہے اور ایک سراپا ان کا ہے"[67]

ان چند کے علاوہ نواب امین الدولہ مہر شاگرد رشک نے بھی اپنی اکثر غزلوں کے مقطعے تاریخی کہے ہیں۔

اس ماحول کا اثر یہ ہوا کہ بعض دوسرے استادوں کے شاگردوں نے بھی نہ صرف فن تاریخ گوئی میں مہارت حاصل کی بلکہ اس کے متعلقات میں امتیاز پیدا کیا۔ عبدالغفور خاں نساخ نے

شوق تخلص کے ایک شاعر کے بارے میں لکھا ہے:

''شوق تخلص جو ہر بیگ لکھنوی شاگرد مصحفی۔ فن نغز ومعتما میں اچھا دخل رکھتے تھے'' 68

## 1- اظہر- مولوی کرامت علی

دہلی میں شاہ نصیر اور ان کے بعض شاگردوں مثلاً مومن اور ذوق نے بھی بڑے ذوق وشوق سے تاریخیں کہی تھیں۔ اظہر بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے اور ناسخ اور رشک کے لکھنؤ میں رہ رہے تھے۔ انھوں نے بھی اس فن میں بڑی شہرت حاصل کی۔ محسن نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''مولوی کرامت علی مرحوم اظہر تاریخ گو ولد امانت علی باشندۂ شیخ پور توابع ضلع فرخ آباد، مقیم لکھنؤ، صاحب دیوان شاگرد شاہ نصیر'' 69

سعادت خاں ناصر کے ان کے ساتھ اچھے روابط تھے۔ اس نے ان کا حال اس طرح قلمبند کیا ہے:

''مرد نام آور، شاعر بہتر، تاریخ گوئی میں مشہور تر، سعید ازلی مولوی شیخ کرامت علی تخلص اظہر خلف الصدق مولوی امانت علی مرحوم ساکن موضع شیخپور توابع فرخ آباد وارد لکھنؤ، شاگرد رشید شاہ نصیر دہلوی، صاحب مروّت دوفا مدّت سی سال سے مؤلف کا آشنا شریک صحبت، یار غار خلوت، نظارہ باز حسن خداداد، تالیف قلوب میں استاد، عنفوان شباب میں عشق سادہ رویاں سے بیتاب رہتا تھا اور الفت امردان رشک حور سے ناصبور، یہ احقر محرم راز بلکہ دمساز تھا۔۔۔'' 70

اظہر نے ناصر کے تذکرے کے لیے چودہ شعر کا قطعہ تاریخ کہا تھا۔ اس میں اس نے ان سب شاعروں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اس تذکرے کے لیے تاریخیں لکھی تھیں۔ ناصر نے اس قطعہ کو اس عنوان سے درج کیا:

''فن تاریخ میں نامور، شیخ کرامت علی تخلص اظہر یہ فرماتے ہیں۔''

اظہر کی غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

رکھیں گے دور جہاں سے ہم آشیاں اپنا ۔۔۔ صبا کو بھی نہ ہو معلوم تا نشاں اپنا

طریق عشق میں جاری ہے سلسلہ دل کا ۔۔۔ نہ کیونکر اشک مسلسل ہو رہنما دل کا

ساقی ترے بغیر تو اس دور میں مدام — مانند آفتاب ہے پُر خوں ایاغ دل

مزا تبھی ہے کہ تنہا گھر اپنے یار آئے — کہ بدنما ہے اگر گل کے ساتھ خار آئے

اظہر نے کچھ زیادہ عمر نہیں پائی تھی، باوجود اس کے ان کی کہی ہوئی تاریخیں قدر کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ اُس زمانے میں مختلف مطبعوں میں جو کتابیں چھپتی تھیں، اکثر کے لیے اظہر سے تاریخ کہلوائی جاتی تھی۔

واجد علی شاہ کا ایک دیوان ان کے زمانۂ ولی عہدی میں چھپا تھا۔ اس کے لیے بھی تاریخ اظہر نے کہی تھی۔ اس قطعہ کا آخری شعر یہ ہے۔

اظہر بنوشت خوش بہ وقتِ طبعش — <u>گلدستۂ عاشقان کلام مطبوع</u>

1259ھ

ڈاکٹر کوکب قدر کا کہنا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد جب بادشاہ کو اس دیوان کا نام رکھنے کا خیال آیا تو اظہر کے اسی قطعہ تاریخ سے وہ لفظ منتخب کر لیے گئے جو ہر طرح اس مقصد کے لیے موزوں تھے یعنی ''گلدستۂ عاشقاں۔'' 72 اس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

الف۔ اظہر کی تاریخوں میں ایسے بامعنی الفاظ لائے جاتے تھے جن سے متعلق کتاب کے مطالب کا بھی کم وبیش اندازہ کیا جا سکتا تھا، اور

ب۔ غالبًا یہ بھی ایک وجہ تھی کہ بادشاہ اظہر کی کہی ہوئی تاریخوں کو قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔

میر علی اوسط رشک نے اپنے استاد شیخ ناسخ کا کلیات مرتب کر کے چھپوایا۔ اس کے لیے اظہر نے جو قطعہ تاریخ کہا اس کا آخری شعر یہ ہے۔

اظہر زبہر طبعش ایں مصرع رقم زد — <u>مطبوع اہل معنی بس ایں کلام ناسخ</u>

1258ھ

اسی طرح میر رشک کے دونوں دیوان نظم مبارک اور نظم گرامی پر اُن کے چھپ جانے کے بعد جب نظر ثانی کی گئی تو کئی صفحے دوبارہ چھپوا کر شامل کیے گئے۔ اس عمل کے بعد اظہر نے جو تاریخ کہی اس کا آخری شعر یہ ہے۔

اظہر بنوشت بعد طبعش تاریخ     مطبوع کلام رشک استاد جہاں

1263ھ

ایسے بامعنی اور برمحل مصرع کہنا اور اُن میں تعمیہ اور تخرجہ کی ضرورت کا بھی پیش نہ آنا بڑی بات تھی۔ یہی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے کہ اظہر کی تاریخوں کو پسند عام کی سند حاصل ہو گئی تھی۔

اظہر نے تعمیرات وغیرہ کی بھی نہایت برجستہ اور پسندیدہ تاریخیں کہی تھیں۔ امجد علی شاہ بادشاہ نے آہنی پُل بنوایا۔ اظہر نے اس کے لیے کہا ؎

بہر سال ابتدائش خامۂ اظہر نوشت     شد زجسر آہنی اعجاز داود آشکار

1261ھ

# ۵ - مرثیہ

مرثیے سے بنیادی طور پر حصول ثواب مقصود ہوتا تھا۔ شروع زمانے میں کوشش اس بات کی کی جاتی تھی کہ بحدِ امکان واقعات اور روایات کو صحت کے ساتھ نظم کیا جائے۔ میاں دلگیر کا دعویٰ تھا کہ ؎

دلگیر نے حدیث سے ہے مرثیہ کہا　　ہاں بین میں تو دخل طبیعت ہے جابجا
راوی کا نام آیا نہ اس میں کتاب کا　　خالی سند سے پر نہیں یہ نظم مطلقا
آگاہ راہ رد ہے ہر اک اس طریق کا　　اس جا پہ اتفاق ہوا ہر فریق کا

پھر شدہ شدہ ''بین'' نے اہمیت زیادہ حاصل کر لی۔ نتیجہ کے طور پر ''دخل طبیعت'' بھی زیادہ ہوتا گیا۔ مطالب ہی نہیں متن میں بھی تصرّف کو گوارا کیا جانے لگا۔ میر خلیق کا یہ مصرع مشہور ہے

ع　　لیلاف پڑھی اور اسے دودھ پلایا

''ضرورتِ شعری'' سے شاعر نے کلامِ پاک کے کلمہ تک میں تصرّف کو گوارا کر لیا تھا۔ اس صورت حال نے مرثیہ کی علمی ہی نہیں مذہبی حلقوں میں بھی وقعت کم کر دی۔ باوجودیکہ فصیح اور دلگیر خلیق اور ضمیر اور انیس اور دبیر نے اپنے اپنے طور پر اس صنفِ شاعری کو ترقی دینے کی بہت کوشش کی تھی، لکھنؤ میں یہ مقولہ زبانوں پر جاری تھا کہ:

''بگڑا شاعر مرثیہ گو''

اور صاحبانِ علم و بصیرت نے اس صنف کا ذکر اسی طور پر کیا تھا چنانچہ ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے بھی لکھا ہے کہ:

''سابق کے شعراخصوصاً مرثیہ گو ایک شعر میں دو طرح کے خطاب ایک مخاطب کے لیے موزوں کرتے تھے چنانچہ مرثیہ دبیر میں ہے۔

اکبر نے کہا صبر کرو اے شہِ عالم   ہم آپ کی آغوش میں مہماں ہیں کوئی دم
بندہ کو تو کچھ مرگِ جوانی کا نہیں غم   افسوس کہ حضرت ہوئے بے مونس و ہمدم

۔۔۔جب اس طرح کے مراثی اور سلام مشہور ہندوستان ہوئے تو اہلِ بنگالہ کو بھی حوصلہ مرثیہ گوئی کا پیدا ہوا اور بہت کچھ کہا۔ ایک مطلع ان میں سے یہ ہے۔ بیت

ہمرے امام صاحب چھوڑا بھگائی ساں   وہ بچو کافر پھکا بگائی ساں

قربان اُن خوش اعتقاد رونے والوں کے جو ایسے کلام سن کر روتے تھے۔''73

میر انیس اور مرزا دبیر کی زندگی میں بھی مرثیہ اور مرثیہ گویوں سے متعلق اس قسم کی تنقیدیں کی جارہی تھیں۔ اُن کے ذہن، فکر اور شعور پر ان کے جس قسم کے اثرات مرتب ہو رہے تھے ان کا اندازہ کر لینا کچھ بہت مشکل نہیں ہے۔

باوجودیکہ شاہانِ اودھ مذہباً شیعہ تھے اور وہ ہر طرح اپنے مذہب کی ترویج و توسیع کے خواہاں بھی تھے، ان میں سے کسی نے بھی مرثیہ گو کی حیثیت سے شاید کسی شاعر کی بھی براہ راست سرپرستی نہیں کی۔ بعض وزرا اور امرا البتہ اپنے وسائل کی حد تک اس صنفِ شاعری کی قدر کرتے رہے تھے چنانچہ معتمد الدولہ، ان کے بیٹوں اور مہاراجا جھاولال وغیرہ کی اس سلسلے میں خدمات کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ واجد علی شاہ بادشاہ کے حالات میں ڈاکٹر کوکب قدر نے یہ اعتراف کیا ہے کہ:

''انیس کو لکھنؤ سے وہی نسبت ہے جو غالب کو دلی سے۔ ان کا کسی خطاب یا جاگیر سے محروم رہنا واجد علی شاہ کی قدر شناسی پر بدنما داغ ہے۔ خود انیس بھی اسی قلق میں مبتلا رہے۔''74

خطاب یا جاگیر سے قطع نظر قابلِ توجہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت بادشاہ نے اپنی تصانیف میں بعض ادنیٰ ادنیٰ شاعروں کا بھی ذکر کر دیا ہے لیکن انھوں نے شاید کہیں میر ببر علی انیس کا نام بھی نہیں لیا ہے البتہ عوام نے ان کی جیسی قدر کی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ مولوی محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

''دونوں استادوں کے ساتھ طرفداروں کے دو جتھے ہو گئے۔ایک انیسیے کہلاتے تھے، ایک دبیریے۔۔۔بے حد تعریفوں نے دونوں استادوں کی فکروں کو شوقِ ایجاد اور مشق پرواز میں عرش سے بھی اونچا اچھال دیا۔۔۔لیکن یہ بات جتانے کے قابل ہے کہ اقلیم سخن میں جو دائرہ ان کے زیرِ قلم تھا، اُن کے جوشِ طبع میں اس کا بہت سا حصہ سخن آرائی اور رزم و بزم نے دبالیا۔مرثیت کا میدان بہت تنگ رہ گیا اور افسوس کہ اصل مدعا ان کا وہی تھا جسے آپ کھو بیٹھے۔''75

شاہی کے زمانے تک دونوں باکمال لکھنؤ میں عزت سے بسر کرتے رہے۔ پھر حالات بدلے اور ناچار دونوں گھر سے نکلے:

58 میں اول مرزا دبیر مرشد آباد بلائے گئے۔وہ گئے اور ہمیشہ الہ آباد اور بنارس میں جاتے رہے۔میر انیس 59 اور پھر 60 میں نواب قاسم علی خاں کی طلب اور اصرار سے عظیم آباد بھی جاتے رہے۔۔۔پھر حیدر آباد بھی گئے۔

انیس اور دبیر کم و بیش ایک ہی زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔ دونوں چند ماہ کے فرق کے ساتھ راہیِ مُلکِ بقا ہوئے۔مرثیہ گوان کے زمانے میں اور بھی کئی ہوئے لیکن ان کے سامنے کسی کا چراغ جل نہیں سکا۔

### 1- انیس- میر ببر علی

میر ببر علی نام، انیس تخلص، شاعری ان کے گھرانے میں کئی پشت سے چلی آتی تھی چنانچہ ان کے والد میر محمد مستحسن خلیق، دادا میر غلام حسن حسن اور پردادا میر غلام حسین ضاحک نے نام پیدا کیا تھا۔ یہ خاندان دہلی سے لکھنؤ آیا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

''کسی جلسہ میں (انیس) اپنا کلام سناتے تو بعض محاورہ پر اتنا کہہ اٹھتے تھے کہ یہ

میرے گھر کی زبان ہے۔ حضراتِ لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے۔ اس سے بھی یہ معلوم
ہوا کہ اب تک اپنے تئیں لکھنؤ کا باشندہ نہ کہنا چاہتے تھے۔" 77

بہر نوع اس میں شبہ نہیں کہ ان کے گھرانے کی زبان سارے لکھنؤ میں سند کا درجہ رکھتی تھی۔

یہ ذکر آ چکا ہے کہ میر انیس نے شروع زمانے میں غزلیں کہی تھیں، اور اس صنف میں بھی انھوں نے استادی کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ کئی نومشق ان سے اصلاح لیتے تھے چنانچہ بعض یہ ہیں:

"اسد الدولہ محمد ذکی خان بہادر تخلص ذکی۔۔۔ پہلے شاگرد میر ببر علی انیس کے تھے۔
بعد اس کے سرفراز علی قادر کے ہوئے۔" 78

"میر عابد علی عابد۔۔۔۔ امان علی سحر ان کو کہتے تھے کہ یہ میرے شاگرد ہیں اور میر انیس
مرثیہ گو فرماتے ہیں کہ مجھ سے اصلاح لی ہے۔" 79

"معز تخلص سید محمد علی ساکن کمن پور شاگرد انیس لکھنوی، عرصہ کئی مہینے کا ہوا کہ
شاہجہاں آباد میں راجا پٹیالہ کے ہمراہ وارد ہوا۔۔۔۔" 80

قریب بہ یقین ہے کہ ان چند کے علاوہ انیس کے اور بھی شاگرد رہے ہوں گے۔

نواب سید محمد خاں رند کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ میر خلیق اور ان کے بیٹے غازی الدین حیدر بادشاہ کے آخر زمانے میں لکھنؤ میں پہنچے تھے اور اس وقت تک وہ سب غزل کہتے تھے۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ میر انیس لکھنؤ میں مرثیہ گو کی حیثیت سے غازی الدین حیدر کے بالکل آخر وقت میں یا شاید نصیر الدین حیدر کے عہد میں متعارف ہوئے ہوں گے۔ کچھ ہی مدت میں انھوں نے ایسا کمال حاصل کر لیا تھا کہ باید و شاید۔ مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ انیس کے:

"ہر مرثیہ کا چہرہ نیا، آمد نئی، رزم جدا، بزم جدا اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا۔۔۔ صبح کا عالم دیکھو تو سبحان اللہ، رات کی رخصت، سیاہی کا پھٹنا، نور کا ظہور۔۔۔۔ غرض جس حالت کو لیا ہے اس کا سماں باندھ دیا ہے۔ آمد مضامین کی بھی انتہا نہ رہی۔ بند ڈیڑھ سو سے گذر کر دو سو سے بھی نکل گئے۔ میر صاحب مرحوم نے کم سے کم دس ہزار مرثیہ ضرور کہا ہوگا اور سلام کا تو شمار ہی کیا ہے۔ رباعیاں تو باتیں تھیں۔" 81

اگر انیس کی شاعری کی عمر ساٹھ برس مان لی جائے تو وہ دس ہزار مرثیے اس صورت میں لکھ سکتے تھے جب ڈیڑھ، دو سو بند کا ایک مرثیہ وہ پابندی کے ساتھ ہر دوسرے دن مکمل کر لیتے ہوں۔ رباعیاں، سلام (اور ابتدائی زمانے کی غزلیں) ان کے علاوہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ آزاد نے انیس کے کلام کی جو مقدار بتائی ہے اس میں بہت ہی زیادہ مبالغہ ہے۔

کہا جا چکا کہ انیس کو شروع میں غزل سے دلچسپی رہی ہے۔ ان کے مرثیوں میں بھی غزل کی کیفیت نمایاں ہے۔ غالباً یہ بھی ان کی مقبولیت کا ایک اہم سبب ہے۔

میر انیس بلا شبہ بڑے قادر الکلام تھے۔ انھوں نے چار بند ''بے نقط'' بھی لکھے تھے۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے وہ بند اس تمہید کے ساتھ لکھوا کر راقم کو عنایت کیے تھے:

> ''میر صاحب نے صرف ایک مرثیہ میں چار بند اس صنعت میں کہے ہیں۔ یہ چاروں بند نقل کروا کے آپ کو بھیج رہا ہوں۔''

بعد میں راقم کو ایک قلمی بیاض دستیاب ہوئی۔ اس میں وہی چار بند اس عنوان سے لکھے ہوئے ہیں:

''بند بے نقط میر انیس صاحب مرحوم''

یہ بند کمیاب ہیں اس لیے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

وہ طاہر واطہر ہو اگر معرکہ آرا — معلوم ہو حملہ اسد اللہ کا سارا
آگاہ ہو کس طرح کہو عمرو کو مارا — صمصام کا اک وار ہوا کس کو گوارا
واللہ گر اک دَم کو وہ صمصامِ علم ہو — ہر روح کو اس دَم ہوسِ مُلکِ عدم ہو
سردارِ اُمم محرم اسرارِ محمدؐ — مہرو اسد اللہ کا دلدار محمدؐ
دلدار و دلآرام و مددگار محمدؐ — ممدوح مَلک مالکِ کار محمدؐ
سَرور کہو اسلام کا اس مالکِ کُل کو — آرام دو اک دَم دلِ سردار رُسل کو
کس کا اسد اللہ سا ہو والد مرحوم — حلّال مہم مالک کل طاہر و معصوم
صدر دوسرا رحمدل و سرورِ مہموم — آسودہ ہو ہر سالک و گمراہ و محروم

معصوم کا دلدار ہو سالار اُمم ہو　　اولاد کا اس عالم و عادل کو اَلَم ہو
اس طرح کا والا ہم اس طرح کا سردار　　اس طرح کا عالم کا مِمِد اور مددگار
وہ مصدر الہام احد محرم اسرار　　وہ اصل اصول کرم داور دادار
حاصل اگر اک مَرد دل آگاہ کو مارا　　مارا اگر اس کو اسد اللہ کو مارا

یہ صرف چار بند ہیں۔ اس صنعت میں غالباً مرثیہ کو پورا نہیں کیا گیا۔ ان بندوں میں بھی ایک سے زائد ترکیبوں کو مکرر نظم کیا گیا ہے مثلاً محرم اسرار اور مالکِ کل وغیرہ۔

2- دبیر- مرزا سلامت علی

لالا سری رام نے دبیر کے حالات خاصی تفصیل سے لکھے ہیں۔ بعض ضروری باتیں یہ ہیں:

"دبیر مرزا سلامت علی ابن مرزا غلام حسین ابن مرزا غلام محمد ابن مرزا رفیع رفیع ابن ملا ہاشم شیرازی نثار برادر بزرگ ملا اہلی شیرازی۔ مرزا غلام حسین کے حقیقی نانا مرزا عنایت اللہ خاں ابن مرزا ابوظفر خاں ناظم صوبۂ کشمیر تھے۔ دبیر کی شادی سید انشا کی نواسی سے ہوئی تھی۔ دبیر دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آ گئے تھے۔ نو عمری میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ میر مظفر حسن ضمیر کے شاگرد ہو گئے۔ انھوں نے دبیر تخلص عطا کیا۔"82

غازی الدین حیدر بادشاہ اول کے زمانے میں غزل کے علاوہ مرثیہ کے لیے بھی دبیر نے شہرت حاصل کر لی تھی چنانچہ رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب میں ان کو "دبیر مرغوب" کہا ہے۔ خود بادشاہ نے طلب کر کے ان سے مرثیہ سنا تھا۔ اس کا پہلا بند یہ ہے۔

واجب ہے حمد و شکر جناب اِلٰہ میں　　فضلِ خدا سے آیا ہوں کس بارگاہ میں
مجھ سا گدا اور انجمنِ شاہ میں　　چرچا یہ لوگ کرتے ہیں اس وقت راہ میں
ذرّے پہ چشمِ مہر ہے مہرِ منیر کو
حضرت نے آج یاد کیا ہے دبیر کو

رامپور کے کتب خانے میں "مراثیِ دبیر" کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے جو آٹھ ورق پر محیط ہے اور جس کی کتابت مرزا علی خاں کاتب نے 1242ھ (27-1826) میں کی تھی۔ ان شواہد سے

بخوبی ظاہر ہے کہ اس زمانے تک مرثیہ گو کی حیثیت سے دبیر ممتاز اور مقبول ہو چکے تھے۔ نئی عمر اور مقبولیت کا یہ عالم تھا، کسی بات پر دبیر کی استاد سے ناچاقی ہوگئی۔ تعجب ہے کہ انیس کے حال میں آزاد نے یہ لکھ دیا ہے:

''میر انیس کو باپ کی جگہ منبر پر ترقی دی۔ ادھر سے مرزا دبیر ان کے مقابلے کے لیے نکلے'' 83

دبیر تو پہلے سے ''مرغوب'' تھے۔ انیس مرثیہ گوئی کی بساط کے نو وارد تھے۔ دبیر کو ان کے مقابلے کے لیے نکلنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ انیس نے اپنے والد کی تحریک پر مرثیہ گوئی شروع کی تھی اور بقول لالا سری رام:

''لکھنؤ میں آتے ہی ان کے فروغ کا بڑا باعث یہ ہوا کہ اکثر شرفا نواب زادے جو ان کے والد (خلیق) کے شاگرد تھے ان کے طرفدار تھے۔'' 84

یہی لوگ ''انیسیے'' کہلائے۔ دبیر کے خلاف رسوا کن لطیفے اور چٹکلے مشہور کیے گئے۔ سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

''میاں دبیر مرثیہ گو نے از روئے مزاح کہا میر (ذاکر) صاحب آپ کے تخلص میں جو یہ حرف الف ہے وہ حرف علت ہے۔ اگر دور ہو جائے تب تو جوڑ اس کا اور اس کا خوب ہو۔ مگر یہ نقل میر انیس صاحب کے شاگردوں کی بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہے ورنہ مرزا صاحب کی تہذیب اور شائستگی سے یہ بات بہت بعید دکھائی دیتی ہے۔ واللہ اعلم۔'' 85

مرزا دبیر کے حالات میں سری رام نے ایک قابل توجہ واقعہ یہ بھی نقل کیا ہے کہ:

''1291ھ میں مرزا دبیر نابینا ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں ایک جرمن ماہر آنکھیں بنانے والا ڈاکٹر ان (واجد علی شاہ) کا ملازم ہوا۔ مرزا صاحب کلکتہ گئے اور عرضداشت متضمن اطلاع بادشاہ کو بھیجی۔ اس کی پیشانی پر بادشاہ نے یہ شعر لکھا۔

گر بر سر و چشم من بیائی      بر قلب نہم کہ کیمیائی

(دبیر) نے آنکھیں بنوائیں۔ 25 ذی الحجہ 1291ھ کو سلطان خانہ مبارک اور

سبطین آباد کے امام باڑہ میں مرزا دبیر سے ملاقات ہوئی اور سلطان عالم نے مرزا دبیر کی تعریف میں اپنے مرثیہ میں فرمایا۔

بچپن سے ان کے دامِ سخن میں اسیر ہوں میں کسنی سے عاشقِ نظمِ دبیر ہوں

3۔محرم 1292ھ کو دبیر نے لکھنؤ میں انتقال کیا۔"

آزاد نے دبیر کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کم سے کم تین ہزار مرثیہ لکھا ہوگا۔ سلاموں اور نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔ ایک مرثیہ بے نقط لکھا جس کا مطلع ہے۔

ہم طالع ہما دمراہم رسا ہوا

اس میں اپنا تخلص بجائے دبیر کے عطارد لکھا ہے اور کچھ شک نہیں کہ ان کے ساتھ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہوگیا۔"86

# و - ہزلیات

نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں انشا اور مصحفی کے معرکوں نے لکھنؤ میں ہزلیہ اور مزاحیہ شاعری کے لیے فضا کو ہموار کر دیا تھا۔ اس قسم کی شاعری کے لیے بتدریج ماحول بہتر ہوتا گیا اور بعض شاعر اسی کے لیے معروف ہو گئے۔

## 1- ذاکر- میر جان

''سحر بیان سید میر جان عالی خاندان، خوش شاعر، تخلص ذاکر خلف الصدق اور شاگرد میر فخر الدین ماہر طاب سراہ، صحبت دیدۂ ہنر وراں، روشناس مردم جہاں، مقامِ رمز و کنایا میں زبانِ میر صاحب تیر بر جستہ، دلِ حاسد اس سے شکستہ اور خستہ۔ یہ قیل و قال اس پر دال کہ مرزا صاحب محمد رضا برق کے مشاعرے میں کسی شعر میں سید نا کے 'شغل بازی شب' بندھا ہوا تھا۔ مرزا حیدر صاحب فیض آبادی نے فرمایا کہ میر صاحب شغل بازی شب کو اصطلاح میں اور کچھ کہتے ہیں۔ میر صاحب نے کہا

فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست 87

سعادت خاں ناصر نے اس تعارف کے ساتھ ذاکر کے کئی شعر نقل کیے ہیں۔ کچھ یہ ہیں۔

کھال تاشے پر نہ ہو، جھلّی سہی　　　نوچ ڈالے گی بچا بلّی سہی
رکھ دیا ہو ان کے جب ایمان پر　　　بچ اگر بلّی کہیں بلّی سہی
عشق میں اس کے ہُوا کیا کیا نہ کچھ　　　آگے تو پتھری تھی اب تلّی سہی
کھیلنا منظور ہے تو آیئے　　　میرا ڈنڈا آپ کی گلّی سہی

ان شعروں کے بارے میں ناصر کا کہنا ہے کہ "ان کے خوف سے لکھے گئے۔ بندہ معذور ہے" اور محسن نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ:

"تمام دیوان ان کا اسی رنگ پر ہے" 88

2- اسرار- مرزا بندو

یہ میر جان ذاکر سے آگے تھے۔ سعادت خاں ناصر نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"بے عزتی خلق خدا اسے گوارا، مرزا بند و تخلص اسرار، شاگرد صاحب قران" 89

ان کے زیادہ شعر فحش ہوتے تھے چنانچہ محسن نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"مرزا بند و اسرار، فحش گو ولد مرزا مغل باشندۂ لکھنؤ، صاحب دیوان، ان کا کلام پسند خاص و عام ہے، مذاق کے پیرایہ میں دلچسپ، شاگرد صاحب قرآن" 90

اب بقول ناصر "یہ شعر اس کے کہ آلودگی فحش سے پاک ہیں لکھے جاتے ہیں۔"

امید ضبط تھی دلِ خانہ خراب سے　　　عاشق سمجھ گیا وہ مجھے اضطراب سے
غیروں کو خوش کرے، وہ ہمارا جلائے دل　　　بگڑوا ہوا اب کسی سے جو اپنا لگائے دل
بعد از فنا یہ کھودیو میرے مزار پر　　　ان کسبیوں سے کوئی نہ اپنا لگائے دل

3- چرکین- شیخ باقر علی

سعادت خاں ناصر نے ان کے حالات اس طرح قلمبند کیے ہیں:

"طرز جدید میں مشہور اور نامور شیخ باقر علی تخلص چرکین قصبہ رودولی کا رئیس و مہتر، بندش مضمون پوچ و پادر ہوا سے بہتر، آخر آخر وہ آلودگی سے پاک ہو کر قاصد کربلائے معلّیٰ ہوا۔ شدت اشتیاق زیارت سے روح نے جسد کو رستے میں چھوڑا اور آپ

ثواب عتبات عالیات حاصل کیا۔ یہ اشعار اس پروردۂ خوانِ نعمتِ نواب عاشورہ علی خاں سے یادگار۔''91

محسن نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ:

''تمام دیوان ایسے مضمون کا ان سے یادگار ہے۔''92

ہگ دے اگرچہ وہ بت بے پیر ہاتھ میں — لے گو کا بوسہ عاشق دلگیر ہاتھ میں
رستم کا خوف سے وہیں پیشاب ہو خطا — عریاں جو دیکھے یار کی شمشیر ہاتھ میں
تھا گرفتاری میں خطرہ جو مجھے بیداد کا — کر دیا بیت الخلا ہگ ہگ کے گھر صیاد کا
روتے انسان کو ہنساتا ہے — گو میں یہ کمال ہے صاحب

بڑی اطمینان بخش حقیقت یہ ہے کہ ابرارالحق شاطر گورکھپوری نے 2007 میں سید مقصود عالم رضوی بہانوی کے ''اختتامیہ'' مطبوعہ 1273ھ کے ساتھ دیوانِ چرکین کو مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ اس میں انھوں نے فرہنگ بھی شامل کی ہے۔

# ز - ریختی

لکھنؤ کے اس ماحول میں انشا اور رنگین جیسے خوش طبیعت استاد بھی ہو گذرے تھے۔ ان کے فیض سے ریختی کو جو فروغ حاصل ہوا تھا اس کے بیان کی احتیاج نہیں۔ بعد کے زمانے میں اس صنفِ شاعری کے لیے حالات مزید سازگار ہو گئے چنانچہ بعض شاعر ایسے بھی ہوئے جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح اسی کے لیے وقف کر دیا تھا۔

1 - جان- میر یار علی

سعادت خاں ناصر نے ان سے متعلق جو کچھ لکھا ہے یہ ہے:

''بہترین ریختی گویان، میر یار علی تخلص جان شاگرد نواب عاشور علی خان'' 93

نواب عاشور علی خاں نواب شجاع الدولہ بہادر کے پوتے اور بقول ناصر ''صاحب فضل وعلم'' بڑے باصلاحیت شخص تھے لیکن شاعری کو شعار نہیں بنایا تھا۔ ان کے شاگرد کئی تھے لیکن قابلِ توجہ حقیقت یہ ہے کہ جرٔکین اور جان صاحب بھی انھیں کے تلامذہ میں تھے۔ اس سے خود عاشور علی خاں کی صلاحیتوں کے تنوع کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔'' 94

محسن نے جان صاحب کے بارے میں مفید معلومات قلمبند کی ہیں:

''فخر ریختی گویان میر یار علی جان صاحب خلف میر امن صاحب باشندۂ لکھنؤ۔ ان کا

طرز بیان مذاق کے پیرایہ میں دلچسپ ہے۔ صاحب دیوان، شاگرد نواب عاشور علی خان بہادر"95

مرزا قادر بخش صابر نے جان صاحب کے کلام سے متعلق رائے اس طرح دی ہے:

"اگر انصاف کیا جاوے تو اس نے بہ نسبت انشاء اللہ خاں اور رنگین کے ریختی کو آب و تاب خوب دی اور زبان کو شستگی اور بخشی، دیوان ریختی اس کا مشہور اور اکثر اشعار اس کے نوجوانوں کی زبان پر مذکور ہیں۔"96

لالہ سری رام نے اسی بات کو کسی قدر صراحت سے لکھا ہے:

"رنگین اور انشا نے جو کچھ کہا تفنن طبع کے لیے کہا۔ جان صاحب نے تمام عمر اسی خاص صنف میں بسر کر دی اور اپنی خاص روش میں استادی کا رنگ پیدا کیا۔ جتنا اچھا کہتے اتنا ہی اچھا پڑھتے بھی تھے۔ مستورات کے رسم و رواج، خیالات اور جذبات سے خوب واقف تھے اور اکثر ایسے ہی مضامین نظم کرتے تھے۔ عورتوں کے روز مرہ اور محاورات میں حیرت انگیز دسترس حاصل تھی۔۔۔ عرصہ ہوا دو دیوان چھپے تھے۔"97

جان صاحب نے ریختی یعنی مستورات کی بول چال میں اپنے زمانے کی مروجہ بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی تھی یہاں اختصار کے ساتھ ان کے ایک ایک دو دو نمونے درج کیے جاتے ہیں۔

واسوختی۔ دو بند

عشق کے نام سے میں تو کبھی آگاہ نہ تھی کچھ خبر میرے فرشتوں کو بھی واللہ نہ تھی
دائی بندی کی تو گھنئی میں پڑی چاہ نہ تھی نیک بختوں میں رہا کرتی تھی بدراہ نہ تھی
پاؤں پھیلا کے سدا شام سے میں سوتی تھی
مجھ کو معلوم نہ تھا صبح کدھر ہوتی تھی

جھوٹ کہتی نہیں، سچی یہ قسم کھاتی ہوں آگ میں غم کی ارے لوگو جلی جاتی ہوں
کس مصیبت میں پھنسی او ہی میں گھبراتی ہوں کیا کہوں کھول کے اس حال کو شرماتی ہوں
چین اک دم نہیں آتا ہے خدا خیر کرے
دل کا کچھ اور ہی نقشا ہے خدا خیر کرے

مخمس۔ایک بند

کھیلیں بتاسے اور کھلونے منگایئے تیوہار کا ہے دن، نہ اجی راگ لایئے
جم جم سے خیر بچوں کی صاحب منایئے دیوالی بھریئے سیدھی طرح گھر میں آیئے
بس ٹیڑھے ہو کے دل کو نہ میرے جلایئے

قطعہ تاریخ طبع دیوان چرکین (کل دو شعر) ع

سنا بی جان باجی کل چھپا چرکین کا نسخہ

1273ھ

اور ان کی غزلوں کے کچھ متفرق شعر یہ ہیں ؎

شاعری میں بوا ہزار ہیں عیب ایک دو کیسے بے شمار ہیں عیب
جان ہے فاقوں سے سولی پر کہے جاتے ہو شعر جان صاحب اس زمانے کے ہیں بس منصور آپ
دو چار نہیں سُن چکی وس طور کی باتیں باندھی ہیں غزل میں اجی دستور کی باتیں
خوب ہی شاد کیا او مُوے ناشاد مجھے لینی اللہ سے اس بات کی ہے داد مجھے
جان صاحب برا دل شاد نہ کیونکر ہووے ہے ولی عہد بہادر نے کیا یاد مجھے
روز پھر آتی ہے لونڈی مری جا کر خالی بھاڑ میں جائے کرایہ، وہ کریں گھر خالی
ریختی پڑھ کر بڑھاپے میں مٹکتا ہے بوا جان صاحب کی اجی دیکھو حماقت نہ گئی

واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں جان صاحب پریشان رہے۔ایک بار وہ گھر سے نکل کر دتی اور بھوپال وغیرہ مقامات تک بھی گئے مگر ناکام واپس آئے۔آخر میں نواب کلب علی خاں کی خدمت میں رامپور بھی گئے۔پھر وہیں سے عالم باقی کو سدھارے۔ان کی ایک غزل کے یہ شعر قابل توجہ ہیں ؎

دل نہ بھاری کرو، کیا کرتے ہیں والی وارث بیکسوں کا تو مری جان خدا ناصر ہے
جس کا جی چاہے وہ بہتان کرے باندی پر میرے اللہ تو حاضر ہے اجی ناظر ہے
شکر ہر حال میں اللہ کا لازم ہے بوا وہ ہے شیطان کہ جو اس کا نہیں شاکر ہے
اعتراضوں سے اری او ہی تجھے کیا مطلب جان صاحب ہو نجے تو بھی کوئی شاعر ہے

## 2- نسبت- احمد علی

یہ جان صاحب کے کوئی ہم عصر شاعر تھے۔ جان صاحب نے اپنے شعروں میں ان کا احترام کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

وہ تھے استاد، تجھ کو جان صاحب ان سے کیا نسبت　　کیا پر نام روشن ریختی نے تیری نسبت کا

برابر گر نہیں نسبت کے دو ماہیہ ہمارا　　غنیمت ہے نمک کی کنکری کا تو سہارا ہے

محسن کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ نسبت 1269ھ (1853) سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ وہاں لکھا ہے:

''احمد علی مرحوم نسبت تخلص ریختی گو باشندہ لکھنو صاحب دیوان'' 98

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

جب سے اُس پر بری پڑی ہے آنکھ　　تب سے اَنّا یہ دکھ رہی ہے آنکھ

اے دو گانا وہ اگلی آنکھ نہیں　　مجھ سے تیری یہ پھر گئی ہے آنکھ

بل ہر اک شخص سے جو کرتی ہے　　کسی بانکے سے کیا لڑی ہے آنکھ

افسوس ہے کہ کسی قدیم تر تذکرے میں نسبت کا مذکور نہیں ہے۔

## 3- مخلوق- سید احسان حسن

یہ شیخ مصحفی سے بھی فنِ شعر میں مشورہ کرتے رہے تھے چنانچہ انھوں نے لکھا ہے:

''سید احسان حسن مخلوق تخلص خلف میر حسن مرحوم، جوانِ شایستہ و باصلاحیت است۔ چوں بحکم موزونی طبع کہ ارث خاندان اوست، از ایام ابتدائے شباب چیزے فکر کردہ، کلامِ خود را بہ برادر کلانِ خود نمودہ و مع ہذا فکرِ مرثیہ و سلام ہم کردہ می کند۔ از چند سال کہ از فیض آباد بہ لکھنؤ رسیدہ رجوع مشورہ گاہ گاہے بہ فقیر ہم آوردہ تا امروز عمرش سی سالہ خواہد بود و ماورائے شعر و شاعری در فنِ افسانہ گوئی ہم رونق تمام پیدا کردہ۔'' 99

مرثیہ اور سلام سے ان کی دلچسپی ان کے بڑے بھائی میر خلیق کے سبب سے رہی ہوگی اور افسانہ گوئی سے رغبت شاید ان کے والد کی مثنوی سحر البیان کا فیض ہوگا۔ سعادت خاں ناصر کے

تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوق ریختی بھی کہنے لگے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ نسبت وغیرہ ریختی گویوں کی صحبت کا اثر ہو:

''شاعر شیریں بیاں سید احسان علی تخلص مخلوق، پسر میر حسن مرحوم، ریختی گوئی اور کہانی کے کہنے میں مشہور اور معروف و اصلاح سخن کی برادر بزرگ پر موقوف۔''100

مخلوق کا صحیح نام وہی ہوگا جو مصحفی نے لکھا ہے۔ ناصر نے ان کی مرثیہ گوئی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ممکن ہے کہ خلیق اور انیس کے فروغ کا خیال کر کے انھوں نے دوسری راہ اختیار کر لی ہو۔ بہرنوع ناصر کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل بھی کہتے رہے تھے۔ ان کے دو شعر یہ ہیں ؎

اس کے آنے تلک سنبھل جاوے — پھر بلا سے جو دم نکل جاوے
پاویں جو نہ مطلق ترے کوچے میں گذر ہم — پھر تو ہی بتا یہ کہ بھلا جائیں کدھر ہم

مخلوق کی ریختی کا نمونہ یہ ہے ؎

کہہ زناخی مجھے ملال ہوا — کیا ترے دشمنوں کا حال ہوا
مُردوں کو ترس رنڈیوں پر کیوں نہیں ہوتا — میں مَر گئی کم بخت کٹر کیوں نہیں ہوتا
مزاج گل سے بھی نازک ترا دوگانہ ہوا — جو پھول انگیا میں رکھا تو درد شانہ ہوا

مخلوق نے ریختی میں سلام وغیرہ بھی کہے تھے چنانچہ ایک سلام کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں ؎

''سلام در زبانِ ریختی میاں مخلوق صاحب''

مجرئی ہوتی جو میں حضرت شبیر کے ساتھ — دیکھتے کرتی جو میں فرقۂ بے پیر کے ساتھ
پہلے تو حرملہ کی ناک میں مَیں دیتی تیر — ناک چھدواتی موے کی میں اسی تیر کے ساتھ

اوپر جو تفصیلات درج ہوئیں ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری کے لیے خصوصاً لکھنو میں، یہ اختصاص کا دور تھا۔ بیشتر شاعر کسی ایک صنف کے لیے معروف تھے مثلاً مرثیہ کے لیے انیس و دبیر، ریختی کے لیے جان صاحب، واسوخت کے لیے آباد، مثنوی کے واسطے نسیم، شوق وغیرہ۔ اس صورت حال کا فائدہ یہ ہوا کہ اکثر شعری اصناف کے نہایت معیاری نمونے وجود میں آ گئے۔

## ح - رَہس

ڈاکٹر کوکب قدر نے واجد علی شاہ کے حالات میں لکھا ہے کہ:

'' واجد علی شاہ ممکن ہے ڈراما، اسٹیج اور تھیٹر جیسی اصطلاحوں سے واقف ہوں۔ 1837 سے 1847 یعنی 15 سے 25 برس کے سن تک وہ کئی دفعہ کانپور گئے تھے جہاں انگریزوں کی تھیٹر کمپنیاں 1837 سے بھی پہلے قائم ہو چکی تھیں اور خوبی سے اپنا کام کر رہی تھیں۔'' 101

واجد علی شاہ کے علاوہ لکھنؤ کے خوش طبیعتوں کا بھی کانپور میں آنا جانا رہتا تھا اور وہاں کے تھیٹروں سے ان کا متاثر ہونا بھی خلاف قیاس نہیں ہے۔ جو بھی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ لکھنؤ میں تھیٹر یا ڈراما کے مقابلے میں لفظ ''رہس'' کسی قدر پہلے رواج پا چکا تھا اور اس سلسلے میں واجد علی شاہ کے علاوہ میاں امانت کے نام اور کام کو بھی اہمیت حاصل رہی ہے۔

### 1 - امانت- سید آغا حسن

میاں امانت بڑے باصلاحیت اور حوصلہ مند شخص تھے۔ سعادت خاں ناصر نے خاصی تفصیل سے ان کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ ان کا اختصار یہ ہے:

'' صاحب دیانت و صیانت سید آغا حسن تخلص امانت ابن میر آقا علی عرف میر آغا،

برادر زادۂ میر طالب علی اچھوتی والے مشہور۔ اوائل میں میاں امانت نے برائے چندے میاں دلگیر صاحب سے اصلاح لی تھی۔ پھر خود استاد بن بیٹھے۔ صاحب دیوان وخمسہ ومسدس وواسوخت وغزل اور مرثیہ وسلام بھی اپنی دانست میں خوب کہے اور آپ کے کلام میں جگت وضلع خوب ہوتا ہے۔ انتہا یہ کہ مرثیے بھی آپ کے جگت سے خالی نہیں تھے۔ ایک مصرع یہ ہے ع

شامی کباب ہو کے پسند قضا ہوئے

میاں امانت نے ہر چند چاہا کہ میرے آگے رنگ میر انیس صاحب کا اور مرزا دبیر صاحب کا دب جاوے۔ میاں امانت کی زبان میں لکنت بھی تھی لہٰذا مرثیہ ان کا ان کے شاگرد پڑھا کرتے ہیں اور ان کے شاگردوں کے تخلص میں آخر میں 'ت' ہوتی ہے مثل جنت، عبادت وغیرہ کے۔ میاں امانت نے ایک رہس کی طرح مثنوی اندر سبھا تصنیف کی تھی۔ اس میں تخلص استاد اپنا قرار دیا تھا اور اس مثنوی میں غزلیں، ہولی، ٹھمری اور چھند زبان بھاکا میں کہتے تھے..... پنڈت کشمیری اور بہاری کہار اور میر حافظ نے چند طفلانِ حسین چنے اور اَمردانِ ماہ جبیں، خوبصورت جمع کر کے اور مثنوی یاد کرا کے اور تعلیم راگ اور ناچ کی دلوا کے ایک رہس کھڑا کیا تھا اور وہ 15 روپے روزینہ پر مجرے بھی جاتے تھے خلائق نے یہ جلسہ جدید دیکھ کر بہت پسند کیا.....دیکھا میں نے کہ ہزار ہا لوگ ان اَمردانِ حسین پر مفتون وشیفتہ ہیں.....میاں امانت مسند پر بیٹھے ہیں اور ایک لونڈا حسین سہ پا آگے گاتا ہے۔ غرضیکہ یہ اندر سبھا خوب چمکی۔''102

اس اقتباس سے جو امور سامنے آتے ہیں یہ ہیں کہ:

الف۔ لفظ رہس اس زمانے میں لکھنؤ میں مروّج تھا۔ بظاہر اس کا تعلق ہندستانی روایات کے مطابق ناٹک سے رہا ہوگا۔

ب۔ رہس کے لیے ہندستانی شعری اصناف کی تعلیم بھی ضروری تھی،

ج۔ راگ (موسیقی) اور ناچ (رقص) وغیرہ کے لیے مسند وغیرہ کے ساتھ اسٹیج کی تیاری کی بھی اہمیت تھی۔

محمد عمر و نور الٰہی نے امانت کی اِندر سبھا کا سالِ تصنیف 1270ھ لکھا ہے[103] اور سید حسین لطافت کا کہنا ہے کہ "1265ھ میں یہ قصہ تصنیف کیا" لیکن سعادت خاں ناصر کے بیان پر نظر کریں تو اس کی تکمیل کا زمانہ چند برس پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں امانت کی اِندر سبھا کا جو نسخہ ہے اس کا سالِ تصنیف 1259[*]ھ لکھا ہے۔ اس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

150

سبھا میں دوستو اِندر کی آمد آمد ہے  پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے

اور اس کا آخری شعر یہ ہے

غلط اس میں نہیں ہے ایک نقطہ  برائے صحت اس پر مُہر کی ہے

اِندر سبھا کا قصہ تو روایتی انداز کا ہے لیکن اس کی ساری دلچسپی اس کے گانوں کی وجہ سے ہے۔ امانت کی اندر سبھا کے بعد مختلف لوگوں نے سبھائیں لکھیں لیکن ان میں سے مداری لال کی اندر سبھا کو شہرت حاصل ہوئی۔

امانت نے اپنی اِندر سبھا میں جس خوبی کے ساتھ گیت ٹھمری اور چھند، ساون، بسنت اور ہولی وغیرہ کو شامل کیا ہے اس سے پہلے بھی اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ یہاں نمونہ کے طور پر صرف کچھ بند لکھے جاتے ہیں۔

ہولی

لاج رکھ لے سیام ہماری  میں چیری ہوں تمھاری
جرا دے سمجھ کے گاری
عبیر گلال نہ مُکھ پر ڈارو  نا  مارو  پچکاری
آدھی دیہیَ سب دیکھ پڑیہے  ساڑی بھیجیو نہ ساری
کہیں گے لوگ متواری

[*] معلوم ہوتا ہے کہ مرتب سے کچھ غلطی ہوگئی ہے کیونکہ یہ سال امانت کے واسوخت کی تصنیف کا ہے۔ اِندر سبھا اس کے بعد کی تصنیف ہوگی

ساون

پیابن گھٹا نہیں بھاوے  رہ رہ دل روندھو آوے
بجری کی چمک چمکاوے ڈراوے  پیا بن گھٹا نہیں بھاوے
رُت برکھا کی آے ری گیاں  آج جیا کو کل نہیں آوے
موری اور سے یا دن بجنی  کوؤ جائے او کو سمجھاوے
پیا بن گھٹا نہیں بھاوے

بسنت

رُت آئی بسنت عجب بہار  کھلے جرد پھول برون کی ڈار
چٹکی کُسم، کھلنے لاگی سرسوں  پھیلت چلت گیندن کے ہار
ہر کے دوارے مالی کا چھورا  گروا ڈارت گیندن کے ہار
ٹیسو پھولے اَنبا بورائے  چنپا کے روکھ کلئین کی بہار

اندر سبھا سے قطع نظر، امانت اپنے زمانے کے اچھے غزل گویوں میں بھی شمار ہوتے تھے۔ محسن نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے:

''سید آغا حسن رضوی امانت خلف میر آغا رضوی باشندۂ لکھنؤ صاحب دیوان، شاگرد رشید میاں دلگیر مرثیہ گو۔ ان چند شعر پر شاعر کو نہایت فخر تھا کہ سوائے میرے یہ تیتے کسی ... نہیں کہے لہٰذا ان کا لکھنا ضرور ہوا۔106

کھلا کرتا ہے سدا ٹی کی اوٹ اے دل شکار  طائر تصویر ہے نخچیر پشت آئینہ
آرسی پہنے ہوئے وہ گل جو لیوے شمع کا  ہم انگوٹھی کو کہیں گلگیر پشت آئینہ

امانت نے محسن کے تذکرے کے لیے مشاعرہ بھی منعقد کیا تھا چنانچہ محسن نے لکھا ہے:

''طرح مشاعرہ میاں امانت واسطے اس تذکرے کی غزل صاحب مشاعرہ سید آغا حسن امانت۔

آنکھوں پہ کیوں ملک نہ رکھیں مرتضیٰ کے ہاتھ  عالم کے دستگیر ہیں دست خدا کے ہاتھ''107

امانت کے بکثرت شاگردان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔

امانت بڑے قادرالکلام شاعر تھے۔ وہ ہر قافیے کو نظم کر دینا اپنے لیے ضروری سمجھتے تھے دو غزلہ، سہ غزلہ کہنے کے باوجود وہ زبان کی صحت اور محاورات کے برمحل صَرف پر بہت نظر رکھتے تھے۔

امانت نے ایک سے زیادہ واسوخت بھی لکھے ہیں اور ان پر بھی انھیں فخر تھا۔ ان کے ایک واسوخت کا پہلا بند یہ ہے۔

عشق کے حال سے یارب کوئی آگاہ نہ ہو　　پاؤں اس راہ میں رکھ کر کبھی گمراہ نہ ہو
غرق بحرِ غم واندوہ میں دل آہ نہ ہو　　حُسن یوسف بھی نظر آئے تو کچھ چاہ نہ ہو
مثل ہاروت نہ اس پر چہ بابل ہووے
دل مگر زہرہ جبینوں پہ نہ مائل ہووے

اس واسوخت کا آخری شعر یہ ہے۔

غیر کے ذکر سے دل یار کا گھبراتا ہے　　بے امانت اسے دم بھر نہیں چین آتا ہے

یہ قابل توجہ بات ہے کہ امانت نے واسوخت کو ایک مذہبی بلکہ دعائیہ صنفِ شاعری کی حیثیت سے استعمال کیا ہے اور اس اعتبار سے وہ منفرد اور ممتاز تھے۔

امانت نے ترجیع بند وغیرہ بھی لکھے ہیں اور اس طرح انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنے زمانے کی مروجہ تقریباً سبھی شعری اصناف پر قادر تھے۔

2- اختر - واجد علی شاہ

واجد علی شاہ اختر تخلص کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے۔ وہ اودھ کے بادشاہ تھے اور اپنی خوش طبعی اور زندہ دلی کی بدولت اودھ کی مذہبی، علمی اور ثقافتی زندگی کے لیے مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ جو کچھ سوچتے اور کرتے تھے اس کا عکس اس خطے کی زندگی میں کم وبیش نمایاں ہوتا تھا۔ میاں امانت کی اندر سبھا کے بارے میں محمد عمر و نورالہٰی کا بھی موقف یہ ہے کہ:

"یہ اندر سبھا اودھ کے رنگیلے فرمانروا اور اس کے اہل دربار کے لیے تحریر ہوئی جسے انھوں نے تمثیل کیا۔ واجد علی شاہ اس میں اندر کا پارٹ کیا کرتے تھے۔ مہ جبینان قیصر باغ پریوں کے لباس میں جلوہ گر ہوئیں۔........ مدت تک اندر سبھا ہندوستانی اسٹیج کی واحد ابجد رہی۔" 108

لیکن واجد علی شاہ جیسے خلاق طبع شخص کا امانت کی اندر سبھا پر قناعت کر کے بیٹھ رہنا ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے کہ:

''واجد علی شاہ نے لکھنؤ میں اپنے عروج کے زمانے میں اور زوال سلطنت کے بعد جو رہس ترتیب دیئے تھے وہ......... تعداد میں چھتیس ہیں اور ان کا ذکر انھوں نے تفصیل سے 'بنی' تصنیف 'بنی' میں کیا ہے۔ ان رہسوں میں اداکاری بھی ہے، مکالمے بھی، اداکاری کے لیے ہدایات بھی ہیں اور مناظر بھی بلکہ واجد علی شاہ نے پروڈیوسر کے تمام فرائض ادا کر دیے ہیں۔ گانوں کی دھن اور بول خود ترتیب دیئے ہیں، لباس کے لیے بھی مناسب ہدایات خود ہی دی ہیں اور ہر رہس پر جو رقم خرچ ہوتی تھی، اس کی تفصیلات بھی فراہم کی ہیں۔''109

''بنی'' کے علاوہ واجد علی شاہ نے اپنی کتاب ''صوت المبارک'' کے چھٹے باب میں ''رہس مبارک سلطانی'' کے نام سے دو فصلوں میں اپنے بتیس رہسوں کا ذکر کیا ہے اور ''ان تمام رہسوں میں شریک ہونے والوں کی تعداد، بول اور مختلف اہم باتیں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں۔''110

ڈاکٹر کوکب قدر نے بادشاہ کے رہسوں کے سلسلے میں رقص اور موسیقی کے علاوہ ان کے فن باغبانی، مصوری وغیرہ سے دلچسپی کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ۔

''واجد علی شاہ کو ان رہسوں کے لیے ہر اس دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا جو موجودہ زمانے میں فلم بنانے والوں کو پیش آتی ہیں۔ نئے نئے رہسوں کے لیے نئے نگار خانے، نئے لباس، نئے ساز و سامان اور نئی آرائش کی ضرورت تھی......... ان کے مدد و معاون چاہے کتنے ہی جدت پسند منتخب روزگار افراد کیوں نہ ہوں ان کی سرپرستی اور ہدایت کاری کے لئے تنہا ذات واجد علی شاہ کی تھی۔''111

ان حقائق پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ ایک رہس کو مکمل کرنے کے لیے متعدد علوم و فنون کے مسائل اور اعمال پر بخوبی گرفت ہونی ضروری تھی اور ہر رہس اپنے زمانے کی تہذیب، ثقافت اور فکر و عمل کی پوری طرح عکاسی کرتا تھا۔

# الف - نثر

مولانا محمد حسین آزاد کے بقول "۔شیخ (ناسخ) صاحب اور خواجہ آتش کے کمال نے لکھنؤ کو دلی کی قید و پابندی سے آزاد کر کے استقلال کی سند دی اور وہی سند ہوئی۔ اب جو چاہیں سو کہیں۔ ہم نہیں روک سکتے ہیں۔" لکھنؤ میں بادشاہت نئی قائم ہوئی تھی۔ اس کی مناسبت سے فکر و عمل کے نئے نئے اصول اور ضابطے مقرر ہوئے اور ہر معاملے میں جدت کی راہ اختیار کرنا گویا لکھنؤ والوں کا امتیاز بنا۔ اس صورت حال میں ضروری معلوم ہوا کہ لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کے کارناموں کو خصوصیت سے کاغذ کی تحویل میں دے کر محفوظ کر دیا جائے۔

# ب - تذکرے

## 1- ناصر- سعادت خاں

قسمت کی بات ہے کہ لکھنؤ میں اردو زبان میں تذکرہ نویسی کی جس شخص نے ابتدا کی تھی اس کے تلمذ کا سلسلہ دہلی تک پہنچتا تھا۔ وہ خود پچھم کی راہ سے چل کر لکھنؤ میں آیا تھا۔ اس نے نہ صرف دلّی والوں کے قصے اور بعض واقعات گوش ہوش سے سنے تھے بلکہ ان کے کچھ تذکرے دیکھے بھی تھے چنانچہ اس نے تذکرہ نویسی کے لیے ایک نئی راہ نکالی۔ اس نے خود لکھا ہے:

> ''سعادت خاں متخلص بہ ناصر سخنوروں کی خدمت میں یہ عرض رکھتا ہے کہ اس احقر کو ایک مدت سے یہ خیال تھا کہ تذکرہ شعرائے ہند کا ترتیب دے مگر بہ سبب عدم دریافت احوال قدما ارادہ صورت پذیر نہ ہوتا تھا۔ ان روزوں کہ تذکرہ تالیف کیا ہوا میاں مصحفی صاحب مغفور کا دستیاب ہو گیا، تقاضائے شوق نے ہمت کو کام فرمایا اور برخلاف میاں صاحب کے کہ ان کا تذکرہ عبارت فارسی میں ہے فقیر نے ہندی میں لکھا کہ دورنگی سے یک رنگی بہتر ہے اور قید حروف تہجی کی اس لیے نہ رکھی کہ جس استاد کا جو شاگرد ہو نام اس کا پائے نام اس کے لکھا جائے کہ عبارت ہندی اور طرز اسای شعرا

ایجاد میرا ہو اور وہ شاعر جن کی استادی اور شاگردی نامعلوم اور نام ونشان غیر مفہوم ہو خاتمہ اس کا ان پر کیا جائے۔"[1]

اس میں پہلی بات یعنی "عبارت ہندی" سے متعلق ناصر کا دعویٰ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے پہلے اردو نثر میں ایک سے زائد تذکرے لکھے جا چکے تھے۔ دوسری بات یعنی "طرز اسامی شعرا" اہم ہے۔ لکھنؤ میں خصوصاً ناسخ کے وقت سے استادی شاگردی کے تعلق کو بہت اہمیت دی جانے لگی تھی، بلکہ کچھ مدت کے بعد تو اسی سلسلے کو "خاندان" سے بھی تعبیر کیا جانے لگا تھا۔ اس اعتبار سے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ تذکرہ اہل لکھنؤ کے مزاج اور فکر کا آئینہ دار ہے۔

اس تذکرے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ دوست دشمن کی خوشی، ناخوشی کی پرواہ کیے بغیر مصنف نے جو صحیح اور مناسب سمجھا ہے وہی لکھا ہے۔ اس کے حوصلے اور ہمت کی ضرور داد دی جانی چاہیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تذکرے میں بعض ایسی حکایتیں وغیرہ ملتی ہیں جن کی صحت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ پھر بھی ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں ایسی ایسی باتیں مشہور ہو رہی تھیں۔

ناصر کو بجا طور پر یہ احساس تھا کہ اس کے تذکرے سے اکثر لوگ کبیدہ خاطر ہیں چنانچہ "خاتمہ" میں اس نے لکھا ہے۔

کذب وافترا سے یہ تذکرہ پاک اور نور صداقت سے تابناک کہیں کہیں بہ طور معما افشائے راز جس سے جھتے شان میں پڑیں وہ قلم انداز۔ قطعہ باعی (مؤلفہ)

افسوس نہیں کسی کو محنت پہ نگاہ　　محنت برباد اور لازم ہے گناہ
عزت کے عبث ہوئے ہیں حاسد در پے　　لاحول ولا قوۃ الا باللہ

کہیں کہیں جو لطافت وظرافت اس میں ہے وہ بھی لطف سے خالی نہیں ہے۔ قطعہ

نشانِ موفیت ہے ظرافت　　شعار انبیاء و اولیاء ہے
قدِ معشوق کہیے اگر تاڑ　　تعلّی ہے، اہانت اس میں کیا ہے

چند مدت اس کے انتظام کے واسطے محنت شاقہ کھینچی اور کیا کیا پریشانی میں بسر کی۔"

میر علی اوسط رشک نے دو تین تاریخیں کہیں۔ ایک یہ ہے۔

"دوسری تاریخ میر موصوف کی انشا کی ہوئی شروع سال تذکرہ کی کہ وہ 1261ھ تھی
اور تمام 1262ھ میں ہوا۔ نام اس کا خوش معرکہ تھا۔ میر صاحب نے لفظ زیبا سے
اسے زینت بخشی نام کا نام اور تاریخ کی تاریخ ہوئی۔

یہ تذکرہ اچھا ہے طور اس کا نرالا ہے    نام اس کا مصنف نے خوش معرکہ ٹھہرایا
اسے رشک پسند آئی اس نسخہ کی زیبائی    تاریخ یہی پائی خوش معرکۂ زیبا" 4۔
1261ھ

تذکرے کے مطالب تین حصوں پر منقسم ہیں۔ اس طرح:

پہلا حصہ: ایسے شعرا جن کی استادی شاگردی معلوم ہے۔ دراصل یہی اصل تذکرہ ہے اور مصنف نے اسی پر محنت بھی کی تھی۔

دوسرا حصہ: وہ شاعر جن کی استادی شاگردی نامعلوم ہے، اور

تیسرا حصہ: شاعرات کے بیان میں۔

اس تذکرے میں ضمناً بعض موقعوں پر اردو نثر کے نمونے بھی نقل کیے گئے ہیں۔

سعادت خاں ناصر نگینہ (موجودہ ضلع بجنور) کے رہنے والے رسالت خاں نامی کسی شخص کے بیٹے تھے۔ انھوں نے خود اپنے تعارف میں لکھا ہے۔

"ناصر شاگرد محمد حسن ملمذ نب صاحب پنج دیوان کہ ہر ایک قصائد اور مثنوی سے مالا مال اور معمور اور مثنوی مسمی بہ مظہر معجزات اخبار میں حاضرات حضرات کے اور مثنوی مختار نامہ اور قصہ اگر گل اور قصہ مسمی بہ گلشن سرور زبان اردو میں تصنیف کیا ہوا اس کا نیز بدستور ہے۔" 5

ناصر کے تفصیلی حالات معلوم نہیں البتہ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ اس نے غزل گوئی سے شاعری شروع کی ہوگی۔ پھر قصیدے اور مثنوی کی طرف توجہ کی ہوگی چنانچہ دیوان ان تینوں اصناف پر مشتمل مرتب کرنے شروع کیے ہوں گے۔ لکھنؤ کے اس ماحول میں اس نے واسوخت بھی لکھے ہوں گے۔

ناصر کا ایک واسوخت جس مجموعے میں ملا ہے اس میں میر، مصحفی اور مرزا حاجی قمر جیسے

پرانے شاعروں کے واسوخت لکھے ہیں۔ قیاساً ناصر کا واسوخت بھی کم وبیش اسی زمانے کا (ناصر کی ابتدائی مشق کا نمونہ) ہوگا۔

اپنے تذکرے میں ناصر نے پانچوں دواوین کے شعر الگ الگ درج کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اس کے تذکرے کی تالیف سے پہلے مدوّن ہو چکے تھے۔ چھٹا دیوان جو مشفق خواجہ صاحب کے پیش نظر تھا شاید بعد کے زمانے میں مرتب ہوا ہوگا۔

7 سعادت خان ناصر کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی مثنویوں سے قطع نظر جو اس کے دواوین میں شامل تھیں اس نے کئی مذہبی مثنویاں بھی لکھی تھیں۔ ان کے نام اس طرح ہیں:

مثنوی مظہر معجزات، مثنوی مختار نامہ۔ یہ دونوں 1261ھ سے پہلے کی تصنیف ہیں چنانچہ خوش معرکہ زیبا میں ان کا مذکور ہے۔ موضوع جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مذہب وعقیدہ ہے۔

مثنوی ناصری یا مثنوی در بیان عقائد۔ شروع میں حمد ونعت اور پھر پانچ حصوں میں عقائد کا بیان ہے۔ 8 عقیدۂ پنجم کے بعد کافروں کی روحوں کا بیان از روئے حدیث ہے۔ آخر میں رشک کا کہا ہوا قطعہ تاریخ ہے۔ آخری شعر یہ ہے

اس طرح رشک نے کہی تاریخ اعتقادا یہ مثنوی باللہ

1266ھ

یہ مثنوی کُل بارہ ورق میں سما گئی ہے۔

مثنوی ثمرۂ فضائل۔ 9 چھیاسی اوراق پر محیط اس مثنوی میں 2890 شعر ہیں۔ یہ مثنوی مصنف نے صرف دو مہینوں میں مکمل کی تھی۔ اس کا نام تاریخی ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ:

نام کا نام، سال کا ہے سال

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ 1266ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں حضرت علی کے فضائل کا بیان جوش وعقیدت سے کیا گیا ہے۔

مثنوی ترجمہ حیات القلوب۔ 10 یہ ملا محمد باقر مجلسی کی فارسی تصنیف کا منظوم ترجمہ ہے۔ میر مظفر علی اسیر نے اس کے لیے دو قطعات تاریخ کہے تھے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے۔

کہی اس کی تاریخ ہاتف نے خوب کہ منظوم جلد حیٰوۃ القلوب

1271ھ

ترجمہ روضۃ السیر۔ 11 یہ ترجمہ 1270ھ میں کیا گیا تھا۔ اس کے لیے شیخ مہدی علی ذکی مرادآبادی نے دو تاریخیں کہی تھیں۔ ایک کا عنوان یہ ہے:

"تاریخ ترجمہ کتاب روضۃ السیر حسب الحکم بادشاہ لکھنؤ"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آخر زمانے میں ناصر کو شاہی دربار میں رسائی حاصل ہو گئی تھی۔ ناصر کے اس ترجمے کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ نثر میں تھا یا نظم کی صورت میں۔ بس اتنا معلوم ہے کہ یہ ہندی (اردو) میں تھا۔

مثنوی در بیان واقعہ کربلا۔ 12 اس کی ابتدا "شادحمد" سے ہوئی۔ مطالب کا اندازہ نام سے کیا جا سکتا ہے۔ سال تصنیف معلوم نہیں۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ آخر عمر میں ناصر کے مزاج پر مذہب غالب آ چکا تھا اور صنف مثنوی سے اسے زیادہ دلچسپی ہو گئی تھی۔

ابتدائی زمانے میں سعادت خاں ناصر نے داستان سے بھی دلچسپی لی تھی۔ اس نے اپنی دو داستانوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تفصیل آگے آئے گی۔

## 2- محسن- سید محسن علی

اس نے خود اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

"مؤلف تذکرہ سید محسن علی موسوی محسن ولد منشی سید شاہ حسین حقیقت لکھنوی بن سید عرب شاہ موسوی اولاد میں سید امیر کلال علیہ الرحمۃ کی، وطن بزرگوں کا خوست توابع غور مولد و مسکن مؤلف لکھنؤ کمترین تلامذۂ خواجہ وزیر اور میر علی اوسط رشک کے۔"13

الف: سراپا سخن۔ اپنے اس تذکرے کے سبب تالیف میں محسن نے یہ ذکر کیا ہے کہ ناسخ مغفور نے کانپور میں یہ غزل پڑھی تھی۔

جب کبھی پہنا جڑاؤ اس نے زیور کان میں

اسے سن کر شیخ الٰہی بخش عشق شاگرد میر رشک نے عرض کیا کہ:

''اگر سب اعضا میں غزلیں ہو جائیں تو ایک دیوان بطور سراپا ترتیب پائے۔

شیخ ناسخ بڑے استاد تھے۔ انھوں نے ایسی غزلیں کہیں تو ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں نے بھی ان کی اتباع کی اور اس طرح کی غزل گوئی کا سلسلہ چل پڑا۔

ناسخ کی وفات کے بعد عشق نے محسن سے کہا کہ:

''اگر تو اشعار شیرین شعرائے ماضی و حال کے جمع کر کے تذکرہ بطور سراپا لکھے تو غالب یہ ہے کہ نئے رنگ ڈھنگ کا تذکرہ نادر الوجود نایاب ہوگا۔''

محسن نے اس کام کا بیڑا اٹھالیا۔ سعادت خاں ناصر نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

'' سید خجستہ خصال، شیریں مقال، غیر ممکن اس سے ممکن، میر محسن علی تخلص محسن ..........سید صاحب موصوف نے ایک تذکرہ اشعار تعریف سراپا لکھنا شروع کیا ہے، الٰہی انجام اس کا بخیر ہو۔ پہلے وہ شاگرد خواجہ وزیر کا تھا، اب رشک کا۔''14

خود محسن نے لکھا ہے کہ:

''بڑی جانکاہی اور عرق ریزی سے دس برس میں یہ تذکرہ مسمّٰی بہ سراپا سخن انجام پا گیا۔'' تاریخ اتمام اس کی خود اس طرح کہی تھی۔ ع

<u>نغمہ طوطیان ہند یہ ہے</u>

1269ھ

یعنی آغاز اس تذکرے کا 1259ھ کے قریب ہوا تھا۔ کئی سال کی محنت کے بعد محسن نے اس تذکرہ کا مسودہ تیار کیا اور اس کے لیے ''دیباچہ'' بھی لکھا۔ اس کی تاریخ اس طرح کہی

ع <u>سراپا فقرہ ایک اک نور کے سانچے میں ڈھالا ہے</u>

1267ھ

یعنی اس کی عبارت کو نکھارنے سنوارنے کی بھی کوشش کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تذکرے میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے، باوجود اس کے کہ اس میں بیشتر شاعروں کے بارے میں تقریباً سبھی ضروری معلومات محفوظ کر دی گئی ہیں۔ محسن نے جس وقت تذکرہ کا مسودہ تیار کیا تھا اس

وقت اس نے بقول خود "سات سو شعرا کا کلام فراہم کیا تھا" بعد میں جب یہ مکمل ہوا تو شاعروں کی تعداد 731 ہو گئی تھی۔

چند سال کے بعد سراپا سخن کی طباعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ محمد حسن خاں طبیب کے قطعہ تاریخ سے 1276 کے عدد برآمد ہوتے ہیں۔ اگلے سال طباعت مکمل ہوئی۔ اس وقت کئی شاعروں نے تاریخیں کہیں۔

مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب دہلوی، نے اس طرح تاریخ کہی ؎

ہند سے پہلے سات سات کے دو دئے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
77

اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا باہزاری ہزار زیبائی
12

یہ تذکرہ 1277ھ/ 1861 میں لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہو چکا تھا۔ یہ تذکرہ جیسا کہ عشق نے خیال ظاہر کیا تھا اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی تذکرہ ایسے موضوعات کی تقسیم کے ساتھ مرتب نہیں کیا گیا۔

ب۔ ترجمہ مخزن نکات، اس کا تعارف سب سے پہلے امتیاز علی خاں عرشی نے کرایا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے۔

> "کتاب میں مترجم کا نام نہیں ہے لیکن خاتمے میں مقام لکھنؤ لکھا ہے۔ یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ لکھنؤ کا باشندہ تھا۔ اس نے تذکرہ انیا کے مؤلف کو اپنا والد بتایا ہے۔ اپنے عمو صاحب کا ذکر شعر فہم اور شعرا سے واقف شخص کی طرح کیا ہے۔ ناسخ کو امام الکملا فخر الاساتذہ شیخ امام بخش ناسخ مغفور لکھا ہے اور انھیں قواعد زبان کا موجد قرار دیا ہے۔ میں نے دستور الفصاحت کے دیباچے میں لکھا تھا کہ محسن علی محسن اس کے مترجم ہیں۔ اس خیال کی بنیاد کس دلیل پر تھی اب کچھ یاد نہیں لیکن یہ باتیں اس خیال کے حق میں ہیں۔"15

اس اقتباس میں جو چار دلیلیں پیش کی گئی ہیں ان میں سے صرف ایک قابل توجہ ہے یعنی

تذکرہ اخیا کے مؤلف کو اپنا والد بتایا ہے۔ لیکن اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ترجمہ کا کام محسن ہی نے کیا تھا۔ صحیح یہ ہے کہ اگر مخطوطہ کی تحریر میں کوئی غلطی یا خرابی نہیں ہے تب بھی اس کا امکان ہے کہ مترجم محسن کا کوئی بھائی ہو۔ خیال رہے کہ شرف احمد صاحب کو بھی اعتراف ہے کہ:

"شاہ حسین (حقیقت) کی اولاد کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی"16

اس مجہول المؤلف ترجمے کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس میں شروع کے دو طبقوں کا مکمل ترجمہ ہے۔16 تیسرے طبقے میں سے صرف شاہ عالم ثانی آفتاب کا ذکر ہے۔ باقی حصے کے بارے میں عرشی صاحب کے بیان یہ ہیں:

"اگلا حصہ ضائع ہو گیا ہے"17 اور

"کتاب ناقص ہے اور یہ نقصان خود کاتب کی طرف سے ہے کہ اس نے اس کو نقل کرتے کرتے چھوڑ دیا ہے۔" صحیح ان میں سے کوئی ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔ موجودہ صورت میں مخطوطہ کے مطالب اس طرح ہیں:

"الحمدُ للہ رَبّ العالمین۔ الخ۔ ترجمہ طبقہ اول تذکرہ محمد قائم قائم مغفور چاند پوری مسمّی بہ مخزن نکات کہ نام تذکرے کا تاریخی ہے، قدر دانان سخن اور نقادان اس فن پر مخفی نہ رہے۔ کہ صاحب تذکرہ بنائے ریختہ گوئی کو لکھتے ہیں کہ...... الخ

"ترجمہ طبقہ دوم تذکرہ محمد قائم قائم۔ اس طبقے میں اشعار اور احوال ان شعرا کا ہے جو بعد دلی کے آخر زمانہ اورنگ زیب عالم گیر بہادر سے تا ابتدائے عہد دولت محمد شاہ بادشاہ کے دار الخلافت شاہجہاں آباد اور سائر بلاد ہندوستان میں ہوئے اور راقم نے ہر تذکرے سے مقابلہ کر کے زیادہ اور بھی لکھ دیے ہیں.................."18

طبقہ سوم میں حمد و نعت کے بعد لکھا ہے کہ "مخفی نہ رہے کہ زمانہ مرزا رفیع سودا مغفور اور میر تقی میر اور خواجہ میر درد میں طرز کلام میں تغیر آیا اور بہت الفاظ متروک ہو گئے اور ریختہ میں اوزنگ کی پختگی آئی اس واسطے........... اس طبقہ سوم میں ترجمہ تذکرہ اخیائے راقم لکھتا ہے........... "

اس ترجمے کے زمانے کے سلسلے میں طبقہ دوم کے آخر میں مترجم کی یہ تحریر توجہ طلب ہے۔

''الحمدللہ و المنہ کہ تاریخ دوسری ربیع الاول 1271 ہجریہ کے یہ طبقہ دوم بہ خط خام مؤلف تمام ہوا شہر لکھنؤ میں۔''

اس سے ظاہر ہے کہ دونوں طبقوں کے ترجمے کا کام مذکورہ تاریخ کو مکمل ہو چکا تھا۔ تعجب یہ کہ ترقیمہ کے اس جزو سے کہ یہ ''بخط خام مؤلف'' ہے عرشی صاحب کو اختلاف ہے،19 وہ اسے کسی کم سواد کاتب کے قلم کی نقل قرار دیتے ہیں۔

اس ترجمے کے بارے میں عرشی صاحب نے جو رائے دی ہے مختصراً اس طرح ہے۔

الف: لفظی ترجمے کی جگہ مطلب کو اپنے الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ب: متعدد نئے شعرا کا حال بھی بڑھایا ہے۔

ج: ترتیب میں بھی فرق کر دیا ہے۔ ہر طبقے کے شعرا کو حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب کر دیا ہے۔

د: سابق تذکرہ نگاروں پر تنقید بھی کی ہے۔

ہ: مترجم نے جگہ جگہ اپنے ماخذوں کے حوالے دیے ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ترجمے کے بجائے خود ایک تالیف وغیرہ کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

محسن نے اپنے استاد وخواجہ وزیر کے دیوان کی ترتیب اور طباعت میں محنت کی تھی۔ اپنے والد کی بھی بعض کتابیں چھپوائی تھیں لیکن خود اپنے کلام کو محفوظ نہیں کیا۔ وجہ غالباً یہ ہو کہ آخر عمر میں انھوں نے ''قلندری اختیار کر لی تھی'' ان کے قلندری اختیار کرنے کے زمانے کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔ اس بارے میں قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں انھوں نے کسی تذکرے کے ترجمہ کا کام غالباً نہیں کیا ہوگا۔

## 3- اشپرینگر- اے اشپرینگر

اشپرینگر (A.Sprenger) 1813ء میں آسٹریا کے ایک قصبہ میں پیدا ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اس نے طب اور مشرقی زبانوں (عربی، ترکی اور فارسی) سے دلچسپی لینی شروع کی۔ اپنے شوق سے اس نے بعض کتب خانوں کی فہرستیں بھی مرتب کیں، اور کچھ اہم کتابوں کے عربی سے انگریزی میں ترجمے بھی کیے۔ 1843 میں بہ سلسلۂ ملازمت وہ ہندوستان آیا۔ یہاں اس

نے اردو زبان سیکھی۔ پھر 1844 میں وہ دہلی کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا۔ 6دسمبر 1847 کو وہ لکھنؤ میں ریذیڈینٹ کا زائد نائب مقرر کیا گیا تاکہ وہ شاہان اودھ کے کتب خانوں کے قلمی نسخوں کی جامع فہرست تیار کر سکے۔ 3۔ مارچ1848 کو لکھنؤ پہنچ کر اشپرینگر نے اپنا منصب سنبھالا اور یکم جنوری1850 کو واپس چلا گیا۔

الف۔ شاہان اودھ کے کتب خانے۔

اشپرینگر نے سرہنری ایلیٹ چیف سکریٹری گورنر جنرل کی خدمت میں درج ذیل تین رپورٹیں ارسال کی تھیں:

| | | |
|---|---|---|
| پہلی رپورٹ | بابت۔ 4۔ جون1848 | متعلقہ موتی محل |
| دوسری رپورٹ | بابت یکم اکتوبر1848 | متعلقہ توپ خانہ |
| تیسری رپورٹ | بابت13۔ مارچ1849 | متعلقہ توپ خانہ و فرح بخش |

"Report of the Researches into the Muhammadan Libraries of Oudh"

ان رپورٹوں سے (1) شاہی کتب خانوں کی تاریخ اور ان کی ابتر حالت سے واقفیت ہوتی ہے۔

ب۔ بعض عبارتوں سے مرتب کے اصول فہرست سازی اور مجوزہ تحقیقی منصوبوں کا پتہ چلتا ہے،

(3) ان میں تقریباً ان تمام عربی، فارسی، اردو، ترکی اور پشتو مخطوطات کا اجمالی طور پر حوالہ دیا گیا ہے جن سے ہم اس فہرست کی بقیہ غیر مطبوعہ جلدوں کی نایابی کی وجہ سے کلی طور پر ناواقف ہیں۔

رپورٹوں کے اس مجموعہ کا ترجمہ اردو میں اپنے محققانہ مقدمے کے ساتھ محمد اکرم چغتائی نے انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کی طرف سے 1973 میں شائع کر دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

چونکہ اس میں مخطوطات اور مصنفین کے بارے میں انتہائی مختصر معلومات فراہم کی ہیں، ان کی شرح و بسط کے لیے تفصیلی حواشی بھی لکھے گئے ہیں۔

ان رپورٹوں کے موضوعات الگ الگ ہیں چنانچہ ان کی کیفیت اس طرح ہے،

پہلی رپورٹ صفحہ 34 تا 48 کل اندراجات۔ 112 ، موضوعات۔ قواعد اور لغات، جغرافیہ، تاریخ، چغتائی ادب، قانون، تذکرہ نویسی، طب اور تاریخ طبی، حدیث، تصوف۔

دوسری رپورٹ، صفحہ 49 تا 55، کل اندراجات ۔22، موضوعات۔ قواعد اور لغات، تاریخ، تذکرہ نویسی، چغتائی اور پشتو کتب، اردو اور ہندی کتب، متفرقات۔

تیسری رپورٹ، صفحہ 56 تا 78، کل اندراجات، 137، موضوعات۔ لغت نویسی، قواعد، فنِ شعر گوئی، علم البدیع، تاریخ، جغرافیہ، تذکرہ نویسی، عربی، فارسی اور اردو شعرا، پشتو اور ترکی کتب، ریاضیاتی علوم، سنسکرت اور ہندی کتب کے فارسی تراجم، تصوف، اخلاقیات وغیرہ، طب اور کیمیا، متفرقات، انگریزی سے فارسی تراجم۔

ان موضوعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہی کے آخری زمانے تک مسلمانوں خصوصاً لکھنؤ والوں کی علمی دلچسپیاں کتنی متنوع تھیں۔

ب۔ یادگار شعرا

اشپرینگر شاہان اودھ کے کتب خانوں کی فہرست کئی جلدوں میں مرتب کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ،

"اگر یہ مکمل صورت میں شائع ہوگئی تو حاجی خلیفہ کی کشف الظنون سے زیادہ وقیع اور مفید کام ہوگا۔" 21

لیکن اس کی صرف پہلی جلد کلکتہ سے 1854 میں چھپ کر شائع ہو سکی۔ بقیہ جلدوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ وہ چھپ سکیں یا نہیں۔ پہلی جلد میں تین باب ہیں۔

پہلے باب میں فارسی اور اردو شعرا کے تذکرے۔

دوسرے اور تیسرے میں فارسی اور اردو شاعروں کی تصنیفیں۔

پھر باب اول کا ضمیمہ اور ایک غلط نامہ ہے۔

مولوی طفیل احمد نے اس کتاب کا انگریزی سے اردو میں یادگار شعرا کے نام سے ترجمہ کر کے 1932 میں ہندستانی اکادمی الہ آباد کی طرف سے چھپوادیا ہے۔ اصل کتاب میں شعرا کی

ترتیب انگریزی حروف تہجی کے اعتبار سے تھی۔ اب اس ترجمے میں ترتیب اردو کے حرفوں کے لحاظ سے قائم کردی گئی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس میں شعرا کے حالات بہت اختصار سے لکھے ہیں بلکہ بعض کا صرف تخلص ہے، نام نہیں ہے، کچھ کا نام ہے لیکن تخلص نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ اہم بات ہے کہ اس میں 1854 تک کے ڈیڑھ ہزار سے زائد شاعروں کا ذکر محفوظ ہے۔ اس وقت تک کے اتنے شاعروں کا غالباً کسی بھی ماخذ میں مذکور نہیں ہے۔

# ج - مقدمے

انیسویں صدی عیسوی کے ربع ثالث تک بھی معمولاً شعرائے اردو کے دواوین کے لیے مقدمے فارسی زبان میں لکھے جانے کا چلن رہا ہے البتہ لکھنؤ کے بعض شاعروں نے اس روش سے انحراف کر کے اردو میں مقدمے اور دیباچے لکھنے شروع کیے۔ اس صورت حال کو بھی اودھ میں بادشاہت کے قیام کے فیوض میں شمار کرنے میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی ہے۔

1۔ تاسّف۔ سید حسین علی

سید حسین علی نام، نسباً رضوی جعفری تھے۔ میر شیر علی افسوس کے نواسے اور شاگرد تھے۔ غالباً افسوس ہی نے ان کے لیے تاسّف تخلص تجویز کیا تھا۔ تاسّف کے والد سید فضل علی کربلائے معلی کی زیارت کے لیے گئے تھے لیکن راستے ہی میں رحلت کی۔ بیٹے نے تاریخ کہی۔

سال ماتم میرے دل نے یہ تاسف کہا ہائے واویلا جناب سیدی فضل علی

1230ھ

چنانچہ اس قسم کے کئی مقطعے ان کے دیوان میں ہے:

کیوں نہ ہوئے دھوم تاسف کی ہند میں اس نے سنایا ریختہ کس زور و شور کا

کہہ تاسف پھر اس زمین میں غزل طرز کا اپنی تو فغانی ہے

اس تعلّی کے باوجود وہ متقدمین شعرا کا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

میر و سودا و درد و سوز و بقا
خوب تھے ان کے قدرداں ہیں ہم

تاسف منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کے متوسلین میں تھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں جب وہ معزول ہو کر لکھنؤ سے نکلے تو تاسف بہت پریشان ہوئے۔ کئی سال کے بعد جب نصیر الدین حیدر نے پھر انھیں وزارت عطا کی تو تاسف کے بھی دن پھر گئے لیکن یہ خوشی دیرپا ثابت نہ ہو سکی کیونکہ اسی زمانے میں منتظم الدولہ نے وفات پائی۔ انھی دنوں میں تاسف نے اپنا دیوان مرتب کیا۔ اس کے لیے اس نے ''قطعہ چہل بیت در تاریخ دیوان'' لکھا۔ اس میں حاسدوں کے جل جانے کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ؎

سُنے منصفوں نے جو دو چار شعر　　خوشی سے یکا یک پڑے وہ اُچھل

اور ذیل کے مصرع میں تاریخ نظم کی ہے۔

<u>ہوا ایک دیوان از صد غزل</u>

1253ھ

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کی ترتیب کے آغاز کی تاریخ ہے کیونکہ اس دیوان میں چند سال بعد تک کے قطعات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے دیوان تاسف کے مخطوطۂ محمود آباد 22 کا تعارف کرایا ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے۔

''دراصل تاسف نے یہ دیوان 1248ھ مطابق 1833ء میں مرتب کیا تھا۔ دیوان کے صفحہ 141 پر تاریخ دیوان درج ہے۔

مرتب کیا اب جو دیوان اپنا　　مقدر مگر تھا ز روزِ ازل
رقم کی تاسف نے تاریخ نادر　　<u>ہوا ایک دیوان با صد غزل</u>

1248ھ

مصنف نے یہ تاریخ قلم زد کی۔ اس کے بعد جو اشعار دیوان میں مندرج ہیں وہ مختلف مضامین اور تاریخوں کے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے جو حاشیے تحریر کیے ہیں اُن سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے بعد کے زمانے میں جا بجا ترمیم و تنسیخ کا عمل کیا ہے۔ موصوف نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ تاسف نے اپنے اس دیوان کا نام 'دیوان صد غزل' رکھا ہے اور اس کا دیباچہ 12۔ صفر 1250ھ میں لکھا ہے۔

دیوان تاسف کا دیباچہ اردو زبان میں ہے۔ شروع میں زبان اردو کی تاریخ اختصار کے ساتھ لکھی ہے۔ پھر محمد شاہی دور کے شعرا کے کلام سے بعض متروکات کی مثالیں پیش کی ہیں۔ ان کے بعد شعر کی خامیوں کا ذکر کیا ہے اور اس کے لیے میر، ناسخ اور آتش وغیرہ کے شعروں سے مثالیں دی ہیں۔ بعض جگہ ناسخ اور آتش کی اصلاحوں سے بھی بحث کی ہے۔ اساتذہ کے کلام سے اس طور پر بحث کرنا اس زمانے میں عام نہیں تھا اس لیے تاسف کی اس جسارت کو عموماً پسند نہیں کیا گیا تھا۔ تذکرہ نویسوں نے اس کے کلام ہی نہیں نام کو بھی نظر انداز کر دیا، البتہ سعادت خان ناصر نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

> ''عادی دخل و تصرف میر حسین علی تخلص تاسف شاگرد میر شیر علی افسوس۔ نہایت خود بین اور خود پسند ارواحِ مرحوماں اس سے دردمند، ناحق ناحق استادوں کے اشعار پر اعتراض کیا اور رسالہ مختصر فریب عوام کو ترتیب دیا۔''23؎

دیوان تاسف کا یہ دیباچہ اگر چہ 1250ھ میں لکھا گیا اور اسے پہلی جلد میں جگہ دی جانی چاہیے تھی لیکن تذکرہ ناصر میں اس سے متعلق جو بحث ہے اس کی رعایت سے اس کا ذکر اس جگہ کیا جانا مناسب معلوم ہوا۔ مذکورہ دیباچے کی صرف دو تین سطریں یہاں نمونہ کے طور پر نقل کی جاتی ہیں۔

> ''حقیقتاً اس زبان نے بھا کیا (= بھاکھا) اور فارسی سے ترکیب پائی ہے۔ آغاز اس کا سلاطین غوری و غزنوی کا تسلط بلادِ ہند پر، پھر جوں جوں مسلمانوں کا عمل دخل زیادہ ہوتا گیا اور ہنود سے اختلاط بڑھتا گیا اس زبان کو بھی ترقی ہوتی گئی۔ سوائے اس کے یہاں کی عورت سے اور مسلمانوں سے وصلتیں ہوئیں اور کتنی پشتیں ان کی گذریں، پھر لہجہ بھی ان کا وہ نہ رہا۔''

دیوان کے مقدمے میں شاعر کے حالات وغیرہ سے صرفِ نظر کر کے زبان کی لفظیات،

روزمرہ، محاورہ اور شاعری کے اصول وضوابط کو زیر بحث لانا نئی بات تھی۔ معاصرین کے سارے اختلاف کے باوجود اصولی حیثیت سے ان بحثوں کے افادیت میں شبہ نہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ ایک مدت کے بعد مولوی الطاف حسین حالی نے جب اپنے دیوان کو مرتب کیا تو اصولاً انھوں نے بھی انھیں خطوط کو اختیار کیا تھا۔ اس اعتبار سے دیوانِ ناسخ کے اس دیباچے کی اہمیت اور افادیت ظاہر ہے۔

2- بیخود- سید ہادی علی

یہ خواجہ محمد وزیر وزیر کے شاگرد تھے اور انھوں نے بڑی محنت اور کاوش سے وزیر کے دیوان کو مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ دیوان وزیر کا مقدمہ بھی انھیں نے لکھا تھا جس کی ابتدا اس طرح کی ہے۔

> "فقیر سراپا تقصیر، کفش بردار اہل سخن نقش قدم استادان زمن خاکسار ازلی سید ہادی علی رضوی بیخود تخلص خلف سید ناصر علی سحر تخلص حضور شاہد پرستان بوستان سخن میں بے باکانہ نقاب خفا چہرۂ شاہد مدعا سے اٹھاتا ہے اور کچھ سرگذشت عمری مصنف اور ماجرائے ترتیب دیوان ہذا مختصر اُسناتا ہے کہ جو کمالات ظاہری و باطنی.... الخ"23

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس دیباچے میں بیخود نے دو امور کے بیان پر توجہ کی تھی یعنی:

اول حالات مصنف اور دوئم ماجرائے ترتیب دیوان ہٰذا

حالات مصنف میں اس کے اسلاف کے ذکر کے علاوہ شاعری میں اس کے تلمذ اور اعمال فتوح وغیرہ سے دلچسپی کا بیان کیا ہے اور ترتیب دیوان کے سلسلے میں ان حقائق کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق اس عمل سے رہا ہے۔ بیخود سے زبان کی تاریخ اور شاعری کے اصول وضوابط سے بحث نہیں کی ہے۔ عبارت اس دیباچے کی مرصّع ہے یعنی عموماً مسجّع بھی ہے اور مقفّیٰ بھی۔ مقصود اس دیباچے سے اپنی لیاقت اور علمی فضیلت کا اظہار بھی رہا ہے فارسی اور عربی کے بکثرت الفاظ اور تراکیب وغیرہ کا استعمال بھی کیا گیا ہے اور اس طرح اس عبارت میں آمد کم سے کم اور آورد بیش از بیش ہے۔

یہ تو صحیح ہے کہ بعد کے زمانے میں عبارت کا یہ انداز متروک ہو گیا لیکن مطالب کے اعتبار سے عموماً مقدمے انھیں خطوط پر لکھے جانے لگے تھے۔

# د - تنقیدِ شعر

## 1- ناسخ وقتیل

شروع زمانے سے مشاعروں میں شعر کی خوبی اور خامی کو پرکھنے، سمجھنے اور مدلل طور پر بیان کرنے کا چلن رہا ہے۔ لکھنؤ میں شیخ ناسخ کے وقت سے ان مسائل کو زیادہ بہتر طور سے پیش کیا جانے لگا تھا۔ سعادت خاں ناصر نے شیخ ناسخ کی اس نوعیت کی ایک تحریر نقل کی ہے اس طرح:

''مرزا حاجی قمر اور میر مظفر حسین ضمیر کو یہ منظور ہوا کہ موجی رام کو مرزا قتیل کی زبان سے ذلت دلوائے۔ مرزا قتیل نے سر مشاعرہ یہ اعتراض اس (کے شعروں) پر کیے کہ گل کو گلاب کہنا غیر مستعمل، اور چشمہ بیرون آب ہے اور سراب محض ریگستان ہے۔ ریگ سے اور موج سے کیا نسبت؟ ناسخ کو دلیری مرزا کی نہایت ناگوار گزری موجی کو یہ سوال و جواب ایک بند کاغذ پر لکھ کر دیے۔ دوسری صحبت میں سر مشاعرہ اس نے پڑھے:

''افصح الفصحا مرزا قتیل صاحب، آپ نے جو مجھ ہیچمداں کی غزل پر یہ اعتراض کیے ہیں کہ گلاب بمعنی گل گلاب غیر مستعمل اور اردو میں نہیں آیا، ایسا کلام لامعنی آپ سا شاعر فخرِ زمانہ کہے بسا عجب ہے۔ نہیں جانتے ہو کہ محاورۂ اہل ہند میں گلابی جاڑا اسے کہتے ہیں کہ موسم گلاب میں ہو

اور گلابی رنگ کہ منسوب بہ گلاب ہو۔ قطع نظر میر محمد تقی کہ زبان ریختہ میں سہیم وعدیل نہیں رکھتے تھے فرماتے ہیں۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

مرزا مظہر جان جاناں فرماتے ہیں:

عالم ہے یہ پسینے کا اس مست خواب پر　　پڑتی ہے اوس جیسے سحر کو گلاب پر

میاں مصحفی ۔

سُرخ ہے ے سے وہ چشم نیم خواب نرگسی　　یا یہ باغ حُسن میں پھولا گلاب نرگسی

دیگر ط

دلّی بھی طرفہ جا ہے کہ ہر اک گلی کے بیچ　　پکتے ہیں کوڑی کوڑی کٹورے گلاب کے

اور آپ نے جو فرمایا کہ چشمہ بیرون آب ہے فی الحقیقت سعدی نے گلستاں میں غلطی فرمائی ہے۔

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل　　چوپُرشدنہ شاید گذشتن بہ پیل

اور آپ نے جو کہا کہ محض ریگستان ہے اور موج سے کیا نسبت، ناصر علی کہتا ہے

نمی دانم کدای شہسوار آمد دریں وادی　　کہ از صد جا گریباں چاک شد موج سرابش را

جواب آپ کے ہر اعتراض کا یہ ہے اور غزل ثانی تصنیف ضمیر کو جو آپ بے عیب کہتے ہیں ایک شعر میں دو اعتراض ہیں:

وطن میں بھی نہیں سرگشتگوں کو چین ذرا　　کہ کم نہ ماہی کا ہو اضطراب در تہہ آب

صاحب میرے، اضطراب ماہی در تہہ آب، کوئی شاعر نہیں بولا، کس واسطے کہ مچھلی کو سوائے پانی کے آرام نہیں اور اگر اضطراب بمعنی رفتار، اضطراب اور رفتار میں بڑا فرق ہے۔ سرگشتہ مفرد، جمع اس کی جس وقت کیجیے گا ہائے ہوز کے کاف فارسی اور الف نون جمع کا آئے گا اور سرگشتگاں ہوگا۔ سرگشتگوں کی ایجاد کہاں سے ہے۔ زبان اردو کے جاننے والے فی زمانناً میاں مصحفی اور انشا اللہ خاں ہیں۔

آپ عبث دخل درمعقولات دیتے ہیں۔ فارسی آپ کی البتہ مشہور۔ اس کو اصفہانی جانیں۔
زیادہ والسلام والاکرام۔

یہ تحریر بہ گمان غالب غازی الدین حیدر بادشاہ اول کے زمانے کی ہے لیکن ہم تک ناصر کے تذکرے کے واسطے پہنچی ہے۔ اس کے بعد والی تحریر کی مناسبت سے اس کو یہاں پیش کیا گیا ہے۔

### 2- ناصر و تاسف

سعادت خاں ناصر نے دیوانِ تاسف کے دیباچے کے بعض مقامات کا جواب قلمبند کیا ہے۔ یہاں مثالاً صرف ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔

''چاہیے کہ جو لفظ جس معنی کے واسطے موضوع ہو اسی کے واسطے استعمال کرے، نہ خلاف اس کے، جیسے کہ شرم کے لیے منہ چھپانا لازم ہے۔ پھر دکھانا چاہیے نہیں۔ اسی بزرگ (مصحفی) نے اپنے اس شعر میں شرم کے واسطے دونوں باتیں ٹھہرا دیں۔

حُسن کہتا ہے کہ پردے کو اٹھا دے پر شرم یہ سکھاتی ہے کہ لے منہ کو چھپا دکھلا کر

دیکھیے کہ حُسن و شرم دو لفظوں کا بیان اس شعر میں ہے چنانچہ خاصۂ حُسن پردے کا اٹھانا تا دیکھنے والے عاشق جمال ہوں، مصرع اول میں ہو چکا پر خاصۂ شرم کہ صرف چھپانا چاہیے سو دکھانا بھی سن لیجیے حالانکہ یہ خطائے فاش ہے مگر منہ کا چھپانا اور پھر دکھانا کام شوخی کا ہے۔

اگر شوخی شرم کی جا اس طرح پر آتا تو یہ شعر خوش رنگ ہو جاتا۔

حُسن کہتا ہے کہ پردے کو اٹھا پر شوخی یہ سکھاتی ہے کہ لے منہ کو چھپا دکھلا کر

اور جواب اس شعر کا راقم نے اپنی غزل میں کہا ہے۔

حُسن بے پردگی چاہے تو حیا پردہ کرے مجھ سے کیونکر وہ نہ لے منہ کو چھپا دکھلا کر

اگر چہ وہ مرحوم شاعر پرگوؤں کا رہنے والا تھا پر لکھنؤ میں آکر استقامت کی پھر رفتہ رفتہ خلق میں نام پیدا کیا۔ حق یہ ہے کہ اس فن میں دستگاہ بھلی چنگی رکھتا تھا مگر باعث ان اغلاط کا کہ جو اس کے کلام میں موجود ہیں پر گوئی پڑی چنانچہ چھ دیوان زبان اردو میں اور کچھ کلام بعض بعض امیر زادوں کے نام پر بہ نظر حصول فوائد معاش کہہ دیا۔ ہر

چند کہ شاگرد بہت اشخاص اس استاد کے ہیں پر سرِ رتبہ ان سب کا خواجہ حیدر علی آتش سلمہ ربہ ہے.............''

''اب انصاف کیا چاہیے کہ لفظ شوخی کو بجائے شرم مناسب سمجھنا حد نا مناسب ہے کہ شوخی عبارت آپ سے باہر ہونا ہے نہ کہ خودداری۔ حرف شرم نہایت با اور اعتراض بجا ہے۔''25؎

اکثر لوگ کہتے ہیں کہ قدما اپنی تنقیدوں میں محض اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کرتے تھے لیکن اس اقتباس پر خیال کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے ہر دعوے کے لیے دلائل اور شواہد بھی پیش کرتے تھے اور اس قسم کی تنقیدوں کے لیے ہر لفظ کے معنی، اس کی اصل اور محلِ استعمال سے واقفیت کے علاوہ غور وفکر کی بھی ضرورت تھی اور کوئی بات بھی سرسری طور پر نہیں کہی جاتی تھی۔

ناسخ نے اپنے دیباچے میں صرف یہی نہیں کیا ہے کہ اساتذہ کے کلام پر اعتراض کیے ہیں بلکہ ان کو بہتر بنانے کی صورت بھی پیش کی ہے۔ اس نے قدما کے بارے میں اختصار کے ساتھ ہی سہی لیکن مفید معلومات بھی قلمبند کی ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی شاعر کے کلام کی قدر و قیمت کے تعین کے لیے مناسب یہ بھی ہے کہ اس کے واقعات اور علمی اکتسابات وغیرہ سے بھی واقفیت حاصل کر لی جائے۔ سعادت خاں ناصر نے بھی تنقید کے لیے اپنے زمانے میں مروج اصول اور ضابطوں کا لحاظ کیا ہے۔

# ہ - بیان وعروض

وہ زمانہ تھا جب شعر گوئی ہی نہیں، زبان دانی کے لیے بھی بدیع وبلاغت اور عروض وقافیہ سے واقفیت کو ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ ان علوم کی تعلیم وتدریس کے لیے زبان اردو میں نہ صرف رسالے اور مختصر کتابیں لکھی جارہی تھیں بلکہ فارسی کی بعض مستند اور معتبر کتابوں کے ترجمے بھی کیے جارہے تھے۔

اس زمانے میں میر شمس الدین فقیر کی فارسی تصنیف حدائق البلاغت کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ دلّی کالج کے پرنسپل بوتروس نے بھی شیخ امام بخش صہبائی سے 1258ھ (1842) میں اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کروایا تھا۔26 صہبائی نے اپنے ترجمے میں حسب ضرورت ترمیم اور اضافے بھی کیے تھے چنانچہ مثال میں پیش کیے گئے فارسی شعروں کی جگہ انھوں نے خود کہہ کر اردو کے اشعار داخل کردیے تھے۔

1 - اختر - واجد علی شاہ

واجد علی شاہ بادشاہ خود بھی شاعر تھے اور اختر تخلص کرتے تھے۔ وہ فنون شاعری سے بخوبی واقف تھے چنانچہ مختلف شاعروں کے ذکر میں انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ ان علوم سے متعلق انھوں نے ایک سے زیادہ کتابیں زبان اردو میں لکھی تھیں۔

الف۔ ارشادِ خاقانی۔ اس کتاب کا نام تاریخی ہے جس سے 1248ھ اس کا سال تصنیف معلوم ہوتا ہے، کپتان مقبول الدولہ مرزا محمد مہدی علی خاں قبول کے اہتمام سے یہ 1269ھ میں مطبع سلطانی میں چھپی تھی۔

ڈاکٹر کوکب قدر نے لکھا ہے کہ:

''ارشاد خاقانی اگرچہ میر شمس الدین فقیر کے رسالے کا ترجمہ ہے لیکن مترجم نے اصل رسالے کی پابندی نہیں کی ہے بلکہ اپنے ذوق اور نظر کے مطابق دیگر عروضیوں کے بیانات بھی یکجا کیے ہیں اور کہیں کہیں فقیر پر اعتراض بھی کیا ہے......... اور مثال میں خود اپنے ہی شعر لکھے ہیں۔'' 27

اصل کتاب میں یہ پانچ ابواب (حدیقے) تھے: بیان، بدیع، عروض، قوافی، معما۔ واجد علی شاہ نے ان میں سے صرف دو کا ترجمہ کیا ہے اور اپنی کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''بنا اس رسالہ کی ایک مقدمہ اور دو رکن (یعنی عروض وقافیہ) پر قرار پائی اور نام اس کا حکم اختر رکھا گیا۔

دراصل بادشاہ نے اپنی کتاب ارشادِ خاقانی کے کئی نام رکھے تھے۔ انھیں میں سے ایک ''حکم اختر'' بھی ہے۔ اس کی عبارت کا انداز یہ ہے۔

1268

''اب ذرۂ بے مقدار اختر حقیر مترجم رسالہ میر شمس الدین فقیر کا خدمت میں طالبان فن شعر کے عرض کرتا ہے کہ شعر کے مشتاقوں کو علم عروض اور قافیے کا علم بھی ضرور چاہیے اور موزوں کرنے والوں کو خبر ان دونوں فنون کی رکھنا واجبات سے ہے۔ اگرچہ عجم کے شاعروں نے ان دونوں فنون کو عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا لیکن کوئی نسخہ ایسا کہ جمع کرنے والا عروض اور قافیے کا ہو کم مروّج ہوا۔ اب ان دنوں یہ علم بالکل جاتا رہا تھا .........''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کو صہبائی کے ترجمے کا بالکل علم نہیں تھا۔ بہرنوع زبان ان کی صاف ہے البتہ اس میں قدامت کا رنگ جھلکتا ہے۔

ب۔ جو ہر عروض۔ اس کا نام بھی تاریخی ہے، سال تصنیف 1290ھ ہے۔ مطبع سلطانی کلکتہ سے دو بار چھپی تھی۔ پہلے 1290ھ میں، پھر 1292ھ میں۔ دونوں کے متن میں خاصا فرق ہے۔ دیباچے کی عبارت دونوں میں فارسی میں ہے اور خاصی مختلف ہے۔ بحروں کے نام اردو کے مصرعوں میں بتائے ہیں اور ان میں ابھی کافی فرق ہے۔ پہلا ایڈیشن 19 صفحوں کا ہے اور دوسرا 35 صفحوں میں سمایا ہے۔ اپنی طبع زاد بحروں کے نام اپنے نام پر رکھے ہیں مثلاً۔

ایجاد اختر اور سراج اختری۔

تو پڑھ اس کو   مری جان   لب دل سے،   ذرا سُن
مفاعیلن   فعولن   مفاعیلن   فعولن

غرض یہ بادشاہ کی ایک دلچسپ تصنیف ہے۔

2- منشی- بشارت علی

میر علی اوسط رشک کے عزیز شاگردوں میں شیخ حیدر علی صغیر بھی تھے۔ ان کے ایک بھائی منشی بشارت علی خاں تھے انھوں نے ایک کتاب ''جدول عروض'' تالیف کی تھی۔ میر رشک نے اس کی تاریخ اس طرح کہی تھی۔

''تاریخ رسالہ عروض تصنیف بشارت علی مع نام تاریخی''

کیا ذہن بشارت علی ہے    کیا فکر مناسب درسا ہے
گونام میں ہوگیا تقرف    ہوجائے اشارہ تو بجا ہے
ہر چند نہیں وہ آپ شاعر    علموں سے طبیعت رسا ہے
لکھا جو عروض کا رسالہ    طور تالیف یہ نیا ہے
اللہ رے طبع کی روانی    دریا کوزے میں بھر دیا ہے
تھا مجھ سے سوال نام و تاریخ    تصنیفوں کا یہ مقتضا ہے
ہے نام قواعد عروضی (1267ھ)    تاریخ سنایئے کہ کیا ہے
اے رشک ہے مصرع مناسب    جدول میں عروض آگیا ہے (1267ھ)

عروض کے سارے مسائل کو جدول کی صورت میں مرتب کر دینا بہت نئی بات تھی اور بلاشبہ اس سے مبتدیوں کے لیے یہ مشکل علم آسان ہو گیا تھا۔ اس نادر کتاب کی تاریخ مولف کے بھائی صغیر نے بھی اس طرح کہی تھی:

''تاریخ تالیف جدول عروض منشی بشارت علی خاں''

کشید جدول صنعت برادر مُردم خلاصہائے بنوشت دور آں مفصلہا
دریں زمانہ آخر چنانست نثرنویس شکستہ شد قلم دست فکرو......
عروض وقافیہ را آنچناں خلاصہ کرد کہ اختصار شدہ دفتر مطولہا
صغیر بینہ وزبرگفت ازمنقوط عروض وقافیہ اندرحساب جدولہا

1267ھ=1851

نہیں کہا جا سکتا کہ بشارت علی کی یہ کتاب شائع ہو سکی یا نہیں۔

3- تمکین- میر ہدایت علی

تمکین کے حالات قدرت اللہ شوق کے تذکرے کے حوالے سے لالہ سری رام نے اس طرح لکھے ہیں:

''تمکین میر ہدایت علی متوطن قصبہ کندرکی ضلع مرادآباد۔ نہایت ذہین اور طباع اور علوم وفنون عربی وفارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ خوش نویسی میں بھی یدطولی حاصل تھا۔ تمام عمر درس وتدریس میں بسر کی۔ فارسی شعر اکثر اور ریختہ بہت کم کہتے تھے''28

معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے لمبی عمر پائی تھی۔ آخر عمر میں طالب علموں کے فائدہ کے لیے ایک کتاب ہدایۃ الشعرا لکھی تھی۔ میر علی اوسط رشک سے اس کے لیے تاریخ کی درخواست کی۔ انھوں نے سات شعر کا قطعہ کہا جس میں مصنف اور تصنیف دونوں کے بارے میں ضروری معلومات محفوظ کر دی ہیں۔

زہے جناب ہدایت علی، زہے علمش شناورے ست پے بحر بیکنار نکات
نوشت مصطلحاتے کہ پیش رتبۂ او نقود جملہ نسخ شد بضاعت مزجات

خزاں گرفت بہارِ عجم ززہت او ۔ زنظم اوشدہ منسوخ نسخہ ہائے لغات
ہمہ متانت و تمکین تخلصش تمکین ۔ کلام پاک دمِ عیسوی وآبِ حیات
نہاد نام شریفش ہدایۂ الشعرا ۔ ہدایتش بہ کمال ست وصحتش بہ ثبات
بخواست ازمنِ نافہم سال اتمامش ۔ بدیں صفحات کہ یک جاشوند نام وصفات
زغیب یافتم اے رشک مصرع تاریخ ۔
ہدایۂ الشعرا جائے حلِ مصطلحات

1257ھ

اس کتاب کے بارے میں بھی تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔ پھر بھی یہ حقیقت بخوبی ظاہر ہے کہ اس زمانے میں قواعد اور مصطلحات کو عام فہم انداز سے لکھنے کی طرف صاحبان علم کی توجہ تھی۔

4- طالب- امام الدین

طالب کے حالات بس اسی قدر معلوم ہو سکے ہیں کہ اس کا نام امام الدین تھا اور۔

"علوم ظاہری اور باطنی میں شاگرد علامہ دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز کا ہے اور شعر کہنے میں خوشہ چیں ملک الشعرا نصیر دہلوی مغفور کا پچیس برس سے بیت السلطنت لکھنؤ میں وارد ہے اور کشمیری محلّہ میں استقامت رکھتا ہے۔"29

یہ عبارت بظاہر 1266ھ کی ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ طالب 1241ھ (1826) کے قریب لکھنؤ میں آیا ہوگا۔ وہ غازی الدین حیدر کا آخری زمانہ تھا اور اس وقت معتمد الدولہ آغا میر اور ان کے متوسلین کا طوطی بولتا تھا۔ انھیں میں فقیر محمد خاں گویا بھی تھے۔ طالب بہ گمان غالب ان کے وابستگان دولت میں شامل ہو گیا تھا۔

اس شخص نے عروض قافیہ سے متعلق اپنی کتاب کے سبب تالیف میں بیان کیا ہے کہ:

"ایک دن محبِ دلی شیخ ولایت علی گویا نے کہ شاگرد رشید میاں جرأت کے ہیں اور ان کی جرأت اور گویائی کے آگے اکثر شاعر دم نہیں مار سکتے ہیں اور گویا قدیم دہی ہیں اور فقیر محمد خاں گویا جدید بہ اشتیاق تمام مجھ سے فرمایا کہ اگر قواعد عروض اور قافیہ کے زبان اردو میں بیان کیجیے اور شعر اردو کے سند میں لایئے عین نوازش

ہوگی اور اس دار ناپائدار میں یادگار رہے گی اس سبب سے بندے نے یہ رسالہ عروض اور قافیہ کا زبان اردو میں لکھا اور اکثر شعرا اپنے سند میں لایا اور نام اس کا تقویت الشعرا رکھا۔ اہلِ ہند کے حق میں مفید ہے اور اوزان شعر کے لیے کلید۔ اہل سخن اگر بھول چوک ہوئی ہو معاف کریں اور عیب نہ پکڑیں کہ انسان سہو اور نسیان سے خالی نہیں۔"

اس کے بعد طالب نے گیارہ شعروں کا ایک قطعہ لکھا ہے۔ کچھ شعر یہ ہیں۔ قطعہ

بہ دورِ حضرت واجد علی شاہ — کہ ہے سب اہل فن کا وہ خبر گیر
گذرتا گر نظر سے یہ رسالہ — کہ کیا دلچسپ کی ہے میں نے تقریر
خدا اگر چاہتا اس کے صلے میں — بجائے زر مجھے دیتا وہ جاگیر
نہیں مجھ کو رسائی اس تک افسوس — کروں تدبیر کیا غالب ہے تقدیر
سنِ ہجری تھے بارہ سے چھیاسٹھ — کہ میری فکر نے کی زور تاثیر
1266

الٰہی ہو قبول اب یہ رسالہ — کہ سہل اس کو کیا ہے میں نے تحریر
کراب تو اس سے بہرہ مند سب کو — اگرچہ ہو جواں یا طفل یا پیر

اس رسالے کے مشمولات کا بیان مصنف نے اس طرح کیا ہے۔

"بنا اس رسالہ کی اوپر دو اصل اور چند فرع کی ہے۔

اصل پہلی بیچ بیان علم عروض کے۔ اس میں ایک مقدمہ اور پانچ فرع ہیں

فرع پہلی بیچ بیان بحروں کے — فرع دوسری بیچ بیان فروع اصول کے
فرع تیسری بیچ بیان زحافات اور تغیرات کے — فرع چوتھی بیچ بیان تقطیع کے
فرع پانچویں بیچ بیان مثالوں بحور کے۔

اصل دوسری بیچ بیان قافیہ کے۔ اس میں بھی ایک مقدمہ اور پانچ فرع ہیں۔

فرع پہلی بیچ بیان حروف قافیہ کے۔ فرع دوسری بیچ بیان حرکات حروف قافیہ کے
فرع تیسری بیچ بیان اوصاف روی اور القاب قافیہ کے

فرع چوتھی بیچ بیان عیوب قافیہ کے۔فرع پانچویں بیچ بیان ردیف اور حاجب کے"

کتاب کے خاتمہ کی عبارت اس طرح ہے:

"خاتمہ۔الحمدللہ کہ یہ رسالہ عروض اور قافیہ کا کہ فی الحقیقت تقویت شعرائے ہند کا ہے
تمام ہوا اور میرا نام ہوا۔اللہ تعالی طالبانِ عروض اور قافیہ کو اس سے بہرہ مند کرے اور
مجھ کو خرسند۔آمین یارب العالمین۔

قطعہ

| | |
|---|---|
| پے تاریخ کی جب میں نے فریاد | کہا یہ طبع نے مجھ سے کہ مت چینخ |
| عروض وقافیہ سے واو دونوں | گرادے تو یہی ہے صاف تاریخ" |

1266=12

1278ھ

کچھ شک نہیں کہ طالب کا یہ رسالہ اس موضوع سے متعلق اردو میں لکھے جانے والے اچھے رسالوں میں سے ہے۔زبان بھی اس کی صاف اور سلیس ہے۔

علم عروض اس زمانے میں "بادشاہ پسند علم" تھا اس لیے اس سے متعلق اردو نثر و نظم میں اس وقت اور بھی بعض رسالے لکھے گئے تھے۔طوالت کے سبب یہاں ان سب کا حال نہیں لکھا جارہا ہے۔

طالب نے اردو نثر میں مختلف موضوعات سے متعلق اور کتابیں بھی لکھی تھیں۔ان کے نام اس طرح ہیں:

"ایک رسالہ بیچ علم استخراج مواضع کواکب کے کہ نام اس کا زیج سلیماں جاہی ہے:
خلاصہ تمام زیجوں اہل ہند اور فارس کا ظاہرا مجمع البحرین یہ اور حقیقت میں مطلع
النیرین اور قران السعدین۔

دوسرا رسالہ کہ نام اس کا مجموعہ وعظیہ عزیزی ہے۔تقریر وعظ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی سورۂ مومنوں سے اول سورۂ والصافات تک جیسی کہ سنی ویسی ہی لکھی۔

تیسرا رسالہ بیچ استخراج علم جفر کے کہ نام اس کا دستور العمل ہے۔جیسا کہ استخراج صحیح اس سے ہوتا ہے سینکڑوں رسالہ جفر سے نہیں ہوسکتا ہے۔

چوتھا رسالہ کہ نام اس کا انشائے پُر بہار ہے اور الفاظ اور معانی اس کے غیرت گلزار۔"

طالب اپنے رسالہ تقویت الشعرا کی تکمیل کے بعد بھی زندہ رہا تھا لیکن بظاہر اس مدت میں اس نے تصنیف و تالیف کا کام نہیں کیا۔ خود اس کا کہنا یہ تھا کہ۔

"جس وقت اس کم نصیب کو زاہچۂ حال سے ثابت ہوا کہ قحبۂ دنیا نے مجھ سے منہ موڑا خانہ نشین ہو کر ملنا اہل دنیا سے چھوڑا اور فقر اور فاقہ کہ ورثہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اختیار کیا۔"

اور غالباً یہ بھی ایک سبب ہوا کہ عموماً اس کے ذکر سے تذکرے خالی رہ گئے ہیں۔

"زیج سلیمان جاہی" کے نام سے خیال ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں پہنچنے کے بعد مصنف کو نصیرالدین حیدر سلیمان جاہ بادشاہ کی خدمت میں رسائی حاصل ہوگئی تھی چنانچہ یہ کام اس نے محنت سے کیا تھا۔

افسوس ہے کہ طالب کے احوال کی طرح اس کی تصانیف بھی اب نایاب ہوگئی ہیں البتہ ان کے ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف علوم و فنون سے واقف تھا۔ البتہ اس کے فکر و عمل پر مذہب غالب تھا۔

اس کی کتابوں کے وجود سے یہ حقیقت بھی بخوبی سامنے آتی ہے کہ اس زمانے تک زبان اردو میں خاصی وسعت آگئی تھی اور وہ اس لائق ہوگئی تھی کہ مروّجہ خالص علمی مطالب اور مباحث کو بھی اس میں سلیقے سے ادا کیا جا سکتا تھا۔

# و - لُغت

1- رشک- میر علی اوسط

شیخ امام بخش ناسخ اور ان کے تلامذہ کی شاعری کی بنیاد "تحقیق الفاظ" پر تھی، بقول میر علی اوسط رشک۔

تحقیق لفظ کرتا ہے ہمیشہ رات دن  سقم و غلط کے حرف مرے حرف گیر ہیں

ایسے میں کتب لُغات اور فرہنگوں کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی تھی چنانچہ ذیل کے شعروں سے بھی ظاہر ہے۔

ناسخ: شام سے تا صبح ہے مجھ کو جو اب سیر لُغات
سامنے رکھتا ہوں اپنے نسخۂ فرہنگ و شمع

آغا علی مہر:

خدا کے فضل سے شوقِ لغت ہے مہر کو اتنا
دھرے رہتے ہیں پہروں نسخۂ فرہنگ سینے پر

اس زمانے تک عربی، فارسی، ترکی وغیرہ زبانوں کی لغتیں دستیاب تھیں۔ انھیں میں ضمناً اردو کے بھی کچھ کچھ لفظ مل جاتے تھے لیکن ایسی لغت جس میں اردو کے لفظوں کے تلفظ، املا، معنی

اور محل استعمال وغیرہ درج ہوں کوئی موجود نہیں تھی۔ اس ضرورت کا احساس استاد المحققین میر علی اوسط رشک سے زیادہ کس کو ہو سکتا تھا۔

اس کام کو انھوں نے خود کیا اور خوب کیا۔ زبان اردو میں ہندستانی اصل کے لفظوں کے ساتھ عربی، فارسی، ترکی وغیرہ زبانوں کے بھی بہ کثرت الفاظ مستعمل ہیں۔ رشک نے اپنی لغت میں ان کو بھی شامل کیا ہے مثلاً آبخورہ، آبرو، آبنوس وغیرہ۔ ہندستانی اصل کے لفظوں کے تلفظ کے تعین میں بھی انھوں نے غور وفکر اور تلاش وتحقیق سے کام لیا ہے مثلاً بیاز، نہ کہ بیاج اور بیازو، نہ کہ بیاجو لکھا ہے۔ یہ بہ گمان غالب مرہٹی تلفظ کا اثر ہے۔ اکثر لفظوں کا تلفظ روزمرّہ کے مطابق تحریر کیا ہے مثلاً آمپی (آپی) نہ کہ آپ ہی لکھا اور اپنے کلام میں بھی نظم کیا ہے۔

میر رشک کانپور میں مقیم تھے اور یہ علاقہ ''ملک نصارا'' کہلاتا تھا۔ یہاں انگریزی مصنوعات اور ان کے استعمال کی بہ کثرت اشیا کا چلن تھا چنانچہ رشک نے اپنی لغت میں روزمرہ کے بہت سے ایسے الفاظ داخل کر لیے ہیں مثلاً آیا، اپیل، اپیلانٹ، ارگن وغیرہ۔ اس طرح ان کا یہ لغت ہر قسم کے اردو میں مروّج لفظوں کا نہایت مفید مجموعہ بن گیا ہے۔

میر رشک نے اپنی لغت فارسی زبان میں لکھی ہے اور اس کا نام ''نفس اللغہ'' رکھا تھا جس سے اس کا سال تکمیل 1256ھ (1840) معلوم ہوتا ہے۔ افسر صدیقی امروہوی کا کہنا ہے کہ:

> ''نفس اللغہ مطبع نولکشور لکھنؤ سے مکمل چھپا تھا اور یہ مخطوطہ مطبوعہ نسخ کی نقل ہے۔ کسی نے اصل کتاب سے قبل اس کا تعارف ان الفاظ میں تحریر کیا ہے۔ لغت اردو مسمّٰی بہ نفس اللغہ تصنیف وتالیف مستند الشعرا جناب میر علی اوسط رشک کہ در عہد حضرت محمد علی شاہ بادشاہ اودھ نوشتہ شد۔ اس مخطوطے کے چند آخری صفحات ضائع ہو گئے تھے جنھیں معمولی خط کے ساتھ نقل کر کے جوڑ دیا گیا ہے۔''29
>
> لغت کا خاتمہ ان لفظوں پر ہوا ہے:
>
> ''یہ: (ف) ایں (ع) ہذا وبمعنی چہ قدر واین قدر آمدہ
>
> یہاں: (فارسی) ایں جا، یہ لوگ (ف) ایں کساں''

بعد میں نشتر نے اپنے دیباچے کے ساتھ اس لُغت کے صرف حصہ اول کو جو حرف "ت" تک ہے نیر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کر دیا تھا۔ اب اکثر کتب خانوں میں یہی دستیاب ہے جس سے یہ غلط فہمی عام ہو گئی ہے کہ "نفیس رشک" لُغت کو مکمل نہیں کر سکے تھے۔

بعد کے زمانہ میں اردو کے اکثر لغت نویسوں نے رشک کے اس لُغت سے استفادہ کیا ہے۔

# ز - مکتوب نگاری

اُنیسویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں زبان اردو میں خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ مرزاپور کے رہنے والے حُسین علی حسین تخلص کے بارے میں غلام محی الدین مبتلا وعشق نے ذکر کیا ہے کہ اس نے زبان اردوے ریختہ میں میرے پاس خط بھیجا تھا۔ میں نے بھی اس کا جواب اسی زبان میں روانہ کیا تھا۔ عام پڑھے لکھے لوگ بھی اسی بول چال کی زبان میں خط وکتابت کرتے رہے ہوں گے۔

شدہ شدہ لکھنؤ میں ،، مجلسِ مناثرہ '' منعقد کی جانے لگیں۔ شیخ مصحفی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے۔

،، شیخ مغل فانی تخلص بانی مجلسِ مناثرہ دریں شہر او شدہ۔ اول جماعتے از ہنوداں وغیرہ بہ تقریب نثر نویسی چہ در زبان اردوے ریختہ وچہ در زبان فاری دراں مجلس حاضری شدند'' بخوبی ممکن ہے کہ اس کے علاوہ ایسی اور مجلسیں بھی منعقد ہوتی ہوں اور نثر لکھی اور پڑھی جا رہی ہو۔ رفتہ رفتہ '' رقعہ خوانی '' نے فن کا درجہ حاصل کر لیا ہوگا۔ سعادت خاں ناصر نے ذکر کیا ہے۔30

''موجد رقعہ خوانی، شیخ مغل تخلص فانی۔ میاں مصحفی نے در پردہ اسے اپنا شاگرد لکھا ہے۔''31

چونکہ ذکر رقعے کا ہو چکا ہے ایک رقعہ لکھتے ہیں:

> ''کیوں سکھ چین میں نے تجھ سے کہا تھا کہ تو کڑی پکانا۔ تو اب تک باتیں بھگارتی ہے۔ ایسا نہ ہو بجلوری سی تیری ناک کاٹ ڈالوں.........'' 32

رقعہ میں صرف ان باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو ضروری اور وقتی طور پر مطلوب ہوں۔ القاب وآداب وغیرہ کی اس میں ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ خط اس کے مقابلے میں مفصل ہوتا ہے اور اس میں القاب وآداب لائے جاتے ہیں گویا وہ رقعہ کی ترقی یافتہ اور شستہ وشائستہ صورت ہوتی ہے۔ لکھنؤ میں بادشاہت کے قیام کے کچھ مدت کے بعد اردو میں خطوط نویسی کا چلن ہو گیا تھا۔

قرائن اس حق میں ہیں کہ محمد علی شاہ بادشاہ سوم کے عہد میں خط نویسی کے اصول اور ضابطے عملاً مقرر ہو چکے تھے اور کچھ مدّت کے بعد ان کے سیکھنے اور سکھانے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ اردو میں انشا کی جو کتابیں لکھی جا رہی تھیں ان میں ایک جز مکتوب نویسی سے متعلق بھی ہوتا تھا۔

1- شہید- غلام امام

ان کا حال سب سے پہلے غالباً کلب حسین خاں نادر نے لکھا تھا۔ مذکور ہے کہ ان کا نام غلام امام تھا۔ قصبہ امیٹھی کے عالی قدر مشائخ اور بڑے روٴسا میں سے تھے۔ الہ آباد میں مولانا نصیر الدین حیدر کے گھرانے میں شادی ہوئی تھی اور محکمہ صدر عدالت نظامت ودیوانی کے حاکم اول کی سرکار میں مثل خوانی کا عہدہ ان کے سپرد تھا............ مختلف النوع اسالیب نثر میں عدیم المثال تھے............

نادر کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ 1247ھ (32-1831) تک شہید الہ آباد میں تھے۔ اس کے بعد وہ آگرے پہنچ گئے اور وہیں پر انھوں نے اپنی انشا کی کتاب تالیف کی۔ خود لکھتے ہیں:

> ''کہتا ہے فقیر غلام امام شہید کہ جب کچہری صدر دیوانی کی الہ آباد سے اکبر آباد آئی اور بندہ بھی جناب بنجمین ٹیلر صاحب بہادر کی رفاقت میں یہاں آیا...... جناب ایل جیمس ٹامسن صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر کے حضور سے حکم پہنچا کہ ایک انشا مختصر کر کے اس کو

سمجھ سکیں اور اس سے لکھنے پڑھنے کی تعلیم پاویں اردو میں تیار ہو.........بجالا نا حاکم
کے حکم کا جان کر اور بھی اوراق لکھ کر اس کے چار باب مقرر کیے اور بہار بے خزاں اس
کا نام رکھا پہلا باب... نظم ونثر کے بیان میں۔
دوسرا باب بعضے دستورات اور خطوط کے قاعدوں کے بیان میں۔
تیسرا باب... رقعات میں، چوتھے باب میں دست آویزوں کا حال......اور ہر
ایک کی مثال کہ جاننا اس کا لڑکوں کو ضرور ہے۔ خدا قبول فرماوے۔ اور لڑکوں کو نفع
پہنچاوے۔''33

اس قسم کی تعلیم اور تربیت کے نتیجہ میں کچھ ہی مدت میں پڑھے لکھے نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جو مقررہ اصول وضوابط کے مطابق کاروباری تحریروں کے علاوہ، معیاری خط بھی اردو نثر میں لکھ سکتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے دوسرے اہم مراکز پر بھی نامہ نویسوں کی جماعتیں وجود میں آرہی تھیں چنانچہ مرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی نے بھی کوئی 1853 (1269ھ) میں یہ شعر کہہ کر اسی حقیقت کا اظہار کیا تھا۔

گر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

معلوم ہوتا ہے کہ نامہ نویسی نے ایک ایسے پیشے کا درجہ حاصل کر لیا تھا جو کسب معاش کا ذریعہ بھی بن گیا تھا۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ ذکر بھی مناسب ہے کہ مولوی غلام امام شہید نے اردو نثر میں یہ کتابیں بھی لکھی تھیں:

مولود شریف اور رمز الشہادتین

جیسا کہ تخلص سے ظاہر ہے وہ شاعر بھی تھے چنانچہ انھوں نے ایک کلیات کے علاوہ یہ مثنویاں بھی یادگار چھوڑی تھیں: مثنوی بلال وحنانہ، قصہ داری حلیمہ اور وفات نامہ

شہید کی نثر ونظم کی یہ کتابیں بہت مقبول ہوئی تھیں اور ان کے بعد اس قسم کی کتابوں اور رسالوں کا ہر طرف خوب رواج ہو گیا تھا۔

### 2- نامہ نویس- بادشاہی نامہ نویس

قسمت نے نامہ نویسی کے فن کو ترقی دے کر خاص پسند بنا دینے کے لیے ایک ایسی صورت پیدا کر دی جس کا کسی کو گمان بھی نہیں تھا یعنی واجد علی شاہ بادشاہ کو رجب 1272ھ (1856) کے بعد لکھنؤ چھوڑ کر نکلنا پڑا۔ ان کی کئی بیگمات اس سفر میں ساتھ نہ جا سکیں۔ اور لکھنؤ ہی میں رہ گئیں۔ ایسی صورت میں ان کے مابین خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ بعض بیگمات کے لیے نثر و نظم کا لکھنا ممکن نہ تھا اس لیے بادشاہ نے ان کے واسطے نامہ نویس مقرر کر دیے۔34 اس صورت حال نے نامہ نویسی کے فن کو خود جلا دی۔

بادشاہ کے خط ہوں یا بیگمات کے، اپنی نوعیت میں وہ عام خطوں سے مختلف ہوتے تھے۔ بادشاہ کے خط کسی عورت (بیگم) کے نام ہوتے تھے ان میں عورت کے جذبات، مزاج اور ذہنی سطح کا لحاظ کیا جاتا تھا۔ بیگمات کے خطوں میں ان کے مخصوص معاملات کو بحد امکان ان کے روزمرہ کے مطابق قلمبند کرنا ہوتا تھا۔ ان خطوں میں دونوں طرف سے جو القاب لکھے گئے ہیں اور بیان کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے اس سے طبیعتوں کی جدت طرازی کا پتہ چلتا ہے۔ بادشاہ کا ہر بیگم سے یہ اصرار تھا کہ برابر خط بھیجتی رہے اور وہ خود بھی ہر خط کا جواب روانہ کرتے تھے کیونکہ بقول ڈاکٹر کوکب قدر:

> ''نظر بند ہونے کے بعد واجد علی شاہ کی کم و بیش وہی حالت تھی جو شاعری میں ہجراں نصیب عاشق کی بیان کی گئی ہے۔ مواصلتِ جسمانی اور معانقۂ روحانی کی خواہش نے المکتوب نصف الملاقات کی راہ دکھادی اور رفتہ رفتہ نامہ نویسی نے ایسی شدت اختیار کی کہ جلا وطنی کے ابتدائی دور میں سوائے مکتوباتی ادب کے اور کوئی صنف تالیفات و تصنیفاتِ واجد علی شاہ میں نہیں ملتی۔''35

اس زمانے کے ایک خط کا اقتباس درج ذیل ہے:

> ''اے غزالہ آدمی ہمیں کوسوں نظر نہیں آتا۔ غزالہ ایک کوٹھا در بند ہمارا مسکن ہے۔ اے غزالہ در بند ہیں۔ اے غزالہ وحشت تنہائی ہے کہ دو برس سے ہمیں موچی کھولے والوں کی صورت بھی نظر نہ آئی۔ اے غزالہ سوائے خطوط نویسی مانیہا کے ہمیں کوئی

کام نہیں۔ اے غزالہ ہم تمھارے چاہنے والے ہیں۔ اے غزالہ ہزار بار تمھارا نام لکھتا چلا جاتا ہوں دل نہیں بھرتا.........''

اس کا جواب یہ ہے:

''اللہ اکبر جان عالم تمھارا ایک جگہ بیس مہینے بیٹھنا، چاند سورج کا منہ نہ دیکھنا، خدا کی قسم ذہن میں نہیں آتا۔ قیاس میں ہرگز نہیں سماتا۔ یہ تمھارا ہی حوصلہ ہے۔ یہ ظرف بادشاہوں کا بنا ہے۔ راحت بھی انتہا کی ہے۔ صعوبت بھی کڑی ہے۔ بڑے رتبہ کی ہر بات بڑی ہے۔ علاوہ اور سب تکلیفات کے کہ بے اختیاری ہیں، بہ مجبوری اور بہ ناچاری ہیں، کثرت تحریرات خطوط میں کیا کم درد سر ہے۔ یہ زحمت و تکلیف کس قدر ہے......''

دیکھنے کی بات ہے کہ القاب و آداب غائب ہو گئے۔ یہ مراسلے نہیں ہیں، مکالمے ہیں۔ صاف ستھری بول چال ہے۔ دل کا جو احوال ہے وہی لکھ دیا ہے۔

کچھ مدت کے بعد جب طبیعت رام ہو گئی تو ہر خط کا جواب بادشاہ کی طرف سے اسی طرز میں دیا جانے لگا جیسا وہ خط ہوتا تھا مثلاً کسی نے صنعت مہملہ میں لکھا تو رسید اسی صنعت میں پائی اور اگر کسی نے صنعت منقوطہ میں خط بھیجا تو جواب بھی ایسی صنعت میں ملا۔ ڈاکٹر کوکب قدر نے لکھا ہے:

> ''سرور، عشیر، مشیر، توقیر، ہنر، ہلال، شفق، زاہر، شفیع اور عباد علی وغیرہ مختلف اہل قلم نے بیگمات کی طرف سے جو خط بادشاہ کو بھیجے...... اور بادشاہ نے جو جواب دیے وہ بھی دستیاب ہو جاتے تو معلوم ہوتا کہ ان حضرات نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی دھن میں انشا پردازی کے کیسے کیسے جوہر دکھائے اور ان کے مقابلے میں تن تنہا بادشاہ نے کیا انداز اختیار کیا۔''36

اس سلسلے میں بادشاہ کے ایک خط کا یہ اقتباس لائق توجہ ہے۔

''افسر فرق جلیل ممتاز جہاں نواب اکلیل محل صاحبہ کو جان عالم کی طرف سے معلوم ہو، اے تاج فرق محبوباں رقعۂ بہزاد مرقع تمھارا عین تشنگی انتظار میں سیراب کن جان جناب ہوا۔ بحمد اللہ تعالیٰ یہاں تا تحریر رقیمہ محبت ضمیمہ ہر طرح کا فضل جناب باری

ہے اور صحت اور سلامتی اس ماہ شب چہاردہ کی ہمیشہ درگاہ خالق ارضین وسماوات سے مطلوب ہے۔"

ان مثالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بادشاہ اردو نثر کے مختلف اسالیب کے لکھنے پر قادر تھے۔

ڈاکٹر کوکب قدر کا دعویٰ ہے کہ:

"واجد علی شاہ کے خطوں میں دوم ذیقعدہ 1272ھ (مطابق 5۔ جولائی 1856) کا خط اردو نثر کا پہلا خط ہے۔ منظوم خط اس سے پہلے بھی لکھے گئے لیکن نثر میں اس خط سے قبل کا اور کوئی خط نہیں ملتا۔" 37

اس بارے میں حقائق کا ذکر شروع میں کیا جاچکا ہے۔ بادشاہ نے خطوں کے مجموعوں کو تاریخ کہا ہے مثلاً:

تاریخِ مذہب، تاریخ ممتاز، تاریخ غزالہ، تاریخ نور وغیرہ ان سے متعلق ڈاکٹر کوکب قدر نے اطلاع دی ہے کہ:

"دریافت شدہ مجموعوں کی مشترک خوبی یہ ہے کہ اردو میں ہیں، قلمی ہیں اور میاں بیوی کے درمیان نجی مراسلات کی نقل ہیں۔ ہر مجموعے میں کسی ایک فرد کے خط ہیں۔ جو مجموعے بیگمات کے خطوں کے ہیں ان کی تعداد چار ہے۔ ان کی ترتیب کا کام ذی الحجہ 1275ھ میں شروع ہوا اور ان کا دیباچہ خود بادشاہ نے لکھا ہے۔ جو مجموعے بادشاہ کے خطوں کے ہیں ان کی تعداد تین ہے۔ ان کے مرتب کرنے کا حکم ذیقعدہ 1275ھ میں دیا گیا اور ان کا دیباچہ بیگمات کے نامہ نویس حضرات نے لکھا ہے۔" 38

جس اہتمام اور سلیقے سے یہ مجموعے تیار کیے گئے تھے، اس سے قطع نظر اپنی نوعیت میں بھی یہ مجموعے اردو نثر کے سرمایہ میں قابلِ قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس تفصیل کے بعد بادشاہی نامہ نویسوں میں سے ایک دو کا مجملاً تعارف کرایا جاتا ہے۔

2- شفق- مرزا علی جان

واجد علی شاہ کی ولی عہدی کے زمانے میں یہ لکھنؤ کے خوش فکر شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔

سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے کہ:

''تحسین و آفریں کا مستحق، شاعرِ خوش فکر مرزا علی جان تخلص شفق، شاگرد میاں بحر''اس کے کچھ مدت کے بعد شفق نے اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا لیکن اس کے بارے میں محسن نے اطلاع دی ہے کہ:39

''مرزا علی جان شفق خلف مرزا جان باشندۂ لکھنؤ۔ غلام نے انکا دیوان چشم سماری کی نذر کیا کہ پڑیوں میں صرف ہو گیا، شاگرد رشید شیخ امداد علی بحر''40

معلوم ہوتا ہے کہ پھر شفق کو فرصت نہ مل سکی کہ وہ دوسرا دیوان مرتب کرتا۔ شفق کی تصانیف نظم و نثر کا حال تفصیل سے معلوم نہیں ہے۔ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اسے بادشاہ کی خدمت میں کس طرح رسائی حاصل ہوئی۔ بلکہ غزالہ کے نام ایک خط میں البتہ بادشاہ نے اتنا لکھا ہے کہ:

''اے غزالہ حسب فرمائش تمھاری علی جان شفق کو ہم نے بیس روپے مہینے کا نوکر رکھ کر تمھاری خطوط نویسی کے لیے مقرر کیا۔''41

شفق نے اپنا کام محنت سے کیا چنانچہ اس کی کارکردگی سے بادشاہ خوش تھے۔ ایک خط میں تحریر فرمایا ہے۔

''شوال المعظم کی پانچویں والے خط میں شفق نے بڑا زورِ طبیعت دکھایا۔ سبحان اللہ کیا کہنا۔ شاباش۔''

بادشاہ اور ملکہ کی خوشنودی کا فائدہ یہ ہوا کہ جب ملکہ غزالہ کلکتہ گئیں تو یہ بھی ساتھ گئے۔ وہیں رہے اور پھر وہیں مرے۔

شفق قطعات تاریخ بھی اچھے کہتے تھے چنانچہ بادشاہ کی تصانیف کلیاتِ اختری، قمر مضمون اور مطبع سلطانی کی بعض دوسری مطبوعات میں بھی ان کے قطعے شامل ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شفق 1295ھ تک زندہ تھے۔ ڈاکٹر کوکب قدر نے لکھا ہے:

''تاریخ غزالہ کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شفق خطوں کے ساتھ مثنویاں اور غزلیں بھی بھیجا کرتے تھے۔ اس عشقیہ کلام کا اب کوئی بھی نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا۔''

شفق کے حالات اور ان کی نظم و نثر اگر دستیاب ہو جاتیں تو خیال ہے کہ وہ ضرور قدر کی نگاہ

سے دیکھی جاتیں۔ شفق کے دو شعر نمونہ کے طور پر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

شفق جی بھر کے رولو جیتے جی کر جاؤ غم اپنا — طمع دو آنسوؤں کی بھی نہ رکھو اہل دنیا سے
محفل میں شمع ساں نہ جلاؤ پرائے دل — کیوں ٹھنڈی سانس بھرتے ہو غیروں کے واسطے

شفق کا شمار اپنے زمانے کے استادوں میں ہوتا تھا۔ نساخ نے ان کے ایک شاگرد کا ذکر اس طرح کیا ہے:

'' امداد تخلص مرزا امداد علی شاگرد علی جان شفق باشندۂ لکھنؤ، مقیم کلکتہ۔ یہ شعر اس تذکرے کے لیے بھیجے تھے۔

پھیر دیجیے آپ دل امداد کا امداد کو — سچ تو یہ ہے گر پسند خاطر عالی نہ ہو
مجھ کو بوئے عاشقی آتی ہے اس تحریر سے''42 — پڑھتے ہی نامہ مرا کہنے لگا وہ رشک گل

4- فارغ- میر علی حسین

عبدالغفور خاں نساخ ان کے بھی جاننے والے تھے۔ اپنے تذکرے میں انھوں نے لکھا ہے:

'' فارغ تخلص میر علی حسین ولد میر نوروز علی باشندۂ لکھنؤ مقیم موچی کھولا شاگرد محب علی طوبا برادر یعنی جمشید بیگم ممتوعہ واجد علی شاہ بادشاہ۔''43

فارغ کے دو بھائی تھے یعنی میر عنایت حسین اور میر امداد حسین۔ نساخ کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر بھی شاعر تھا۔

'' عادل تخلص میر عنایت حسین ولد میر نوروز علی لکھنوی مقیم کلکتہ برادر جمشید محل زوجۂ واجد علی بادشاہ شاگرد مرزا محب علی طوبا۔''44

معلوم ہوتا ہے کہ امداد حسین جو سب سے چھوٹا تھا اس وقت تک شعر نہیں کہتا تھا۔ افسوس ہے کہ محب علی طوبا کا حال بالکل معلوم نہیں ہو سکا۔

لکھنؤ میں جمشید بیگم کا گھرانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ان کے دو بھائی شاعر تھے، ان کی ایک چچی پڑھی لکھی تھی البتہ وہ نثر نویسی کی لیاقت نہیں رکھتی تھی۔45 ڈاکٹر کوکب قدر کے بیان کے مطابق جمشید بیگم لاولد رہیں اس لیے ''محل'' کے رتبہ تک نہیں پہنچ سکیں۔ قیصر باغ کی

تباہی کے بعد یہ بھی پریشان ہوگئیں۔ پھر بادشاہ سے اجازت ملنے کے بعد محرم 1276ھ (1859) میں اپنی ماں اور بڑے بھائی (فارغ) کے ساتھ کلکتہ کے لیے روانہ ہوگئیں۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد بیگم کو ستر روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ اس زمانے میں ''چٹھی نویسی'' کا کام لکھنؤ میں عورتیں بھی کرتی تھیں۔ جمشید بیگم کے بعض خط کسی عورت ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ نامہ نویسی کا کام وہ اپنے بڑے بھائی فارغ سے بھی لے لیتی تھیں لیکن ان کی علمی استعداد بس واجبی سی تھی۔ اس لیے وہ عموماً عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی کرتے تھے۔ جمشید بیگم کے کچھ خط منشی مظفر علی ہنر نے بھی لکھے تھے۔ ان کے خطوں کے مجموعے کا نام ' تاریخِ جمشیدی'' رکھا گیا تھا اور اس کی ترتیب کا کام بھی ہنر نے کیا تھا۔ ڈاکٹر کوکب قدر نے لکھا ہے کہ:

''اس مجموعے کے خطوں میں صرف دو خط مکمل منظوم ہیں۔ باقی تمام خط نثر میں ہیں اور اکثر میں پانچ شعر کی غزلیں ''تفریحِ طبع'' کے لیے درج کی گئی ہیں۔ غزلوں میں تخلص جمشید ہے لیکن شروع کی غزلوں میں واضح طور پر اس کا اظہار ملتا ہے کہ ان کا مصنف کوئی اور ہے۔''46

5- ہنر- مرزا مظفر علی

ہنر بادشاہ کے مقرب اور مصاحب تھے۔ خود بادشاہ نے لکھا ہے کہ:

''ہنر داخلِ سبع سیارہ، کتب خانہ کے داروغہ کی نالائقی کی جہت سے کلام اس کا ہر وقت کتابت دستیاب نہ ہوا مگر شاعر خوشگو، میرا شاگرد وملازم ہے۔''47

نساخ نے ان کے بارے میں ضروری معلومات قلمبند کی ہیں، اس طرح:

''ہنر تخلص مرزا مظفر علی ولد مرزا امام علی باشندۂ لکھنؤ مقیم کلکتہ شاگرد میر وزیر علی صبا، ان سے کلکتہ کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی تھی۔ شعر اچھا کہتے تھے۔''48

ان کی مقبولیت کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ کلکتہ چلے جانے کے بعد بھی لکھنؤ والے ان کے نام اور کلام کو یاد کرتے تھے چنانچہ کلب حسین خان نادر نے ان کی ایک غزل پر خمسہ لکھا تھا۔ مطلع یہ ہے۔

بوسے جو یار نے دیے پیہم تمام شب بخشش کیا کیا مراحاتم تمام شب

تاریخ جمشیدی کے خاتمہ کی عبارت ''فدوی نمک خوارازلی مظفر علی ہنر'' نے 26۔محرم 1276ھ (1859) میں لکھی تھی اور اس مجموعے کی تالیف کا کام ذی الحجہ 1275ھ میں شروع ہوا تھا۔اس کے ایک خط میں ہے کہ:

''اس زمانے میں ہمارے منشی کو بھی بہ حسن جوہر شناسی سرفراز کیا یعنی پچیس روپے مہینے کا نوکر رکھ لیا۔ سچ ہے شرفا اسی دن کے واسطے اکتساب علم وہنر کرتے ہیں کہ مقبول خواطر قدسی مناظر سلاطین روزگار ہوں اور لائق خدمات شائستہ وقابل دربار زربار ہوں۔''48

ہنر کے حالات میں ڈاکٹر کوکب قدر نے تحریر کیا ہے کہ:

''ہنر واجد علی شاہ کی حیات تک ان کے مصاحب رہے.........مطبع سلطانی کلکتہ کی اکثر کتابوں میں ہنر کے قطع شامل ہیں اور واجد علی شاہ کے انتقال پر ایک عبرت انگیز قطعہ تاریخ ان ہی کی فکر کا نتیجہ ہے۔ بادشاہ کے بعد انگریزی حکومت نے پرورش کے لیے تیرہ روپے ماہوار وظیفہ ہنر کا مقرر کر دیا تھا۔ مٹیا برج کی تباہی پر متوسلین شاہی نے ایک انجمن گلدستہ اتحاد، کے نام سے قائم کی تھی۔ ہنر کئی سال تک اس انجمن کے سکریٹری رہے اور آخر الامر 21۔اپریل 1896ء میں فوت ہو کر اسی انجمن کے تکیہ میں سپرد خاک ہوئے۔ ہنر کی یادگار وہ انجمن ایک نئے نام سے آج بھی ادبی، مذہبی، اور سماجی خدمات انجام دے رہی ہے۔''49

ہنر کی مذکورہ انجمن کا نام اب ''انجمنِ محمدی'' معلوم ہوتا ہے۔

جمشید بیگم کے خطوں کے مجموعہ کا ایک قلمی نسخہ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ کیفیت اس کی اس طرح ہے:

''افسرالتواریخ جمشید بیگم مرتبہ: مظفر علی ہنر/اوراق: 57 سطریں: 11۔''50

اس نام کے بارے میں ڈاکٹر کوکب قدر کا کہنا ہے کہ:

''بنی کی فہرست میں یہ مجموعہ اپنے اصلی نام (تاریخِ جمشیدی) سے درج ہے۔ افسرالتواریخ نام کی نہ کوئی سند ملتی ہے اور نہ یہ نام دوسرے ناموں سے مطابقت رکھتا ہے۔''51

ہنر واقعی ہنرمند شخص تھے۔ غزل کے علاوہ وہ تاریخیں بھی بہت اچھی اور برمحل کہتے تھے۔
بادشاہ کی کتاب ''دولہن'' کی تاریخ اس طرح کہی تھی۔ ع

شرمندہ ہوگی ہر دولہن اب اس دولہن کے سامنے

1290ھ

بادشاہ کی وفات کے موقع پر سات شعر کا قطعہ کہا تھا۔ اس کا پہلا اور آخری شعر یہ ہے۔

حضرتِ سلطانِ عالم جابسے زیرِ زمین    تھی یہ آخر گردش افلاک مٹیا برج میں
مصرع سالِ مسیحی مُخبر حالات ہے    اب اُڑے گی چار جانب خاک مٹیا برج میں

لالا سری رام نے بادشاہ کے حالات میں تحریر کیا ہے:

''اس غریب الوطنی میں بھی بیس ہزار متوسلین حضرت کے ہم رکاب رہے اور سب کے ساتھ خلیق الوسع وہی سلوک، وہی برتاؤ برقرار رکھا جو زمانہ سلطنت میں رہا تھا۔'' 52

اس بیان میں اگر کچھ مبالغہ ہو تو بھی لکھنؤ سے کلکتہ آنے والوں کی تعداد بلاشبہ ہزاروں میں تھی۔ بادشاہ اور ان کی بیگمات کے علاوہ ان کے نامہ نویس بھی اپنے اعزا اور اقربا کو خط بھیجتے رہے ہوں گے اور ان خطوں کا معیار بھی کچھ گرا ہوا نہ ہوگا۔ عوام کے خطوط ان کے علاوہ ہوں گے اور ان کی تعداد بھی بہت ہوگی۔ اس طرح تسلیم کرنا چاہیے کہ بادشاہ کے فیض سے لکھنؤ اور کلکتہ کے درمیان اچھے برے، شخصی، علمی، مذہبی ہر قسم کے خطوں کا تانتا بندھ گیا ہوگا اور چٹھی نویسی کے پیشے اور فن نے بھی خوب ترقی کی ہوگی۔ بظاہر ایسی ترقی کسی ایک فرد کے اثر سے کبھی وقوع میں نہ آئی ہوگی۔

## ح - سفرنامے

احمد شاہ بادشاہ کے وقت سے دلّی کے خانہ برباد فیض آباد میں، پھر لکھنؤ میں آکر سر چھپاتے رہے ہیں۔ جلا وطنی کے اس عالم میں وہ اپنے بزرگوں کے اور آبائی وطن کے واقعات، قصے کہانی کی صورت میں نئی نسل کو سناتے رہے ہوں گے۔ انھیں میں ان کے سفر کے تذکرے بھی ہوتے ہوں گے۔ انھیں تذکروں نے لکھنؤ میں ایسے حالات پیدا کر دیے تھے جن میں سفر کے واقعات کو قلمبند کر دینے کی تحریک ہوتی تھی۔ اسی صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں نثر و نظم میں اس زمانے میں کئی سفرنامے لکھے گئے تھے۔

### 1- یوسف خاں

اردو میں تا حال جتنے سفر نامے دستیاب ہوئے ہیں ان میں سب سے قدیم غالباً ''تاریخ یوسفی'' ہے جس کا مصنف یوسف خاں تھا۔ اس نے اپنے حالات اس طرح لکھے ہیں۔

> ''میں 1828 مطابق 1244ھ میں اپنے وطن خاص حیدرآباد کو چھوڑ کر نکلا۔ شاہجہاں آباد وغیرہ ہوتا ہوا بیت السلطنت لکھنؤ پہنچا۔ کپتان ممتاز خاں کے واسطے سے نصیر الدین حیدر سلیمان جاہ کے رسالہ خاص سلیمانی میں عہدۂ جمعدار پر ملازم ہوا۔ ترقی کر کے صوبیدار ہوگیا۔ علم انگریزی کی تحصیل کا شوق ہوا۔ پھر تواریخ کی کتابیں

پڑھیں۔ نئے شہروں اور ملکوں کے حالات سے محظوظ ہوتا رہا۔ اچانک دل سیاحی کی طرف مائل ہوا۔ بادشاہ سے دو برس کی چھٹی لے کر کلکتہ پہنچا۔ چھ ماہ وہاں کی سیر کی۔ 30 رمارچ 1873 کو جہاز میں سوار ہو کر جو دریائے گنگا سے گذر کر 3، اپریل کو کھلے سمندر میں روانہ ہوا۔ 31، اگست 1837 کو انگلستان پہنچ گیا۔''

نصیر الدین حیدر کی انگریز نوازی مشہور ہے۔ ان کے زمانے میں اگر یوسف خاں کو انگلستان کی سیاحت کا شوق ہوا اور اس کام کے لیے اگر انھوں نے ''عنایت اور انعام'' سے اسے نوازا تو اس میں تعجب کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یوسف خاں نے اپنا سفرنامہ فارسی میں لکھ کر 1259ھ/1843 میں اسے مرتب بھی کر لیا تھا۔ بعد میں اس نے اسے اردو میں لکھا۔ فارسی متن پر مصنف کا نام یوسف خاں گلیم پوش لکھا ہے اور اردو متن یوسف خاں کمبل پوش کے نام سے پنڈت دھرم نرائن ناشر نے دہلی میں 1847 میں چھپوا کر شائع کیا۔ سبب تالیف میں مؤلف نے لکھا ہے۔

''اس عاجز نے اکثر اوقات اپنی سیر مختلف ملکوں میں بسر کی اور کیفیت عجائبات زمانہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اکثر دوستوں پر روداد سفر عیاں کی، انہوں نے نہایت محظوظ اور مشتاق ہو کر مجھ کو آمادۂ تالیف کیا۔ ناچار بے بس خاطر ان کی فقیر نے جو کچھ سفر میں دیکھا بھالا تھا اس رسالہ میں مفصل لکھا.......... چونکہ اس کتاب میں سب حال اپنا گذرا بیان تھا، نام اس کا تاریخ یوسفی رکھا۔''

یوسف خاں لندن، وہاں کے لوگوں اور عجائبات سے نہایت متاثر ہوا تھا۔ ایک جگہ لکھتا ہے:

''کیا خوب شہر لندن ہے۔ لوگ وہاں کے مسافروں پر ایسی عنایت کرتے ہیں کہ ماں باپ بیٹوں کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ فقیر نے سفر بہت شہروں کے کیے مگر صاحب مروت ایسے نہیں پائے۔ انگریز جو ہندوستان میں آتے ہیں مزاج میں بدل جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو ان سے کچھ نسبت نہیں۔''

یوسف خاں نے وہاں شراب بھی پی تھی۔ اس کا عمل اُس مصرع پر معلوم ہوتا ہے کہ

ع خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

چنانچہ اس نے بیان کیا ہے کہ:

"وہاں کے مالک نے بہت اخلاق سے ملاقات کی اور شراب انگوری ہم کو پلائی۔
عجیب ذائقہ کی تھی کبھی دل سے نہیں بھولتی۔ ایک شخص قوم غلائی سے میرا نوکر تھا اس
نے مجھ سے کہا: تم مذہب مسلمان رکھتے ہو۔ شراب کیوں پیتے ہو؟ میں نے جواب دیا
کہ حضرت پیغمبرؐ نے شیرۂ انگور کو منع نہیں کیا۔"

اس سفر نامہ کی عبارت اکثر مقاموں پر مقفّٰی بھی ہے۔ بعض جگہوں پر مصنف نے فارسی اور اردو کے شعر بھی نقل کیے ہیں مثلاً:

انگلستان میں ایسی ایسی عجیب چیزیں اور تماشے دیکھے کہ ہندوستان میں کانوں سے نہ سُنے تھے۔ خدا اس شہر کو قیامت تلک قائم رکھے اور وہاں کے فرماں روا کو مدد بخشے۔ شعر

عجب شہر ہے وہ، عجب شہر یار پُر از حکمت ولطف ہے وہ دیار

مصنف نے اپنے سفر نامہ کو ذیل کی عبارت پر ختم کیا ہے:

"ایک وہ دن تھے کہ میں انگلستان میں پریوں کے ساتھ چلتا پھرتا تھا۔ رات کو نفیس باجوں کی آواز سنتا تھا۔ ایک یہ وقت ہے کہ اس مکان ناہموار میں چڑیلوں کی پڑوس میں رہ کر صورت کریہہ ان کی دیکھتا ہوں اور رات کو ان کی آپس کی لڑائی کے شور وغل سے سو نہیں پاتا ہوں۔ ولایت لندن میں پریوں کی سیر دیکھتا دو کانوں خوش قطع کے نظارے کرتا، بارش برف کا عجب عالم تھا۔ نسیم خوشگوار بہاری سے دل شگفتہ ہوتا۔ سینکڑوں گھوڑے نفیس نظر آتے۔ راگ معشوقوں کے دل پر اثر کرتے۔ یہاں بجائے گھوڑوں کے گدھے اینٹوں کے لدے رات کو دوڑتے دکھائی دیتے ہیں اور بجائے پریوں کے چڑیلوں کے منہ نظر پڑتے ہیں۔ جس مکان میں رہتا ہوں قریب اس کے اجلاف لوگ رہتے ہیں۔ ان کی عورتیں رات کو شراب پی پی کر درجہ بدرجہ ہمسایوں کو گالیاں دیتی ہیں۔ اگر بالفرض تھک کر چپ رہتی ہیں مرد ان کے بدمست ہو کر آلھا گاتے ہیں، دماغ کو پریشان کرتے ہیں۔"

انسان کا حال عجیب ہے۔ خود شراب پیتا ہے اور اس پر شرمندہ نہیں ہوتا۔ غریب ہندستانی یہی کریں تو ان سے اس کا دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے یوسف خاں اور اس کے

سفرنامے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جس ماحول میں روزگار اور تعلیم کے لیے بھی سفر نہ کیا جاتا تھا اس میں یوسف خاں کا پہلے انگریزی زبان سیکھنا اور پھر صرف سیاحت کی غرض سے عازم سفر ہونا اسے بے غرض مسافر اور خالص سیاح ثابت کرتا ہے کہ یہ صرف مَن کی موج کی وجہ سے گھر سے نکلتا ہے۔ بے غرض مسافر اور خالص سیاح کے پاس مشاہدہ کو باریک بین نگاہ اور تجسس پسند طبیعت ہوتی ہے اور یوسف خاں کے مشاہدے کا یہ عالم ہے کہ وہ جب بھی کسی شخص، مقام وقوع یا واقعہ کا تذکرہ کرتا ہے تو کسی افسانہ نگار کی مانند جزئیات نگاری کا حق ادا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ معمولی سی باتوں میں بھی دلچسپی اور تجسس کا رنگ بھر دیتا ہے۔''53

اور ڈاکٹر انور سدید کا تاثر یہ ہے کہ:

''یوسف خاں ابتدا میں لندن کا محض تماشائی نظر آتا ہے لیکن جیسے جیسے وہ اس شہر سے بے تکلف ہوتا ہے یہ شہر بھی اپنے اسرار کھولتا چلا جاتا ہے اور سفر کے اختتام پر تو وہ اس شہر کا باسی نظر آنے لگتا ہے۔ ان خوبیوں کی بنا پر یہ سفرنامہ آج بھی تازہ نظر آتا ہے۔''54

کہا جا چکا کہ یوسف خاں اودھ کے بادشاہ نصیر الدین حیدر سے دو برس کی چھٹی لے کر انگلستان گیا تھا۔'' تعجب یہ ہے کہ اس کے سفرنامہ کو شاہی کے زمانے میں لکھنؤ میں چھپنا نصیب نہ ہوا۔ کئی برس کے بعد جب زمانے کی ہوا بدل گئی، اس شہر میں اس کی طباعت کی صورت ہوئی۔ اس کے سرورق کی عبارت اس طرح ہے:

''عجائبات فرنگ یعنی کیفیت سفر یوسف خاں کمبل پوش منلک انگلستان میں یہ کتاب 1847 میں بہ مقام دہلی طبع ہوئی تھی اور چونکہ مصنف اس کا باشندہ لکھنؤ کا تھا اور مالک مطبع سے بھی اس کی ملاقات تھی تو یہ تحفہ یادگار باشندہ اس صوبہ کا سمجھ کر حسب تحریک مسٹر جوزف جو بانس صاحب جو اخلاق و مروت میں بے عدیل اور فن فوٹو گرافی وغیرہ صناعت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں۔

ماہ ستمبر 1873 میں مطبع منشی نول کشور میں بہ طبع مزین مطبوع ہوئی۔''

افسوس ہے کہ اب مذکورہ صورت حال کے بارے میں وثوق سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ اس دوسری اشاعت کے وقت یوسف خاں زندہ بھی تھا یا نہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں پاکستان میں یہ سفرنامہ ایک سے زائد بار چھپ کر شائع ہوا ہے۔

2- شاہ اودھ کا سفرنامہ

انگریزی حکومت کے آخری زمانے میں ہندوستان کے بادشاہوں اور شاہزادوں وغیرہ کے عبرتناک واقعات کو شائع کرنے کا شوق عام ہو چلا تھا۔ خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنؤ کے رہنے والے اور اس شہر کے عاشق و شیدائی تھے۔ ان کی ترتیب کی ہوئی پہلی کتاب 'سیر اودھ' ہے۔55 جس میں اودھ کے بادشاہوں کے حالات، خاندان اودھ کے امرا کی کیفیت، محلاتِ شاہی کی فیاضیاں، لکھنؤ کی تمدنی حالت، شہر کی آبادی اور عماراتِ قدیم کا تذکرہ ہے' ان کا کہنا ہے کہ ''علمی مذاق کے ہر شعبہ میں ایک نہ ایک تصنیف (واجد علی شاہ) بادشاہ کی موجود ہے۔''56

خواجہ عشرت کی تحریروں کو واجد علی شاہ کے سلسلے میں ڈاکٹر کوکب قدر نے بھی کما حقہ، اہمیت دی ہے۔ تعجب ہے کہ عشرت نے بادشاہ کا جو سفرنامہ ماہنامہ ''ساقی'' دہلی کے سالنامہ 1945 میں شائع کیا ہے انھوں نے اس کا بالکل ذکر نہیں کیا ہے۔ عشرت نے اس کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے:

> ''مرحوم شاہ اودھ کا حسرت ناک سفرنامہ بہ قلم خود'' اس میں لکھنؤ سے ملیا برج پہنچنے تک کے حالات کا بیان کیا گیا ہے۔

بادشاہ نے اپنے اس سفرنامہ میں آغازِ سفر کا احوال اس طرح قلمبند کیا ہے:

> ''آخر میراں جی (ربیع الثانی) کی ستائیس تاریخ 1271ھ پنجشنبہ کا دن عمر بھر نہ بھولے گا جب کہ مجھ کو اپنی سلطنت سے جدا ہونا پڑا، گویا بلبل سے گلزار چھوٹا، یوسف مصر سے نکلے، بوئے گل چمن سے جدا ہوئی............''57

بتایا گیا ہے کہ واجد علی شاہ کی والدہ ملکہ کشور آرا بیگم، بھائی سکندر حشمت اور ولی عہد کے علاوہ پانچ چھ بیبیاں ساتھ تھیں۔ لکھنؤ سے روانگی کا حال اس طرح لکھا ہے کہ:

''رجب کی پانچویں تاریخ شب پنجشنبہ کو لکھنؤ سے کوچ ہوا گویا روح قلب سے جدا ہوئی۔ کچھ ماحضر ساتھ لے لیا تھا۔ کانپور میں برنڈن صاحب کے بنگلہ میں رجب کے مہینہ بھر قیام رہا۔ شعبان کی پہلی تاریخ کو الہ آباد روانہ ہوئے۔ آٹھ روز وہاں قیام رہا۔ وہاں سے بنارس آئے۔ مہاراجا بنارس نے بہت کچھ خدمت کی۔ اسی کی کوٹھی میں قیام رہا۔ بنارس سے دخانی جہاز پر سوار ہوئے۔ کچھ سفر کی تکان، کچھ تبدیلی آب وہوا، کچھ اعزا کی جدائی، کچھ سلطنت کا صدمہ، کچھ شہر و دیار کا چھوٹنا ان سب اسباب نے ہم کو علیل کر دیا۔''

بادشاہ نے اس بیماری سے شفایاب ہونے کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

''اس زمانے میں بہت بیمار تھا۔ کسی طرح افاقہ نہ ہوتا تھا۔ صفراوی تپ نے دق کر دیا تھا۔ آخر تبرید کے بعد صحت ہوئی اور میں بالکل تندرست ہو گیا۔ جس قدر نذر نیا .. ںی گئی اس کے لیے ایک جلسہ کیا گیا۔ تمام ملازمین اور سب محلات طلب کیے گئے۔ رات بھر چہل پہل ناچ گانا ہوا کیا۔ قہقہے مچا کیے۔ کوئی چار گھڑی باقی ہوگی کہ جلسہ برخاست ہوا۔''

واجد علی شاہ بڑے زندہ دل بڑے حوصلہ مند شخص تھے۔ لکھنؤ میں عملاً انگریز کی قید کے باوجود بادشاہت کر گئے اور جلاوطنی کے سفر میں بھی جس حد تک اور جس طور پر ممکن ہو سکا دن رات خوشی سے کاٹ دیے۔ بڑے بے حس بلکہ ظالم ہیں وہ لوگ جو اپنے حالات پر نظر کیے بغیر بادشاہ کے معاملات اور معمولات پر زبان دراز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کا کہنا ہے کہ:

''اس سفرنامے کی سب سے بڑی خوبی اس کی جذباتی نثر ہے۔''

### 3- سفیر اودھ کا سفرنامہ

کلکتہ پہنچنے کے بعد بادشاہ نے شیدا بیگم کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ'' بے سلطنت لیے ارادہ میرا لکھنؤ آنے کا نہیں ہے۔''58 اس مقصد سے انھوں نے ''برخوردار سعادت اطوار مرزا ولی عہد بہادر، اپنے چھوٹے بھائی مرزا سکندر حشمت بہادر کو بہ امید دادیابی کے روانہ دارالسلطنت لندن کیا'' قافلے میں ان دو کے علاوہ اور بھی چند لوگ تھے جن میں سب سے اہم بلکہ کلیدی

شخصیت ''سفیر الدولہ مولوی محمد مسیح الدین خان بہادر کاکوروی'' کی تھی۔59انھوں نے اپنا سفرنامہ بھی لکھا تھا جو الناظر پریس لکھنؤ سے 1929 میں ایک سو چوالیس صفحوں پر شائع ہوا تھا۔اس میں انھوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ:

''قریب دو برس کے ہیں خانہ نشین رہا کہ اتنے میں اودھ کے سلطنت سرکار انگریزی نے ضبط کر لی۔ جس دن ضبطی کا حکم بادشاہ کو سنایا گیا راقم اپنے گھر میں تھا۔ بہ تاکید میری طلبی ہوئی اور بادشاہ نے اپنے پاس بلا کے مجھے نہایت تاکید سے تیسرے دن ضبطی کے کلکتہ کی روانگی کا حکم دیا ... بادشاہ کو اس کے خیر طلبوں نے صلاح دی تھی کہ بہ ذات خود انگلستان کی طرف روانہ ہوں اور مرافعہ اپنی مظلوی کا ملکہ معظمہ کے حضور میں اور پارلیمنٹ میں بہ ذات خود اصالتاً پیش کریں۔ حقیقت میں یہ رائے بادشاہ کے واسطے بہت بہتر تھی۔ مگر چونکہ جبلت سے ضعیف القلب ہیں اور دریا کے سفر سے ان کو نہایت خوف و خطر تھا کلکتہ پہنچ کر رائے بدل گئی۔ اپنی عزیمت موقوف کی۔ ملکہ کشور اپنی والدہ ماجدہ کو اور مرزا حامد علی بہادر ولی عہد کو اور مرزا جواد علی سکندر حشمت اپنے بھائی کو جو اپنے باپ کے وقت میں جنرل کہلاتے تھے ولایت کی روانگی کے واسطے تجویز کیا اور راقم کو سفیر مقرر کیا۔''

یہ قافلہ 18۔ جون 1856 کو کلکتہ سے انگلستان کے لیے روانہ ہوا۔ کوئی ساڑھے سات برس وہاں رہ کر وطن کی طرف لوٹے۔ راستہ میں مکہ مکرمہ میں حاضری کا خیال ہوا چنانچہ مولوی مسیح الدین (سفیر الدولہ) حجاز چلے گئے۔اس کا ذکر خود انھوں نے اس طرح کیا ہے:

''ارادہ تھا کہ مفلسانہ وہاں سے مکہ معظمہ جاؤں، اس واسطے کہ جن نجاسات میں راقم مبتلا رہا تھا۔ بغیر زمزم کے دھونے کے طہارت ممکن نہ تھی۔ اگرچہ میرے عقیدے میں لندن میں کچھ نجاست نہ تھی۔''

اس اقتباس کا آخری فقرہ اس ذہنی پریشانی کا مظہر ہے جس میں یہ سفیر اودھ مبتلا تھا۔''

بادشاہ نے دادرسی کے لیے اس قافلہ کو لندن بھیج تو دیا تھا لیکن ان افراد کے خلوص اور ان کی واقعی کارگزاری سے وہ بہت بے خبر بھی نہیں تھے چنانچہ ان کے ایک خط میں ہے کہ:

''لندن میں یہ حال ہے بھائی صاحب، یہ چاہتے ہیں کہ مجھے سلطنت ہو، صاحبزادے صاحب یہ چاہتے ہیں کہ مجھے ہو۔ چچا بھتیجے میں قرار واقعی جوتا اچھل رہا ہے۔ ہم یہاں علیل پڑے ہیں۔ ہمیں کوئی نہیں پوچھتا۔ خدانخواستہ اگر وہاں یہی حال ہوا تو کمپنی مجھے جیتا نہ چھوڑے گی۔ خدا جانے کیا گت اور نوبت میری ہوگی۔ اب تو یہ مدعی قرار واقعی دشمن ہو چکے ہیں۔''60

مولوی صاحب کو کارِ سفارت سے زیادہ دلچسپی اپنے لیے ''عزت و امتیاز کی راہ'' تلاش کرنے سے تھی۔ اس کوشش میں وہ اتنے مصروف تھے کہ شہر کو بھی سیاح کی نظر سے نہ دیکھ سکے۔ لکھتے ہیں۔

''اس امر کے اظہار سے راقم کو باک نہیں کہ مجھ سا بدلیاقت، ناقص اور ناتمام اپنے جوہر ذاتی میں اس وقت تک جس کی عمر ستر برس کو پہنچی جناب اقدس الٰہی جل شانہٗ نے محض اپنے لطف و کرم سے بدوں استحقاق کے اس کو اس مرتبہ اور ناموری پر پہنچایا کہ جس نے میرے آباؤ اجداد کی جو شہرت اور بلند پائیگی تھی اس کو روشن کیا۔ انگلستان میں سلطانہ برطانیہ اعظم اور آئرلینڈ اور ہندوستان وغیرہ یعنی ملکۂ معظمہ وکٹوریہ دام اقبالہا و حشمتہا جس کا جھنڈا شوکت اور عظمت کا اکثر کرۂ عالم پر اڑ رہا ہے اس کے دربار میں راقم نے عزت اور امتیاز کی راہ پائی اور ان کے کھانے کی میز پر مدعو ہوا تھا۔ اگرچہ یہ اقتضائے تقدیر کے کا اس ظہور نہ ہوا.... آنریبل مسٹر گلیڈسٹون......اور ان کی لیڈی نے اپنی صحبت شبینہ میں جہاں تمام ارکین سلطنت و وزرا اور امرا جمع تھے دو دفعہ اپنا رقعۂ طلب کا بھیج کر شرکت سے راقم کو مشرف کیا۔''

اس قسم کے بیانوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اودھ کا شاہی سفارتی وفد انگریزوں سے کس حد تک مرعوب تھا اور خود اپنے منصبی فرائض میں کہاں تک مخلص تھا۔ اس سفرنامہ سے اس زمانے کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات کا بھی کم و بیش علم حاصل ہو جاتا ہے۔ مولوی مسیح الدین کے اس سفرنامے کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید کا کہنا یہ ہے کہ:

'' سفرنامہ ایک ایسے دور میں لکھا گیا تھا جب سوانح اور سفرنامے کی روایت مستحکم نہیں ہوئی تھی۔ سفر کی زیادہ سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ اس سفرنامے نے مستقبل کے مصنفین کو

اس صنف کی طرف متوجہ کرایا اس لیے اپنی جملہ خامیوں کے باوجود ابتدائی دور کی سفرناموں میں یہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔''61

یہاں تک جن سفرناموں کا ذکر کیا گیا وہ اردو نثر میں لکھے گئے تھے۔ان کے علاوہ اہلِ لکھنؤ نے بعض ایسی نظمیں بھی لکھی تھیں جن میں سفرنامہ کی کیفیت پائی جاتی ہے۔طوالت کے خوف سے ان میں سے صرف دو منظومات کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

## 4- حُزنِ اختری

حُزنِ اختری واجد علی شاہ کی ایک مشہور مثنوی ہے۔اسے بادشاہ کی منظوم سوانح بھی کہا گیا ہے۔ یہ مطبع سلطانی کلکتہ میں محمد عبدالرحمٰن احسن کی کتابت سے 77 اوراق پر 1276ھ میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ بتایا گیا ہے کہ:

> '' صفحہ اول سادہ ہے، صفحہ 2 منقش لوح، زیرِ محراب تمغائے واجدی، بعدازاں لوح بسم اللہ اس کے بعد تین شعر حمد، چار شعر نعت اور نو شعر منقبت میں کہنے کے بعد چوتھے صفحے ساقی نامہ، احوال ضعف در قید خانہ، کی ابتدا ہے۔ ہر صفحے پر تین جانب دو انگل چوڑی خوشنما بیل اور رشتے کی جانب عرض میں تقریباً ایک سینٹی میٹر نازک سی بیل ہے۔ آخر میں کاتب کا ایک قطعہ تاریخ طبع ہے۔

الغرض مطبوع شد احسن زحکم گفتمش تاریخ حُزنِ اختری'' 62
1276ھ

اس مثنوی میں آخر 1272ھ سے 1274ھ تک کے واقعات نظم ہوئے ہیں چنانچہ ذیل کے شعروں میں ہے۔

مگر سَن پلٹ کر بہتر ہوئے اور کہ ہم تندرست اور بہتر ہوئے

اور

ہے چھبیسویں آج ذیقعد کی لکھ اخبار کچھ قید کے بعد کی
ہیں اب بارہ سو پر چوہتّر جو سَن اسی سَن میں دکھلا سخن کا چمن
1274

اس مثنوی کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید کا کہنا ہے کہ:

''اس کے ابتدائی حصے میں اس سفر کے واقعات بھی موجود ہیں جو انھوں نے لکھنؤ سے کلکتہ تک معزولی کے بعد اختیار کیا۔ قیام کلکتہ بھی ان کے سفر کا حصہ ہے۔ ان تمام تاثرات کو ہم سفرنامے کا حصہ قرار دے سکتے ہیں۔''63

اب مختلف مواقع کے کچھ کچھ شعر لکھے جاتے ہیں:

رزیڈنٹ جرنیل اوٹرم جو تھے — گورنر کا خط مجھ کو وہ دے گئے
دلا بست و ہفتم تھی اس ماہ کی — چھٹی سلطنت جس میں مجھ شاہ کی

اس کے بعد سفر کے آغاز اور مختلف منازل کا بیان ہے، اس طرح:

رجب کی غرض پانچویں جب کہ آئی — اُسی سن میں راہی ہوئے جان مائی
لیا ساتھ ماں کو اور اک بھائی کو — نہ کچھ کام فرمایا خود رائی کو
ولی عہد کو بھی لیا ہاتھوں ہاتھ — ہوئیں پانچ چھ بیبیاں میرے ساتھ
کیا بندے نے لکھنؤ سے سفر — لیا ساتھ تھوڑا سا کچھ ماحضر
رجب بھر رہے کانپور میں مقیم — برنڈن کے بنگلے میں باخوف و بیم
الہا جو آباد ہے ایک نام — رہے آٹھ دن اس میں اے خوش خرام
بنارس میں آ کر رہے چودہ روز — وہ راجا کی کوٹھی میں ہم سینہ سوز

پھر دخانی جہاز پر سوار ہو کر کلکتہ میں پہنچ گئے:

وہاں پر دخانی کیا اک جہاز — چڑھے اس پہ جس دم، ہوئے سرفراز
رہے اس پہ ہم بیس اُنیس دن — ..........................................
دکھائی دیا جب کہ ماہِ صیام — تو کلکتہ میں آئے اے نیک نام
جو گِنیے تو تاریخ تھی ساتویں — کہ داخل ہوئے ہم ملول و حزیں

کلکتہ میں ہر جگہ پر توپوں نے بادشاہ کو سلامی دی۔ سفر کی تکان اور پریشانیوں کے نتیجہ میں وہ بیمار ہو گئے۔ علاج ہوا، تبریدی دی گئی اور صحت حاصل ہو گئی۔ غسل صحت کا جشن منایا گیا۔

وہ جلسہ رہا دھوم سے ثلث شب — گھڑی چار باقی رہی رات جب

اس سفرنامے میں بادشاہ نے اپنے قید کیے جانے اور پھر رہائی پانے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس طرح یہ مثنوی اس زمانے کے واقعات کا بہت اچھا اور معتبر مرقع ہے۔

### 5- قلق

واجد علی شاہ کے ساتھ جو لوگ لکھنؤ سے کلکتہ گئے تھے ان میں قلق بھی تھے جن کے بارے میں محسن نے لکھا ہے:

> ''مصاحب خاص حضرت سلطان عالم آفتاب الدولہ خواجہ اسد علی خان بہادر قلق ولد خواجہ بہادر حسین فراق بن خواجہ مرزا جان انکی باشندہ لکھنؤ صاحب دیوان شاگرد رشید اور ہمشیرہ زادۂ خواجہ وزیر وزیر۔''64

قلق نے اپنے سفر کلکتہ کے حالات ایک مسدس کی صورت میں نظم کیے تھے۔ اس نظم میں کل 124 بند ہیں۔ اس کے سرورق کی عبارت اس طرح ہے۔

> ''بہ توفیق خدائے سخن آفریں جلا بخش مضامین رنگین نظم دل پذیر کلام پر تاثیر، ناظم شیریں بیاں، فصیح اللساں جناب آفتاب الدولہ خواجہ اسد قلق مسمّی بہ سفر آشوب 1289ھ متضمن کیفیت سفر حضرت قدر قدرت سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اعاداللہ ملکۂ سلطنۂ مطبع کارنامہ لکھنؤ میں بہ اہتمام احقر العباد محمد یعقوب طبع ہوا۔''

یہ مطبوعہ نسخہ کل 26 صفحوں کا ہے۔ قاضی عبدالودود نے اپنے مقدمے کے ساتھ اس کے متن کو معاصر پٹنہ حصہ 17 میں شائع کر دیا تھا اور وہی ہمارے پیش نظر ہے۔

''سفر آشوب'' کی ابتدا میں شاعر نے کلکتہ سے اپنے لکھنؤ واپس آنے کا ذکر کیا ہے۔ بادشاہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے مشتاقوں کی بھیڑ لگ گئی۔ ان کے اصرار کا جواب اس نے اس طرح دیا ہے:

اب جو چھیڑا ہے تو حالِ غم غربت سُنیے ماجرائے سفرِ دشتِ مصیبت سُنیے
الم بیکسی و رنج مشقت سنیے صدمۂ آفت و ایذائے ہلاکت سُنیے
خانہ ویراں وطن آوارہ و بدنام ہوئے مبتلائے الم و مورد بیداد ہوئے

سلطنت کے جانے کے غم کے ساتھ جیٹھ جیسا کھ کی گرمی میں وہ ''خسرو یکتا'' سفر پر روانہ ہوا۔ چند روز کانپور میں رہ کر روانہ ہوئے اور تربینی تک پہنچے۔ ایک ہوٹل میں اُترے:

انگریزی میں ہوٹل کہتے ہیں اس گھر کو    مالک اس کوٹھی کا تھا ایک شقی بدخو
انگریزوں کا وہ بھٹیارا تھا وصف اس کا سنو    ولد القلب بلاشک تھا وہ ملعون یارو
بادشاہ نے اس سے کرایہ طے نہیں کیا تھا اس لیے    کیا کہوں میں دم رخصت کہ وہ کیا بپھرا

ناچار بادشاہ نے ''کچھ اپنا تصدق'' دے کر اس سے پیچھا چھڑایا۔ آگے چلے تو پھنس گئی ریتی میں بگھی تو یہ ناچار ہوئے بادشاہ کو خود بھی برہنہ پا اُتر کر اسے کھینچنا پڑا۔ کسی طرح گوپی گنج ہو کر بنارس پہنچے۔

وہاں کا راجا بادشاہ کے آنے سے نہایت خوش ہوا اور اس نے اپنے مالک کی ہر طرح خدمت کی۔

جیسی کرتے ہیں غلام، ایسی وفا کی اس نے    سب نمک خواریِ سرکار ادا کی اس نے

بادشاہ نے کہا کہ ہم ہاتھی اور پالکی کے ساتھ تمھیں خلعت دیتے لیکن اس وقت وہ ممکن نہیں، اس لیے حکم دیا کہ جو کچھ پیش کش انھوں نے کی ہے وہی ان کو دے دو اور جب خدا وہ دن کرے گا میں اس امانت کو ان سے لے لوں گا۔

بنارس میں ایک پرانا سادخانی جہاز ملا اس میں سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ سُندربن پہنچے۔ پھر سمندر کا مہانا سامنے آیا۔ پھر......ع......ہوگیا موج کے صدموں میں گرفتار جہاز۔

ہر شخص ڈرا ہوا تھا لیکن دوسرے کو تسلی دے رہا تھا۔ بالآخر کلکتہ پہنچ گئے۔ پھر بادشاہ کی ماں، بیٹا اور بھائی لندن کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس کے بعد بادشاہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ خود قلق بھی قید ہوئے۔ بے خطا سات مہینے تو گرفتار رہے

جب رہائی ملی تو قلق لکھنؤ واپس آ گئے۔ یہاں لکھنؤ کی بربادی کا حال اپنی نظروں سے دیکھا اور اس کی کیفیت تفصیل سے نظم کی۔ اپنے مسدّس کو قلق نے اس شعر پر ختم کیا ہے:۔

تو مرے شاہ کو سلطان اودھ پھر کر دے    دُرِ مقصود سے دامانِ تمنا بھر دے

قاضی عبدالودود نے اس نظم کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''سفرآشوب کے بہت سے بند جاندار اور باا ثر ہیں اور قلق پڑھنے والوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے اسے محسوس بھی کیا ہے۔ قلق کے لکھنوی، معاصرین انھیں اپنے وطن کا نمائندہ شاعر ماننے میں غالباً عذر نہ کرتے..........''

راقم نے اس نظم کا خلاصہ اوپر درج کیا ہے۔اس میں لکھنوی یادیں آخر کے حصہ میں نظم کی گئی ہیں لیکن شروع کے نصف سے زائد اشعار میں سفر کے کوائف بڑی خوبی سے بیان کیے گئے ہیں اس لیے اس نظم کو لائق توجہ سفرناموں میں شمار کرنے میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی ہے۔

# ط - علمی تصانیف

لکھنؤ میں اردو نثر میں مختلف علوم وفنون کی کتابیں بھی لکھی جا رہی تھیں۔اس باب میں بھی بادشاہ کا قلم کسی سے پیچھے نہیں تھا۔طوالت کے خوف سے اس جزو میں بھی ہم صرف ایک دو کتابوں کا ذکر نمونہ کے طور پر کریں گے۔

1 - اختر واجد علی شاہ

گزشتہ اوراق میں بادشاہ کی مختلف النوع نثری تصانیف کا حال لکھا جا چکا ہے۔اب یہاں ان کی صرف دو ایسی کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں سے ایک کا تعلق ہندستانی موسیقی اور نقلوں وغیرہ سے ہے اور دوسری میں سیاسی مسائل اور ملکی معاملات سے بحث کی گئی ہے۔ بظاہر دونوں کا مزاج اور انداز مختلف بلکہ متضاد ہے اس کے باوجود بادشاہ نے بڑی خوبی سے ان کو مکمل کیا ہے۔

الف: بنی

اس کتاب کے ابتدائی کلمات یہ ہیں:

''بعد حمد خالق ہفت پیکر اور نعت سید خیر البشر اور منقبت شبیر داور واجد علی شاہ اختر خدمت طالبین اور شائقین میں عرض کرتا ہے، وادی اطلاع دہی میں پاؤں دھرتا ہے،

ماقبل اس کے دو کتابیں ناجو اور دولھن تقسیم ہو چکی ہیں۔ سب کو دیں مگر ان میں فقط

آستائی انترے ہیں.........''

اس اقتباس سے خیال ہوتا ہے کہ علم موسیقی سے متعلق بادشاہ کی یہ تیسری کتاب ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے مشمولات میں اور بھی بہت کچھ ہے چنانچہ یہ کتاب زیادہ اہم ہے۔ اس کی کیفیت اس طرح ہے۔

''اس کا نام بنی ہے۔ حقیقت میں بنی ٹھنی ہے اور اس میں چھ باب ہیں۔

پہلا باب۔ سُر ادھیا — باب دوسرا۔ تال اُدھیا

باب تیسرا۔ ناچ ادھیا — باب چوتھا۔ رہس کے بیان میں

باب پانچواں۔ بھنڈیتیوں اور نقلوں مضحک میں

باب چھٹا۔ بیگمات اور وابستگانِ دولت کے نام معہ خطابات اور متفرقات اس بات کے آخر میں دو ضمیمے بھی۔''

کتاب کے آخر میں یہ دو قطعات تاریخ خصوصیت سے توجہ کے لائق ہیں۔

از حامد الدولہ سید محمود علی خاں برتر۔

برتر نے تار کھ بچاری رس بھینی بنت بنیاں کر کے

ہس کہ پائی بنی رنگیلی چاؤ گھنیری راج دولارے

1285 فصلی

از رئیس الدولہ علی حسن بہادر

سمت اوہ کے بچار کے کھاطر بیر بکر ماجیت کہن یہ

آکھتر پیارے سدا براجو بنی کے بنرے راج دولارے

سمت1235 بکرمی

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان میں (جسے اردو کی ایک صورت تسلیم کرنا چاہیے) واجد علی شاہ کے علاوہ لکھنؤ کے کئی نام برآوردہ شاعر بھی طبع آزمائی کرتے تھے اور انھوں نے اس زبان کی مقامی شعری اصناف گیت، ٹھمری وغیرہ کو کبھی بھی ''غیر'' نہیں سمجھا تھا۔ اپنی کتاب

بنی میں بادشاہ نے مختلف قسم کی ٹھمری، ٹپہ، ہوری اور دوہرے وغیرہ نقل کر کے ان سے اپنی دلچسپی ظاہر کی ہے۔

کتاب بنی میں بادشاہ نے بکثرت نقلیں بھی درج کی ہیں۔ ان سے نہ صرف بادشاہ کی وسعت معلومات کا پتہ چلتا ہے بلکہ اردو نثر پر ان کی قدرت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ یہاں صرف ایک نقل درج کی جاتی ہے۔

"اڑتالیسویں نقل مشاعرے کی۔ چند آدمی چند شاعر نامی بنیں۔ یہ کون ہیں، یہ میاں ناسخ ہیں، یہ کون ہیں، یہ آتش ہیں...... میر انشا...... میاں صفیر...... یہ شرف...... یہ حزیں...... یہ ہلال ...... نکامی...... جامی...... اسمعیل فارسی...... شوکت فارسی...... فتح الدولہ برق...... قبول...... مہر...... ظفر شاہ دہلی...... اختر شاہ اودھ...... سودا...... رند...... ہنر...... شاذ...... اندھے میاں جرأت...... اندھے جرأت کا ناقل کہے کہ جرأت تو اب پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر ٹانگیں چیر کر کھڑا ہو جائے۔ دوسرا آدمی ٹانگوں کے نیچے سے چہرہ نکال کر کہے کہ اے باوا۔ سامنے والا کہے کہ بیٹا کیا ہے۔ وہ جواب دے کہ باوا پھنس گیا۔ سامنے والا کہے کہ بیٹا جرات ہو تو نکل آ۔ پس وہ فوراً اس گلے کے ساتھ ٹانگوں کے نیچے سے نکل آئے۔ پھر جرأت کا نقال اپنی آنکھیں اندھوں کی مانند بنا کر کہے کہ قربان جاؤں، اندھوں کا شعر بھی اندھا ہوتا ہے۔ ساتھ والے کہیں کس طرح سے۔ اس وقت یہ مطلع میاں جرأت نابینا کا پڑھتا جائے اور دونوں ہاتھوں سے چار طرف اندھوں کی طرح ٹٹولتا جائے۔

مطلع جرات اعمٰی

سنا ہے یار کی ہم نے کمر ہے     کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے

مگر یہ نقل تمام مشاعرے کے بعد ہو......"

اس نقل کو سیدھے سادے انداز سے لکھا ہے مگر اس میں مکالمے کا انداز اور ڈرامائی اسلوب نمایاں ہے۔

موسیقی، رقص اور ڈراما کے مسائل اور ہر ایک کے لیے مثالیں وغیرہ اس خوبی سے پیش کی گئی

ہیں کہ کتاب ہٰذٰی کے مشمولات کو معمولی لیاقت والا بھی سمجھ سکتا ہے اور خیال بھی نہیں ہوتا کہ ان فنون کے مباحث اور نکات کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔

ب: جواب بلو بک (Blue book)

بلو بک سے مراد وہ رپورٹیں ہوتی تھیں جو پارلیمنٹ کی واقفیت کے لیے پیش جاتی تھیں۔ واجد علی شاہ نے 1273ھ میں جواب لکھ کر پینتالیس ورقوں پر چھپوادیا تھا۔ سبب تالیف کے بعد اس کے مطالب کی تقسیم اس طرح کی ہے۔

"باب پہلا مشعر بیان حقائق اطاعت اور انقیاد سرکار کمپنی میں وقت سے مصالحۂ مابین کے،

باب دوسرا متضمن بیان ان باتوں کے کہ اہالی سرکار کمپنی نے مقتضیات عہد ناماجات سے آنکھ چھپا کے کیا ہے۔

باب تیسرا مشعر کیفیت ان مقدمات کے کہ جن پر کرنل سلیمن صاحب اور جنرل اوٹرم صاحب نے بنیاد بدنامی اس ریاست کی رکھی ہے۔

باب چوتھا بیچ بیان اختلافات کے کہ تحریرات لارڈ ڈلہوزی صاحب بہادر اور جنرل اوٹرم صاحب اور صاحبان کونسل ان سے بھری ہیں۔

باب پانچواں بیچ دلیلوں حسن انتظام ملک اودھ کے۔

باب چھٹا مشعر دلائل اس بات کے کہ عہد ناماجات جو بہت مضبوطی کے ساتھ دونوں سرکار ہیں لکھے گئے ہیں، ان کا توڑنا کسی طرح جائز نہیں۔

باب ساتواں مشعر بیان وارداتوں خونریزی اور دوسری طرح کے فسادات کے کہ عملداری سرکار انگریز بہادر میں ہوتے ہیں۔" 68

ان ابواب میں لکھنے والے نے بلو بک یعنی پارلیمنٹری پیپرز 56-1855 میں عائد کردہ الزامات کی صفائی اور عائد کرنے والوں پر نکتہ چینی تک اپنے بیان کو محدود رکھا ہے۔ یہ کتاب ملکہ وکٹوریہ اور برٹش پارلیمنٹ سے انصاف طلب کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھی اس لیے اس میں غیر معتبر اور غیر متعلق بحثوں کو چھیڑنے کی گنجائش نہیں تھی۔ سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے

اس رسالے کی اہمیت ظاہر ہے۔

2- محمد حسن

اس زمانے میں طب وحکمت کو بہت فروغ حاصل تھا چنانچہ خاص وعام کے فائدہ کے لیے چھوٹی بڑی کتابیں اور رسالے معمولاً لکھے جاتے رہتے تھے۔ حکیم محمد حسن لکھنوی نے اپنے فن سے متعلق اردو نثر میں کئی رسالے لکھے تھے۔ بعض یہ ہیں:

الف: رسالہ احوال نبض۔ اس کتاب کا جو قلمی نسخہ دستیاب ہے وہ ناقص الآخر ہے۔ اس میں کل بیس ورق ہیں۔

ب: رسالہ بحران۔ کل بارہ ورق۔ کتابت اس کی 1278ھ (62-1861) میں ہوئی تھی۔

ج: رسالہ البول۔ سولہ ورق

یہ تینوں قلمی رسالے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہیں۔

3- ریورنڈ پارکن

اس شخص کا ایک رسالہ، بحر الحکمت، کے نام سے 70 لکھنؤ میں 1847 میں چھپا تھا۔ اس میں اسٹیم انجن کا بیان ہے۔

4- خواجہ احمد علی

اس زمانے کے ضرورتوں کے تحت انھوں نے رسالہ معرکہ آرا تصنیف کیا تھا۔ اس میں بھالے اور برچھے کے استعمال کرنے کا طریقہ تحریر کیا ہے۔ یہ ایک سوترپن صفحوں پر 1248 میں لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ 153

مختلف علوم وفنون سے متعلق اس زمانے میں اور بھی بہ کثرت کتابیں لکھی اور چھاپی گئی تھیں۔ ڈاکٹر محمد شعیب 72 نے اسی سلسلے میں مقبول الدولہ مہدی علی خان قبول کی بھی ایک کتاب ''جہاں نما'' کا مفصل تعارف کرایا ہے۔ 73-

# ی - مذہب سے متعلق

1 - اختر واجد علی شاہ

''لکھنؤ آج بھی شیعیت کا مرکز اور شیعہ عقائد کی تعلیم کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس شہر میں شیعی عقیدہ سے متعلق تصنیف وتالیف کا کام زیادہ تیزی سے ہوا تھا۔ واجد علی شاہ نے اردو نثر میں تو اپنے مذہب سے متعلق غالبًا کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن نظم میں ان کی کئی کتابیں موجود ہیں مثلاً۔

ایمان، بحر ہدایت، توشۂ آخرت، ثبات القلوب، ریاض العقبیٰ،
ریاض القلوب، مباحثہ بین النفس والعقل، ہیبت حیدری وغیرہ۔

اس زمانے میں سید علی ابن سید دلدار علی مجتہد نے توضیح المجید، محمد باقر ابن اکبر علی خاں نے صفاتِ امجدیہ وغیرہ کئی کتابیں لکھیں۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی کی تصنیف ''تحفۂ اثنا عشریہ'' کے بھی جواب میں چند کتابیں لکھی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک کے مصنف زین العابدین خاں تھے۔

زین العابدین خاں شیخ کرامت علی خاں کے بیٹے تھے جو دہلی کے رہنے والے تھے اور ترکِ وطن کر کے لکھنؤ میں آ رہے تھے۔ ان کی لیاقت سے متاثر ہوکر واجد علی شاہ نے ان کو تحفۂ اثنا عشریہ کا جواب لکھنے پر مامور کیا۔ انھوں نے اپنی کتاب کا نام ''تحفہ حنفیہ جوابِ تحفہ اثنا عشریہ'' رکھا۔ 74

اس کا سال تصنیف 1270ھ ہے۔ کتاب کا آغاز اس عبارت سے کیا گیا ہے۔

''حمد وثنائے بے حد وستائش لا تعداد اسی خالق ارض وسما کو زیبا وسزاوار ہے کہ جس نے لفظ کُن میں عالمِ کون ومکاں کو بنایا اور ذات باصفات حضرت رسول مجتبیٰ مصطفیٰ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو عاصیانِ عالم ایجاد کی ہدایت کے واسطے مبعوث کر کے سید النبیین خاتم المرسلین لقب فرمایا۔'' اس کتاب کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ:

''جناب امیر بھی شہید ہوئے اور حسنین بھی شہید ہوئے اور تا قیامت اولاد رسول کے واسطے صورت تباہی نمودار ہے۔ تمام شد رسالہ۔

یہ جواب واجد علی شاہ کے زمانے کے حالات کے مطابق لکھا گیا تھا چنانچہ نہایت مقبول ہوا۔ زبان بھی اس کی بہت صاف اور رواں ہے چنانچہ کتب خانہ آصفیہ اور سالار جنگ وغیرہ میں بھی اس کے نسخے محفوظ ہیں۔

شیعیت کی اس ترقی کے زمانے میں لکھنؤ میں سنی مذہب کی بھی بہت کتابیں لکھی گئی تھیں مثلاً: ''تحفۃ الزوجین از مولوی قطب الدین خاں، 1261ھ، 88 صفحات، مطبع نولکشور لکھنؤ''

مفتی محمد عنایت احمد نے بھی اس زمانے میں مختلف مذہبی مسائل سے متعلق کئی کتابیں لکھی تھیں لیکن ان کی کتابیں کانپور میں چھپی تھیں اس لیے یہاں ان کا ذکر مناسب نہیں معلوم ہوا۔

## 2- مرزا جان

واجد علی شاہ کے زمانے میں ہنومان گڑھی (اجودھیا) کی مسجد کے سلسلے میں مولوی امیر الدین علی کو جہاد کرنا پڑا تھا جس میں وہ اپنی مختصری جماعت کے ساتھ شہید ہو گئے تھے۔ اس سانحہ کے سلسلے میں اردو نظم ونثر میں مختلف کتب خانوں میں کئی تحریریں محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک ''حدیقۂ شہدا'' ہے۔

حدیقۂ شہدا کے مصنف کا نام مرزا جان ہے۔ 76 یہ شخص حضرت اسماعیل شہید کا عقیدت مند اور مولوی امیر علی کے رفقا میں تھا۔ اس نے مولوی صاحب کی تحریریں جمع کر کے ان کو مرتب

کر دیا تھااور اس مجموعہ کا نام حدیقۂ شہدا مقرر کیا تھا۔ اس کی تکمیل کی تاریخ اس طرح ہے۔

تحریر ہو چکا جب احوال کفر وایماں ؔ77     جس سے بدوں کی قلعی محشر تلک کھلے گی
تاریخ خاتمے کی ڈھونڈھی جو میں نے ناگہ     آئی ندا فلک سے تاریخ ہے اودھ کی

1272ھ

یہ کتاب اسی سال میں چھپ بھی گئی تھی۔

حدیقۂ شہدا میں مولوی صاحب اور ان کی جماعت کی شہادت کی تاریخ اس طرح درج ہے۔

بہ تاریخ شہیدانِ کفن پوش     چہ حاجت تاسّفش من برنگارم
کہ خود فرمود آں شاہِ شہیداں     سرِ میداں کفن بردوش دارم

1272ھ

مرزا جاں کا تخلص معلوم نہیں ہو سکا، اس کے باوجود اتنی بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ اردو نظم ونثر دونوں پر قادر تھا۔ ضرورت پڑنے پر فارسی میں بھی شعر کہہ لیتا تھا۔ اسے تاریخ گوئی سے دلچسپی تھی اور اچھی تاریخیں کہہ لیتا تھا۔ حدیقۂ شہدا کو اس نے ذیل کے جملوں سے شروع کیا ہے۔

> ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد سراپا عصیان مرزا جان کی یہ عرض ہے کہ شکر پروردگار کا ہر فرد بشر پر فرض ہے، جس نے کعبۂ دل کو اپنا گذرگاہ بنایا اور کنشت کا نقشہ امتحان کے واسطے کھینچ کے دکھایا...... ...''

اور اختتام اس رسالے کا اس عبارت پر ہوا ہے:

> ''یہ تحریر عبرت الناظرین اور تنبیہ الغافلین ہے۔ اس کا مزا اس کو آئے گا وہ لذت پائے گا، اس دنیا میں جس کی زبان پر ذائقۂ دین ہے، وہ جو صاحب دل ہیں کامل ہیں ان کو بہت سرور ہوگا اور جو ایسے تیسے ہیں ان کو تو دیکھنا بھی نہ منظور ہوگا۔''

مرزا جان کو مقفّٰی عبارت لکھنے کا شوق تھا اور اس اعتبار سے وہ اپنے وقت کے اچھے نثر نویسوں میں شمار ہوتا تھا۔

آخر میں یہ ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حال ہی میں ڈاکٹر مرزا احمد زماں آزردہ نے اپنی کتاب ''مرزا سلامت علی دبیر حیات اورکارنامے'' میں مرزا دبیر کی ایک نثری تصنیف ''ابواب المصائب'' کا اس طرح تعارف کرایا ہے۔

> ''یہ کتاب مطبع یوسفی دہلی سے شائع ہوئی۔ دیباچہ اور ترقیمہ سے 1245ھ (1849) سالِ تصنیف قرار پاتا ہے۔ اشاعتِ اول 168 صفحات پندرہ سطری مسطر پر مشتمل ہے۔''

ڈاکٹر آزردہ کی تحریر کے مطابق اس کتاب میں چھ ابواب ہیں۔

# ک - داستان

لکھنؤ میں بادشاہت کے قیام کے بعد ہی ''داستان نویسی'' کا سلسلہ شروع تو ہو گیا تھا لیکن اردو نثر کی اس صنف کو شاہی سرپرستی غالباً بادشاہ دوم کے وقت تک حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے ''فسانہ عجائب'' میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''یہ فسانہ بہ عہد دولت شاہ غازی الدین حیدر شروع ہوا تھا اور تمام بہ عصر سلطان ابن سلطان ابوالنصر نصیر الدین حیدر دام ملکہٗ ہوا۔''78

لیکن اس کو بادشاہ سوم محمد علی شاہ کی وفات کے بعد ہی چھپنا نصیب ہو سکا تھا۔

شاہی سرپرستی حاصل نہ ہونے کے باوجود، معلوم ہوتا ہے کہ محمد علی شاہ کی تخت نشینی کے بعد ہی زبان اردو میں داستان نویسی کے لیے شہر لکھنؤ میں فضا کسی نہ کسی حد تک سازگار ہو چلی تھی۔ پھر امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے عہد دولت میں تو اتنی تیزی اور کثرت سے داستانیں لکھی گئی تھیں کہ ملک کے کسی بھی مرکز پر اس میدان میں قلم کی یہ تیز رفتاری دیکھی اور سنی نہیں گئی۔ یہاں صرف بعض اہل قلم کی داستان نویسی کا حال مجملاً لکھا جاتا ہے۔

### 1 - گویا - فقیر محمد خاں

نام ان کا فقیر محمد اور خطابات حسام الدولہ، خان بہادر، تہور جنگ تھے۔ محسن نے ان کا ذکر

اس طرح کیا ہے:

> ''حسام الدولہ فقیر محمد خان بہادر رسالدار گویا خلف بلند خاں قوم آفریدی باشندۂ مرزا گنج مقیم لکھنؤ صاحب دیوان شاگرد رشید خواجہ وزیر وزیر''79

نصیر الدین حیدر کے زمانے میں گویا کو دو مرتبہ شہر لکھنؤ سے نکلنا پڑا تھا لیکن ''عہد محمد علی شاہ میں منتظم الدولہ کی وفات کے وقت وہ لکھنؤ میں موجود تھے۔'' بتایا گیا ہے کہ ان کے معاملات میں تعصبِ مذہب کو دخل رہا ہے۔ اسی زمانے میں گویا نے کتاب ''بستانِ حکمت'' لکھی تھی۔ اس میں حمد و نعت کے بعد لکھا ہے:

> ''قاتل الکفرۃ والزندیق الغار لصاحبہ رفیق۔ امام المسلمین ابوبکر ن الصدیق ولفدل الاصحاب صاحب الدرۃ ذاالاحتساب۔ امیر المومنین عمر بن الخطاب ومقتدائے الصابرین فی البأ سائے ذالضرا۔ امیر المومنین امام المجتہدین عثمان بن عفان ومظہر العجائب والغرائب مطلوب کل طالب۔ امیر المومنین علی ابن اَبی طالب رضوان اللہ علیہم...''80

اس سے بخوبی ظاہر ہے کہ اس زمانے تک گویا اپنے آبائی مذہب پر قائم تھے۔ اپنی کتاب بستان حکمت کی اصل کا حال گویا نے اس طرح قلمبند کیا ہے۔

> ''کتاب کلیلہ دمنہ حکیم روشن رائے بیدپا برہمن نے رائے دابشلیم ہندی کے واسطے...... زبان سنسکرت میں تالیف کی تھی اور دابشلیم اس کتاب کو...... مخفی رکھتا تھا...... برزویہ پزشک...... حسب الحکم نوشیرواں...... ہندوستان میں کہ وہ زمانہ رائے تلبند کا تھا آیا اور ہزار تدبیر سے اس کتاب کو حاصل کر کے زبان سنسکرت سے الفاظ پہلوی میں ترجمہ کیا...... بعد نوشیرواں کے سب بادشاہان عجم مخفی اور عزیز رکھنے میں اس کتاب کے مبالغہ کرتے رہے۔ خلیفہ ثانی عباسیاں نے بہ ہزار تدبیر...... ملک حبش سے بہم پہنچائی اور ترجمہ اس کا ابوالحسن عبداللہ بن مقفع سے...... لکھوایا...... پھر ابوالحسن ابن نصر نے...... عربی سے فارسی میں ترجمہ کروایا...... رودکی نے اس کو نظم کیا...... نسخہ ابن مقفع کا فارسی سلیس میں ترجمہ کرایا الخ'' اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف قدیم

اور اصل سنسکرت کتاب، بلکہ اس کا پہلوی ترجمہ بھی ناپید ہوگیا۔ اب اس کا جو قدیم
ترین متن دنیا میں موجود ہے وہ عربی میں ہے اور دنیا کی مختلف زبانوں میں بشمول
سنسکرت جو متن دستیاب ہے وہ اسی عربی متن کا ترجمہ ہے۔

فارسی زبان میں شیخ احمد سہیلی کے ترجمہ انوار سہیلی سے کاشفی نے ترجمہ کیا۔ پھر اسی سے ابوالفضل نے کچھ کاٹ کوٹ کے عیار دانش لکھی اور اس کی تصحیح کر کے گویا نے اپنی کتاب بستانِ حکمت تیار کی۔ اپنی تصحیح کے بارے میں گویا نے لکھا ہے:

> ''بہ غور تمام دیکھا تو بیشتر مطالب پر اعتراض وارد ہوتے ہیں اور بعض جگہ اجمال میں مثلاً دو چیز کا مذکور تھا جب تفصیل کی تو ایک کا مذکور ہوا دوسرا مطلب رہ گیا۔ اگر کچھ بیان اور ہوا تو مطلب برآمد ہوتا ہے ورنہ نقصان رہتا ہے۔ اکثر فقرات کہ واسطے رنگینی کلام کے طول دیے گئے تھے سو حذف کرنا اس کا ضرور تھا...... معلوم ہوتا ہے کہ..... کاتبوں کی غلط نویسی سے یہ نقصان سب عارض ہوئے لہٰذا بندے نے...... اسے درست کیا...... صورت کتاب کی اور ہی ہوگئی ہے، برائے نام ترجمہ کہا جاتا ہے ورنہ یہ کتاب حقیقت میں جدا ہے۔ گویا نے کتاب کے دیباچے میں'' کچھ حال مولد اور مسکن اور اپنی نژاد کا اور بعض واردات زمانے سے کہ جو لاحق حال اپنے ہوئے ہیں'' بھی لکھے ہیں اور ان کی افادیت ظاہر ہے۔

کتاب چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ مطالب کو زیادہ دلنشیں بنانے کے لیے مترجم نے مولانا روم، شیخ سعدی، سودا، جرأت، ناسخ، اور گویا وغیرہ شاعروں کے ابیات، قطعے، رباعی، مثنوی وغیرہ کے علاوہ کچھ دوہے بھی نقل کیے ہیں۔ ناسخ اور گویا کے بیشتر اشعار ایسے ہیں جو اُن کے دیوان میں نہیں ہیں۔ مترجم نے قرآن پاک کی بعض آیتوں اور حدیثوں کے ترجمے بھی متن میں شامل کیے ہیں۔ کتاب کے سبب تالیف میں مذکور ہے کہ:

> ''ایک روز بندہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ شاعر کہ یہ دونوں شاگرد رشید شیخ ناسخ صاحب کے ہیں اور چند احباب اور بھی باہم بیٹھے تھے اور اس وقت شغل انوار سہیلی کے مطالعہ کا تھا...... سب اہل محفل نے اصرار کیا کہ...... تم اردو میں اسے ترجمہ کرو۔''

کتاب میں شیخ ناسخ کو مترجم نے "استاد" کہا ہے لیکن وزیر کے لیے اس قسم کا کوئی کلمہ نہیں لایا گیا ہے۔ ایسی صورت میں قیاس یہی کہتا ہے کہ ناسخ کی وفات کے بعد گویا نے وزیر سے رجوع کیا تھا۔ شیخ ناسخ کی وفات کی تاریخ میر رشک نے اس طرح بتائی ہے۔

بودہ پنجم بست وچارم پنجشنبہ آہ وائے۔

1254ھ

اور کتاب بستان حکمت میں ہے۔ تاریخ ناسخ"

زہے نسخہ حکمت آمیز نافع　　کہ ہر باب واکردصد باب حکمت
مسمّٰی بہ بُستانِ حکمت نمودند　　برائے تماشائے ارباب حکمت
گل وبرگ وشاخ وثمر جملہ حکمت　　شدایں باغ سرسبز با آب حکمت
بہ لطف مسبّب کہ زیباست شکرش　　فراہم شدہ جملہ اسباب حکمت
پے سال تاریخ اتمام ناسخ　　خرد گفت بستان سیراب حکمت

1254ھ

اس صورت میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بستانِ حکمت 24۔ جمادی الاول 1254ھ سے پہلے اسی سال میں کسی تاریخ میں مکمل ہوگئی تھی۔ اس تاریخ کو طباعت کی تاریخ سمجھنا خود اس کے الفاظ کے خلاف ہوگا۔ بستان حکمت کے خاتمہ کی عبارت اس طرح چھپی ہے۔

"شکر خدائے عزوجل کہ ترجمہ انوار سہیلی کا چودھویں ذیقعدہ 1251ھ وقت صبح کے کہ ہنوز نیّرِ اعظم نورانی افق سے بلند نہ ہوا تھا کہ مقام دارالسلطنت لکھنو میں ختم ہوا الحمدللہ علیٰ ذالک باطناً وظاہراً والسلام علیٰ سیّدا لعالمین ...... امیدوار ہوں کہ ایسی مقبولیت اسے عنایت فرما کہ از وضیع تا شریف خریداری اس کی بجان و دل کریں...... واسطے اس عاصی کے خدائے کریم سے دعائے مغفرت چاہے......"

یہ مذکور آچکا ہے کہ نصیر الدین حیدر کے آخر زمانے میں گویا کا لکھنؤ سے اخراج عمل آگیا تھا البتہ وہ محمد علی شاہ کے عہد میں منتظم الدولہ کی وفات کے وقت لکھنؤ میں آگئے تھے۔ وفات

منتظم الدولہ کی تاریخ یہ ہے۔

<u>از نہم بست و ششم ہے بے بود</u>

1253ھ

چنانچہ تسلیم کرنا چاہیے کہ گویا نے 26۔ رمضان 1253ھ کے بعد کسی وقت لکھنؤ میں مقیم رہ کر بستان حکمت کو مکمل کیا ہوگا۔ اقتباس بالا میں جو تاریخ لکھی ہے وہ 14۔ ذیقعدہ 1253ھ (نہ کہ 1251ھ) ہے۔ سہواً تین کی جگہ ایک چھپ گیا ہے۔

امکان ہے کہ مسودہ کی تکمیل کے بعد گویا کسی کام میں مصروف رہے ہوں یا کوئی اور سبب ہوا ہو۔ بہر نوع جب انھوں نے استاد (ناسخ) سے تاریخ کی فرمائش کی نیا سال 1254ھ (1838) شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ ناسخ کے قطعہ سے یہی برآمد ہوتا ہے۔

گویا نے خاتمہ کی عبارت میں کتاب کو "ترجمہ انوار سہیلی" کہا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ اس وقت تک انھوں نے اس کا نام بستان حکمت نہیں رکھا تھا ہو سکتا ہے کہ یہ نام استاد ناسخ ہی کا تجویز کیا ہوا ہو۔

امجد علی شاہ کا زمانہ سلطنت پانچ برس سے بھی کچھ کم رہا تھا۔ اس کے باوجود ان کے عہد میں اردو نثر میں حسبِ ذیل داستانیں لکھی گئی تھیں۔ ان میں سے بعض اس طرح ہیں:

| نمبر شمار | مصنف | نام داستان | سال تصنیف | کیفیت |
|---|---|---|---|---|
| 1 | عابد علی خاں[81] کاکوروی فریاد۔ صاحب دیوان و تاریخ کاکوری | فسانۂ اعجاز | 1258ھ<br>اتمام 1259ھ | آغاز بہ جواب فسانہ عجائب نسخہ قلمی لکھنؤ یونیورسٹی |
| 2 | راجا خیراتی لال[82] عرف بدھ سنگھ تخلص آشم لکھنوی | باغ ارم (قصہ کنور کامروپ ورانی کام لتا) | 1259ھ/ 1843 | مطبوعہ مطبع ماہ پرتو بریلی 192 صفحے زبان کا انداز بہت قدیمات[83] |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| 3 | میر فرخند علی رضوی نوتنوی حسب فرمائش میر حسن رضوی مالک مطبع حسنی لکھنو[84] | قصہ بہرام[85] وحسن بانو مطبوعہ نسخہ پرنام قصہ بہرام گور لکھا ہے۔ | قبل 1261ھ | مطبوعہ مطبع دارالسلام دہلی 1262ھ نسخہ گنج بخش ناقص الطرفین چونسٹھ ورق و دو رنگین تصویریں بھی[86] |
| 4 | سعادت خاں ناصر | قصہ گلشن سرور | قبل 1261ھ | نایاب |
| 5 | ایضاً | قصہ اگر گل | قبل 1261ھ | متعدد بار چھپ چکا ہے۔ |

مصنف نے قصہ اگر گل کا تعارف اس طرح کرایا ہے کہ:

"نام اس کا قصہ اگر گل ہے۔ یہ حسب فرمائش بعض احباب کے زبان فارسی سے بیان اردو میں جلوۂ نو دیتا ہے۔ شہر ہائے قدیم سے ایک شہر کہ نام اس کا خشخاش اور لوگ وہاں کے خوشحاش تخت نشین اس سرزمین بہشت آئیں کا رعیت پرور...... منصور شاہ تا: ار، چار وزیر مثل اربع عناصر کے ہمدم اور مشیر..........."

رامپور کی رضا لائبریری میں اس قصہ کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے جس کی کتابت اَسّی ورق پر بہ عہد بہادر شاہ ظفر 1263ھ/ 1847 میں ہوئی تھی۔

اگر گل ہی کے نام سے ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں چند سال قبل کتابت کردہ ایک اور قصہ ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر زور صاحب کا کہنا ہے کہ:

"یہ ضخیم قصہ دکنی نثر میں ہے......... اس میں حمد و نعت نہیں ہے۔ قصہ شہر خشخاش کے بادشاہ فیروز شاہ کے واقعہ سے شروع ہوتا ہے، یہ بادشاہ فرزند کی خواہش میں تخت چھوڑ کر جنگل کو روانہ...... گل عاشق کا نام ہے اور اگر معشوق کا جو ہمیشہ مردانہ لباس میں رہتی اور اپنی نسوانیت چھپا رکھتی ہے۔"

2- ناصر- سعادت خاں

اس طرح بعض کرداروں اور مقاموں کے ناموں میں اشتراک کے باوجود یہ قصہ ناصر کے قصہ سے کسی قدر مختلف ہے اور اس دکنی قصہ کے مصنف کا نام وغیرہ بھی معلوم نہیں ہے۔ ناصر کے

قصہ میں بیچ بیچ میں عبارت کو دلچسپ بنانے کے لیے فارسی اور اردو کے بیت، قطعہ، رباعی، نظم (مثلاً منظوم سراپا اور نام وغیرہ) بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ سودا، درد، رسا، ناسخ اور وزیر کے بھی ہیں۔ زیادہ تر خود مصنف یعنی سعادت خاں ناصر کے ہی شعر ہیں۔

ناصر کے قصہ اگر گل پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب خلیل الرحمٰن داودی نے لکھا ہے:

''پلاٹ بہت زیادہ ناقص اور الجھا ہوا ہے۔ کرداروں کی اس درجہ زیادتی ہے کہ اکثر اوقات طبیعت الجھ جاتی ہے قصہ اگر گل کی یہ ندرت ہے کہ اس میں ہیرو کا کام ایک عورت انجام دیتی ہے۔ اگر چہ وہ عورت ہے لیکن مردانہ لباس میں ہیرو کے تمام کام کرتی ہے۔ قصہ اگر گل نوابی عہد کے لکھنؤ کی معاشرت کا ایک دلآویز مرقع ہے...... عبارت اگر چہ تجع اور قافیہ سے خالی نہیں، اس میں روانی ہے...... کہیں مؤلف کے قلم میں تکان کے آثار نظر نہیں آتے۔''88

3- رسا- لالا انبا پرساد

رسا کا تعارف محسن نے اپنے تذکرے میں اس طرح کرایا ہے:

''لالا انبا پرشاد داستان گو رسا ولد چندی پرشاد خواہر زادے راجا جھاؤلال کے قوم کائستھ باشندہ لکھنؤ، شاگرد نواب مرزا تقی خاں ہوس اور داستان گوئی میں یکتائے زماں اور شاگرد میر قام علی کے۔''89

رسا بعد میں مسلمان ہو گئے تھے اور ان کا اسلامی نام عبدالرحمٰن رکھا گیا تھا۔ امیر مینائی نے لکھا ہے کہ:

''عہد جنت آرام گاہ (نواب محمد سعید خاں) سے ملازم سرکار دولت مدار ہیں۔''90

پھر ان کے بیٹے کے ذکر میں مزید صراحت اس طرح کی ہے:

''رضا تخلص غلام رضا ولد منشی انبا پرشاد رسا۔ لکھنؤ ان کا وطن ہے مگر تیس برس سے دارالریاست مسکن ہے...... ''91

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسا مع اہل و عیال مسلمان ہوئے تھے اور 1267ھ (1851) کے قریب لکھنؤ سے رامپور میں منتقل ہو گئے تھے۔ رضا بھی اپنے باپ کی طرح شاعر اور داستان

نویس تھے چنانچہ رامپور میں ان کی داستانیں بھی محفوظ ہیں۔

رسا کے استاد میر قاسم علی برائے نام شاعر بھی تھے۔ ان کی دو منظومات کے قلمی نسخے علی گڑھ میں ہیں:

الف: پند نامہ قاسم، سولہ ورق......اس کا پہلا شعر یہ ہے۔92

بیاں کیا کروں حق کی حمد وثنا کہ پیدا کیا کن میں ارض وسما

ب: مناجات میر قاسم علی۔ تین ورق۔ مطلع یہ ہے۔93

رحمان ہے، رحیم ہے بے شک تو اے خدا پس رَب عالمین نہیں ہے ترے سوا

وہ داستان گوئی میں اپنی شاعری سے بھی فائدہ اٹھاتے تھے۔ رسا نے بھی انھیں کی روش اختیار کی اور اسی راہ سے وہ داستان نویسی تک جا پہنچے۔ اس سلسلے کا ان کا پہلا کام بظاہر ''حکایتِ سخن سنج'' ہے اس کے دیباچے میں رسا نے لکھا ہے۔

> ''حسب اتفاق مرشد زادہ بلند اقبال نونہال چمن عظمت واجلال...... بیدار بخت محمد مرزا بہادر نے، دراز کرے اللہ سن وسال اور جاہ اقبال ان کا، کچھ ذکر طوطی نامے کا کہ معروف بہ طوطا کہانی ہے فرمایا اور کمال عنایت خدا سے میری طرف متوجہ ہو کر ارشاد کیا کہ اگر تو اس طوطا کہانی کو زور طبیعت سے اپنے طور پر پروازی دلائے اور حاضر کرے تو سبب خوشنودی خاطر مابدولت کا ہو۔''

شاہزادے کی ایما سے رسا نے قادری کے طوطی نامے کی بیس حکایتوں کا ترجمہ کیا۔ اس کی تاریخ کی فکر کی تو مادّہ ایسا ہاتھ آیا کہ اسی کو اس کا نام بھی رکھ دیا، اس طرح

جب ختم ہوئی رسا کہانی تاریخ کا اس کی مجھ کو تھا رنج
ناگاہ بولا یہ ہاتفِ غیب تاریخ حکایت سخن سنج

1262ھ

رامپور کے کتاب خانے میں اس کا جو مخطوطہ ہے اس کی کتابت عبدالرشید نے 1274ھ (1857) میں چونسٹھ اوراق پر کی تھی۔ یہ کتاب اسی سال میں چھپ بھی گئی تھی۔

بعد کے زمانے میں رامپور میں پہنچنے کے بعد رسا نے کئی داستانیں لکھی تھیں۔

امجد علی شاہ کے ولی عہد واجد علی شاہ بڑے علم دوست تھے۔ جانِ عالم کے نام سے مشہور تھے۔ کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ شاید انھیں کی رعایت سے رجب علی بیگ سرور نے اپنی تصنیف کو "قصۂ جانِ عالم" کہا ہے۔ واللہ اعلم۔ واجد علی شاہ کے زمانۂ سلطنت میں بڑی تعداد میں داستانیں لکھی گئی تھیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ ان کے زمانۂ ولی عہدی میں بھی بعض کتابوں کی تصنیف میں ان کی نوازشات کو دخل رہا ہوگا۔ اس پہلو کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔ واجد علی شاہ کی بادشاہت کے دور میں اردو نثر میں جو داستانیں لکھی گئی تھیں ان میں سے بعض کا مجملاً ذکر کیا جاتا ہے۔

## 4- حیدر علی- حیدر علی

یہ اصلاً فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ اردو نثر میں انھوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔

الف: مناسک حیدریہ۔ یہ حج کے مسائل سے متعلق ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کا مخطوطہ علی گڑھ ناقص الاول ہونے کے باوجود کوئی ڈیڑھ سو اوراق پر محیط ہے۔ بہ صورتِ موجودہ اس کی ابتدا ان فقروں سے ہوئی ہے۔

> "ہزار ہزار شکر خدا کا کہ اس نے اپنی عنایت سے ہم کو راہ اسلام کی بتائی اور پیروی حضرت سید المرسلین کی سمجھائی۔" 94

اور کتاب کا خاتمہ ان فقروں پر کیا گیا ہے:

> "اور تصدق کرے مساکین پر اور خاک حرم شریف کی کچھ اپنے پاس لے یا سنگریزے وہاں کے۔"

ب: تموز نیم روز۔ یہ رسالہ اڑتیس ورق کا ہے اور اس کا آغاز ان کلمات سے کیا گیا ہے:

> "اس مقدمہ میں میرے نزدیک بارہ امر تنقیح طلب معلوم ہوتے ہیں.........."95

اور اس رسالے کے آخری الفاظ یہ ہیں:

> "لکھنؤ میں کبھی میں نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ کی سلطنت سے نہ دبا۔ یہاں کیونکر خاموش رہوں گا۔"

ان مختصر سے فقروں سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مصنف بادشاہ دوم نصیر الدین حیدر کے

عہد میں (یا ممکن ہے اس سے کچھ پہلے فیض آباد سے لکھنؤ آ گیا تھا۔ وہ اپنے وقت کے صاحب حیثیت مذہبی عالموں میں سے تھا۔ زبان اس کی تصانیف کی صاف اور رواں تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کے بعد وہ لکھنؤ چھوڑ کر کسی دوسرے مرکز پر چلا گیا تھا۔ اس نے 1299ھ (1882) میں وفات پائی تھی۔ گمان غالب ہے کہ مذکورہ دونوں کتابیں اس نے آخر زمانے میں لکھی ہوں گی۔

حیدر علی کا اردو نثر میں سب سے بڑا کارنامہ ''ترجمہ الف لیلہ'' ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر سہیل بخاری نے لکھا ہے کہ:

''حیدر علی فیض آبادی نے واجد علی شاہ کے عہد میں عربی سے دس جلدوں میں الف لیلہ کا ایک ترجمہ کیا تھا جس کی ایک مطبوعہ جلد انجمن ترقی اردو (ہند) کے کتب خانہ میں ملتی ہے۔ باقی کا پتہ نہیں۔ اس میں سو راتیں ہیں اور حکایات الجلیلہ کی پہلی جلد کی کہانیاں ہیں۔ یہ جلد 1263ھ (1847) میں طبع ہوئی تھی۔''69

ہمارے پاس رتن اینڈ کو، تاجران کتب، دہلی کی طبع کی ہوئی الف لیلہ کی ''مکمل چار جلد'' ہیں لیکن افسوس ہے کہ اس پر کسی جگہ مترجم کا نام نہیں لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ حیدر علی ہی کا ترجمہ ہو۔ واللہ اعلم۔

### 5- سرور۔ مرزا رجب علی بیگ

مرزا رجب علی بیگ سرور کا زندۂ جاوید کارنامہ ''فسانۂ عجائب'' ہے جس کا پہلے حصے میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سرور کو واجد علی شاہ کی خدمت میں رسائی حاصل ہوگئی تھی چنانچہ انھوں نے بادشاہ کے حکم سے شمشیر خانی کا ترجمہ اردو میں ''سرور سلطانی'' کے نام سے کیا تھا۔ اس سلسلے میں خود سرور کا بیان یہ ہے:

''سن ھ بارہ سے چونسٹھ تھے حکم قضا شیم صادر ہوا کہ شمشیر خانی زبان اردو میں لکھ لیکن طول نہ ہوتا قاری و سامع ملول نہ ہو۔ فیض ارشاد ہدایت بنیاد سلطان عالم حامی و مددگار ہوا۔ یہ نسخہ تیار ہوا۔ نام اس کا سرور سلطانی ہوا۔''

یہ کتاب پہلی بار مطبع خاقانی میں مع فرہنگ تین سو دس صفحوں پر 7 رجب 1265ھ کو اور

مطبع مسیحائی لکھنؤ میں 1268ھ میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ عبارت اس کتاب کی بھی مسجع اور مقفّی ہے۔ ڈاکٹر گوکب قدر نے لکھا ہے کہ:

"مثنوی خونِ اختری کے ناشر محبوب علی صاحب نے اسے واجد علی شاہ سے منسوب کیا ہے۔" جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں ہے۔"97

سرور نے شاہی کے زمانے میں ہی ایک اور داستان "شگوفۂ محبت" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے سبب تالیف میں لکھا ہے۔

"ایک شفیق نام نامی امجد علی خاں ایک قصہ مہر چند کھتری کا لکھا ان کی نظر سے گذرا ...... روزمرّ ہ محاورہ لا وبالی تھا۔ فقیر نے باعث رغبت خانِ والا شان اس داستان کی جان جو کہ مطبوع طبع اس نکتہ داں کے تھی نکال لی۔ خدا کی عنایت سے آغاز اس کا خوب ہوا۔ بخیر انجام ہے، شگوفۂ محبت اس کا نام ہے۔"

6- ولایت علی- ولایت علی

ان کے حالات سوائے اس کے کہ جو انھوں نے خود "گلشنِ دانش" میں لکھ دیے ہیں، کچھ معلوم نہیں ان کے الفاظ یہ ہیں:

"بندہ خاکسار...... ولایت علی ولد شیخ محمد بخش خلف الصدق شیخ محمد حیات عہدِ سلطنت مہد...... سلطان ابن سلطان...... محمد واجد علی شاہ اودھ غازی...... ایک روز صحبت ...... مصدر اخلاقِ خفی و جلی شیخ جعفر علی...... کے حاضر تھا...... میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ کتاب بہار دانش تصنیف عنایت اللہ مرحوم کے مضامین...... فارسی سے لباس اردو میں آرائش پائے...... بپاس خاطر...... آبیاری زبان اردو سے 1268ھ میں آب و تاب ترجمہ کی دی۔"98

گلشن دانش، ترجمۂ اردو بہار دانش، باتصویر، الکٹرک ابوالعلائی پریس آگرہ کی چھپی ہوئی ہمارے پیش نظر ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارا یہ نسخہ ناقص الآخر ہے۔ شاید خاتمہ میں کتاب کے بارے میں بعض ضروری معلومات درج رہی ہوں گی۔

رواج عام کے مطابق اس داستان میں بھی سودا، درد، میر، میرحسن، جرأت، انشا اور خود

ولایت کی اردو اور فارسی غزلوں، رباعیوں، تضمینوں (مسدّس اور مخمس) وغیرہ کے علاوہ دوہرے اور مثلیں وغیرہ بھی جگہ جگہ شامل کی گئی ہیں۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر سہیل بخاری نے لکھا ہے۔

> ''فارسی اشعار نکال کر جا بجا اردو کے اشعار، متفرق بیتیں اور واسوخت داخل کر کے کتاب کو اردو کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے، اس کے باوجود ترجمہ اصل کتاب سے بہت مختصر ہو گیا ہے۔''98

حقیقت یہ ہے کہ اس ترجمے میں فارسی کے مصرعے، شعر، قطعے، رباعی اور سبھی کچھ موجود ہیں۔ ہمارے نسخے میں 140 صفحے ہیں۔ ان کے بعد کتاب کے کتنے ورق اور تھے اس کا اندازہ کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

اس ترجمے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولایت کو اردو میں غزل کے علاوہ قصیدہ، قطعہ اور تضمین (مسدّس، مخمس) کا بھی شوق تھا۔ کتاب کے دیباچے کی زبان بہت مغلق اور فارسی آمیز ہے لیکن اصل داستان کی زبان عربی فارسی کے الفاظ و تراکیب کے باوجود صاف اور سلیس ہے۔ متن میں حسب ضرورت اردو نثر کے خط بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں مراسلت کا اس زمانے میں رواج عام ہو گیا تھا۔

### 7- اصغر- سید اصغر علی خاں

واجد علی شاہ بلا شبہ نہایت خوش سلیقہ انسان تھے۔ ان کے حالات میں مذکور ہے کہ:

> ''دو خطوں میں اپنی دو بیگموں سے فرمائش کی تھی کہ جو محبت نامے میں نے تمھیں بھیجے ہیں تم انھیں تاریخ وار، خوش تقطیع، بین السطور اچھا، مطلا، مذہب، منقش کروا کے ہمارے پاس بھجوا دو۔''99

اس قسم کی فرمائش دوسری بیگمات سے بھی ضرور کی گئی ہوگی۔ اس کے نتیجہ میں خطوں کے مجموعوں پر مشتمل کئی کتابیں تیار ہو گئیں جن کے نام اس طرح تھے: تاریخ غزالہ، تاریخ جمشیدی، تاریخ نورو وغیرہ۔

''بادشاہ نے اپنی بیگمات اور محلات کے نام بہ نام اُستی نام رکھائے ہیں، ان میں ملکۂ غزالہ، ملکۂ سکھتن، ملکہ مہرتن اور مہرلقا وغیرہ بھی شامل ہیں۔100

الف: قصہ روشن جمال

سید اصغر علی خاں لکھنؤ کے رہنے والے ایک داستان گو نے جس کے مفصل حالات معلوم نہیں ہو سکے ایک داستان قصہ روشن جمال' کے نام سے لکھی تھی۔ اس کا جو قلمی نسخہ رامپور میں ہے ایک سو انٹھاون اوراق پر اس کی کتابت 1272ھ (1886) میں ہوئی تھی۔ اس کے سبب تالیف میں ہے:

> ''اس حقیر حکیم سید اصغر علی خاں داستان گو نے ہی شوق سے اس فن داستان گوئی کو اختیار کیا ہے کئی سال بیکار رہا کہ شہرہ داستان گوئی کا بہت ہوا۔ واجد علی شاہ بادشاہ نے یاد فرمایا۔ داستان سُنی، مواجب مقرر فرمادیا۔ مثنویاں تینوں اپنی مرحمت فرمائیں۔ خیال میں گذرا کہ کوئی قصہ دلچسپ ایسا بنا کہ اس میں سلطان عالم کے شعر ہوں اور نثر تیری ہووے۔ اس سبب سے یہ قصہ بنایا اور خدمت میں حضرت سلطان عالم کی بھیجا۔ ملاحظہ فرما کر بہت پسند کیا اور نام اس کا قصہ روشن جمال رکھا۔''

بادشاہ کی تین مثنویاں بہ گمان غالب یہ ہیں۔ افسانۂ عشق، دریائے تعشق، بحر الفت اس داستان میں جگہ جگہ بادشاہ کے شعر درج کیے گئے ہیں۔ زبان صاف اور رواں ہے۔

ب: قصہ ماہ پروین

بادشاہ کی مثنوی بحر الفت سے یہ داستان مرتب کی گئی ہے۔ رامپور میں اس کا باسٹھ ورقی مخطوطہ محفوظ ہے۔ اس کے سبب تالیف میں ہے۔

> '' سبب تصنیف کتاب یعنی قصہ ماہ پروین یہ ہے کہ غلام نے سُنا کہ ان دنوں میں رہس ماہ پروین اور مہر پرور کا بہت اشتیاق سے حضرت سلطان عالم ملاحظہ فرماتے ہیں۔ اس خاکسار کے خیال میں آیا کہ تو دونوں رہسوں کی داستان تو بنا چکا ہے اس کی بھی داستان بنا کر پیش کش ملازمان شاہنشاہی کر کے نحوست ایام نافرجام کی برطرف ہووے۔ اس سبب سے یہ داستان بنائی۔ نام اس کا قصہ ماہ پروین رکھا۔''

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ دو رہس کون سے تھے جن کی داستان اصغر پہلے بنا چکا تھا۔

ج: داستان غزالہ

یہ داستان بھی رامپور میں ہے۔ کل پچاس صفحے ہیں۔ اس کا سبب تالیف یہ ہے:

''ماہ رجب میں خیال میں آیا کہ دو مثنویوں کی داستان بنا کر تو نے ملازمان بادشاہی کو سنائی۔ اب غزالہ کی مثنوی کی داستان بنا کر قریب میلہ قیصر باغ کے گزرانیے کہ نحوست ایام تیری برطرف ہووے اور حکم سلام کر لینے کا تجھے ہو جائے۔ اس سبب سے یہ کہانی غزالہ کی مثنوی کی اصغر علی داستان گو نے بنائی اور نام اس کا قصہ غزالہ رکھا۔''

یہ مثنوی دریائے تعشق ہے جس میں شہزادی غزالہ اور شہزادہ ماہ رو کے عشق کا حال نظم کیا گیا تھا۔

د: قصہ سیمتن و پری پیکر

اس داستان کا باسٹھ ورقی قلمی نسخہ بھی رامپور میں ہے۔ مصنف نے اس کا سبب تالیف اس طرح قلمبند کیا ہے:

''ایک روز رہس مبارک میں جو مشتری بنتے ہیں وہ اس حقیر کے پاس آئے اور کہا کہ آپ داستان گو بے نظیر ہیں۔ آپ کو خدا نے شہرہ آفاق کیا ہے۔ آپ بطرز داستان کے گفتگو مشتری کی درست کر دیجیے تو بڑا احسان ہوگا۔ اس خاکسار نے موافق اپنی عقل کے درست کر دی۔ بعد اس کے خیال گزرا کہ اتنی کہانی درست ہو چکی ہے۔ باقی اور بنا کر پیشکش ملازمان سلطان عالم کیجیے کہ نحوست ایام نافرجام کی دفع ہووے اور زیارت وقدم بوسی سے شرف ہووے۔ اس سبب سے یہ قصہ تیار ہوا۔ نام اس کا قصہ سیمتن رکھا۔

مصنف نے اس داستان میں عبارت کو مقفیٰ بنانے کی کوشش کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں سادگی اور صفائی کا لطف باقی نہیں رہ گیا۔ نمونہ عبارت کا یہ ہے۔

''صبح کو مہر پرور مع فوج روانہ ہوا کہ ہُوا نقارہ کوچ کا یکبار ساتھ سب فوج ہو گئی تیار، جبکہ خورشید آشکارا ہوا، مہر پرور ادھر سوار ہوا، آگے آگے نقیب بولتے ہوئے پیچھے پڑے سواروں کے پلٹنیں سجے ہوئے رفتار کیوں پر سوار، آگے بڑھے ہوئے، جوانان خوش رو، سبزے آغاز، عالم شباب، خانہ جنگ، سرکش، تیوریوں پر بل پڑے ہوئے، زرہ

بکتر پہنے ہوئے........"

یہ سب واجد علی شاہ کے لکھنؤ سے روانہ ہونے سے پہلے کی حکیم سید اصغر علی خاں کی لکھی ہوئی داستانیں ہیں۔ بعد میں وہ نواب کلب علی خاں کے زمانے میں رامپور چلے گئے اور وہاں بھی کئی داستانیں لکھیں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے 1296ھ (1879) میں وفات پائی۔

لکھنؤ میں کچھ داستانیں اور بھی لکھی گئی تھیں مثلاً اکرام الدین احمد بلگرامی کی داستان ''انیسِ عاشقان'' وغیرہ کہا جا سکتا ہے اردو نثر کی اس صنف کو ترقی دینے میں اہلِ لکھنؤ اور شہر لکھنؤ کے ماحول کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔

# حواشی

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | گزشتہ لکھنؤ | | ص52 |
| 2- | ایضاً | | ص57 |
| 3- | ایضاً | | ص42 |
| 4- | نی | | ص246 |
| 5- | اقلیم سخن کے تاجدار | | ص93 |
| 6- | ایضاً | | ص90تا91 |

## الف - شاعری

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | اقلیم سخن کے تاجدار | | ص72 |
| 2- | خوش معرکہ زیبا | جلد2 | ص393 |
| 3- | سراپا سخن | | ص174،346 |
| 4- | واجد علی شاہ | | ص565 |
| 5- | ایضاً | | ص611تا612 |
| 6- | اقلیم سخن کے تاجدار | | ص62 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 7- | واجد علی شاہ | | ص604تا606 |
| 8- | اقلیم سخن کے تاجدار | | ص97 |
| 9- | ایضاً | | ص132 |
| 10- | ایضاً | | ص100تا174 |
| 11- | ایضاً | | ص104 |
| 12- | آب حیات | | ص341 |
| 13- | ایضاً | | ص357 |
| 14- | ایضاً | | ص382 |
| 15- | ایضاً | | ص374تا375 |
| 16- | ایضاً،اردو کراچی | جلد59 | ص383 |
| 17- | دبستان آتش | | ص53 |
| 18- | سراپا سخن | | ص342 |
| 19- | صہبائی ایک مختصر تعارف | | ص17تا171 |
| 20- | سخن شعرا | | ص79 |
| 21- | خوش معرکہ زیبا | جلد2 | ص79 |
| 22- | سراپا سخن | | ص204 |
| 23- | ایضاً | | ص312 |
| 24- | خمخانہ جاوید | جلد5 | ص352 |
| 25- | افسانۂ لکھنؤ | | ص87 |
| 26- | خوش معرکہ زیبا | جلد2 | ص533تا534 |
| 27- | سراپا سخن | | ص55 |
| 28- | دبستان آتش | | ص163تا166 |
| 29- | اردو مثنوی شمالی ہند میں | | ص499تا500 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| -30 | ایضا | | ص497 تا 498 |
| -31 | لکھنؤ کا دبستان شاعری | | ص606 تا 607 |
| -32 | نگار لکھنؤ سالنامہ | | 1950 |
| -33 | خوش معرکہ زیبا | جلد 2 | ص63 |
| -34 | لکھنؤ کا دبستان شاعری | | ص594 |
| -35 | جواہر سخن | جلد 3 | ص603 |
| -36 | تلخیص معلی | | ص92 تا 93 |
| -37 | ایضا | | ص93 |
| -38 | ایضا | | ص95 تا 96 |
| -39 | آب حیات | | ص359 |
| -40 | ایضا | | ص357 |
| -41 | آب حیات | | ص353 |
| -42 | خی | | ص228 |
| -43 | جواہر سخن | جلد 3 | ص401 |
| -44 | فسانہ عجائب | | ص24 |
| -45 | خلاصہ سوانح لکھنؤ مشمولہ معاصر پٹنہ جولائی 1992 | | ص84 تا 85 |
| -46 | تذکرہ نادر | | ص66 |
| -47 | آب بقا | | ص142 تا 144 |
| -48 | خوش معرکہ زیبا | جلد 2 | ص467 |
| -49 | ایضا | جلد 2 | ص318 |
| -50 | بحر الفصاحت | | ص78 |
| -51 | خوش معرکہ زیبا | جلد 2 | ص239 تا 240 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 52- | سراپا سخن | | ص48تا374 |
| 53- | سخن شعرا | | ص3 |
| 54- | تذکرہ مخطوطات | جلد3 | ص272 |
| 55- | ایضا جلد ا | | ص335 |
| 56- | بی | | ص236تا238 |
| 57- | انتخاب یادگار | | ص13تا14 |
| 58- | واجد علی شاہ | | ص387 |
| 59- | فہرست موزہ ملی کراچی | | ص216 |
| 60- | ایضا | | ص173 |
| 61- | اردو مثنوی شمالی ہند میں | | ص569 |
| 62- | خوش معرکہ زیبا | جلد2 | ص238 |
| 63- | آب حیات | | ص354 |
| 64- | خوش معرکہ زیبا | جلد2 | ص261 |
| 65- | سراپا سخن | | ص324 |
| 66- | خوش معرکہ زیبا | جلد2 | ص217 |
| 67- | سراپا سخن | | ص330 |
| 68- | سخن شعرا | | ص254 |
| 69- | سراپا سخن | | ص87تا124 |
| 70- | خوش معرکہ زیبا | جلد2 | ص154 |
| 71- | ایضا | | ص589 |
| 72- | واجد علی شاہ | | ص86 |
| 73- | تلخیص معلی | | ص86تا91 |
| 74- | واجد علی شاہ | | ص459 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 75- | آب حیات | | ص 521 تا 523 |
| 76- | ایضا | | ص 524 |
| 77- | ایضا | | ص 525 |
| 78- | خوش معرکہ زیبا | جلد 1 | ص 337 تا 338 |
| 79- | سراپا سخن | | ص 259 |
| 80- | گلستان سخن | جلد 2 | ص 373 |
| 81- | آب حیات | | ص 521 |
| 82- | خمخانۂ جاوید | جلد 3 | ص 151 تا 158 |
| 83- | آب حیات | | ص 520 |
| 84- | خمخانۂ جاوید | جلد 3 | ص 156 |
| 85- | خوش معرکہ زیبا | جلد 1 | ص 51 تا 52 |
| 86- | آب حیات | | ص 519 |
| 87- | خوش معرکہ زیبا | جلد 1 | ص 51 تا 53 |
| 88- | سراپا سخن | | ص 122 |
| 89- | خوش معرکہ زیبا | جلد 2 | ص 199 |
| 90- | سراپا سخن | | ص 252 |
| 91- | خوش معرکہ زیبا | جلد 2 | ص 141 |
| 92- | سراپا سخن | | ص 197 |
| 93- | خوش معرکہ زیبا | جلد 1 | ص 133 |
| 94- | ایضا | جلد 1 | ص 118 |
| 95- | سراپا سخن | | ص 300 تا 314 |
| 96- | گلستان سخن | جلد 1 | ص 369 |
| 97- | خمخانۂ جاوید | جلد 2 | ص 207 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 98- | سراپا سخن | | ص109 |
| 99- | ریاض الفصحا | | ص307 |
| 100- | خوش معرکہ زیبا | جلد1 | ص401 |
| 101- | واجد علی شاہ | | ص478 |
| 102- | خوش معرکہ زیبا | جلد1 | ص230تا231 |
| 103- | ناٹک ساگر | | ص355 |
| 104- | لکھنؤ کا دبستان شاعری | | ص509 |
| 105- | علی گڑھ کے اردو مخطوطات | | ص192 |
| 106- | سراپا سخن | | ص334 |
| 107- | ایضاً | | ص191 |
| 108- | ناٹک ساگر | | ص362 |
| 109- | لکھنؤ کا دبستان شاعری | | ص535تا536 |
| 110- | واجد علی شاہ | | ص158 |
| 111- | ایضاً | | ص640 |

## نثر

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | آب حیات | | ص357 |
| 2- | خوش معرکہ زیبا | جلد1 | ص1 |
| 3- | ایضاً | جلد2 | ص584تا585 |
| 4- | ایضاً | جلد2 | ص71تا73 |
| 5- | ایضاً | جلد1 | ص191 |
| 6- | تحقیق نامہ، خوش معرکہ مرتبہ شمیم | | ص33تا41 |
| 7- | تحقیق نامہ | | ص193 |
| 8- | ایضاً | | ص185 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 9- | ایضاً | | ص186 تا 188 |
| 10- | ایضاً | | ص190 تا 191 |
| 11- | ایضاً | | ص188 تا 190 |
| 12- | ایضاً | | ص188 |
| 13- | سراپا سخن | | ص321 تا 386 وغیرہ |
| 14- | خوش معرکۂ زیبا | جلد 2 | ص351 تا 352 |
| 15- | فہرست مخطوطات اردو رامپور | جلد 1 | ص400 تا 401 |
| 16- | شاہ حسین حقیقت | | ص279 |
| 17- | فہرست مخطوطات رامپور | جلد 1 | ص395 |
| 18- | ایضاً | جلد 1 | ص401 |
| 19- | ایضاً | جلد 1 | ص400 |
| 20- | شاہ حسین حقیقت | | ص330 |
| 21- | شاہان اودھ کے کتب خانے | | ص29 |
| 22- | اردو ادب علی گڑھ نمبر 3 | | 1972 |
| 23- | دفتر فصاحت | | ص1 تا 7 |
| 24- | خوش معرکۂ زیبا | جلد 1 | ص514 تا 517 |
| 25- | ایضاً | جلد 1 | ص244 تا 245 |
| 26- | صہبائی۔ ایک مختصر تعارف | | ص70 تا 82 |
| 27- | واجد علی شاہ | | ص166 |
| 28- | تقویت الشعرا | | ص2 |
| 29- | مخطوطات اردو انجمن کراچی | جلد 6 | ص156 |
| 30- | ریاض الفصحا | | ص250 |
| 31- | خوش معرکۂ زیبا | جلد 1 | ص425 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| -32 | شوکت ناری | | ص69تا70 |
| -33 | بہارِ بےخزاں | | ص2تا3 |
| -34 | واجد علی شاہ | | ص231 |
| -35 | ایضا | | ص527 |
| -36 | ایضا | | ص536تا537 |
| -37 | ایضا | | ص526 |
| -38 | ایضا | | ص530 |
| -39 | خوش معرکۂ زیبا | جلد2 | ص473 |
| -40 | سراپا سخن | | ص262 |
| -41 | واجد علی شاہ | | ص206 |
| -42 | سخن شعرا | | ص42 |
| -43 | ایضا | | ص455 |
| -44 | ایضا | | ص314 |
| -45 | واجد علی شاہ | | ص250 |
| -46 | ایضا | | ص252 |
| -47 | بنی | | ص246 |
| -48 | سخن شعرا | | ص563 |
| -49 | واجد علی شاہ | | ص241 |
| -50 | علی گڑھ کے اردو مخطوطات | جلد1 | ص313 |
| -51 | واجد علی شاہ | | ص247 |
| -52 | خمخانۂ جاوید | جلد1 | ص208 |
| -53 | الزبیر۔سفرنامے | | ص135 |
| -54 | اردو ادب میں سفرنامہ | | ص118 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 55- | آب بقا | | ص2 |
| 56- | ایضا | | ص161 |
| 57- | اردو ادب میں سفرنامہ | | ص555 تا 556 |
| 58- | واجد علی شاہ | | ص69 |
| 59- | ایضا | | ص167 |
| 60- | ایضا | | ص573 تا 538 |
| 61- | اردو ادب میں سفرنامہ | | ص124 |
| 62- | واجد علی شاہ | | ص176 تا 180 |
| 63- | اردو ادب میں سفرنامہ | | ص624 |
| 64- | سراپا سخن | | ص277 |
| 65- | سفر آشوب۔ مقدمہ | | ص5 |
| 66- | واجد علی شاہ | | ص310 |
| 67- | بنی | | ص230 تا 240 |
| 68- | واجد علی شاہ | | ص167 تا 169 |
| 69- | علی گڑھ کے اردو مخطوطات | | ص109 تا 110 |
| 70- | یادنامہ داوری | | ص198 |
| 71- | ایضا | | ص222 |
| 72- | لکھنؤ میں اردو نثر | | ص258 |
| 73- | واجد علی شاہ | | ص43 |
| 74- | آصفیہ کے اردو مخطوطات | جلد2 | ص171 تا 172 |
| 75- | یادنامہ داوری | | ص207 |
| 76- | ایضا | | ص183 |
| 77- | مخطوطات اردو انجمن کراچی | جلد3 | ص6 تا 7 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 78- | فسانۂ عجائب | | ص25 |
| 79- | سراپا سخن | | ص251 |
| 80- | ابن طوفان | | ص78تا79 |
| 81- | لکھنؤ میں اردو نثر | | ص268تا ب280 |
| 82- | علی گڑھ کے اردو مخطوطات | جلد 1 | ص335 |
| 83- | اردو داستان | | ص203تا206 |
| 84- | ایضا | | ص207تا209 |
| 85- | علی گڑھ کے اردو مخطوطات | جلد 1 | ص119 |
| 86- | مخطوطات اردو گنج بخش | | ص119 |
| 87- | تذکرہ مخطوطات | جلد اول | ص205 |
| 88- | قصہ اگر گل | | ص18تا23 |
| 89- | سراپا سخن | | ص71 |
| 90- | انتخاب یادگار | | ص147 |
| 91- | ایضا | | ص150 |
| 92- | علی گڑھ کے اردو مخطوطات | جلد 1 | ص170 |
| 93- | ایضا | | ص380 |
| 94- | ایضا | | ص40 |
| 95- | ایضا | | ص289 |
| 96- | اردو داستان | | ص197تا198 |
| 97- | واجد علی شاہ | | ص368 |
| 98- | اردو داستان | | ص223 |
| 99- | واجد علی شاہ | | ص189 |
| 100- | اردو داستان | | ص244 |

# مآخذ

## الف - کتابیں

(متن میں جن کتابوں یا رسالوں سے بحث کی گئی ہے ان کے نام یہاں درج نہیں کیے گئے ہیں)


| | | | |
|---|---|---|---|
| 1- | آب بقا (تذکرہ) | خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت | بار اول نامی پریس لکھنؤ جنوری 1918 (1336ھ) |
| 2- | آب حیات | مولوی محمد حسین آزاد | پہلا آفسیٹ ایڈیشن 1982 اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ |
| 3- | آب حیات کا تنقیدی مطالعہ | پروفیسر سید مسعود حسن رضوی | بار اول، کتاب نگر، لکھنؤ 1953 |
| 4- | آثار الشعرا (تذکرہ) | حافظ سید محمد ممتاز علی بھوپالی حافظ تخلص | مطبع الطرفین 1307ھ (1890) |
| 5- | آثار بنارس (تاریخ) | مولانا عبدالسلام نعمانی | مکتبہ ندوۃ المعارف بنارس جنوری 1963 |
| 6- | آرائش محفل | میر شیر علی جعفری متخلص بہ افسوس | پہلی بار، 1945 انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی |

| | | |
|---|---|---|
| 7- اردو داستان | ڈاکٹر سہیل بخاری | مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول 1987 |
| 8- اردو رباعیات | ڈاکٹر سلام سندیلوی | نسیم بکڈپو، لکھنؤ بار اول 1963 |
| 9- اردو شاعری میں منظر نگاری | ڈاکٹر سلام سندیلوی | نسیم بکڈپو لکھنؤ، اگست 1968 |
| 10- اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری | ڈاکٹر فرمان فتحپوری | مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول نومبر 1972 |
| 11- اردو کی ابتدائی نشونما میں صوفیائے کرام کا کام | مولوی عبدالحق | انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی 1953 |
| 12- اردو مثنوی شمالی ہند میں (صحیفۂ اغلاط) | ڈاکٹر گیان چند جین | انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ 1969 |
| 13- اردو مخطوطات | (خدا بخش جنوبی ایشیائی علاقائی سمنار 1987 کے مقالات) | خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ 1999 |
| 14- اردو میں مرثیے کا ارتقا- ابتدا سے انیس تک | ڈاکٹر مسیح الزماں | کتاب نگر لکھنؤ، پہلی اشاعت 1981 |
| 15- اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ | ڈاکٹر ابواللیث صدیقی | مقتدرہ قومی زبان، کراچی طبع اول 1981 |
| 16- اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ | ڈاکٹر محمد ایوب قادری | ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور طبع اول 1988 |
| 17- اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (آصفیہ) کے اردو مخطوطات جلد اول | نصیر الدین ہاشمی | مطبع ابراہیمیہ حیدرآباد دکن، 1381 ہجری (1961) |
| 18- ایضاً جلد دوم | | مطبع اعجاز مشین پریس، حیدرآباد دکن، 1381ھ (1961) |
| 19- افسانۂ لکھنؤ | آغا حجو شرف، مرتب: سید محمود نقوی | نشاط پبلکیشنز، دہلی 1985 |

| | | |
|---|---|---|
| 20- انتخاب دواوین | مولوی امام بخش صہبائی، مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی | شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی اشاعت اول 1987 |
| 21- انتخاب رتجی | مولوی عظیم الدین رتجی (مولف) ڈاکٹر محمد انصار اللہ (مرتب) | تاج پرنٹنگ پریس علی گڑھ 1981 |
| 22- انتخاب کلام الٰہی بخش خاں معروف | مرتب: عتیق احمد صدیقی | پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1991 |
| 23- انتخاب ناسخ (شیخ امام بخش ناسخ) | مرتب: رشید حسن خاں | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی اپریل 1972 |
| 24- انتخاب یادگار (تذکرہ) | امیر احمد امیر مینائی | اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ پہلا ایڈیشن 1982 |
| 25- انشائے بہار بے خزاں | مولوی غلام امام شہید الہ آبادی | مطبع آئین ہند دہلی |
| 26- باندہ اور غالب | صالحہ بیگم قریشی | بندیلکھنڈ پریس جھانسی 1994 |
| 27- برار کی تمدنی و علمی تاریخ- مسلم عہد حکومت میں | ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل | سلمان فائن آرٹس، ناگپور 2001 |
| 28- برہن کی کہانی یعنی محمد مقصود مقصود لکھنوی کا بارہ ماسہ | محمد انصار اللہ | مکتبہ جامعہ علی گڑھ اشاعت دوم 1979 |
| 29- بمبئی میں اردو 1914 تک | ڈاکٹر میمونہ دلوی | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی بار اول ستمبر 1970 |
| 30- بہار بے خزاں (تذکرہ) | احمد حسین سحر، مرتب: نعیم احمد | علمی مجلس، دہلی 1968 |
| 31- بہارستان ناز (تذکرہ) | حکیم فصیح الدین رنج، مرتب: خلیل الرحمٰن داودی | مجلس ترقی ادب، لاہور مارچ 1965 |

| | | |
|---|---|---|
| 32- بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا 1857 تک | سید اختر اورینوی | شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ، مارچ 1957 |
| 33- بھوپال ادب کے آئینہ میں | ڈاکٹر محمد نعمان | سیفیہ آرٹس، کامرس، اینڈ لا کالج بھوپال 1994 |
| 34- بیگمات اودھ | شیخ تصدق حسین | کتاب نگر لکھنؤ 1956 |
| 35- پری جمال بیگمات شاہان اودھ | خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی مرتب: مولانا عبدالسلام رامپوری | حمیدیہ پریس دہلی ستمبر 1935 |
| 36- پنج آہنگ میں مکاتیب غالب | مرزا اسداللہ خاں غالب مرتب: کالیداس گپتا رضا | دل پبلیکیشنز بمبئی اپریل 1989 |
| 37- پنجاب میں اردو | حافظ محمود خاں شیرانی مرتب: خورشید احمد خاں یوسفی | مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد 1988 |
| 38- پہیلی نامہ (مختلف شاعروں کی پہیلیاں) | مولف الطاف رسول دہلوی | مطبع نارائنی دہلی 1976 (1293ھ) |
| 39- تاریخ آصفی (اردو ترجمہ تفضیح الغافلین) | مرزا ابوطالب اصفہانی ترجمہ: ڈاکٹر ثروت علی | ادارۂ صبح ادب، دہلی 1968 |
| 40- تاریخ ادب اردو | رام بابو سکسینہ، ترجمہ اردو: مرزا محمد عسکری | مطبع منشی تیج کمار لکھنؤ 1969 |
| 41- تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند اردو ادب حصہ سوم | مدیر خصوصی: گروپ کیپٹن سید فیاض محمود | پنجاب یونیورسٹی لاہور 1971 |
| 42- تاریخ اودھ جلد سوم | حکیم محمد نجم الغنی خاں رامپوری | مطبع مطلع العلوم مرادآباد اگست 1912 |
| 43- تاریخ گجرات وسیلۃ الظفر لآل مظفر | پروفیسر سید ابوظفر ندوی | ندوۃ المصنفین دہلی صفر 1378ھ (ستمبر 1958) |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 44- | تاریخ محمدی | مرزا محمد بن رستم<br>مرتب: امتیاز علی عرشی | ہندوستان پرنٹنگ ورکس<br>رامپور طبع اول 1960 |
| 45- | تاریخ محمودی<br>(کتاب الشہادات) | شاہ عبدالستار علوی جھنجھانوی،<br>ترجمہ: ڈاکٹر تنویر احمد علوی | ادارۂ مطبوعات مدرسہ نور محمد<br>جھنجھانہ، ضلع مظفر نگر |
| 46- | تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول<br>(ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد) | ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور | ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1984 |
| 47- | ایضاً جلد دوم | ایضاً | ایضاً |
| 48- | ایضاً جلد سوم | ایضاً | ایضاً |
| 49- | ایضاً جلد چہارم | ایضاً | ایضاً |
| 50- | ایضاً جلد پنجم | ایضاً | ایضاً |
| 51- | تذکرہ مخطوطات جلد ششم | مرتبین: محمد اکبر الدین صدیقی<br>ڈاکٹر محمد علی اثر | ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد،<br>دکن 1983 (1403ھ) |
| 52- | تذکرۃ الذاکرین | سید آغا شہر لکھنوی | شمسی پریس جھانسی 1946 |
| 53- | تذکرۂ سرور (عمدۂ منتخبہ) | اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور<br>، مرتب: خواجہ احمد فاروقی | شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی<br>مارچ 1961 |
| 54- | تذکرۂ شعرا | ابن امین اللہ طوفان<br>مرتب: قاضی عبدالودود | مطبوعہ آزاد پریس پٹنہ<br>1954 |
| 55- | تذکرہ شعرائے اردو | میر حسن دہلوی، مع مقدمہ<br>از محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی | انجمن ترقی اردو ہند دہلی<br>طبع جدید 1940 |
| 56- | تذکرہ شعرائے جے پور | احترام الدین احمد شاغل | انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ<br>1958 |
| 57- | تذکرہ شورش | از: غلام حسین شورش<br>مرتب: ڈاکٹر محمود الٰہی | اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ<br>پہلا ایڈیشن 1984 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 58- | ترجمہ حدائق البلاغت | شیخ امام بخش صہبائی | مطبع منشی نولکشور لکھنؤ |
| 59- | تذکرہ نادر | میرزا کلب حسین خاں نادر | کتاب نگر لکھنؤ 1957 |
| | | مرتب: سید مسعود حسن رضوی ادیب | |
| 60- | تذکرۂ نعت گویان بریلی | ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب | روشن پبلیکیشنز بدایوں 1986 |
| 61- | تذکرۂ ہندی | شیخ غلام ہمدانی مصحفی | انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن |
| | | مرتب: مولوی عبدالحق | طبع اول 1933 |
| 62- | تفصیلی فہرست مخطوطات متفرقہ | منظور احسن عباسی | پنجاب پبلک لائبریری لاہور |
| | | | 1964 |
| 63- | تقویۃ الایمان مع دو | مولانا محمد اسمٰعیل شہید | مطبع مجتبائی میرٹھ |
| | ابواب یعنی: | | |
| | باب اول تقویۃ الایمان رسالہ | از مولوی محمد حسین فقیر | |
| | بیان الصفات | | |
| | وباب دوم تقویۃ الایمان | مترجم مولوی محمد سلطان | |
| | تذکیر الاخوان | | |
| | مع رسالہ عصائے فقیر | از مولوی محمد حسین فقیر | |
| 64- | تلاش وتعارف | ڈاکٹر حنیف نقوی | نصرت پبلشرز لکھنؤ 1987 |
| 65- | تلخیص معلی | ڈپٹی کلب حسین خاں نادر | انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی |
| | | مرتب: ڈاکٹر انصار اللہ نظر | اشاعت اول 1975 |
| 66- | ایضاً | ڈپٹی کلب حسین خاں نادر | لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ |
| | | مرتب: ڈاکٹر انصار اللہ نظر | بار اول 1976 |
| 67- | تواریخ کانپور جلد اول، | منشی درگاہی لال | مطبع شعلۂ طور کانپور |
| | دوم، سوم | | |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 68- | تواریخ گورکھپور (قلمی) سرورق ندارد | | |
| 69- | تواریخ نادر العصر | منشی نولکشور | خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نقش ثانی 1990 |
| 70- | ثلاثۂ غسالہ | حکیم حبیب الرحمٰن مرتب: ڈاکٹر سید عارف نوشاہی | مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور مارچ 1995 |
| 71- | جامع الحکایات ہندی | شیخ صالح محمد عثمانی مرتب: پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر | مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول جون 1963 |
| 72- | جائزہ مخطوطات اردو جلد اول | مولف مشفق خواجہ | مرکزی اردو بورڈ لاہور طبع اول فروری 1979 |
| 73- | جلوۂ خضر (تذکرہ) | صفیر بلگرامی تلخیص وتنقید: ظفر اوگانوی | اقدار کتاب گھر کلکتہ دسمبر 1973 |
| 74- | جنگ نامۂ آصف الدولہ ونواب رامپور | خلیفہ محمد معظم عباسی مرتب: محمد ایوب قادری | انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی اشاعت اول 1980 |
| 75- | چمن انداز (تذکرہ مراۃ خیالی کا دوسرا حصہ) | درگا پرشاد کھتری دہلوی نادر تخلص | اکمل المطابع دہلی 1883 |
| 76- | چند اہم اخبارات ورسائل | قاضی عبدالودود | ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ 1993 |
| 77- | حکیم آغا جان عیش اور ہریانہ کے مشاہیر | بلجیت سنگھ مطیر | کایا پبلکیشنز بہادرگڑھ پہلا ایڈیشن دسمبر 1981 |
| 78- | خلاصۂ قوانین یعنی تلخیصات مجدد نادری | کلب حسین خاں نادر | مطبع اسعد الاخبار اکبرآباد 1265ھ (1849) |

| | | | |
|---|---|---|---|
| -79 | خمخانۂ جاوید (تذکرۂ ہزار داستان) جلد دوم | لالہ سری رام دہلوی | امپیریل بک ڈپو پریس دہلی 1911 |
| -80 | ایضاً جلد سوم | ایضاً | دلی پرنٹنگ ورکس دہلی 1917 |
| -81 | ایضاً جلد چہارم | ایضاً | ہمدرد پریس دہلی، بار اول 1926 |
| -82 | ایضاً جلد پنجم | مرتب: پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی | ناشر لالہ امیر چند کھنہ دہلی 1940 |
| -83 | ایضاً جلد ششم | مرتب: خورشید احمد خاں یوسفی | مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد 1990 |
| -84 | خندۂ گل (ظریف شاعروں کا تذکرہ) | مولانا عبدالباری آسی الدنی | نگار مشین پریس لکھنؤ 1929 |
| -85 | خوش معرکۂ زیبا جلد اول | سعادت علی خاں ناصر مرتب: مشفق خواجہ | مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول 1970 |
| -86 | ایضاً جلد دوم | ایضاً | ایضاً مارچ 1972 |
| -87 | دارالسرور برہانپور | مولوی معین الدین ندوی | جامعہ اشرفیہ برہانپور نومبر 1978 |
| -88 | دربار اکبری مع دیباچہ اشاریہ از پروفیسر محمد انصار اللہ | شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد | قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی پہلا ایڈیشن |
| -89 | دستور الفصاحت (مقدمہ و خاتمہ) | حکیم سید علی خاں یکتا بہ تصحیح امتیاز علی خاں عرشی | ہندوستان پریس، رامپور 1943 |
| -90 | دفتر فصاحت (دیوان وزیر) | خواجہ محمد وزیر وزیر | مطبع مصطفےٰ لکھنؤ 1308ھ (1891) |
| -91 | دکن میں اردو | نصیر الدین ہاشمی | ترقی اردو بیورو نئی دہلی پہلا ایڈیشن 1985 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| 92- | دہلی کی آخری شمع | مرزا فرحت اللہ بیگ | اسٹار بک ڈپو کلکتہ |
| 93- | دہلی کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست | ڈاکٹر صلاح الدین | انجمن ترقی اردو ہند دہلی ستمبر 1975 |
| 94- | دیوان اعظم | اعظم علی اعظم الہ آبادی | مطبع نور الابصار الہ آباد 1285ھ (1868) |
| 95- | دیوان جہاندار | شاہزادہ جواں بخت جہاندار شاہ مع مقدمہ از ڈاکٹر وحید قریشی | مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول جنوری 1966 |
| 96- | دیوان حیدری | سید حیدر بخش حیدری دہلوی مرتب: ڈاکٹر عبادت بریلوی | اردو دنیا کراچی 1966 |
| 97- | دیوان ذوق (خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق) | مولف: شمس العلما محمد حسین آزاد دہلوی | علمی پرنٹنگ ورکس دہلی 1933 (1351ھ) |
| 98- | دیوان شاداں دیوان اول | مہاراجا چندو لال شاداں مرتب: راجا کشن پرشاد شاد | محبوب پریس حیدرآباد دکن سال ترتیب 1239ھ |
| 99- | ایضاً دیوان دوم | ایضاً | ایضاً 1243ھ |
| 100- | دیوان شیفتہ | نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ | اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1985 |
| 101- | دیوان ظفر | بہادر شاہ ثانی ظفر تخلص پیش لفظ: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی | اعجاز پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی بار اول جنوری 1997 |
| 102- | دیوان عرش | میر حسن عسکری عرف میر کلو عرش مرتب ایم حبیب خاں | انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی دسمبر 1987 |
| 103- | دیوان غافل | منور خاں غافل ابن صلابت خاں | مطبع منشی نولکشور کانپور بار اول دسمبر 1897 |

| | | |
|---|---|---|
| 104- دیوان غالب کامل (تاریخی ترتیب سے) | مرزا اسد اللہ خاں غالب مرتب: کالی داس گپتا رضا | ساکار پبلشرز پرائیوٹ لمیٹڈ بمبئی بار اول فروری 1988 |
| 105- دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ | مرزا اسد اللہ خاں غالب مرتب: مفتی محمد انوار الحق | اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ پہلا فوٹو آفسٹ ایڈیشن 1982 |
| 106- دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ | مرزا اسد اللہ خاں غالب مرتب: پروفیسر حمید احمد خاں | مجلس ترقی ادب لاہور طبع دوم مئی 1983 |
| 107- دیوان غالب (مطبوعہ اکتوبر 1841 عکسی) | مرزا اسد اللہ خاں غالب پیش لفظ: کالی داس گپتا رضا | ول پبلکیشنز بمبئی 1986 |
| 108- دیوان غالب (چوتھا ایڈیشن، مطبوعہ مطبع نظامی کانپور، جون جولائی 1962 عکسی) | مرزا اسد اللہ خاں غالب پیش لفظ: کالی داس گپتا رضا | ول پبلکیشنز بمبئی 1987 |
| 109- دیوان فراق (عکس نسخۂ قلمی) | ثناء اللہ خاں فراق دہلوی | مخزونہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی |
| 110- دیوان گویا | فقیر محمد خاں گویا ملیح آبادی | مطبع منشی نولکشور لکھنؤ 1288ھ (1871) |
| 111- دیوان مصحفی | شیخ غلام ہمدانی مصحفی مرتبین: اسیر لکھنوی و امیر مینائی | خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ 1990 |
| 112- دیوان مصحفی (دیوان ہشتم) | شیخ غلام ہمدانی مصحفی | خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ 1995 |
| 113- دیوان مومن | حکیم محمد مومن خاں مومن دہلوی | مطبع جوہر ہند دہلی 1299ھ/1882 |
| 114- دیوان مہر (نسخۂ ناقص الآخر) | امین الدولہ سید آغا علی خاں مہر، کتبہ: جعفر | مطبوعہ 1263ھ (1847) |

| | | |
|---|---|---|
| 115- دیوان نوازش | آغا نوازش حسین خاں نوازش<br>مرتب: قاضی عبدالودود | خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری<br>پٹنہ 1993 |
| 116- دیوان نیاز (فارسی و اردو) | شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی | مطبع نامی منشی نولکشور، کانپور اپریل<br>1875 |
| 117- دیوان ولا | مظہر علی خاں ولا<br>مرتب: ڈاکٹر عبادت بریلوی | ادارۂ ادب وتنقید، لاہور دسمبر<br>1983 |
| 118- ذخیرۂ شیرانی میں اردو مخطوطات | سید جمیل احمد رضوی | مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد<br>1986 |
| 119- راجستھان میں اردو زبان<br>وادب (1857 تک) | ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی | راجستھان اردو اکادمی جے پور<br>مارچ 1992 |
| 120- رسالہ قواعد صرف ونحو اردو | مولوی امام بخش صہبائی | مطبع منشی نولکشور لکھنؤ |
| 121- ریاض الفصحا (تذکرہ) | شیخ غلام ہمدانی مصحفی<br>مرتب: مولوی عبدالحق | جامعہ برقی پریس دہلی 1934 |
| 122- ریاض دلربا | منشی گمانی لعل مرتب: ڈاکٹر ابن<br>کنول | کنول پبلیکیشنز دہلی مئی 1989 |
| 123- سخن شعرا (تذکرہ) | ڈپٹی عبدالغفور خاں نساخ | اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ<br>پہلا آفسٹ ایڈیشن 1982 |
| 124- سخنوران قصبہ کڑا<br>(تذکرہ شعرائے الہ آباد) | محمد واصل عثمانی | مکتبہ ذی النورین کراچی اشاعت<br>اول 1978 |
| 125- سخنوران گجرات | سید ظہیر الدین مدنی | ترقی اردو بیورو نئی دہلی 1981 |
| 126- سراپا سخن (تذکرہ) | سید محسن علی موسوی محسن | مطبع نامی منشی نولکشور لکھنؤ<br>بار سوم اپریل 1898<br>1315ھ |

| | | |
|---|---|---|
| 127- سراج نظم | شیخ امام بخش ناسخ<br>مرتب: میر علی اوسط رشک | مطبع محمد حسین لکھنؤ<br>1265ھ (1849) |
| 128- سرگذشت غالب<br>(مرزا اسد اللہ خاں غالب) | میرزا احمد بشیر بھرتپوری | عزیزی پریس آگرہ 1942 |
| 129- سعادت یار خاں رنگین | ڈاکٹر صابر علی خاں | انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی<br>1956 |
| 130- شگفتا (کہانی) | کاظم علی جوان<br>مرتب: ڈاکٹر محمد اسلم فرخی | مجلس ترقی ادب لاہور دسمبر 1963 |
| 131- شاہان اودھ کے کتب خانے | ڈاکٹر اے اشپرنگر<br>مرتب ومترجم: محمد اکرم چغتائی | انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی<br>1973 |
| 132- شاہ حسین حقیقت<br>اور ان کا خاندان | مشرف احمد | ادارۂ ادبیات پاکستان کراچی بار<br>اول 1977 |
| 133- شعرائے اردو کے تذکرے | ڈاکٹر سید حنیف نقوی | نسیم بک ڈپو لکھنؤ بار اول جون<br>1976 |
| 134- شمیم سخن (تذکرہ) | مولوی عبدالحی صفا بدایونی | مطبع منشی نولکشور لکھنؤ<br>بار دوم 1891 |
| 135- شوکت نادری (تذکرہ) | میرزا کلب حسین خاں نادر<br>ترتیب وترجمہ: ڈاکٹر شاہ عبدالسلام | نامی پریس لکھنؤ ستمبر 1984 |
| 136- شہر چارہ گراں | احسان آوارہ | ماہنامہ برگ حنا، چھاؤنی<br>باندہ بار اول 1991 |
| 137- شیو برت لال ورمن اور<br>ان کی علمی و ادبی خدمات | ڈاکٹر ذکیہ خاتون | شیو برت لال اکیڈیمک<br>ریسرچ سوسائٹی علی گڑھ 2001 |

| | | |
|---|---|---|
| 138- صبح گلشن (تذکرہ) | سید علی حسن خاں بہادر | مطبوعہ بھوپال 1295ھ (1878) |
| 139- صوبۂ متوسط و برار میں اردو کی حالت | سید علی شبر حاتمی | انجمن ترقی اردو ہند حیدر آباد دکن 1938 |
| 140- صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات | محمد عتیق صدیقی | انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پہلی بار 1962 |
| 141- صہبائی ایک مختصر تعارف | ڈاکٹر محمد انصار اللہ | لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ 1986 |
| 142- طبقات الشعراء (تذکرہ) | قدرت اللہ شوق<br>مرتب: نثار احمد فاروقی | مجلس ترقی ادب لاہور<br>طبع اول جنوری 1868 |
| 143- طبقات شعرائے ہند | مولوی کریم الدین پانی پتی | اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1983 |
| 144- طبقات سخن (تذکرہ) | غلام محی الدین مبتلا و عشق میرٹھی<br>مرتبہ: ڈاکٹر بیگم نسیم اقتدار علی | نظامی آفسیٹ پریس لکھنؤ 1991 |
| 145- عروس الاذکار (تذکرہ) | نصیر الدین نقش حیدر آبادی<br>مرتب: افسر صدیقی امروہوی | انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی 1975 |
| 146- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے اردو مخطوطات | ڈاکٹر عطا خورشید | خدا بخش اورنٹل پبلک لائبریری پٹنہ 1995 |
| 147- عود ہندی | مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی | مطبع نامی منشی نولکشور لکھنؤ 1331ھ (1913) |
| 148- عین المعارف (دیوان آسی) | مولوی عبد العلیم آسی<br>مرتب: سید شاہ مشاہد علی فانی گورکھپوری | طبع دوم |
| 149- غالب کے لطیفے | مفتی انتظام اللہ شہابی | حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی<br>پہلی بار سنہ ندارد |

| | | |
|---|---|---|
| 150 - غزلیات ذوق ردیف الف مع شیخ محمد ابراہیم ذوق مقدمہ وغیرہ | مرتب: محمد انصار اللہ | مقالہ برائے ایم اے غیر مطبوعہ 1963 |
| 151 - فسانۂ عجائب | مرزا رجب علی بیگ سرور مرتب: مخمور اکبر آبادی | رام نارائن لال ارون کمار پبلشر الہ آباد 1990 |
| 152 - فہرست (قلمی) کتب خانہ ذاتی نواب سید حیدر علی خان بہادر جعفری گوالٹولی کانپور | مرتب: محمد انصار اللہ | فارسی اردو کتب مطبوعہ وغیر مطبوعہ |
| 153 - فہرست (قلمی) کتب خانہ ذاتی نواب سید قیصر حسین خاں قیصر ٹکاپوری کانپور | مرتب: محمد انصار اللہ | فارسی اردو کتب مطبوعہ و قلمی |
| 154 - فہرست کتاب ہائے فارسی چاپ سنگی وکمیاب کتاب خانہ گنج بخش جلد یکم | مرتب سید عارف نوشاہی | مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد 1986 |
| 155 - فہرست مخطوطات اردو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، بانکی پور پٹنہ جلد اول | مرتب: عابد امام زیدی | بیسٹ مشین پریس کلکتہ 1962 |
| 156 - فہرست مخطوطات اردو مملوکہ رضا لائبریری رامپور جلد اول | مرتب امتیاز علی عرشی | ہندوستان پرنٹنگ ورکس رامپور 1967 |
| 157 - فہرست مخطوطات اردو کتاب خانہ گنج بخش | مرتب سید عارف نوشاہی | مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور جولائی 1978 |
| 158 - فہرست مخطوطات شیرانی (حافظ محمود خاں شیرانی) جلد اول | مرتب: ڈاکٹر محمد بشیر حسین | ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب لاہور چاپ دوم اگست 1975 |

'تاریخ ادب اردو جلد چہاردہم' انیسویں صدی عیسوی کی تاریخ ادب اردو کا ایک حصہ ہے جس میں بہادر شاہ ثانی کے زمانے کی علمی وادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ تاریخ اس اعتبار سے عدیم المثل ہے کہ اس میں مختلف مراکز کی علمی وادبی فتوحات کے حوالے سے اردو زبان وادب کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس جلد میں خطۂ بہار (عظیم آباد، پٹنہ)، بنگال اور مضافات (کلکتہ، مرشدآباد، ڈھاکہ، سلہٹ)، اڑیسہ، گجرات (احمد آباد، بڑودہ، بھروچ، سچین، سورت، کھمبایت)، صوبہ متوسط وبرار (ایلچ پور، جل گاؤں، ملکاپور)، بمبئی، ناگپور، کامٹی، دکن (حیدرآباد، ویلور، کرنول، قمرنگر)، بنگن پلی، کرناٹک، مدراس، نیپال، برما، جزائر انڈمان، پنانگ، ملایا اور مکہ معظمہ وغیرہ میں اردو زبان وادب کی صورت حال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ جلد 1838 سے 1857 تک کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان کی ادبی ہی نہیں سیاسی وثقافتی تاریخ کے اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اردو کے سلسلے میں تو اس کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب میں ان مراکز کی علمی وادبی فتوحات پر شاعری ونثر، مذہبی نثر، افسانوی نثر، مطبعے اور اخبارات وغیرہ کے ذیلی عنوانات کے تحت گفتگو کی گئی ہے۔

پروفیسر محمد انصار اللہ اردو کے معروف وممتاز محقق ہیں ان کے ادبی ذوق کی تربیت قاضی عبدالودود اور پروفیسر نذیر احمد کی تحریروں کے زیر اثر ہوئی ہے۔ ان کا پہلا تحقیقی مضمون نگار لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ ادبی تاریخ سے ان کی گہری دلچسپی ہے اور ان کی 60 سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ISBN: 978-93-5160-095-4
9 789351 600954
NCPUL
New Delhi
₹ 215/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی - 110025